دل گداز تحریریں • زندگی کی تصویریں

کراچی

ماہنامہ

سچی کہانیاں

November

2014

"مسئلہ یہ ہے"

قرآنی آیات کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل

اس شمارے میں:

★ برصغیر کے نامور قلم کار "ایم اے راحت" کا سنسنی خیز سلسلہ "ہم شکل"

★ وادی سون کا بے تاج بادشاہ، محمد خان ڈاکو کی داستان، پہلی بار منظر عام پر

★ خوشاب، ساہیوال، کوئٹہ، ڈسکہ، گوجر خان، بورے والا، ایبٹ آباد سے موصولہ سچی کہانیاں

فون: 34930470 - 021-34939823 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی سٹی پریس OB-7 تالپور روڈ، کرا

سالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 720 روپے/ افریقہ 65 ڈالر/ کینیڈا/ آسٹریلیا 65 ڈالر/ ایشیا/ یورپ 55 ڈالر/ قانونی مشیر جی ایم بھٹو ایڈووکیٹ ہائی کورٹ



بچپن......

کسی کام سے بازار جانا ہوا۔ دورانِ خریداری دو چھوٹے بچے مستقل بھیک مانگ رہے تھے اور سب انہیں نظر انداز کر رہے تھے مگر ایک لمحے کے لیے میں نے جب اُن کو پلٹ کر دیکھا تو میں اُن کے معصوم چہرے دیکھ کر گنگ رہ گئی۔ دونوں کی عمریں 4 یا 5 سال کے درمیان ہوں گی۔ چہرے پر بلا کی معصومیت، اردو زبان سے مکمل طور پر نا آشنا، دونوں اِس قدر گول مٹول اور خوب صورت تھے کہ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی انھیں کچھ پیسے دے ڈالے اور وہ خوشی خوشی چلے گئے......

اس واقعہ کو گزرے کئی دن ہوگئے ہیں مگر اُن کے چہروں پہ پھیلی معصومیت اور چند روپے جیب میں رکھ کر جو اطمینان اور خوشی اُن کے چہروں پر تھی، اُس نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔

'کاش، ہم اپنے بچوں کو اچھی غذا دے سکتے......

کاش ہم اپنے بچوں کو تعلیم دے سکتے...... برسہا برس بیت گئے اس تگ ودو میں۔ ہر آنے والے نے وعدے تو بہت کیے ہیں مگر وفا شاید سرشت میں ہی نہیں لیکن میں دعا کرتی ہوں کہ ہم اپنے بچوں کو کچھ دے سکیں یا نہ دے سکیں کاش اُن کا ''بچپن'' انھیں دے سکیں۔ کچھ بچا سکیں یا نہ بچا سکیں، اُن کی معصومیت ضرور بچا لیں، تب شاید اپنے پاکستانی ہونے کا کچھ حق ضرور ادا ہو سکے گا۔

منزہ سہام

کچھ اپنی باتیں

وہ مجھے ایک دن فٹ پاتھ پر ملے تھے، گھٹنوں میں سر دے کر بلک بلک کر روتے ہوئے۔ وہ ایک عمر رسیدہ بزرگ تھے۔ کھچڑی بال، جھریوں سے اَٹا چہرہ، موٹے شیشوں والی عینک، ہاتھوں میں رعشہ، لباس میلا کچیلا گرد آلود۔ بے انتہا بوسیدہ حالی کے باوجود وہ بھکاری نہیں لگتے تھے۔ چہرے کی جھریوں میں زمانے کی چیرہ دستی کے ساتھ ساتھ خودداری موجود تھی۔ مگر یہ اتنی رات گئے اِس غیر آباد صنعتی علاقے میں کیا کر رہے تھے۔ پوچھا کہ بڑے صاحب خیریت تھی جو رات گئے یہاں کھڑے ہیں۔ کہنے لگے جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں، کام کی تلاش میں نکلا تھا، لوگ مجھے دیکھتے ہیں اور بھیک تھمانے کی کوشش کرتے ہیں مگر کام کوئی نہیں دیتا۔ اور بیٹا اب عمر گزر چکی، ساری عمر ہاتھ نہیں پھیلایا۔ اب مرتے مرتے اپنا منہ کیوں کالا کروں؟ میں نے پوچھا کہ بچے نہیں ہیں کیا؟ کہنے لگے بچے کیا، میرے تو پوتا پوتیوں کے بچے جوان ہونے کو ہیں؟ میں ان کا جواب سن کر حیران رہ گیا کہ یاالٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ پوچھا کہ کھانا دانہ کھایا ہے؟ کہا کہ صبح چائے روٹی کھائی تھی۔ میں انھیں اٹھا کر ایک قریبی ہوٹل میں لے گیا۔ ہوٹل میں کھانا آتے آتے ان سے کافی باتیں ہوئیں۔ جن کا لب لباب یہ تھا کہ وہ ایک ٹھیکیدار تھے، خوب دولت کماتے تھے۔ اِدھر یہ دولت کما رہے تھے اُدھر بیوی بیٹے پر بیٹا پیدا کر رہی تھی۔ بڑے صاحب نے کبھی اپنے بیوی بچوں کی طرف دھیان نہیں دیا۔ شفقتِ پدری کا حق یہی ادا کیا کہ جب دل چاہا روئی کی طرح اولاد کو پیٹ دیا، یا روٹی سالن کے لیے دو چار روپے بیوی کے ہاتھ پر دھر دیے، بچے جوان ہونے لگے تو بڑے صاحب نے ایک جوان اوڑھنی سے شادی کرلی۔ دوسری شادی ایسی کی کہ پہلی بیوی اور بچوں کو اپنی زندگی سے یکسر نکال دیا کہ اب یہ جوان ہو گئے اپنا کمائیں کھائیں۔ اوڑھنی سے بھی دو بیٹے پیدا ہوئے۔ انھوں نے تیسری شادی ایک خوبصورت نرس سے کرلی۔ اوڑھنی نے شور مچایا تو اسے طلاق دے کر ہمیشہ کے لیے بھول گئے۔ نرس حسین اور پڑھی لکھی تھی۔ اس نے بڑے صاحب کی دو بیٹیاں پیدا کیں اور خوب مال بٹورا۔ اب بڑے صاحب پر بڑھاپا آ رہا تھا۔ آمدنی کم ہو رہی تھی۔ مگر بڑے صاحب ایک مکان کی مرمت کرنے گئے تو اس کی بیوہ مالکن سے شادی رچالی۔ انھوں جب جب نئی شادی کی پرانی کی طرف مڑ کر نہیں دیکھا۔ بیوہ کے پہلے شوہر سے بچے جوان ہوئے تو انھوں نے بڑے میاں کو گھر سے نکال باہر کیا۔ المختصر یہ کہ بڑے صاحب واپس لوٹ لوٹ کر اپنی اولاد کی طرف گئے۔ تو انھوں نے پرائی اولاد سے زیادہ بری طرح دھکے دے کر نکالا اور کہا کہ عیاش بڈھے دوبارہ نظر آیا تو گولی مارنے سے دریغ نہیں کریں گے۔ اب یہ بڑے صاحب گذشتہ پانچ سال سے اِدھر اُدھر کہیں سوتے پھرتے ہیں۔ اور بھیک سے نفرت کے باوجود بھیک پر ہی سانسیں گن رہے ہیں۔

کہنے لگے بیٹا میں نے پوری زندگی گنوا کر بس ایک بات سیکھی ہے، اور وہ بات اسم اعظم ہے، سمجھو کہ جادو کا منتر ہے، وہ تمھیں بتانا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا جی ضرور بتایئے۔ کہنے لگے انسان کی کمائی نہ دولت ہے، نہ اولاد ہے اور نہ ہی علم و ہنر ہے۔ میں نے کہا کہ علم کی کوئی اہمیت نہیں؟ کہنے لگے رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں۔ بیٹا انسان کی سب سے بڑی کمائی ''محبت'' ہے۔ صرف اور صرف محبت۔ میں نے اپنی زندگی میں سب کچھ پایا، میرے پاس دولت، علم، ہنر، اولاد کی کثرت سب کچھ تھا اور ہے، اگر کوئی چیز میرے پاس نہیں تھی تو وہ محبت تھی۔ میں نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔ اگر محبت کرتا تو آج اولاد بھی میرے پاس ہوتی، بیوی بھی ہوتی، علم بھی سودمند ہوتا اور ہنر بھی بارآور رہتا۔ بیٹا زندگی کے ہر فیصلے میں محبت کو ترجیح دینا۔ محبت کے لیے ظاہری طور پر جتنا بھی نقصان اٹھانا پڑے اٹھالینا کیوں کہ محبت کبھی نقصان نہیں پہنچاتی۔ بیٹا علم تو ایک معمولی سا پجاری ہے، محبت تو خدا ہے خدا۔ میں سناٹے میں کھڑا رہ گیا، بڑے صاحب ہوٹل کی کرسی سے جانے کے لیے اٹھے اور جاتے جاتے پھر پلٹے اور کہنے لگے، بیٹا ہمارے ملک میں بھی کسی چیز کی کمی نہیں ہے، اس ملک میں دولت بھی خوب ہے، علم بھی خوب ہے اور اس کی اولاد بھی اٹھارہ کروڑ سے تجاوز کر چکی ہے۔ اگر یہاں کسی چیز کی کمی ہے تو بیٹا وہ محبت ہے، یہاں محبت موجود نہیں ہے۔ ہم نفرت کے پالے ہوئے ہیں۔ فرقہ واریت کی نفرت، لسانیت کی نفرت، امیر غریب کی نفرت، اور تو اور اللہ کے نام پر نفرت، خدائے محبت کے نام پر ایک دوسرے کے گلے کاٹ رہے ہیں ہم۔ ہمیں ہندستان سے نفرت ہے، ہمیں امریکا سے نفرت ہے، ہمیں ایران سے نفرت ہے، ہمیں عیسائی یہودی سے نفرت ہے، ہمارے تین پڑوسی ہیں، ہندستان، افغانستان، ایران..... بیٹا ہماری ان تینوں ہی سے لڑائی ہے۔ سوچتا ہوں ہمارے ملک کا کیا ہوگا؟ ڈرتا ہوں کہ کہیں اس کا حال بھی مجھ جیسا نہ ہو جائے!

آپ کا اپنا
کاشی چوہان

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

پیارے ساتھیو! دوستو! مترو! سجنو!
کیسے ہیں، امید ہے آپ سب اپنی اپنی محبتوں سمیت، جہاں ہوں گے خوش ہوں گے۔ ساتھیو! کچھ باتیں تمہید مانگتی ہیں، اور کچھ باتیں بس روبرو کر لی جاتی ہیں بالکل ایسے جیسے کہ روبرو آئینہ ہو اور عکس ہو۔ آئینے اور عکس کے فاصلے جتنا ہی میرا اور آپ کا فاصلہ ہے اور رہے گا۔ زندگی نام ہے تبدیلی کا۔ کوئی بھی ہستی، کس کے لیے ضروری اور غیر ضروری ہوتی ہے۔ کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ اس پرچے کے ساتھ ہی میرا آپ کے ساتھ ایک سال پورا ہوا۔ میں نے آپ سب سے بہت محبت کی ہے یہ سب کہنا تو اچھا نہیں لگتا ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھیے۔ یہ دھڑکن خود جواب دے گی......

ارے ساتھیو! آپ سمجھ رہے ہیں یقیناً میں کوئی بری خبر سنانے جا رہا ہوں۔

یہ جواب آپ کو سنانی ہے۔
اک کہانی بڑی پرانی ہے۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ احوال میں اب آپ کے جواب ہماری ساتھی مینا تاج دیا کریں گی۔ مینا تاج کے نام اور کام سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ اُمید ہے آپ اِس تبدیلی کو مثبت انداز میں لیں گے۔ اِن پورے بارہ ماہ دسمبر **2013** تا نومبر **2014** میں شائع ہونے والی کہانیوں کا میں نے ایک قرض چکانا تھا۔ وہ قرض کیا تھا۔ آپ اگلے صفحات پر ملاحظہ کر ہی لیں گے۔ جی ہاں ساتھیو! سچی کہانیاں رائٹرز ایواڈ **2014** ایوارڈ حاصل کرنے والے خوش نصیب یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اُمید ہے ان نتائج کو بغیر کسی ردوکد کے خوش دلی سے تسلیم کیا جائے گا۔ ساتھیو! اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ اب ہم احوال کا آغاز کرتے ہیں۔

⊠ شاہد رفیق سہو کی کبیر والا سے لکھتے ہیں، السلام وعلیکم! اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ آج پہلی بار آپ کی محفل میں حاضری دے رہا ہوں۔ میں تین چار ڈائجسٹوں میں لکھ چکا ہوں۔ سچی کہانیاں سے میرے پیارے بھائی مقصود احمد بلوچ نے تعارف کرایا ہے۔ ایک کہانی بھیج رہا ہوں اور ایک غزل بھی امید ہے مجھے اپنی محفل میں جگہ دیں گے۔ اگر آپ نے حوصلہ افزائی کی تو لکھتا رہوں گا۔ سچی کہانیاں بہت ہی دلچسپ رسالہ ہے۔ اللہ دن دگنی رات چوگنی ترقی دے۔

⊠ شاہد رفیق! خوش رہو۔ آپ کی غزل اس ماہ پرچے میں شامل ہے۔ کہانی کے لیے آپ مزید محنت کریں۔ انشاء اللہ ضرور شامل کی جائے گی۔

⊠ السلام وعلیکم پیارے بھائی کاشی چوہان اور دانیال شمسی صاحب منزہ آنٹی اور پوری ٹیم اور تمام لکھاری

دوست سب ٹھیک ہوں گے۔ اللہ پاک آپ تمام دوستوں کو ہمیشہ خوش و کامیاب رکھے۔ اگست اور ستمبر کے مہینے میں کافی پرابلم کی وجہ سے شامل نہ ہو سکا اور اب ستمبر کا شمارہ پانچ تاریخ کو کوئٹہ سے ملا اور جلدی سے تبصرہ لکھنے بیٹھ گئے۔ اور اب آتے ہیں احوال کی طرف تو جن جن بھائی اور بہنوں نے میری نظم اور مجھے حوصلہ دیا ان سب کا شکر گزار ہوں۔ منزہ آنٹی کا دھرنا پڑھ کر بہت کچھ سمجھنے کو ملا۔ غلام حسین بھائی کے دوست آفتاب علی کا سُن کر بہت افسوس ہوا۔ ہم آپ کے دکھ میں برابر کے شریک ہیں۔ ممتاز احمد کو عمرہ کی سعادت کی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ مریم شاہ بخاری کے حادثے کا سن کر دل اُداس ہو گیا۔ مریم جی اللہ تعالیٰ آپ کو اور مرحومین کے لواحقین کو صبر جمیل عطا کریں۔ غلام رسول گل بھائی آپ نے اس ناچیز کو یاد رکھا۔ شکریہ۔ کاشی بھائی اب اجازت شاعری بھیج رہا ہوں۔ حوصلہ افزائی کر دینا اور سب لکھاریوں سے گزارش ہے کہ دعاؤں میں یاد رکھیں۔ زندگی نے وفا کی تو آئندہ احوال میں ساتھ ہوں گے۔ اللہ حافظ۔

☆ ظفر خط لکھنے کا بہت شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی یہ رابطہ جاری رہے گا۔

⊠ امجد علی چیزل آباد سے لکھتے ہیں، اکتوبر کا تازہ شمارہ آج 2 تاریخ کو موصول ہوا۔ منزہ سہام جی نے ہمیشہ منفرد موضوع پر اداریہ لکھا۔ کاشی چوہان کی کچھ اپنی باتیں اپنی لگیں۔ احوال کی محفل بڑی خوبصورتی سے سجی ہوئی تھی۔ پہلے صفحہ پر جاوید راہی نمایاں تھے۔ ڈیئر محمد اسماعیل کیسے ہو شکریہ، اور شعبان کھوسہ یادگیری کا شکریہ یار۔ رخسانہ سہام کے لیے دعائیں اور مرحومہ پروین سعید ہارون کی مغفرت کے لیے دعائیں، مور شاہد حسین آپ کی تحریر میں لٹ گئی لوگو روح میں اُتر گئی۔ ویلڈن۔ ایم اے راحت ہم شکل شاندار تھی۔ حفظیٰ شکور تم سے ملوں گی میں عالیہ حرا، یقین منزل ہے۔ مجید احمد جائی، ہر پل تیرے ساتھ رہوں کی پسند آئیں۔ کاشی چوہان قاتل حسینہ عادل حسین کالا ناگ، سنبل ڈبل ایک فیصلہ محمد سلیم اختر بازگشت خوبصورتی سے بیان کی گئی تحریریں تھیں باقی شمارہ زیر مطالعہ ہے۔ کاشی بھائی چار نظمیں ارسال کر رہا ہوں۔ امید ہے سچی کہانیاں کے معیار پر پوری اتریں گی اگر حوصلہ افزائی کی گئی تو انشاء اللہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ آخر میں تمام ساتھیوں کو سلام اور ڈھیروں دعائیں۔

☆ امجد علی! بہت شکریہ خط لکھنے اور مختصر اور جامع بات کرنے کا یہ سلسلہ جاری رکھیے گا۔

⊠ ارم ناز کراچی سے لکھتی ہیں جناب کاشی بھیا آداب! اُمید کرتی ہوں کہ تمام اسٹاف خیریت سے ہوں گے 1996ء جب میں اسکول میں تھی تب سے سچی کہانیاں پڑھ رہی ہوں۔ مگر خط پہلی مرتبہ لکھ رہی ہوں جب اسکول میں تھی تو سچی کہانیاں پڑھنے پر ڈانٹ پڑتی تھی کہ بڑوں کی کہانیاں ہیں۔ مت پڑھو مگر اب کوئی پابندی نہیں ہے۔ احوال بھی باقاعدگی سے پڑھتی ہوں۔ خط شامل کیجیے گا پھر انشاء اللہ کہانیاں اور شاعری بھی بھیجتی رہوں گی اب آتے ہیں اپنے کہانیوں کی طرف نفیسہ فضل نے جو فضل صاحب کی کہانی سنائی بہت اچھی تھی اور اختتام بہت دکھ بھرا تھا۔ حنا بشریٰ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ دور کے ڈھول محمد سلیم اختر کی بہت اچھی تھی۔ سلیم صاحب اب تو ہر دوسرے مرد کی یہی کہانی ہے۔ دکھ دہلیز کے جاوید راہی، گونگی ماں ملک عاشق حسین ساجد قسمت کی دستک، ریحانہ نسیم، کیوں یہ کھیل کھیلا فوزیہ جاوید تمام کہانیاں ہی اچھی تھیں مزہ آ گیا۔ نصرت سرفراز، جیجل میتلو، سدرہ انور، مسز نوید ہاشمی، مور شاہد، تحسین جونیجو، عبدالعزیز تمام بہت اچھا لکھتے ہیں تمام لوگوں کو سلام پہلی مرتبہ مہمان بن کے حاضر ہوئی ہوں۔ اب دیکھنا ہے کہ آپ کتنے مہمان نواز ہیں! ملکھنی سلسلہ بہت اچھا چل رہا ہے اس سے بہت نالج ملتی ہے۔ کاشی بھیا تصویر بھیج رہی ہوں ڈرنا مت آئندہ بھی تبصرہ لے کر حاضر ہوتی رہوں گی۔ اب مجھے لکھنے کی اجازت ہے۔ میں بھی پچھلے 10 سال سے ایک چوہان

کے قبضے میں ہوں ان سے اجازت لے کر خط لکھ رہی ہوں۔ میرا تو جس چوہان سے واسطہ ہے وہ تو بڑا ضدی ہے۔ آپ کا پتا نہیں کہ آپ کیسے چوہان ہیں۔ باتیں تو بہت ہیں مگر اس مرتبہ بس اتنا ہی اللہ حافظ۔

☆ ارم ناز خوش آمدید! شکر ہے تمہاری عمر کے ساتھ سچی کہانیاں پڑھنے کی عائد پابندی ختم ہوگئی۔ اب ہم سے ہمیشہ رابطے میں رہنا۔

✉ ڈاکٹر صغیر احمد جہلم سے لکھتے ہیں، ڈیئر کاشی السلام وعلیکم! ایک لمبے عرصے کے بعد سچی کہانیاں کی بزم میں دستک دے رہا ہوں۔ 3 ماہ سے اوپر جہاں اپنے اور سب کے پسندیدہ پرچے کے مطالعے سے نامستفید رہا۔ وہیں مجبور بھی رہا۔ دراصل اچانک ہرنیا کا مرض لاحق ہوگیا۔ اور نوبت آپریشن تک جا پہنچی۔ پھر کچھ وقت آپریشن کی پیچیدگیوں کا شکار رہتا رہا۔ اب الحمدللہ بہتر ہوں۔ اسی لیے پہلی فرصت میں حاضر ہورہا ہوں۔ ایک تحریر بہ عنوان 'دھوپ چھاؤں' جو کافی پہلے کی لکھی ہوئی ہے مگر بوجوہ بھیجنے میں تاخیر ہوگئی۔ ایک غزل بھی سچی کہانیاں کی نذر کررہا ہوں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام قارئین اسٹاف ممبران کو اپنی حفظ وامان کے سائے تلے رکھے اور ہمارے اس ترجمان ماہنامے کو اوج کمال بخشے۔

☆ صغیر بھائی! خدا آپ کو صحت عطا کرے آپ کی صحت کے لیے ہمارے پاس الفاظ نہیں ہماری دعا ہے کہ آپ ہمارے پرچے سے جڑے رہیں۔

✉ عمران فائق اٹک سے لکھتے ہیں آج مورخہ 10 ستمبر 2014، سچی کہانیاں موصول ہوا۔ تو باقی تمام علمی وادبی کام چھوڑ کر سچی کہانیاں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ایسی کشش سچی کہانیاں میں واہ...... کیا بات ہے...... اس کے لیے تو میں استعارہ کہا کرتا ہوں کہ......

تم جو آجاتے ہو مسجد میں ادا کرنے نماز ☆ ☆ تم کو معلوم نہیں کتنوں کی قضا ہوتی ہے؟

سب سے پہلے سرورق پر نظر ڈالی جو آپ کے اعلیٰ ذوق کا عکاس ہے۔ اس کے بعد اشتہارات سے ٹکر ہوئی اور ہاں یہی اشتہارات تو پرچے کا دل ہوتے ہیں اور اگر دل ہی نہ ہو تو باقی اعضا تو بیکار ہی ہوتے ہیں۔ تمام احوالیوں کو جی جان سے سلام، بہت اچھے تبصرے پڑھنے کو ملے۔ لیکن منشی محمد عزیز میمن، مجید احمد جائی، عظمیٰ شکور اور حنا بشریٰ نے احسن انداز میں اپنے احوال پیش کیے۔ بھائی یوسف لغاری وتکیم، عبدالغفار عابد صاحب بہت شکریہ اس معطر پذیرائی کا کہ آپ نے میرا کلام پسند کیا۔ فریدہ فری یوسف زئی، آپ کو کتاب کی اشاعت پر بہت بہت مبارک، ہمیں کہاں سے مل سکے گی آپ کی کتاب؟ جو تحریریں دل کو بھائیں اُن میں دکھ دہلیز کے، گلابی دوپٹا، کشف، گل دستہ اور قسمت کی دستک شامل ہیں۔ سخن آباد میں عبدالعزیز جی آر، تمثیلہ لطیف اور فرح علی نے خوب لکھا۔ ساحل ابڑو کی نظم 'اکیلی ہوں' بے وزن ہے۔ سدرہ انور نے اچھا تخیل پیش کیا۔ سدرہ جی...... میری آپ سے گزارش ہے کہ آپ نثر اور آزاد نظموں سے پابند کلام لکھنے کی طرف پلٹ آئیں۔ جو ایک استاد شاعر کی بنیادی علامت ہے۔ اُمید ہے توجہ فرمائیں گے۔ نصرت سرفراز، ویلڈن۔

اطلاعاً عرض ہے کہ میں آپ کی دعاؤں سے امتیازی پوزیشن لے کر ICS میں کامیاب ہوگیا ہوں۔

☆ عمران جی! خوبصورت لفظوں سے سجے خط کا شکریہ، اور ہاں ہماری جانب سے ICS کی کامیابی پر دلی مبارکباد۔

✉ مجید احمد جائی ملتان سے لکھتے ہیں، سیلابی طوفان نے ملتان کے کئی دیہات صفحہ ہستی سے مٹا دیے ہیں۔ ہر طرف آہ وبکا کی صدائیں ہیں۔ بس دعا کرنا، میرا وطن پاکستان سلامت رہے، ان حالات میں بھی ہم

سچی کہانیاں کو نہیں بھولے اور نہ ہی بھولیں گے۔ جب تک دم ہے، ہم ساتھ ہیں۔ سچی کہانیاں کے پلیٹ فارم سے بہت چاہتیں مل رہی ہیں۔ گزشتہ عیدالاضحیٰ کی ڈھیروں مبارکباد قبول کریں۔ دیگر احوال یوں کہ ہماری عید پھیکی پھیکی، اُداس اُداس ہی گزر گئی اُداس اس لیے کہ تا حال سچی کہانیاں نہ مارکیٹ سے ملا اور نہ ہی ادارے کی طرف سے اعزازی کاپی موصول ہوئی۔ ملتان سے لاہور تک چھان مارا مگر سچی کہانیاں تاخیر کا شکار ہے۔ نجانے کیوں؟ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔ 22 سے 25 تاریخ تک مل جاتا تھا۔ کاشی بھیا، آپ کی طرف سے کہانی شائع ہونے کی نوید مل چکی تھی۔ پھر محمد عزیز مٹے اور آج صفدر علی حیدری نے مبارک باد دی۔ ہم تو انتظار کی سولی پر الٹے لٹکے ہوئے ہیں۔ خیر بنا سچی کہانیاں ملے، احوال میں شامل ہونے کی جسارت کر رہا ہوں۔ دوستوں کی محبتیں ہیں اور احوال سے مس نہیں ہونا چاہتے۔ محمد عزیز جی صاحب کی عید کے دن خصوصی کال دل جیت گئی۔ بہت سے دوستوں نے ایس ایم ایس سے عید مبارک دی ان کا شکریہ محمد عزیز مٹے، سدرہ انور، صفدر علی حیدری، مبارک علی شمسی، مبشر حسن، اور ان سب کا جنہوں نے گاہے بگاہے یاد رکھا۔ اجازت طلب کرنے سے پہلے تمام دوستوں کے لیے دعا اور نیک خواہشات۔

☆ مجید بھائی خط لکھنے کا بے حد شکریہ۔ جن حالات سے ملتان گزرا ہے اللہ اپنا فضل فرمائے اتنی محبت کا شکریہ۔

☒ سیدہ اقصیٰ نقوی گلبرگ لاہور سے لکھتی ہیں سب سے پہلے تمام رائٹرز اور سچی کہانیاں کے اسٹاف کو عید قرباں، مبارک ہو۔ اب کچھ اپنا بھی تعارف کرواتی چلوں۔ میں سچی کہانیاں گزشتہ 6 سال سے پڑھتی آرہی ہوں۔ آج ہمت کی اور خاموشی کا پردہ چاک کر کے آپ سے آدھی ملاقات کا سوچا ہے۔ سچی کہانیاں پہلے صفحے سے لے کر آخری صفحے تک بے مثال ہے۔ اس کا ہر قسط وار سلسلہ بہت زبردست ہے۔ خاص طور پر امجد جاوید صاحب کی سلسلہ وار کہانی 'فیض عشق' بہت زبردست جا رہی ہے۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ مجھے ساری کہانی ایک ہی بار پڑھنے کا موقع مل جائے۔ باقی تمام رائٹرز کی کہانیاں بھی بہت زبردست ہیں۔ یہ میرا پہلا خط ہے۔ برائے مہربانی اسے شائع کر کے مجھے آگے بھی مزید لکھنے کا موقع دیا جائے۔

☆ اقصیٰ! احوال میں تمہاری آمد پر خوش آمدید۔ لو تمہارا خط شامل احوال ہوا اب ہمیشہ اس سے جڑی رہنا۔

☒ رابعہ کنول واہ کینٹ سے لکھتی ہیں کاشی چوہان صاحب، السلام وعلیکم! میری طرف سے آپ کو اور آپ کے رسالے یعنی سچی کہانیاں کی پوری ٹیم کو اور سچی کہانیاں کے تمام پڑھنے والوں کو عیدالاضحیٰ مبارک ہو۔ امید ہے کہ آپ تمام خیریت سے ہوں گے۔ ستمبر کا شمارہ پڑھ رہی ہوں بہت لیٹ خریدا ہے۔ لیکن جتنا بڑھا بہت اچھا ہے۔ آپ کا سلسلہ ''کچھ اپنی باتیں'' واقعی حقیقت پر مبنی ہے۔ واقعی انسان صرف خود غرض ہو کر رہ گئے بس۔ احساس نام کی چیز تو بالکل ہی ختم ہو گئی ہے۔ پہلے بھی شرکت کی تھی کچھ شاعری بھیجی تھی۔ آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے وہ شائع کر دی تھی۔ اُمید کرتی ہوں کہ یہ خیالوں کے تبادلوں کا حسین سلسلہ یوں ہی رواں رہے اور آپ جیسے حسین خیالات رکھنے والوں سے ہم بھی کچھ حاصل کر لیں۔ آپ تمام لوگ خوش رہیں۔

☆ رابعہ کنول! شکریہ کی ضرورت نہیں۔ بس اور بہتر غزلیں بھیجتی رہو۔

☒ مور شاہد حسین، قمبر شہداد کوٹ سے رقم طراز ہیں کاشی چوہان بھیا اکتوبر کا تازہ شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ میں لٹ گئی لوگو، شائع کرنے پر بے حد شکریہ۔ زندگی کے احساس اور کچھ اپنی باتیں دل کی آنکھ سے پڑھی جو دل کی گہرائیوں میں اُترتی گئی۔ احوال میں قدم رکھا۔ رخسانہ سہام کی صحت یابی کے لیے ڈھیروں

دعائیں، محفل کی رونق اپنے عروج پر تھی۔ محمد اسلم جاوید، محمد جاوید، اور حسنین علی تابش بھلی کرے آیا۔ ویلکم، ام عادل، سیدہ موں شاہ، سیدہ مریم شاہ اور گڈی آپا ویلکم بیک، مقصود احمد بلوچ خوش آمدید، دیر آمد درست آمد۔ سدا سلامت رہو۔ بہت پیارے اور محبوب دوست محمد اسماعیل بروہی الحمد اللہ ہم ٹھیک ہیں۔ آپ سنائیں۔ ملکہ احوال ادی تحسین جونیجو اب فنافٹ کوئی اچھی سی تحریر پڑھنے کو دیں ورنہ آپ کے خلاف احتجاجی دھرنا ہوگا اور ادی زرینہ جونیجو کو لا ییے نا، کمانڈو شعبان کھوسہ بھیا بے حد شکریہ خوش رہو۔ فیصل ندیم بھٹی بھیا ہم اور ناراض! نابابانا، مجید احمد جائی تہاڈی مہربانی یاد کرن دی۔ ارے شفقت حسین دلی معذرت، ظفر علی ابڑو کہانی پر تمہاری رائے کا انتظار ہے۔ دلبر اور محبوب دوست غلام رسول گل اور غلام حسین تم دونوں بھائی آج کل خفا خفا رہنے لگے ہو۔ یار جیکب آباد آؤں کیا؟ امجد علی بھیا اور ممتاز احمد آپ نے بھی بھلا دیا۔ صفدر علی حیدری شکریہ۔ سنائیے کیسے مزاج ہیں۔ عبدالغفار عابد بھیا آپ کا خط مجھے بہت ہی اچھا لگا۔ آپ کی باتیں دل میں اُتر گئیں۔ عامر زمان عامر کہاں غائب ہو؟ سدرہ انور علی گڑیا رانی آپ کا خط بڑی حسرت سے پڑھا مگر خود کو نا پا کر دل اُداس ہوگیا۔ جاوید راہی، ساحل ابڑو، سائیں نوید شاہ، انکل فرید عالم، اشفاق شاہین، ایم اشفاق بٹ، عادل حسین، مسز نوید ہاشمی، عظمیٰ شکور، ایم جے قریشی، عبدالغفار ثاقب، نصرت سرفراز، ملک عاشق حسین ساجد آپ سب کیسے ہیں جناب۔ سخن آباد میں سب کے خیالات اچھوتے تھے۔ بس کمی تھی تو ہماری کیوں بھئی؟ کاشی بھیا پُر اسرار نمبر 3 کے لیے ایک کہانی بھیج رہا ہوں۔ ہمیشہ کی طرح حوصلہ افزائی کی امید رکھتا ہوں۔

☆ پیارے مور! سلامت رہو، انشاء اللہ ہم ضرور حوصلہ افزائی کریں گے۔

✉ اسیل حسین جامشورو یونیورسٹی سے لکھتے ہیں، کاشی چوہان صاحب، السلام وعلیکم! امید ہے اللہ پاک سے آپ اور آپ کا پورا اسٹاف خیریت سے ہوگا۔ کاشی بھیا اس ماہ ایک تحریر بھیج رہا ہوں۔ اُمید ہے ضرور پسند آئے گی اور جلد از جلد سچی کہانیاں کا حصہ بنیں گی۔ کاشی بھائی چار ماہ سچی کہانیاں میں غیر حاضر رہا اس کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔ کچھ مصروفیت کی وجہ سے لکھنے کا ٹائم نہ ملا، دکھ بھی ہے کہ چار ماہ سے کچھ لکھا نہیں، قلم اٹھایا نہیں قلم سے دور رہا اور خوشی بھی ہے کہ قلم سے رشتہ جوڑ لیا ہے اور یہ تو قلم کا کمال ہے جو اس نے مجھے پھر تھام لیا اور میں نے قلم کو۔ خیر کہاں سے کہاں نکل گیا۔ دعا ہے خالق کائنات سے آپ قارئین، لکھاری، سب شاد و آباد رہیں۔ آپ سب کی دعاؤں کا طالب۔

☆ اسیل حسین! خوش رہو اور مہربانی کر کے قلم اگر اٹھا ہی لیا ہے تو اس سے جڑے ہی رہنا۔

✉ ایم ارشد وفا، گوجرانوالہ سے لکھتے ہیں، ناچیز کی جانب سے چاہتوں بھرا محبتوں بھرا اسلام قبول ہو۔ بات کی جائے پہلے احوال کی تو جناب سب سے پہلے جن کے احوال اچھے لگے اگر ان کی تعریف نہ کی جائے تو غلط بات ہے۔ نبیلہ شاہین، سدرہ انور، ویلڈن بہت اچھا لگا آپ کو پڑھ کر خدا خوب ترقی دے۔ آپ کو اس کے بعد نصرت سرفراز، مریم شاہ بخاری، بھائی اشفاق شاہین، ماشاء اللہ سے آج دیدار بھی کروا دیا آپ نے میرے بڑے بھائی عبدالغفار عابد میڈم مسز نوید ہاشمی، حنا بشریٰ، مور شاہد حسین، میرے محترم ملک عاشق حسین ساجد، چھوٹے بھائی حاذق ندیم، کراچی سے کنول عمران ماشاء اللہ سے اچھا لکھا ہے آپ نے۔ فیصل ندیم بھٹی، ثمینہ عبدالقیوم، میری استاد فریدہ فری یوسف اللہ تعالیٰ آپ کو صحت دے [illegible] اور کراچی سے اسامہ ندیم کا احوال خوب رہا۔ اسٹوریوں میں میرے بہت ہی محترم استاد جناب سلیم اختر صاحب دور کے ڈھول کی کیا بات تھی۔ اس کے بعد دکھ کی دہلیز کے گلابی دوپٹا، فیصلے دل کے، انوکھا رشتہ، کشف جناب مقصود احمد بلوچ،

گل دستہ، عادت کی بھینٹ، ناکردہ گناہ، محبت کی کسک، بھائی عبدالغفار عابد، گونگی ماں، کیوں یہ کھیل کھیلا، کانٹوں کی زمین، نئی قبر، ماں کی قبر نے رونگٹے کھڑے کر دیے، سب نے بہت محنت کی۔ میری طرف سے سب کو بہت زیادہ مبارکباد۔ سخن آباد ماشاء اللہ سے بہت اچھا سلسلہ ہے۔ سب ہی بہت خوب سے خوب لکھتے ہیں۔ آخر میں میری طرف سے سب کو محبتوں بھرا چاہتوں بھرا اسلام دیکھتے ہیں کہ آپ میری کیسے حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ میرے محترم جناب ڈاکٹر طارق آکاش، شہباز گل، تنویر گل اور صفیہ سجل شاہ اور اقرار سیف سے ریکوسٹ ہے کہ وہ بھی اپنی حاضری کو یقینی بنائے۔ لو جی، بہت ہو گیا اب دے ہم کو اجازت، زندگی نے وفا کی، سانسوں نے اجازت دی تو اگلے ماہ دوبارہ آپ سب سے ملاقات ہوگی۔

☆ ارشد صاحب! خوش آمدید۔ پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ آپ اپنے خیالات سے ہمیں آگاہ کرتے رہیں گے۔

✉ نازیہ جہانگیر من آباد لاہور سے لکھتی ہیں سب سے پہلے کاشی چوہان اور تمام گروپ کو سلام اللہ آپ سب کو اپنی امان میں رکھے یہ میرا دوسری مرتبہ سچی کہانیاں کی طرف بڑھتا ہوا قدم ہے۔ فرسٹ ٹائم میں نے احوال میں جگہ پائی آپ یقین کریں میں اور میرے شوہر جہانگیر خان خوشی سے ناچ رہے تھے۔ آپ نے احوال میں جگہ دی بہت شکریہ میری دو کہانیاں دونوں نہیں چھپیں کوئی بات نہیں مجھے یقین ہے آپ اگلے مہینے ضرور شائع کریں گے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف بہت اچھی بہت زبردست چونکہ مجھے دونوں ڈائجسٹ ایک ساتھ ملے اس لیے دونوں کے بارے میں بتا رہی ہوں۔ پُراسرار نمبر میرا فیورٹ ہے اس لیے سب کہانیاں نمبر **1** تھیں۔ انار کا درخت، خان زادہ، سفید آنکھیں لاجواب تھیں۔ کہانیاں لاجواب نمبر **1** ہمیشہ کی طرح مگر سب سے اچھی کہانی دور کے ڈھول تھی میں اگلی کہانی بھیج رہی ہوں مجھے یقین ہے کہ میری ساری کہانیاں ضرور شائع ہوں گی۔ میں اور میرے شوہر انتظار کر رہے ہیں اب اجازت زیادہ لمبا ہو گیا۔

☆ پیاری بہن نازیہ! اللہ آپ کو خوش رکھے۔ کہانیوں کی پسندیدگی کا شکریہ، انشاء اللہ جلد آپ کی کہانی بھی شامل رسالہ ہوگی۔

✉ شفیق احمد شرقی لاہور سے لکھتے ہیں محترمہ رخسانہ سہام مرزا صاحبہ السلام وعلیکم میری دعا ہے کہ جناب بخیریت ہوں آمین، جناب سہام مرزا صاحب، ایڈیٹرز صاحبان نے لرزہ خیز، تلخ و سبق آموز معاشرتی حقائق کی کہانیوں کے حصول و اشاعت کے کارناموں میں پاکستان کے معاشرے و بیرون ملک کے معاشروں میں انسانیت کی تعمیر و ترقی کے لیے تاریخ ساز کوششیں سرانجام دی ہیں، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور اسٹاف کو اپنے مشن میں کامیابیاں عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

☆ محترم شفیق احمد! خوش رہیں۔ پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ، اللہ آپ کی دعا قبول فرمائے آمین۔

✉ زیب ملک گھوٹکی سے لکھتے ہیں محترم جناب کاشی چوہان صاحب اور منزہ سہام مرزا صاحبہ السلام وعلیکم! دعا ہے کہ آپ اور آپ کی پوری ٹیم، قارئین حضرات اور رائٹرز حضرات خوش و خرم ہوں گے۔ آمین اور میری دعا ہے کہ سچی کہانیاں خوب سے خوب ترقی کے زینے عبور کرتا رہے، آمین۔ سچی کہانیاں میں یہ میری پہلی انٹری ہے۔ ویسے تو میں **2004**ء سے قاری ہوں لیکن **2010**ء کے بعد اس ماہ میں نے سچی کہانیاں پھر سے لیا۔ یہ میری سچی کہانیاں سے محبت کا ثبوت ہے۔ سرورق پر نظر پڑتے ہی ایک حسینہ مل گئی۔ جو حسینہ سرورق پر [illegible] اس کے پہرے سے [illegible] اور حسینہ سے [illegible] ہیں۔ ناگن حسینہ بھی کمال کی تھی۔ ساری ہی کہانیاں زبردست تھیں۔ لیکن اس بار ملک عاشق حسین کی 'گونگی ماں' سب سے بازی لے گئی۔ 'فیض

خواتین کی محبوب قلم کار

کئی دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ یافتہ **رفعت سراج**

رفعت سراج، جن کے جادوگر قلم کی کاٹ سے کون واقف نہیں۔

رفعت سراج، وہ قلم کار، جن کو قلم کی حرمت کا پاس، زندگی سے زیادہ عزیز ہے۔

رفعت سراج، وہ قلم کار جنہیں اپنی تحریر سے دھڑکنیں بے ترتیب کرنے کا ہنر خوب آتا ہے۔

گلابی کاغذ اور زرد پھول کے بعد......

نئے شاہکار ناول کے ساتھ، آپ کے روبرو

بہت جلد ماہنامہ ''دوشیزہ'' ڈائجسٹ میں ملاحظہ کیجیے۔

بس تھوڑا سا انتظار اور......

عشق میں امجد جاوید نے بہت متاثر کیا۔ نصرت سرفراز کی ناکردہ گناہ' نے معاشرے کی تصویر کا وہ رُخ دکھایا جس کے لیے ہمیں نہ صرف قلم اٹھانا ہے بلکہ قدم بھی اور آواز بھی۔ سخن آباد میں شائستہ جمال کی نثری نظم دیر سے لوٹا نہیں کرتے' اس بار بازی جیت گئی۔ یہ نثری نظم مجھے بہت ہی پسند آ گئی اور میں نے اپنی ڈائری میں زیرِ قلم بھی کر لی۔ سدرہ انور علی کی شاندار نثری نظم' جانے والے' بھی بے حد خوبصورت تھی اور دل کو بھا گئی۔ کشمالہ احمد تشنہ نے تو 'اے میرے وطن' سے حب الوطنی اور مزید بڑھا دی۔ بیشک وطن عزیز کی محبت ایمان کا حصہ ہے میں تو کہتا ہوں سارا ایمان ہی وطن عزیز کی محبت ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اس ایمان کو ہمیشہ تر و تازہ رکھے۔ آمین۔ اول و آخر ماہ ستمبر کا شمارہ بہت ہی پسند آیا۔ بہت جلد ایک سچی کہانی ارسال کروں گا۔ انشاء اللہ۔ اب اجازت چاہتا ہوں۔

☆شازیب ملک خوش آمدید، پرچے اور کہانیوں کی پسندیدگی کا شکریہ۔ بس اب ہمیشہ اپنی آراء سے آگاہ کرتے رہیے گا۔

✉ جیجل میتلو کراچی سے احوال میں شریک ہیں لکھتی ہیں کاشی جی میری کہانی روشنی کے مینار ستمبر میں شائع کی بہت بہت شکریہ۔ سچی کہانیاں پر آپ بہت محنت کر رہے ہیں۔ میری کہانی کے علاوہ سب کہانیاں بہت اچھی ہیں۔ خاص کر کے دور کے ڈھول، ناکردہ گناہ، نصرت سرفراز کی دکھ کی دہلیز، جاوید راہی، انسانیت کی ہار عذرا فردوس، اور گونگی ماں، نئی قبر دونوں کہانیاں بہت پسند آئیں۔ ذرا ہٹ کر تھیں عام موضوع سے آتشِ جنوں بھی بہت اچھی جا رہی ہے اور اس سلسلے میں بھی سب اچھے ہیں شاعروں میں۔ شائستہ جمال، کشمالہ احمد تشنہ، کنول ناز، ہائیکو، صادق تبسم، شعر، عمران فائق پسند آئے۔ سب لکھاریوں کو بہت سلام، اللہ اور کرے زورِ قلم زیادہ آمین۔ اللہ پاک، ساری دنیا اور خاص طور سے میرے پاکستان کو زمینی آسمانی آفتوں سے بچائے۔ آمین سیلاب سے جن لوگوں کو نقصان پہنچا ہے ان کو صبر دے اور ہم سب مل کر ان کی جتنی ہو سکے مدد کریں۔ شکریہ۔

☆جیجل جی! آپ کی محبت کے مشکور ہیں۔ پرچے کی کامیابی آپ سب کی مرہونِ منت ہے۔

✉ نوید شاہ ٹنڈو جام سے لکھتے ہیں کاشی صاحب اُمید ہے کہ آپ، آپ کی مکمل ٹیم اور احوال کے تمام احوالی خوش و خرم ہوں گے اور ہوش رُبا مہنگائی کے باعث روتے دھوتے عید کی تیاری میں مگن ہوں گے۔ کاش کہ ہم سب کو پروردگارِ عالم کوئی ایسا جیون عطا کرے کہ حقیقی روحانی مسرتوں کے ہمراہ جینے کے قابل ہو سکیں۔ آمین۔ آتے ہیں شمارہ ستمبر **2014**ء کی جانب جو ہم اہلیانِ ٹنڈو جام کو **10** ستمبر کو موصول ہو کے برداشت کا گویا درس دے گیا۔ 'احوال' کی تو کیا بات کریں، یوں لگتا ہے گویا ایک ہی کنبے کے مکین مصروفِ گفتگو ہوں۔ اتنی محبت، مروت، خلوص واہ واہ، سدرہ انور علی، محمد یوسف لغاری، نصرت سرفراز، مور شاہد حسین، ممتاز احمد عظمی شکور اور منشی محمد عزیز میمن کے خطوط پسند آئے۔ مریم شاہ اور غلام حسین کے خطوط پڑھ کر دکھی ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ان کے مرحومین پیاروں کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔ کہانیوں میں دُکھ دہلیز کے' جاوید راہی، گلابی دوپٹا بشریٰ سعید، قلمی دوستی ادیب سمیع چمن، انوکھا رشتہ عارف رمضان، ناکردہ گناہ نصرت سرفراز شاہکار ثابت ہوئیں۔ قسمت کی دستک، انسانیت کی ہار، روشنی کے مینار، ماں کی قبر، دور کے ڈھول بھی پسند آئیں۔ فیضِ عشق بھی متاثر کن کہانی ہے، اچھی چل رہی ہے۔ سخن آباد میں سدرہ انور علی، ایم جے قریشی، کنول ناز، نصرت سرفراز، عمران فائق اور ثمینہ ناز کے کلام دل سے گرے گرے کرتے۔ یعنی کہ دل میں اُتر گئے۔ شاعری چیز ہی ایسی ہے بس جو اسے سمجھے، موبائل پر جواب دینے کے لیے آپ کا مشکور ہوں۔ بلاشبہ آپ غیر روایتی مدیر ہیں اور

اپنے قارئین کو غیر معمولی مان مرتبہ دے رہے ہیں۔ سدا مسکراتے رہیں۔ شکریہ۔

☆ نوید شاہ! خوش رہیے۔ آپ کا تفصیلی خط پڑھ کر مسرت ہوئی۔ کہانیوں کی پسندیدگی کا شکریہ۔

✉ ممتاز احمد سرگودھا سے لکھتے ہیں السلام وعلیکم، خدا کرے خوشیاں، صحت تندرستی عزت و وقار سب کا مقدر ہو۔ آمین۔ اس بار خلاف معمول شمارہ بہت تاخیر سے پانچ اکتوبر کو ملا یقیناً کوئی خاص وجہ ہی ہوگی۔ جو شمارہ لیٹ ہوا عید کی گہما گہمی قربانی کا فریضہ اور بے انتہا مصروفیت کی وجہ سے مکمل شمارہ پڑھنے کا ٹائم نہیں ملا صرف چند ایک کہانیاں پڑھ سکا۔ منزہ سہام کا اداریہ بعنوان 'زندگی کا احساس' مذہب کے نام نہاد ٹھیکیداروں کو جھنجوڑنے کے لیے خوب تھا کہ اللہ کے گھر کی تعمیر میں ناقص میٹریل کا استعمال کرنے سے باز نہیں آئے اور جہاں پولیس خاندان برباد ہوئے وہیں اپنی عاقبت بھی برباد کی۔ کاشی چوہان کی 'کچھ اپنی باتیں' حسب معمول دل کو چھو لینے والی تھیں۔ احوال میں پہنچا تو محفل احوالیوں کے خوبصورت سندیسوں سے خوب سجی تھی بلکہ احوال کا گلستان پیار، محبت، خلوص اور عزت و احترام کے جذبوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ روح تر و تازہ ہوگئی۔ سب سے پہلے میں اپنی پیاری اور محترم بہن اُم عادل سے مخاطب ہوں۔ آپ نے آٹھ ماہ بعد اپنی حاضری سے احوال کو رونق بخشی۔ آپ نے میری عزت رکھی، مان بڑھایا، دل بہت خوش ہوا۔ آپ سے التجا ہے کہ احوال کی محفل کو اپنے خوبصورت الفاظ کی مہک سے سجائے رکھیے گا۔ میاں چنوں کے بھائی مقصود احمد بلوچ صاحب دل کی گہرائیوں سے آپ کو ویلکم، خوش آمدید۔ پیر نوید شاہ ہاشمی صاحب پیار اور خلوص بھرا سلام قبول فرمائیں۔ آپ کا خط اور تبصرہ بہت شاندار تھا۔ آپ کا بے حد ممنون و مشکور ہوں میری تجاویز سے آپ نے اتفاق فرمایا بھائی عبدالعزیز جی آ، آپ کا شکریہ آپ نے اپنا استعفیٰ واپس لیا۔ مسز نوید ہاشمی خوبصورت اور شاندار تبصرے کے ساتھ آئیں۔ کوئٹہ کے پیارے بھائی شعبان سدا سلامت رہو۔ بھائی اشفاق شاہین کی خدمت میں سلام عرض ہے۔ عظمیٰ جی آپ ہیں ہی اتنی پیاری سوئٹ اور کیوٹ تو اسی لیے سب آپ سے محبت اور خلوص کا اظہار کرتے ہیں۔ اب آتا ہوں کہانیوں کی طرف سب سے پہلے عظمیٰ شکور کی کہانی 'تم سے ملوں گی میں' پڑھی۔ کاوش اچھی تھی مگر ایک افسانوی انداز میں کہانی لکھی گئی تھی۔ فیصل ندیم بھٹی کی پہلی مختصر کہانی 'میں خود غرض نکلا' ایک ناعاقبت اندیش مرد کی کہانی تھی۔ جس سے یہ درس ملا جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ فیصل آپ کی کوشش بہت اچھی رہی، مزید لکھتے رہیں گے تو قلم میں مزید نکھار آئے گا۔ عالیہ حرا کی کہانی 'یقین منزل ہے' کے ٹائٹل پر مور شاہد حسین کی تصویر لگا دی ہاہاہا..... ؟ کاشی چوہان کی 'قاتل حسینہ' بہت خوب رہی۔ سسپنس اور تجسس سے بھرپور تھی۔ منشی محمد عزیز مے کی کہانی 'تریا چلتر' ایک خوبصورت اور تھانیدار کی ذہانت کی داد دیتی کہانی تھی۔ اپنی فہم و فراست سے مجرموں کو پکڑا۔ روبینہ شاہین کی 'ڈیلیٹ آپشن' عبرت کا درس دیتی سبق آموز کہانی تھی۔ خط بہت طویل ہو گیا ہے۔ انشاء اللہ باقی کہانیوں پر تبصرے کے ساتھ اگلے ماہ حاضری ہوگی اگر زندگی نے وفا کی تو......

☆ ممتاز صاحب! خوش رہیے۔ اور ہمارے پرچے سے اسی پیار سے وابستہ رہیے۔

✉ ایم اشفاق بٹ لالہ موسیٰ سے شامل احوال ہیں، لکھتے ہیں اکتوبر کا پچی کہانیاں 4 اکتوبر کو ملا جو کہ کافی پرچہ لیٹ ملا۔ اس دفعہ اکتوبر کا سرورق بہت دل فریب تھا۔ کپڑوں کے ساتھ میچ کرتے کانوں میں پہنے جھومر بہت بھلے لگ رہے تھے۔ منزہ سہام نے زندگی کا احساس ہونے کا خوب احساس دلایا ہیں ہمارے دل ... کے ہو گئے ہیں۔ اگر ہر ایک بندہ پوری ایمانداری سے کام کرنے لگ جائے تو سارا نظام ہی ٹھیک نہ ہو جائے۔ کاشی صاحب کچھ اپنی باتیں کہہ رہے تھے۔ احوال کالم میں جن جن دوستوں نے مجھ ناچیز کو یاد کیا ان کے لیے

خلوص بھرا سلام اور دعائیں۔ اول نمبر پر میری کہانی لگا کر سچی کہانیاں والوں نے میرا دل جیت لیا ہے۔ باقی کہانیوں میں سب سے پہلے میرے محترم محمد سلیم اختر، کاشی چوہان، عالیہ حرا، مور شاہد حسین، عظمیٰ شکور، عمران مظہر، کرن نورین، نازیہ بتول رضا، ملک صفدر عباس اعوان، ایم اے راحت، روبینہ شاہین، عادل حسین، شعبان کھوسہ، ان سب کی کہانیاں زبردست تھیں۔ سخن آباد میں پرنس تابش، مومنہ بتول، ثمینہ ناز، ساحل ابڑو، عمران فائق، تمثیلہ لطیف، سدرہ انور علی، یاسمین اقبال، مریم شاہ بخاری، فریدہ خانم، ایم حسن نظامی، انیلا شمیم، احمد فراز، سید نور العین زہرہ ان سب نے خوب محفل کا لطف دوبالا کردیا۔ سچی کہانیاں کے سبھی قارئین کو میرا سلام قبول ہو۔

☆ اشفاق صاحب! پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ، آئندہ بھی اپنی رائے سے آگاہ کرتے رہیے گا۔

✉ پیر نوید، حیدرآباد سے لکھتے ہیں قابل احترام کاشی چوہان صاحب، منتظمین سچی کہانیاں اور تمام پیارے قارئین! آداب عرض، امید ہے کہ بخیر و عافیت ہوں گے۔ آمین ثم آمین۔ رنگ برنگے اشتہارات سے لدا شمارہ اکتوبر **2014**ء حسب سابق ٹنڈو جام میں تاخیر سے پہنچا یعنی عیدالاضحیٰ کے یوم **6** اکتوبر کو مدیرہ اعلیٰ کے قلم سے 'زندگی کا احساس' نے سماجی زوال کی مختصر اور پُراثر منظر کشی کی۔ کچھ اپنی باتیں میں ریز لینتھ کو عمدگی سے موضوع بنا کے آپ نے ایک مرتبہ پھر یہ ثابت کردیا کہ آپ محض شاعر ہی نہیں بلکہ باکمال نثر نویس بھی ہیں۔ جاوید راہی، ایم اشفاق بٹ، مور شاہد حسین، نصرت سرفراز، صفدر علی حیدری اور عبدالغفار عابد کے تبصرے نمایاں رہے۔ کہانیوں میں 'ہر پل تیرے ساتھ رہوں گی' مجید احمد جائی کی کہانی بہتر رہی۔ جن زادی اور انسان کی محبت اور وفا پر مبنی کئی کہانیاں پڑھی ہیں اگر سچی ہیں تو حیرت انگیز ہیں۔ ایم شفیق بٹ کی 'اب میرا انتظار کر' بہتر ثابت ہوئی۔ ''اچھو قصاب'' جاوید راہی کی یہ زبردست کہانی۔ محمد اسلیم اختر کی 'بازگشت' میں کرداروں کے پیچیدہ ہندوانہ ناموں نے اُلجھا کے رکھ دیا۔ واقعی تاریخ سب کو ہضم نہیں ہوتی۔ کاشی چوہان صاحب آپ کی تخلیق 'قاتل حسینہ' پراسراریت میں ڈوبی یہ مختصر تحریر بھی پسند آئی۔ ایم اے راحت کی ہم شکل بلاک بسٹر ثابت ہوئی۔ پہلی کڑی سے ہی سحر زدہ کردیا۔ جیون آگ کا دریا، یقین منزل ہے، تم سے ملوں گی میں، ڈیل ایک فیصلہ، کالا ناگ، فیض عشق کی قسط نمبر **4** اور دیگر کہانیاں بھی اچھی رہیں۔ آئندہ شمارے تک کے لیے اجازت، سدا مسکراتے رہیں۔ آمین۔

☆ پیر نوید شاہ! شاد رہو، پرچے کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ۔

✉ فیصل ندیم بھٹی، سرگودھا سے لکھتے ہیں السلام وعلیکم! محترمہ منزہ سہام مرزا صاحبہ و مدیر جناب کاشی چوہان ماہ اکتوبر کے شمارے کا انتظار کرتے کرتے آخرکار **5** اکتوبر کو بذریعہ ڈاک موصول ہوگیا۔ سب سے پہلے ٹائٹل پر نظر پڑی کہ نظر ٹھہر ہی گئی خوبصورت لڑکی **Smart** دلکش بال بہت ہی اچھا لگا۔ منزہ سہام مرزا کا اداریہ زندگی کا احساس پڑھ کر زندگی کا احساس ایک بار پھر مضبوط ہوگیا۔ کاشی چوہان کی کچھ اپنی باتیں پڑھ کر یقین پختہ ہوگیا کہ فن کبھی مرتا نہیں فن کو زندہ رہنا ہے۔ تمام قارئین اور اسٹاف کو عیدالاضحیٰ کی خوشیاں مبارک ہوں۔ ایم اشفاق بٹ، عبدالعزیز جی آ، مجید احمد جائی، مور شاہد بھیا، سلام اور دعا ہمیشہ خوش رہیے۔ نصرت سرفراز، مسز نوید ہاشمی کو سلام، فریدہ فری آپ غیر حاضر کہاں ہیں۔ علی حسنین تابش شمارے میں شامل ہونے پر خوش آمدید۔ کاشی بھیا اس بار اپنی کہانی دیکھ کر عید کی خوشی دوبالا ہوگئی اور اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف، ممتاز بھیا سنائیے کیسے ہیں؟ بھیا اس ماہ میری کہانی شمارے میں شامل ہے پڑھ کر ضرور بتائیے گا۔ اب مرا انتظار کر' اشفاق بٹ کی کہانی میں مرد کی بے وفائی نظر آرہی ہے۔ یقین منزل ہے یہ حقیقت ہے کہ اگر انسان کو یقین ہو

خلوص بھرا سلام اور دعائیں۔ اول نمبر پر میری کہانی لگا کر سچی کہانیاں والوں نے میرا دل جیت لیا ہے۔ باقی کہانیوں میں سب سے پہلے میرے محترم محمد سلیم اختر، کاشی چوہان، عالیہ حرا، مور شاہد حسین، حفظی شکور، عمران مظہر، کرن نورین، نازیہ بتول رضا، ملک صفدر عباس اعوان، ایم اے راحت، روبینہ شاہین، عادل حسین، شعبان کھوسہ، ان سب کی کہانیاں زبردست تھیں۔ سخن آباد میں پرنس تابش، مومنہ بتول، ثمینہ ناز، ساحل ابڑو، عمران فائق، تمثیلہ لطیف، سدرہ انور علی، یاسمین اقبال، مریم شاہ بخاری، فریدہ خانم، ایم حسن نظامی، انیلا شمیم، احمد فراز، سید نور العین زہرہ ان سب نے خوب محفل کا لطف دوبالا کر دیا۔ سچی کہانیاں کے سبھی قارئین کو میرا سلام قبول ہو۔

☆ اشفاق صاحب! پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ، آئندہ بھی اپنی رائے سے آگاہ کرتے رہیے گا۔

✉ پیر نوید، حیدر آباد سے لکھتے ہیں قابل احترام کاشی چوہان صاحب، منتظمین سچی کہانیاں اور تمام پیارے قارئین! آداب عرض، امید ہے کہ بخیر و عافیت ہوں گے۔ آمین ثم آمین۔ رنگ برنگے اشتہارات سے لدا شمارہ اکتوبر **2014** حسب سابق ٹنڈو جام میں تاخیر سے پہنچا یعنی عیدالاضحیٰ کے یوم **6** اکتوبر کو مدیرہ اعلیٰ کے قلم سے 'زندگی کا احساس' نے سماجی زوال کی مختصر اور پُر اثر منظر کشی کی۔ کچھ اپنی باتیں میں ریز لینتھ کو عمدگی سے موضوع بنا کے آپ نے ایک مرتبہ پھر یہ ثابت کر دیا کہ آپ محض شاعر ہی نہیں بلکہ باکمال نثر نویس بھی ہیں۔ جاوید راہی، ایم اشفاق بٹ، مور شاہد حسین، نصرت سرفراز، صفدر علی حیدری اور عبدالغفار عابد کے تبصرے نمایاں رہے۔ کہانیوں میں 'ہر پل تیرے ساتھ رہوں گی' مجید احمد جائی کی کہانی بہتر رہی۔ جن زادی اور انسان کی محبت اور وفا پر مبنی کئی کہانیاں پڑھی ہیں اگر سچی ہیں تو حیرت انگیز ہیں۔ ایم شفیق بٹ کی 'اب میرا انتظار کر' بہتر ثابت ہوئی۔ ''اچھو قصاب'' جاوید راہی کی یہ زبردست کہانی۔ محمد اسلیم اختر کی 'بازگشت' میں کرداروں کے پیچیدہ ہندوانہ ناموں نے اُلجھا کے رکھ دیا۔ واقعی تاریخ سب کو ہضم نہیں ہوتی۔ کاشی چوہان صاحب آپ کی تخلیق 'قاتل حسینہ' پراسراریت میں ڈوبی یہ مختصر تحریر بھی پسند آئی۔ ایم اے راحت کی ہم شکل بلاک بسٹر ثابت ہوئی۔ پہلی کڑی سے ہی سحر زدہ کر دیا۔ جیون آگ کا دریا، یقین منزل ہے، تم سے ملوں گی میں، ڈیل ایک فیصلہ، کالا ناگ، فیض عشق کی قسط نمبر **4** اور دیگر کہانیاں بھی اچھی رہیں۔ آئندہ شمارے تک کے لیے اجازت، سدا مسکراتے رہیں۔ آمین۔

☆ پیر نوید شاہ! شاد رہو، پرچے کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ۔

✉ فیصل ندیم بھٹی، سرگودھا سے لکھتے ہیں السلام وعلیکم! محترمہ منزہ سہام مرزا صاحبہ و مدیر جناب کاشی چوہان ماہ اکتوبر کے شمارے کا انتظار کرتے کرتے آخر کار **5** اکتوبر کو بذریعہ ڈاک موصول ہو گیا۔ سب سے پہلے ٹائٹل پر نظر پڑی کہ نظر ٹھہر ہی گئی خوبصورت لڑکی **Smart** دلکش بال بہت ہی اچھا لگا۔ منزہ سہام مرزا کا اداریہ زندگی کا احساس پڑھ کر زندگی کا احساس ایک بار پھر مضبوط ہو گیا۔ کاشی چوہان کی کچھ اپنی باتیں پڑھ کر یقین پختہ ہو گیا کہ فن کبھی مرتا نہیں فن کو زندہ رہنا ہے۔ تمام قارئین اور اسٹاف کو عیدالاضحیٰ کی خوشیاں مبارک ہوں۔ ایم اشفاق بٹ، عبدالعزیز جی آ، مجید احمد جائی، مور شاہد بھیا، سلام اور دعا ہمیشہ خوش رہیے۔ نصرت سرفراز، مسز نوید ہاشمی کو سلام، فریدہ فری آپ غیر حاضر کہاں ہیں۔ علی حسنین تابش شمارے میں شامل ہونے پر خوش آمدید۔ کاشی بھیا اس بار اپنی کہانی دیکھ کر عید کی خوشی دوبالا ہو گئی اور اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف، ممتاز بھیا سنائیے کیسے ہیں؟ بھیا اس ماہ میری کہانی شمارے میں شامل ہے پڑھ کر ضرور بتائیے گا۔ اب مرا انتظار کر اشفاق بٹ کی کہانی میں مرد کی بے وفائی نظر آ رہی ہے۔ یقین منزل ہے یہ حقیقت ہے کہ اگر انسان کو یقین ہو

تو منزل ضرور مل جاتی ہے۔ مور شاہد کی میں لٹ گئی ایک نصیحت سے بھرپور کہانی ہے۔ لڑکیوں کو خاص طور پر ایسے واقعات سے بچنا چاہیے۔ عظمیٰ شکور کی تم سے ملوں گی اچھی کہانی ہے۔ گناہ گار کون عمران مظہر کی کہانی ہر پل تیرے اچھی کہانیاں ہیں۔ اک خلش ہے کرن نورین کی کہانی واقعی خلش تو اندر رہتی ہی ہے۔ جیون آگ کا دریا، کون دلاں دیاں بہت پسند آئیں۔ ایم اے راحت کا سلسلہ ہم شکل اچھا جا رہا ہے۔ اچھوتقصاب، آتش نفس، ڈیل، ڈیلیٹ آپشن اچھی ہیں۔ کاشی چوہان کی کہانی قاتل حسینہ بہت پسند آئی۔ ایک Suspense میں بھرپور کہانی ہے۔ تین مرد کہانیاں کے سلسلے میں کالا ناگ، عادل حسین کی کہانی واقعی بے راہ روی کے شکار معاشرے کے منہ پر طمانچہ ہے۔ نیا انتقام شعبان کھوسہ میں ایک نئے انتقام کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اور میں خودغرض نکلا، میری اپنی کہانی یہ تو قارئین ہی بتائیں گے کہ کیسی لگی۔ سخن آباد میں تمام غزلیں اچھی تھیں۔ سدرہ انور علی کی سہاگن بھی بہت اچھی کاوش ہے۔ فیض عشق مشق میں ڈوبی لازوال کہانی چل رہی ہے۔ تمام قارئین کو سلام۔

☆فیصل بھیا خوش رہیے، آپ کا تفصیلی خط شاملِ اشاعت ہے آئندہ بھی اپنی آراء ہم تک پہنچاتے رہیے گا۔

✉ کراچی سے عادل حسین رقم طراز ہیں اکتوبر کا سچی کہانیاں اپنی روایتی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ ٹائٹل خوبصورت، میری تحریر کی اشاعت پر شکریہ، منزہ آپی کا اداریہ ہمیشہ کی طرح حقیقت پر مبنی اور آپ کی اپنی باتیں سائنس میں ڈوبی ہوئی۔ بہت خوبصورت کاشی بھائی مزا آ گیا۔ اللہ حمید ہارون صاحب کی والدہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ اور تمام لکھنے پڑھنے والے جن جن مشکلات کا شکار ہیں، اللہ اُن کی تمام مشکلات دور فرمائے۔ احوال کی محفل بہت جاندار تھی۔ مستقل لوگوں کے ساتھ ساتھ نئے لوگ بھی اس کارواں میں شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ پڑھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ ناگن اور ملکھنی دونوں ہی خوبصورتی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس ماہ ایم اے راحت صاحب کا ہم شکل بھی شروع ہو گیا ہے۔ پہلی ہی قسط نے بتا دیا کہ شاہکار پڑھنے کا ملے گا۔ زبردست قسط تھی۔ اب آتے ہیں سچ بیانیوں کی طرف، ایم اشفاق بٹ صاحب کی اب مرا انتظار کرا چھی تھی۔ دوسری سچ بیانی عالیہ حرا جی کی جاگیردارانہ سسٹم کے خلاف بہترین تحریر تھی۔ میں لٹ گئی لوگو مور شاہد حسین صاحب کی ایک دکھ بھری تحریر تھی۔ چوتھی سچی کہانی تم سے ملوں گی میں عظمیٰ شکور صاحبہ کی ایک اور بہادر عورت کی کہانی، اور اگر مضبوط ہوں تو عورت دنیا فتح کر سکتی ہے۔ بے شک پانچویں سچ بیانی عمران مظہر صاحب کی گناہ گار کون؟ ایک ایسی تحریر جو سیکڑوں سوال اٹھاتی تھی۔ معاشرے سے، یہ سارے وہ سوال ہیں جن کے جواب سب کے پاس موجود ہیں مگر دینا کوئی نہیں چاہتا۔ عمران مظہر نے اپنی بات بہت اچھے طریقے سے پہنچائی ہے قارئین تک۔ چھٹی سچ بیانی میرے بھائی مجید احمد جائی کی تھی۔ محبت محبت ہے۔ نازیہ بتول رضا جی کی جیون آگ کا دریا بھی حقیقت کے قریب تر تھی۔ گڈی آپا نے بھی بڑی اچھی محبت پیش کی۔ رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ تو اب ہر گھر کا قصہ بن گئی ہے۔ دسویں تحریر ملک صفدر عباس اعوان صاحب کی دیر لگی آنے میں بھی اچھے انداز میں لکھی گئی تحریر۔ ملک صاحب کی تصویر کسی فلمی ہیرو کی تصویر لگ رہی ہے۔ اچھوتقصاب جاوید راہی صاحب کی پُراسرار تحریر۔ انداز بیاں خوب تھا۔ بہت سلیقے سے کہانی کو پیش کیا گیا۔ بازگشت محمد سلیم اختر صاحب کی ایک تاریخی تحریر شروع میں تھوڑی سی غلطیاں تھیں تحریر میں۔ شاید یہ پروف کی غلطی ہوں۔ جیسے کہ 1932 میں رنجیت سنگھ کی عمر 55 سال کی اور 1937ء میں 57 سال؟ 1937ء میں جب راجا چندر کور سے شادی کرتا ہے تو وہ 16 سال کی بہن 15 سال کی بنتی ہے؟ خیر

دلچسپ لگی۔ آتش نفس بھی خوبصورت لگی۔ ڈیل ایک فیصلہ سنبل جی کی نہایت حقیقت پر مبنی تحریر جو دل کو بہت دکھی کر گئی۔ میں اس شہر کا باسی ہوں۔ مجھے اس حقیقت کا بخوبی علم ہے۔ ویری نائس سنبل جی، اللہ اس شہر اور اس کے لوگوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔ تریا چلتر منشی محمد عزیز مئے صاحب کی ایک چالباز عورت کی کہانی جو اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ ڈیلیٹ آپشن روبینہ شاہین صاحبہ کی زبردست تحریر تھی جو کہ حقیقت پر مبنی، کاش یہ تحریر پڑھ کر ایک بھی لڑکی بچ جائے تو تحریر کا مقصد پورا ہو جائے۔ نائس روبینہ جی، کاشی جی کی قاتل حسینہ اُن کے جادوئی قلم کا شاہکار انتقام کی آگ میں جلتی ایک عورت کی کہانی۔ بہت خوبصورتی سے پیش کیا۔ نائس کاشی جی، میری کہانی کیسی لگی یہ تو اگلے پرچے میں ہی پتا چلے گا۔ نیا انتقام شعبان کھوسہ صاحب کی خوبصورت تحریر کاش ہر انسان اپنے انتقام کو ایسی ہی شکل دے دے۔ فیصل ندیم بھٹی صاحب کی میں خود غرض نکلا بھی ایک ایسے نوجوان کی داستان جو لوگوں کے احسان بھول کر خود غرض بن جاتا ہے۔ نیفِ عشق کا چوتھا حصہ بھی خوب تھا۔ مسئلہ یہ ہے جیسے نیک کام پر دعائیں۔ تمام لکھنے پڑھنے والوں کو سلام اور دعائیں، کوئی غلطی ہوگئی ہو یا کسی کا دل دُکھا ہو تو معافی، اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔

☆ پیارے عادل! تمہاری تجاویز پر ضرور عمل ہوگا۔ تبصرہ شاندار رہا۔

✉ سدرہ انور علی جھنگ صدر سے لکھتی ہیں محترم عزیز از جان بھیا کاشی چوہان، ڈیئر ریڈرز، رائٹرز اینڈ آل اسٹاف السلام وعلیکم! محفل میں حاضر ہوں اس اُمید، یقین اور دعا کے ساتھ کہ تمام قارئین سچی کہانیاں انشاء اللہ عافیت کے ساتھ ہوں گے۔ ماڈل اور اداکارہ عائزہ خان سے سجا اکتوبر کا شمارہ کچھ لیٹ ملا۔ منزہ آنٹی کا اداریہ 'زندگی کا احساس' دل کی آنکھ سے پڑھا۔ آپ کی کچھ اپنی باتیں ہمیشہ کی طرح لاجواب لگیں۔ ڈاکٹر غزل خان، اسلم جاوید، علی حسنین تابش کو سچی کہانیاں میں خوش آمدید احوال میں سبھی نے بہت شاندار لکھا۔ کنگ آف احوال کمانڈو شعبان، اشفاق بٹ، مقصود احمد، پیر نوید شاہ، محمد اسماعیل بروہی، فیصل ندیم، مجید احمد بھیا، علی حسنین تابش، ملک عاشق حسین میرا تبصرہ پسند کرنے کا بہت شکریہ۔ مور شاہد بھیا پرنس آف احوال کا لقب آپ کو دیتی ہوں کیا یاد کرو گے۔ مگر اسی وجہ سے کچھ احوالی میرے دشمن بن گئے ہیں۔ خیر مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ سچی کہانیاں کا نیا سلسلہ ہم شکل کی پہلی قسط اچھی لگی۔ ناگن تو شمارے کی جان ہے۔ ملکھنی بھی اچھی جا رہی ہے۔ اشفاق بٹ کی، اب میرا انتظار کر، پاگل اور بے وقوف لڑکیوں کے لیے بہت اچھا سبق ہے۔ مور شاہد حسین کی میں لٹ گئی ویلڈن مور بھیا اچھا سبق دیا آپ نے قارئین کو۔ عظمیٰ شکور کی تم سے ملوں گی میں بہت اچھا لکھا انہوں نے بھی۔ مجید احمد کی ہر پل تیرے ساتھ رہوں گی۔ پسند آئی۔ بہت عرصے بعد ناز یہ بتول کی کہانی پڑھنے کو ملی۔ جیون آگ کا دریا بہت اچھا سبق دیا۔ ملک صفدر عباس کی دیر لگی آنے میں۔ اس شمارے کی ٹاپ کلاس کہانی ہے۔ جاوید راہی کی اسلم قصاب یقیناً وہ انسانیت کا محسن تھا۔ محمد سلیم اختر کی بازگشت' از ابیل کی آتش نفس، سنبل کی ایک ڈیل ایک فیصلہ محمد عزیز کی تریا چلتر روبینہ کی ڈیلیٹ آپشن' بہترین کہانیاں تھیں۔ کاشی بھیا کی قاتل حسینہ بہت پسند آئی۔ عادل حسین کی کالا ناگ، کمانڈو شعبان کی نیا انتقام پسند آئیں۔ فیصل ندیم کی میں خود غرض نکلا ویلڈن، فیصل جی اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ سخن آباد میں تمام شاعروں نے کمال لکھا۔ بہت بے چین رہتی ہے طبیعت اب میری اکثر، مجھے اب قتل ہونا ہے مگر قاتل نہیں ملتا۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ اللہ نگہبان۔

☆ سدرہ خوش رہو، تفصیل سے کیا جانے والا تبصرہ شاملِ احوال ہے۔

✉ فریدہ جاوید، لاہور سے شاملِ احوال ہیں۔ محترم بھائی کاشی چوہان السلام وعلیکم! اکتوبر کا سچی کہانیاں

عید کے ایک روز پہلے ملا اب تبصرہ پہنچ ہی جائے گا۔ اس مرتبہ کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ سچی کہانیاں پڑھ کر مزا آ جاتا ہے۔ کاشی چوہان کی قاتل حسینہ بہترین تحریر تھی۔ روبینہ شاہین کی کہانی اور کالا ناگ، نیا انتقام، آتش نفس، فیض عشق دیر لگی آنے میں ابھی اتنی ہی کہانیاں پڑھی ہیں۔ ایم اے راحت کا ہم شکل قسط وار سلسلہ پہلی قسط ہی زبردست لگی وہ تو لکھتے ہی بہت اچھا ہیں۔ مقصود بھائی، ایم اشفاق بٹ کو میگزین میں دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی سلیم اختر کی کہانیاں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ فیصل ندیم بھٹی جی سرگودھا میں آپ کو بک نہیں مل سکتی ہاں لاہور سے آپ کو بک پرائم ٹائم پبلی کیشنز سے مل سکتی ہے۔ بک کا نام محبت یاد رکھوں گی سے رجوع کریں وہ آپ کو بک بھیج دیں گے شکریہ سب رائٹرز قارئین دوستوں کو دعا اور سلام۔

☆ شکریہ فریدہ! آپ کا مفصل خط شامل احوال ہے۔ آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رکھیے گا۔

☒ منشی محمد عزیز لڈن ضلع دیہاڑی سے لکھتے ہیں ڈیئر کاشی چوہان جی! سلام محبت، اکتوبر کا شمارہ عید کی چھٹیوں سے محض ایک روز قبل بروز ہفتہ چار تاریخ کو ملا۔ اس مرتبہ کا سرورق بہت ہی پسند آیا۔ کاشی بھیا! پُراسرار نمبر سے متعلق آپ نے بتایا بھی نہیں اور چپکے سے اعلان بھی کر دیا۔ چلیے، جو ہوا اچھا ہی ہوا۔ اشتہارات سے ہیلو ہائے منزہ سہام مرزا کے اداریے تک پہنچے جہاں منزہ باجی، مردہ دلوں اور ضمیروں کو جگانے کی سعی کر رہی تھیں۔ اللہ کرے کہ اُن کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز ثابت نہ ہو۔ کچھ اپنی باتیں میں کاشی میاں، سائنسی رُو سے محترم سہام مرزا مرحوم کی موجودگی سے ہمیں آگاہ کر رہے تھے۔ احوال کا ابتدائی خط قبولہ شریف کے ایم حسن نظامی صاحب کا تھا۔ اس حوالے سے آپ کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ احوال کی ابتداء میں وہ خط شائع ہونا چاہیے جو کہ تبصرے اور مزاح سے بھرپور ہو اور لیٹر آف دی منتھ کا درجہ دیا جائے۔ ذرا آگے بڑھے تو محترم جاوید راہی سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ اُن کی خدمت میں دست بستہ سلام پیش ہے۔ پیر نوید شاہ ہاشمی، خط کی پسندیدگی پر مشکور ہوں۔ آپ نے جی آ صاحب اور اور سمیع چمن کو بہت اچھے مشورے سے نوازا۔ یقیناً اس چار دن کی زندگی کو ہنس کر اور محبتیں بانٹتے ہوئے گزاریے کہ آج کل محبت اور خلوص نایاب ہو رہے ہیں۔ سدرہ آپ میرے لیے چھوٹی بہنوں یا بیٹیوں جیسی ہیں۔ ویسے شعر آپ نے بہت خوب لکھا ہے اور ہاں 'سہاگن' بھی بہت اچھی کوشش ہے۔ ویلکم بیگ، عبدالعزیز جی آ جی! آپ کا شعر بہت اچھا ہے لیکن آپ کاشی بھائی کے جواب پر بھی غور کریں۔ فائزہ شہزاد کو میں بھی یاد کر رہا ہوں کیونکہ وہ بھی...... ہمارے...... اولڈ از گولڈ ساتھیوں میں سے ہیں۔ ممتاز احمد، اللہ کا شکر اور آپ سب کی دعائیں ہیں بھائی میاں، لیجیے عظمیٰ شکور کی تحریر بھی شائع ہوگئی۔ ویلکم علی حسنین تابش، سالانہ خریدار بن کر آپ ہر قسم کے جھنجھٹ سے بچ گئے اور یقیناً سچی کہانیاں آپ کو مایوس نہیں کرے گا کیونکہ ان لوگوں کی پالیسی کبھی صرف اور صرف حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ حوصلہ شکنی نہیں۔ ثبوت آپ نے خود دیکھ لیا ہوگا اکتوبر کے شمارے میں؟ جن دوستوں نے خط پسند کیا، اُن سب کا مشکور ہوں۔ محترمہ رُخسانہ سہام مرزا کے لیے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ و عمر خضرؑ عطا فرمائے۔ آمین۔ مجید احمد جائی ایک جن زادی کی محبت کے ساتھ حاضر تھے۔ بہت خوبصورت تحریر تھی۔ ملک صفدر عباس اعوان کی دیر لگی آنے میں پڑھ کر مہر النساء کی بدنصیبی اور قدرت کی ستم ظریفی پر ہنسی آ گئی۔ محترمہ سنبل ایک بے بس نوجوان کے حالات زندگی کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ ڈیلیٹ آپشن آج کل کی جھوٹی محبت سے متعلق تھی، نہ جانے کتنی ہی لڑکیاں، محبت کے نام پر لُٹ چکی ہیں۔ قاتل حسینہ کاشی چوہان بھائی کی بہت زبردست تحریر ڈھونڈ کے لائے۔ سخن آباد میں مریم شاہ بخاری کی غزل کے علاوہ ایم حسن نظامی کی غزل اور سیدہ نور العین زاہرا کی میں محبت ہوں بہت پسند آئیں اب اجازت سوہنے اللہ کے حوالے۔

☆ محمد عزیز! خوش رہو۔ پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ۔

✉ نیئر رضا دی کراچی سے لکھتے ہیں محترم جناب کاشی چوہان السلام وعلیکم! اللہ تعالیٰ سب کو حفظ وامان میں رکھے (آمین) آپ کی محبتوں نے آخرکار مجھے بھی خطوں کو وسعت دینے پر مجبور کردیا۔ آپ کی محبتوں کا بہت شکرگزار ہوں۔ سچی کہانیاں اور دوشیزہ ایک ساتھ ہی نصیب ہوئے میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ آپ کو دو گلدستے دیے جائیں تو کیا آپ باری باری دونوں گلدستوں کو نہیں دیکھیں گے یا باری باری دونوں گلدستوں کی خوشبوؤں سے اپنی سانسوں کو نہیں مہکائیں گے اور یہی میرے ساتھ ہوا میں نے سچی کہانیاں کی ایک تحریر پڑھی اور کام سے اٹھ گیا پھر دوشیزہ کی تحریر پڑھی اور پھر مجھے مجبوراً مطالعہ چھوڑنا پڑ گیا اس طرح میں دونوں رسالوں کی آدھی آدھی تحریریں پڑھ چکا ہوں باقی جو تحریریں رہ گئی ہیں وہ عیدالاضحیٰ کی مصروفیت کے بعد پڑھنے کا ارادہ ہے خط اس لیے جلدی لکھ رہا ہوں کہ آپ دوشیزہ میں بھی میری تحریر کو شامل اشاعت نہ کریں کہ تحریر تاخیر سے ملی۔ ایک سوال اور آپ سے کرنا ہے کیا تحریر اگر تاخیر سے پہنچے تو آپ اس تحریر کو ضائع کردیتے ہیں اور یہ بھی بتا دیجیے کہ خط آپ کو کس تاریخ تک مل جائے تاکہ شامل اشاعت ہوسکے۔ سچی کہانیاں اور دوشیزہ کا مکمل مطالعہ ابھی باقی ہے لیکن جہاں تک میں پڑھ چکا ہوں وہاں تک تو تحریریں خوبصورت انداز اپنائے ہوئے تھیں۔ تحریریں وہی اچھی ہوتی ہیں جو قاری کو اپنے حصار میں لے لیں اور ایسا سحر زدہ کردیں کہ قاری اختتام تک اپنے آپ کو بھول جائے۔ سارے سلسلے خوب جارہے ہیں باقی شاعری پر آپ کا رجحان کم نظر آرہا ہے 'نئے لہجے نئی آوازیں' کے صفحات بڑھائیں اور اس کے علاوہ اندرونی صفحات پر بھی شاعری کم نظر آرہی ہے پہلے جیسی شاعری کو جگہ نہیں دے رہے ہیں یہ آپ ہی بہتر جانتے ہیں کہ معاملہ کیا ہے۔ "نئے لہجے نئی آوازیں" صفحات بڑھانے کا تقاضا کررہی ہیں۔ آپ کی محبتوں کا نہایت شکرگزار ہوں کچھ غلط لکھا گیا ہو تو معافی کا خواستگار ہوں۔

☆ نیئر رضا دی! پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ، آئندہ بھی اپنی رائے سے آگاہ کرتے رہیے گا۔

✉ عظمیٰ شکور، سرگودھا سے لکھتی ہیں، ایڈیٹر صاحب آداب، میری طرف سے سب کو عید مبارک ایڈیٹر صاحب اسٹوری شائع کرکے آپ نے کمال کردیا ہے۔ یہ عنایتیں غضب کی یہ بلا کی مہربانی، اسٹوری دیکھ کر دل ایسا دھڑکا کہ قیامت کردی اب آتے ہیں رسالے کی طرف ہمیشہ طرح پھولوں کی خوشبو میں مہکتا رسالہ تھا ارے واہ سرورق بہت حسین لگا اور کہانیاں لاجواب تھیں۔ عظمیٰ تو کیا خوب لکھتی ہیں۔ واہ عالیہ حرا کی تحریر یقین منزل ہے۔ واہ کیا بات ہے دل خوش کردیا۔ ایک لڑکی کی ہمت کی داستان بہت حوصلہ دے گئی۔ اُف مور شاہد بھائی کی میں لٹ گئی رُلا ہی تو ڈالا اس کہانی نے جیسے خوف کی لہر دوڑ گئی۔ اس معاشرے کی داستان ہے تو اور کیا۔ بازگشت بھی اچھی اسٹوری تھی۔ بس ذرا نام پڑھنے میں دقت ہوئی۔ محمد سلیم اختر اچھا لکھا۔ صاحبہ کی لکھی تحریر دکھیاری غموں کی ماری تھی۔ بس تھوڑا سا مسئلہ ہوا مجھے ناسمجھ میں نہیں آیا کہ کون سے گروپ نے جنہوں نے یہ سب کردیا۔

☆ شکریہ عظمیٰ! اُمید ہے آئندہ بھی اپنی آراء سے ہمیں مستفید کرتی رہوگی۔

✉ ثمرہ خان! کراچی سے لکھتی ہیں منزہ آنٹی اور محترم ایڈیٹر صاحب اسلام وعلیکم امید کرتی ہوں آپ اور آپ کی پوری ٹیم خیریت سے ہوں گے آپ کے اس ڈائجسٹ میں میرا یہ پہلا خط ہے اسے ضرور شائع کیجیے گا سب کہانیاں کافی اچھی ہیں ہمارے کاشی صاحب کی کہانی قاتل حسینہ بہت زبردست لگی کاشی صاحب آپ سے ایک ریکوسٹ کرنا چاہتی ہوں جیسے کہ آپ کے ڈائجسٹ میں فیمس ہستیوں کا انٹرویو لکھا جاتا ہے تو

ضروری نہیں ہے کہ بزنس لوگوں کا انٹرویو لے کر لکھا جائے آپ کسی غریب طبقے سے تعلق رکھنے والوں کا انٹرویو لے کر بھی لکھ سکتے ہیں تا کہ اس ڈائجسٹ کے پڑھنے والے اتنے ہیں کہ ان لوگوں کو بھی غریب طبقے کے لوگوں کی زندگی کے بارے میں پتا لگے کہ غریب طبقے کے لوگ عیدالضحٰی پر قصائیوں کا کام شروع کر دیتے ہیں کیا یہی تو ان کی زندگی نہیں ہے جو پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے اتنے بڑے دن بھی یہ کام کی تلاش میں نکلتے ہیں ۔اگر کوئی بات بری لگی ہو تو معاف کیجیے گا پہلی بار خط لکھ رہی ہوں تمام کہانیاں اور اس ماہ کا شاعری کا صفحہ بھی بہت زبردست تھا کاشی صاحب خوش رہیں اس کے ساتھ ہی اجازت دیجیے گا۔(اللہ حافظ)

☆ثمرہ خوش رہو، خوش آمدید! تمہاری کوئی بھی بات بری نہیں لگی آئندہ بھی احوال سے جڑی رہو۔

✉انیسہ خاتون کراچی سے احوال میں شامل ہیں کاشی جی! آپ کو اور تمام احوالیوں کو بہت بہت سلام عرض ہے۔ ماہ اکتوبر کا شمارہ پسندیدگی کے عروج پر تھا کیوں کہ اس میں ایم۔اے۔راحت کا نیا سلسلہ ہم شکل جو شامل تھا۔ ''مسئلہ یہ ہے'' میں بہت سے مسائل کا حل بہترین لگتا ہے۔ کاشی جی آپ شمارے میں غالب اور میر تقی میر علامہ اقبال کی شاعری بھی لگانا شروع کر دیں تو مزا آ جائے گا کیوں کہ یہ میرا پسندیدہ پرچہ ہے مشورہ دینے کا حق تو بنتا ہے نا جی۔ اجازت دیں کیوں کہ طویل خط دوسرے احوالیوں کے لیے جگہ گھیر لے گا اللہ نگہبان

☆شکریہ انیسہ آپ کا پورا حق ہے اس پرچے پر اور مفید مشورے سے نوازنے پر ہم آپ کے مشورے پر غور کریں گے۔

✉نوریہ فاطمہ کراچی سے لکھتی ہیں محترم جناب ایڈیٹر صاحب سلام عرض ہے میرا نام نوریہ فاطمہ ہے آپ کے احوال میں میری یہ پہلی انٹری ہے سچی کہانیاں ایک عرصے سے پڑھ رہی ہوں مگر خط لکھنے کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ مگر ایک عرصے سے احوال کے حصے داروں نے ایک ہی طرح ایک دوسرے لکھاری کی تعریفیں لکھ لکھ کر مجھے مجبور کر دیا کہ میں بھی احوال کا حصہ بننے کی جسارت کر ہی ڈالوں۔ میری تمام احوالیوں سے گزارش ہے کہ تعریف کے ساتھ ساتھ تنقید بھی ہو تو زیادہ بہتر ہوگا کیوں کہ مخلص دوست وہی ہوتا ہے جو صحیح اور غلط کا فیصلہ بہتر طریقے سے کرے۔ ارے ارے ناراض مت ہوں اگر میری بات بری لگی ہو تو معذرت خواہ ہوں پر میں تعریف کے ساتھ ساتھ تنقید پر عمل کرنے والی انسان ہوں بلکہ یوں کرتے ہیں جب میں کہانی لکھوں تو آپ لوگ جی بھر کر میری کہانی پر تنقید کریے گا یقین جانیے مجھے بے حد مسرت ہوگی ایک تو میری اصلاح ہوگی دوسری آپ لوگوں سے جڑے رہنے کا ذریعہ بھی بنا رہے گا۔ پرچہ بے حد اچھا ہے اس کی اور آپ کی سب لوگوں کے لیے دعا گو!

☆خوش آمدید نوریہ! یقین جانو خط لکھنے کا انداز بڑا اچھا اور جدا لگا۔

✉سیالکوٹ سے کیتھرین پہلی بار احوال میں شریک ہیں لکھتی ہیں ہیلو کاشی برادر! میرا نام کیتھرین ہے میں ایک کرسچن فیملی سے تعلق رکھتی ہوں کچھ عرصے قبل میرا قیام اپنے ماما کے گھر ہوا تھا اور وہاں میری کزن سچی کہانیاں کی دیوانی تھی ہر ماہ شدت سے پرچے کا انتظار کرتی نظر آتی جس سے مجھے بڑی کوفت ہوتی اور میں نے اس کا اظہار بھی کر ڈالا بس جی پھر کر گیا تھا۔ وہ میرے پیچھے پڑ گئی ایک بار پڑھو تو تمہیں بھی اس کی عادت نہ پڑ جائے تو کہنا جب تک میں ان کے گھر قیام پذیر رہی سچی کہانیاں کا پرانا اسٹاک مفت میں پڑھنے کا موقعہ ملا صرف ایک بات کہوں گی میری کزن کا کہا سچ ثابت ہوا بلکہ اب تو اس سے ایک ہاتھ آگے نکل آئی کیوں کہ وہ صرف پڑھتی ہے جبکہ ہم نے تو احوال میں بھی انٹری دے دی ہے جب چرچ جاتی ہوں دعا ضرور کرتی ہوں

کہ سچی کہانیاں پوری آب وتاب سے ترقی کی منزل طے کرے۔

☆ کیتھرین خوش رہو آباد رہو بہت خوشی ہوئی یہ جان کر تم ہمارے پرچے سے آخر جڑ ہی گئی۔

☒ ثناء اشرف ایبٹ آباد سے لکھتی ہیں۔کاشی بھیا اسلام وعلیکم! خوبصورت سرورق ہے سچا شمارہ ہمیشہ کی طرح ہمیں لیٹ ہی ملا اس بات کا گلہ اس وقت ختم ہوا جب منزہ سہام اور کاشی جی آپ سے پرچہ کھولتے ملاقات ہوئی۔گلابی دوپٹہ بہترین لگی پردیس کہانی میں ''کیوں یہ کھیل کھیلا'' اچھی لگی ''فیض عشق'' امجد جاوید کی بہترین جارہی ہے۔سخن آباد میرا پسندیدہ صفحہ ہے کاشی جی ہم کو یہ سفرنامہ بھیج سکتے ہیں میرا چاچا جی نے بہت سفر کیے ہیں میں ان کا سفرنامہ لکھ کر بھیج سکتی ہوں احوال میں گا ہے بگا ہے انٹری دے کہ تمام احوالیوں سے جڑی رہنا چاہتی ہوں۔

☆ ارے ثناجی خوش رہو تم انٹری دو یا نہ دو تم کو ہم ہمیشہ یادرکھتے ہیں۔

☒ علی گل کراچی سے لکھتے ہیں مدیر اعلی منزہ سہام صاحبہ! مدیر کاشی چوہان صاحب تمام اسٹاف کو ہمارا سلام قبول ہو۔ہمیشہ کی طرح ماہ اکتوبر کا شمارہ بھی پسندیدگی کی بلندیوں پر رہا یہ میرا ذاتی خیال ہے باقی سب کا خدا جانے۔منزہ سہام کا اداریہ ان کی سوچ وفکر کی ترجمانی کرتا ہے کاشی بھیا آپ میرے فیورٹ شاعر ہیں رائٹر فیورٹ نہیں ہاہاہا...... مذاق کررہا تھا بھائی اپنوں میں ہنسی مذاق تو چلتا ہے نا ''فیض عشق'' پسندیدہ سلسلہ وار ہے تین سرد تین کہانیاں بھی تھوڑی متاثر کردیتی ہے سوچ رہا ہوں ایک کہانی میں بھی دے ہی ڈالوں سخن آباد کے لیے ایک خیال لکھ کر بھیج رہا ہوں اگر پسند آئے تو ضرور شائع کر کے شکریہ کا موقعہ دیں۔تمام لکھاری اچھے ہیں مطلب اچھا لکھتے ہیں سبکو میرا اسلام۔

☆ علی گل سدا خوش رہو سخن آباد میں تمہاری شاعری لگ جائے گی پر ابھی انتظار فرمایئے۔

☒ آمنہ علی شاہ فیصل کراچی سے لکھتی ہیں اسلام وعلیکم کاشی بھیا امید کرتی ہوں کہ آپ اور آپکا پورا اسٹاف خیریت سے ہوں میں اس ڈائجسٹ میں فسٹ ٹائم خط لکھ رہی ہوں میں نے پچھلے مہینے ڈائجسٹ کو جب پہلی بار پڑھا تو مجھے بہت پسند آیا ساری کہانیاں بہت زبردست اور سبق آموز کہانیاں ہیں۔میری تمام فرینڈ سچی کہانیاں بہت شوق سے پڑھتی ہوں اور میں نے چھوٹی سی ایک کہانی لکھی ہے ''محبت کی آب بیتی'' اگلے مہینے ارسال کروں گی اچھی لگے آپ کو تو ضرور شائع کیجئے گا۔منزہ آنٹی کا اداریہ بہت اچھا لگا ان کلے اداریہ میں بہت سبق آموز باتیں لکھی ہوتی ہیں بہت اچھا ڈائجسٹ ہے اللہ آپ کو اور ترقی عطا فرمائے اور بہت سی نیک تمناؤں کے ساتھ اب اجازت دیجئے دعاؤں میں یادرکھیے گا۔

☆ آمنہ شکریہ پرچے کی پسندیدگی کا اپنی کہانی ضرور ارسال کرو انتظار رہے گا۔

☒ کنول عمران خان کراچی سے لکھتی ہیں اسلام وعلیکم! کیسے ہیں آپ سب اور تمام احوال کے بہن بھائیوں کو سلام اور سب کو بقرعید مبارک کہا داس بار شمارہ بہت ہی دیر سے ملا یقین کہ 5 تاریخ کو۔اب آپ ہی بتایئے کہ پھر عید بھی اور کیسے کہانیاں پڑھتے اور تبصرہ کریں اور اگر لیٹ خط بھیجے تو شائع نہ ہونے کا ڈر؟ چلیں جی اب آپ ہی انصاف کریں اب میں خط بھیج تو رہی ہوں شائع ہوتا ہے کہ نہیں سب سے پہلے میں دلفریز رخسانہ سہام کے لیے دلی دعا گو ہوں کہ اللہ تعالی انھیں جلد صحت یاب کریں (آمین) اور اب میں اپنے تمام بہن بھائیوں کا دل سے شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جنھوں نے میری سالگرہ کو یادرکھا اور نئے اور میری نئی کو مبارک یاد کے پیغام بھیجے جن میں اشفاق شاہین، محمد اسماعیل بروہی، شعبان کھوسہ، مور بھائی، شائستہ جمال، شامل ہیں اور صفدر بھائی اور مسز نوید ہاشمی نے میری تنقید کو بھی سراہا انکا بھی شکریہ اور

نومبر 2014ء

کوپن برائے احوال

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کررہا ر کررہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کرلیں۔

نام: ________________

مکمل پتا: ________________

____

نومبر 2014ء

کوپن برائے اشاعت کہانی

میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا ر بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شامل اشاعت کرلیں۔

عنوان کہانی: ________________ تعداد صفحات: ________________

نام: ________________

مکمل پتا: ________________

____

فون ر سیل نمبر: ________________

نومبر 2014ء

کوپن برائے پسندیدہ کہانی

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا ر کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اوّل، عنوان: ________________ مصنف: ________________

دوم، عنوان: ________________ مصنف: ________________

سوم، عنوان: ________________ مصنف: ________________

نام: ________________ شہر: ________________

محمد جواد قریشی. جی آپ نے میرا تبصرہ پسند کیا بہت نوازش جی ،ممتاز بھائی شکریہ آپ نے مٹھائی کا بول دیا بس آپ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنے گھر آنے کی سعادت بخشے (آمین) سدرہ سسٹر کیسی ہو یار تمہاری غزل بڑی پسند آئی ''سہاگن'' keep at up اوکے کاشی بھائی اب کہانیوں کی طرف آتی ہوں ''اب میرا انتظار کر'' بہت پسند آئی تھی۔ ''تم سے ملوں گی میں'' سچ پوچھے تو یہ تحریر پڑھ کر میری آنکھیں بر آئیں اگر واقعی کوئی دل سے چاہنے والا مل جائے تو اس کا غم مار ڈالتا ہے عظمیٰ شفور زبردست ''گنہگار کون'' ''جیون آگ کا دریا'' دیر لگی آنے میں زبردست تھی۔ اور راحت صاحب ''ہم شکل'' اچھی لگی مگر یہ کیا بات ہوئی کہ اسے یقین ہی نہ آئے اپنی بیماری کا عجیب سا لگا چلیں جی دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے فی الحال تو کہانی شروع ہوئی ہے آگے آگے دیکھیں ہوتا ہے کیا'' اچھو قصاب'' کا پڑھ کر دل میں دکھ ہوا اس کو ناحق سزا ہوئی پلیز یہ ذرا بتایئے کہ یہ واقعہ کوئی آجکل کا ہے یا پھر کب کا ہے مطلب کتنا ٹائم ہوا ہے اس کو کیوں کہ جب میں نے اپنے Husband سے پوچھا تو وہ کہنے لگے کہ اچھو قصاب کا نام تو سنا ہے مگر یاد نہیں آ رہا کچھ اور واقعی ڈر بھی لگا کہ کوئی آدم خوروں کے بیچ میں کیسے رہ سکتا ہے اور پھر اتنی ہمت سے ''بازگشت'' ''ڈیلیٹ آپشن'' ''قاتل حسینہ'' ''کالا ناگ'' ''نیا انتقام'' یہ کہانیاں تو زبردست ہی نہیں لاجواب لگیں اور باقی بھی تمام تحریریں خوب صورت تھیں کاشی بھائی پلیز شمارہ ٹائم سے بھجوا دیا کریں بہت لیٹ ملتا ہے اور پھر ہم کب پڑھتے گے اور کب تبصرہ دیں گے او کے چلیں جی سب کو سلام اور عید مبارک کافی ٹائم لے لیا آپ کا اب اجازت دیں اللہ حافظ۔

☆ کنول جی سدا خوش رہو تمہارا خط شامل احوال ہے اب تو خوش۔

اوچ شریف سے صفدر علی حیدری برقی نامے کے ساتھ احوال میں شامل ہیں لکھتے ہیں کاشی بھیا! خیریت مطلوب! سہام فیملی ، اسٹاف ممبرز ، قلم کار ساتھیوں اور قاری دوستوں کی سلامتی کی امید اور دعا کے ساتھ عرض خدمت ہے کہ اب کی بار بھی ''سچی کہانیاں'' حسب معمول تاخیر سے ملا اور تاخیر بھی ایسی کہ پچھلے سارے ریکارڈ ٹوٹ گئے (اور یہ دل بھی) امید تھی کہ چھوٹی عید کی طرح بڑی عید پر بھی یہ ہماری خوشیوں کو چار چاند لگائے گا لیکن...... ہماری خوشیوں کا سورج گہنا کر رہ گیا۔ جیسے اسے گرہن لگ گیا ہو۔ پھر احوال کی محفل میں اس اعلان نے گویا ''مرے پر سو درے'' کا سا کام کیا کہ پراسرار نمبر 3 میں تحریر بھیجنے کی آخری تاریخ 5 اکتوبر ہوگی۔ سچ میں یہ چند سطریں جس دل گرفتگی کے عالم میں لکھ رہا ہوں وہ میں جانتا ہوں یا میرا رب...... کچھ اور لکھنا مشکل بھی ہے اور شاید حد ادب بھی مانع ہے۔

☆ پیارے بھائی صفدر! 2014ء میں دل گرفتہ نہ ہوں۔ وہ آپ کے لیے بہت کچھ ایسا بھی لایا تھا جو آپ کے گمان میں بھی نہ تھا۔ پُراسرار نمبر 3 بھی آنا تھا۔ سب جانتے تھے۔ پھر آپ نے تحریر بھیجنے میں تاخیر کیوں کی۔ آئندہ ہم بھی تحریر لگاتے ہوئے بہت کچھ 'خیال' میں رکھیں گے۔

✉ اسامہ ندیم کراچی سے لکھتے ہیں پیارے بھائی اکتوبر کا شمارہ حسین ترین ٹائٹل کے ساتھ میرے روبرو ہے بھیا آپ نے کمال کر دیا ہے۔ ایک سے ایک خوبصورت تحریر شمارے میں شامل ہے لیکن سب سے پہلے میں اداریہ سے بات شروع کروں گا۔ زندگی کا احساس میں منزہ جی نے احساس جھنجھوڑنے کی ایک بھرپور کوشش کی ہے۔ آپ کی کچھ اپنی باتیں اس بار فن کی بلندیوں پر ہیں۔ احوال میں جاوید راہی انکل کا خط دیکھ کر اُن کی آپ سے محبت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جاوید انکل کا کسی بھی میگزین میں یہ پہلا خط آپ کی محبت اور مقبولیت کا کھلا ثبوت ہے۔ ہمیں پُراسرار کہانی نمبر 3 کا اشتہار دیکھ کر اُسے پڑھنے کی

اشتہا جاگ اٹھی ہے۔ احوال میں سب ساتھیوں کے خطوط بہت چاہت اور محبت لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ میری طرف سے تمام احوالیوں کو بہت بہت پیار اور سلام۔ اب بات کرتے ہیں اس ماہ کی سچ بیانیوں کی گڈی آپا کی کون دلاں دیاں جانے' نازیہ بتول رضا کی جیون آگ کا دریا، عمران مظہر کی گناہ گار کون، عظمیٰ شکور کی تم سے ملوں گی میں' اور ملک صفدر عباس اعوان کی دیر لگی آنے میں کمال کی سچ بیتیاں تھیں۔ مجید احمد جائی، ایم اشفاق بٹ اور کرن نورین اپنی تحریروں سے انصاف نہ کر سکے۔ ایم اے راحت صاحب ادب کا بہت بڑا نام ہیں۔ اگر میں انہیں ادب کا ایک ستون کہوں تو غلط نہ ہوگا۔ اُن کا سچی کہانیاں میں آنا انتہائی نیک شگون ہے۔ ہم شکل کی پہلی ہی قسط نے سچی کہانیاں میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ واہ واہ...... اس بار جرم کہانی اچھو قصاب نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ جاوید بھائی ہم تو آپ کے پہلے ہی سے اسیر تھے مگر اچھو قصاب نے ہمیں جس حصار میں لیا ہے شاید ہی اب وہ ٹوٹ پائے۔ سلیم اختر صاحب کی بازگشت سچی کہانیاں کے مزاج کی بالکل نہیں تھی۔ اِس کہانی کو پڑھ کر قطعاً مزا نہیں آیا۔ حالانکہ محمد سلیم اختر وہ رائٹر ہیں۔ جن کا نام دیکھ کر ہم کہانی پڑھتے ہیں۔ ازابیل آئندے کی آتش نفس بہت پسند آئی۔ مکھنی میں ارشد علی ارشد صاحب پتا نہیں کیا دکھانا چاہتے ہیں۔ بھلا اتنی عجوبہ تحریر اور وہ بھی سچی کہانیاں میں...... شعلہ ساماں تحریروں میں سنبل کی ڈیل، ایک فیصلہ' نے ایک سچی تصویر دکھائی۔ سنبل ہماری پسندیدہ رائٹر ہیں۔ منشی محمد عزیز کی تریا چلتر اور روبینہ شاہین کی ڈیلیٹ آپشن بہت دھماکے دار تھیں۔ آگے ہمارے کاشی بھائی بھی قاتل حسینہ کو لے کر پلیٹ فارم پر موجود تھے۔ کاشی بھائی سچ مچ آپ نے جس طرح اُس قاتل حسینہ کو بے نقاب کیا وہ قابلِ تحسین ہے۔ مرد کہانیوں میں عادل حسین کی کالا ناگ سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ شعبان کھوسہ نیا انتقام کے ذریعے بلندیوں پر نظر آئے۔ جبکہ اپنے فیصل ندیم بھٹی بھی میں خود غرض نکلا میں زبردست رہے۔ ناگن دسویں قسط میں بھی حواسوں پر سوار رہنے میں کامیاب رہی۔ مسئلہ یہ ہے پڑھ کر بہت کچھ آسانیاں ہماری زندگیوں میں بھی آ رہی ہیں۔ سخن آباد بھی خوب رہا۔ اور اب آخر میں فیضِ عشق...... امجد جاوید صاحب سچ مچ آپ غضب کا لکھ رہے ہیں چوتھا حصہ بھی کمال ہے۔ لیجیے یہ تو پرچہ ختم ہو گیا۔ اوور آل ماہِ اکتوبر کا شمارہ بے نظیر رہا۔ اگلے ماہ پھر ملیں گے۔

☆ پیارے اسامہ! یار سچ بتاؤ اتنا بھرپور تبصرہ لکھنے میں مدد کس نے کی ہے؟ تم تو بہت چھوٹے سے لگتے ہو۔ خدا تمہیں نظرِ بد سے بچائے۔ آمین۔

پیارے ساتھیو! اگلے ماہ آپ کے ساتھ احوال میں ہماری ساتھی بینا تاج آپ کے خطوط کے جواب دیں گی۔ امید ہے آپ جہاں ہوں گے خدا آپ کا حامی و ناصر ہوگا۔

سچی کہانیاں اسپیشل ایوارڈز

☆ لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ۔ محمد سلیم اختر۔ (راولپنڈی)

☆ بیسٹ رائٹر آف دی ایئر 2014ء جاوید راہی (اوکاڑہ)

☆ موسٹ پاپولر (مرد) رائٹر آف 2014ء ممتاز احمد (سرگودھا)

☆ موسٹ پاپولر (عورت) رائٹر آف 2014 سنبل (کراچی)

نوٹ: اسپیشل ایوارڈز، دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ تقریب میں روایتی شان و شوکت کے ساتھ مصنفین کو دیے جائیں گے۔

سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ حاصل کرنے والے لکھاریوں کی مکمل فہرست

2014ء کے ایوارڈ یافتگان

ایوارڈ ماہ	ایوارڈ یافتہ کہانی	مصنف/مصنفہ	شہر
دسمبر 2013	عجب مقدر ہے مرا	رضوانہ کوثر	لاہور
	میں ایک بیٹی ہوں	نگہت غفار	کراچی
جنوری 2014	جُھولا	آصفہ ضیاء احمد	حیدرآباد
	ہاف بٹ	گڈی آپا	لاہور
	غرقاب	فرزانہ سحاب مرزا	دبئی
	چراغ پالی	محمد علی اسد بھٹی	خوشاب
فروری 2014	برسات	جویریہ سلیم	راولپنڈی
	بازاورابابیل	دستگیر شہزاد	ٹوبہ ٹیک سنگھ
مارچ 2014	روشنی والے	احمد سجاد بابر	لودھراں
	کالا انڈا	صدف آصف	کراچی
	ایک کہانی	حمیرا خان	شاہ کوٹ
	ہم زاد	خلیل احمد انجم	کھاریاں
	14 مارچ	نصرت سرفراز	اسلام آباد
اپریل 2014	پکھی واس	بشیر احمد بھٹی	بہاول پور
	ہم نام	ایم اشفاق بٹ	لالہ موسیٰ
	بے جڑ کے پودے	رئیسہ خالد	اسلام آباد
	کھٹل	سردار شاذ	منچن آباد
مئی 2014	صنم کدہ ہے جہاں	ریاض حسین شاہد	قبولہ شریف
	کایا پلٹ	مسز نوید ہاشمی	کراچی

سچی کہانیاں رائٹر ایوارڈ حاصل کرنے والے لکھاریوں کی مکمل فہرست

2014ء کے ایوارڈ یافتگان

	جون 2014	خارزار ہے زندگی	اُم منابل	ایبٹ آباد
		شریکِ سفر	نفیسہ فضل	کراچی
	جولائی 2014	کسے الزام دوں	ذرینہ جونیجو	خیرپور ناتھن شاہ
		سب جائز ہے	عبدالغفار عابد	چیچہ وطنی
		میں کون ہوں؟	سدرہ انور علی	جھنگ
	اگست 2014	پُراسرار حویلی	سلمیٰ کنول	امریکہ
		ایک حسینہ	الماس فاطمہ ارمان	کراچی
		عشق ہوش رُبا	صفدر علی حیدری	اُچ شریف
	ستمبر 2014	کانٹوں کی زمین	شعبان کھوسہ	کوئٹہ
		روشنی کے مینار	جمیل میتلو	کراچی
	اکتوبر 2014	تریا چلتر	منشی محمد عزیز میے	لندن، وہاڑی
		کالا ناگ	عادل حسین	کراچی
	نومبر 2014	فیضِ عشق	امجد جاوید	حاصل پور
		اِک گناہ اور	عابد علی سحر	چشتیاں
		اعتراف	شاہانہ خان	کراچی

نوٹ: تمام مصنفین کو اُن کے ایوارڈ (سرٹیفکیٹس) اسی ماہ بذریعہ ڈاک روانہ کردیے جائیں گے

اس ماہ کی سچ بیانیاں

اپنے وطن سے، اپنے شہروں سے موصول ہونے والی سچ بیانیاں
جن کو پڑھ کر اپنی مٹی کی خوشبو آس پاس محسوس ہوتی ہے

خواہشوں کے سراب	محمد سلیم اختر	راولپنڈی سے، عورت کے پیار اور انتقام کے گرد گھومتی ایک کہانی
بابل کی پری	جنجل میتو	کراچی سے، انسانی سفاکی کی ایک لرزہ خیز داستان
مردِ مجاہد	شعبان کھوسہ	کوئٹہ سے، وطن عزیز پر قربان ہو جانے والے بہادر سپاہی کا قصہ
بہاریں روٹھ نہ جائیں	بابر نایاب	ساہیوال سے، ایک انسان ناشناس دوشیزہ کی روئیداد
کیوں اعتبار نہ کیا	نسیم سکینہ صدف	ڈسکہ سے، بے اعتباری پر قربان ہو جانے والی عورت کتھا
یہی زندگی ہے	رفعت محمود	راولپنڈی سے، مکافاتِ عمل کی ایک تصویر
اعتراف	شاہانہ خان	ضمیر کے بوجھ تلے سانس لیتی ایک دوشیزہ کا اعتراف، پنجاب سے
صلہ	رانا محمود شاہد	بورے والا سے، ایک شخص کی ایمانداری کا قصہ خاص
زندگی ٹھہر ذرا	محمد شعیب مجبور	خیبر پختونخوا سے، ایک حوصلہ مند لڑکی کی داستان
ہمت کرے انسان تو	اُمِ مناہل	ایبٹ آباد سے، حالات کے شکار نوجوان کی کہانی
بے وفا کون؟	شازیہ جاوید شازی	اسلام آباد سے، ایک شادی شدہ جوڑے کی بدقسمتی

پہلی سچ بیانی

خواہشوں کے سراب



محمد سلیم اختر

راولپنڈی سے، عورت کے پیار اور انتقام کے گرد گھومتی ایک لازوال کہانی

انسان کی اس سے بڑھ کر اور کیا بدنصیبی ہو سکتی ہے کہ وہ جو چاہتا ہو وہ نہ ہو پائے اور وہ ہو جائے جو اسے پسند نہ ہو..... میں بھی ایسے ہی حالات کا مارا ہوا انسان ہوں۔

میرے ابا جان نے بیک وقت تین شادیاں کر رکھی تھیں۔ ایک والدین کی پسند کی اور دو اپنی پسند کی۔ میری ماں ان کی برادری کی تھیں اور انکے والدین کی پسند تھیں ان کی پہلی شادی میری ماں سے ہوئی تھی اس لحاظ سے میں تمام بہن بھائیوں میں بڑا ہوں۔

ان دنوں ہمارے خاندان کے مالی حالات بہتر تھے گزر بسر بہتر انداز میں ہو رہی تھی۔ ہم سب اکٹھے ہی رہتے تھے نہ جانے وہ تینوں سوکنیں ایک دوسرے کو کیسے برداشت کر رہی تھیں دل سے یا اوپر اوپر سے حالات اور وقت بدلتے دیر نہیں لگتی یہ فقیروں کو بادشاہ اور بادشاہوں کو بھکاری بنا دیتا ہے وقت کا سمندر بڑا ظالم ہوتا ہے۔ تھپیڑوں کے زور پر زندگی کا سفر جاری رکھنے پر مجبور کیے رہتا ہے اور جب انسان ہار جاتا ہے تو یہی وقت اسے ساحل پہ لے آتا ہے۔

میرے ابا جان کاروباری شخص تھے لاکھوں میں کھیلتے تھے کسی قسم کی مالی پریشانی غم اور فکر نہ تھی اسی وجہ سے تو انھوں نے تین شادیاں کر رکھی تھیں۔ لیکن ان خوش گوار حالات میں بھی ان کا میری ماں کے ساتھ سلوک اچھا نہ تھا کیوں کہ وہ ان کی پسند نہ تھیں۔ میری دادی میری ماں کی شادی کے کچھ عرصے بعد ہی فوت ہو گئی تھیں۔ اس وقت میں پیدا ہی نہیں ہوا تھا دادی کے بعد دادا جان ہی امی کے ہمدرد تھے ان کی موجودگی کی وجہ سے میرے ابا ماں کا کسی حد تک خیال رکھتے تھے۔ مگر جب دادا جان بھی چل بسے تو ابا جان ہر فکر سے آزاد ہو گئے۔

تمام کاروبار، جائیداد اور دولت ان کے ہاتھ آ گئی تو انھوں نے نہ صرف میری امی کو بلکہ مجھے بھی نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ یوں جیسے ہم ان کے کچھ لگتے ہی نہ ہوں، انھوں نے میری ماں کی حیثیت نوکرانی سی بنا ڈالی اور اپنی دوسری بیویوں کے ناز نخرے اٹھانے لگے وہ ان کی تو ہر ضرورت کا خیال رکھتے اور ان میں سے کسی کو سر درد بھی ہو جاتا تو وہ تڑپ اٹھتے ڈاکٹر تک کو گھر بلا لیتے اور جب میں یا امی بھی بیمار ہوتے تو ہمیں ڈسپرین کی ایک گولی تک بھی نہ لا کر دیتے۔ امی..... ابا کے اس رویے پر کڑھتی اور روتی رہتی تھیں مگر صرف شکایت زباں پر نہ لاتی تھیں۔ نانا اور نانی بھی اس دنیا میں نہ تھے اس لیے امی اپنے بھائیوں اور بہنوں پر بوجھ نہیں بننا چاہتی



تھیں اور نہ ہی وہ لوگ ہمارا بوجھ برداشت کر سکتے تھے۔انھوں نے بھی ہم ماں بیٹے کو بھلا دیا تھا،اس لیے امی اسی گھر میں رہنے اور دکھ سہنے پر مجبور تھیں۔وہ ابا جان اور دونوں سوکنوں کے ظلم و ستم سہتی رہیں۔وہ نوکرانی بن کر اپنی سوکنوں کی خدمت کرتی رہیں۔گھر کا سارا کام کاج امی ہی کرتیں مگر پھر بھی ابا جان اور سوکنیں ان سے خوش نہ تھیں وہ تو ابا جان کی ہاں میں ہاں ملاتی تھیں اور ان دونوں میں نہ جانے کیسے اور کیوں اتفاق تھا ان میں کبھی لڑائی جھگڑا نہ ہوا تھا شاید یہی وجہ ہو کہ ابا جان ان دونوں کا برابر خیال رکھتے تھے۔

مگر نہ جانے ابا ہم ماں بیٹے کو کس جرم کی سزا دے رہے تھے حالانکہ میری امی حسن اور خوبصورتی میں ان سے کچھ کم نہ تھیں وہ ہمیشہ سادہ کپڑے پہنا کرتی تھیں لیکن اس کے باوجود وہ ان دونوں سے زیادہ خوبصورت دکھائی دیتی تھیں۔

☆......☆......☆

میں ان دنوں کالج میں پڑھ رہا تھا کہ ابا جان کو کاروبار میں خسارہ ہونے لگا کئی جگہوں سے رقم کی ادائیگی نہ ہوئی۔کئی پارٹیاں بھاگ گئیں اور کچھ ورکروں نے ہیرا پھیری کی۔ابا جان نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح کاروبار کو سنبھال لیں مگر وہ اپنی اس کوشش میں نا کام رہے انھوں نے غیروں پر تو اعتماد کرلیا مگر اپنی اولاد یعنی مجھ پر نہ کیا،غیروں نے جب دھوکہ دیا اور اندر ہی اندر مال کھانے لگے تو تب ان کو احساس ہوا مگر اس وقت سب کچھ برباد ہو چکا تھا۔

مالی حالات بگڑے تو اس کا تمام تر نزلہ ہم ماں بیٹے پر ہی گرا ہمیں منحوس اور نہ جانے کیسے کیسے القاب سے نوازا گیا اور ہم یہ سب کچھ برداشت کرتے رہے آخر کار حالات اتنے خراب ہوگئے کہ ابا جان محلے میں ہی جنرل اسٹور چلانے پر مجبور ہوگئے لاکھوں میں کھیلنے والے ہزاروں پر آگئے......

بدلتے وقت کے ساتھ گھر کی حالت بھی متاثر ہونے لگی ہمیں تو گھر میں پہلے ہی کوئی مقام اور حیثیت حاصل نہ تھی اور اب تو ہمیں یوں نظر انداز کیا جانے لگا جیسے ہم اس گھر کے فرد ہی نہ ہوں میں اس زیادتی پر بہت کڑھتا تھا۔جی چاہتا تھا کہ ابا جان کے رویوں کے آگے دیوار بن جاؤں اور زبردستی ان سے اپنا اور ماں کا حق وصول کروں،مگر میری ماں مجھے منع کر دیتی کہ باپ کے سامنے کبھی زبان نہ کھولنا......"بدتمیز کہلاؤ گے۔"

حالات کچھ مزید بگڑے تو میری سوتیلی ماؤں نے بھی جھگڑا شروع کر دیا پہلے تو چنگاری اندر ہی اندر سلگتی رہی اور پھر جب آگ بن کر بھڑکی تو محلے والوں کو بھی پتا چل گیا۔ابا جان نے گھر میں بہت کوشش کی کہ گھر میں اتفاق رہے نا اتفاقی نہ ہو مگر روایتی جلن کو روکنا انکے بس کی بات نہ تھی حالات دن بہ دن بد سے بدتر ہوتے گئے حتیٰ کہ ایک سوتیلی ماں نے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ابا جان نے بہت چاہا کہ طلاق کی نوبت نہ آئے مگر جب وہ بھی چکی کے دونوں پاٹوں کے درمیان پسنے لگے تو انھوں نے ایک کو طلاق دے دی جسے طلاق نہ ملی اس کا پلہ بھاری ہو گیا اور اسے یہ بھی شہ مل گئی۔

وہ یہی سمجھی کہ ابا جان اس سے زیادہ پیار کرتے ہیں اور اب اس کا اگلا شکار ہم ماں بیٹا تھے اس نے ابا جان پر کچھ ایسا جادو کر ڈالا تھا کہ وہ اس کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے پھر میری سوتیلی ماں کا اگلا وار بھی کامیاب ہو گیا۔ابا جان نے میری ماں کو طلاق تو نہ دی البتہ وہ گھر چھوڑنے کا حکم دے دیا۔

اس روز میں نے پہلی بار ابا جان سے اونچے لہجے میں بات کی اور انھیں بے حس،خود غرض اور مطلب پرست انسان تک کہہ دیا۔امی پھر بھی وہ گھر نہ چھوڑنا چاہتی تھیں مگر میں انھیں زبردستی اس گھر سے لے کر نکل آیا جبکہ میرے پاس کوئی ایسا ٹھکانہ بھی نہ تھا کچھ دن تو میں نے اپنی ماں کو اپنے ایک دوست کے گھر ٹھہرا دیا اور خود کسی کام کی تلاش میں نکل پڑا۔جلد ہی مجھے ایک دوسرے شہر میں ایک پرائیویٹ فرم میں ملازمت مل گئی تو میں امی کو بھی ساتھ لے گیا اور اپنے آبائی شہر اور گھر سے ہر قسم کا تعلق ختم کر ڈالا۔

میں نے ماضی کو بھلانا شروع کر دیا مجھے ان لوگوں سے نفرت سی ہوگئی جو خود ایک سے زائد شادیاں کرتے ہیں اور اپنے ہی خون پر ڈاکہ ڈالتے ہیں میں نے عہد کیا کہ کم از کم میں ایسی زندگی نہیں گزاروں گا میں ایک ہی

شادی کروں گا اور اپنی تمام محبتیں اور چاہتیں اپنی بیوی اور اولاد پر نچھاور کروں گا۔

☆......☆......☆

میں جس فرم میں کام کرتا تھا۔ وہاں ترقی کرنے کے مواقع بھی ملتے تھے میں نے ملازمت کے ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کرنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور اپنے دفتری کام پر بھی توجہ دی میں نے بی اے امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کر لیا تو میری ترقی ہو گئی میری فرم کے مالک مجھ سے بہت ہی خوش تھے کیوں کہ میں انھیں کبھی شکایت کا موقع نہ دیتا تھا۔ انھوں نے ایک اور شہر میں برانچ قائم کی تو مجھے اس کا انچارج بنا کر وہاں بھیج دیا...... میں نے تو یہ سوچا بھی نہ تھا اتنی جلدی میرے حالات اس قدر بہتر ہو جائیں کے یہ میری ماں کی دعاؤں کا ہی پھل تھا کہ کامیابیاں میرے قدم چوم رہی تھیں۔

میں نے بھی فرم کے کاروبار اور ترقی کے لیے دن رات ایک کر ڈالا...... پھر مجھے کمپنی کی طرف سے مکان اور گاڑی بھی مل گئی، تو میری امی کو میری شادی کی فکر پڑ گئی جبکہ میں ابھی اس جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ قدرت نے مجھے حسن و جمال بھی خوب دیا تھا کہ میں کسی کے بھی دل کی دھڑکن بننے کے قابل تھا...... مگر میں جسے تلاش کر رہا تھا وہ مجھے ابھی تک نہ ملی تھی اس لیے امی کو میں یہ کہہ کر ٹال رہا تھا۔

"جب بھی مجھے اپنی پسند کی کوئی لڑکی ملی میں آپ کا بتاؤں گا پھر اسے بہو بنا کر لانا آپ کا کام ہوگا۔"

☆......☆......☆

"آخر کار مجھے میری پسند مل ہی گئی تھی"...... میں نے نورین کو زندگی کا ہم سفر بنانے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے دوست کی مدد سے نورین کے بارے میں بہت کچھ معلوم کر لیا...... وہ دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ اچھے معزز خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے بھائیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں نورین کے لیے بھی کئی رشتے آ چکے تھے مگر کوئی بھی اس کے معیار پر پورا نہیں اتر رہا تھا اس کے ماں باپ نے اسے اس معاملے میں خود مختار بنا رکھا ہے وہ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی خامی نکال کر اسے مسترد کر دیتی۔ مضبوط کردار کی پڑھی لکھی تھی ان تمام حقائق سے آگاہ ہونے کے بعد میں نے عہد کیا کہ میں نورین کو حاصل کر کے ہی رہوں گا۔ اگر قدرت کو ہمارا ملن منظور ہوا تو میرے من کی خواہش ضرور پوری ہوگی...... نورین نے میرے من میں ایک آگ سی لگائی تھی اور میں اس کی چاہت کی دھیمی دھیمی آگ میں جل کر ایک سکون سا محسوس کرنے لگا تھا میں نے امی کو بھی اپنی کیفیت سے آگاہ کیا اور واضح کر دیا کہ نورین کو ہر صورت میں آپ کی بہو بننا چاہیے یہ میری زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔

امی نے میری بیتابی دیکھی تو کہنے لگیں۔

بیٹا! مجھے تمہاری خوشیاں عزیز ہیں میں اسے ہر حال میں لے کر آؤں گی!۔

ایک دو بار امی اکیلی ہی نورین کے گھر گئیں بعد میں...... میں بھی ان کے ہمراہ گیا نورین میرے سامنے تو نہ آئی لیکن اس نے مجھے دیکھ تو لیا تھا اس نے میری گفتگو سنی اور پھر ہاں کر دی اس روز میں بہت خوش تھا میرے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے میں حیران بھی تھا کہ نورین نے کیا دیکھ کر اور کیا سوچ کر میرے حق میں فیصلہ دے دیا ہے بلکہ اس سے قبل وہ کئی رشتے ٹھکرا چکی تھی میرے دوست اور اس کی بیوی نے جب نورین کا فیصلہ سنا تو وہ میری خوش قسمتی پر رشک کرنے لگے وہ بھی حیران تھے کہ نورین نے اتنی آسانی سے ہاں کیسے کر دی......؟

امی نے دیر نہ کی اور جلدی سے منگنی کی رسم ادا کر دی۔ اور پھر تین ماہ بعد میری شادی دھوم دھام سے نورین سے ہو گئی......

نورین میرے گھر کیا آئی لگتا تھا میرے آنگن میں چاند اتر آیا ہے، نورین نے بھی مجھے پہلی نظر میں پسند کر لیا تھا۔ اپنی ازدواجی زندگی کی اول شب ہم نے ڈھیروں عہد و پیمان باندھے...... مستقبل کے حسین سپنے سجائے۔

کئی دنوں تک دعوتوں کا سلسلہ چلتا رہا اور پھر سیر و تفریح میں دو ماہ گزر گئے" میں نورین کو پا کر بڑا خوش تھا مجھے یہ مان تھا کہ میری شریک حیات لاکھوں میں ایک ہے اور ہماری ازدواجی زندگی یقیناً نہایت ہی پر سکون اور شاندار گزرے گی کیوں کہ ہمیں ایک دوسرے سے محبت تھی ایک دوسرے پر اعتماد اور بھروسا تھا۔ ہم اس محبت کے چشمے سے جی بھر کر سیراب ہو رہے تھے اور جی بھر کر

چاہنے اور چاہے جانے کا خمار ہی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کی ساری حسیات پر نشہ سا چھا جاتا ہے ایک دوسرے کے جذبوں میں بھیگے ہوئے لفظ زندگی بن جاتے ہیں میں اور نورین بھی ایسی ہی کیفیت میں تھے ہماری زندگی نہایت ہی خوش گوار اور پرسکون گزر رہی تھی ہم ایک دوسرے کی محبت اور چاہت میں کھوئے رہتے تھے البتہ میں کبھی کبھار یہ محسوس کرتا کہ نورین مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن الفاظ اس کے ہونٹوں پر آ کر رک جاتے ہیں لیکن میں نے اسے ایک دو بار اکسایا کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتی ہے کہہ دے..... مگر وہ بڑی خوبصورتی سے ٹال جاتی......

وہ اپنی ایک سہیلی مہتاب کا مجھ سے اکثر ذکر کرتی رہتی تھی۔ مہتاب کو میں اپنی اور نورین کی شادی کے موقعے پر دیکھ چکا تھا۔ بلاشبہ وہ بہت ہی حسین تھی اس کا تو نام ہی انگ انگ میں رس گھول دینے والا تھا بلاشبہ وہ چاہے جانے کے قابل تھی۔ مگر میں نے اس کی طرف خاص توجہ نہ دی تھی کیوں کہ میں تو صرف اور صرف نورین کا دیوانہ تھا مجھے صرف نورین سے محبت تھی اس لیے جب بھی نورین میرے سامنے اس کا ذکر کرتی تو میں چڑ سا جاتا تھا اور کہتا......

''ہاں وہ بھی خوب صورت ہے، مگر تم سے بڑھ کر نہیں ہے۔''

نورین خاموش ہو جاتی مگر میں یہ محسوس کرتا کہ اسے اچھا نہیں لگتا کہ میں اس کی سہیلی کے خلاف کوئی بات کروں، یہ اچھا تھا کہ ابھی تک مہتاب سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ورنہ اس کو نظر انداز کر دینا بھی نورین کے لیے تکلیف دہ ہوتا۔

☆......☆......☆

نورین کو میکے آئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا اب وہ پہلی بار اتنے دنوں کے لیے میکے گئی تھی، میں نے کئی بار ڈرائیور بھیجا فون بھی کیا مگر وہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتی کہ میں آج نہیں آ سکوں گی نورین کے بغیر میرا وقت ہی نہ گزر رہا تھا گھر بھی سونا سونا لگ رہا تھا۔

اس کے ہجر کا دکھ حد سے بڑھا تو میں خود اسے لینے چلا گیا سسرال جا کر معلوم ہوا کہ وہ اپنی سہیلی مہتاب کے گھر گئی ہوئی ہے۔

''کب واپس آئے گی؟'' میں نے نورین کی امی سے پوچھا، معلوم نہیں وہ کب لوٹے گی؟

اس کی امی کا جواب سن کر میرا دماغ گھوم گیا اور شک کا ناگ میرے من میں کنڈلی مار کر بیٹھ گیا کہ کہیں سہیلی سے ملنے کے بہانے وہ کسی اور سے تو نہیں ملتی؟ یہ سوچ کر میرے اندر جھکڑ چلنے لگے شک اور نفرت کا پودا سر ابھارنے لگا...... لیکن دل نہیں مان رہا تھا کہ نورین ایسی ہو سکتی ہے۔

شادی کے بعد کسی سہیلی کے گھر رکنے کا کوئی جواز ہی نہیں تھا میں وہاں زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ اور مہتاب کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا...... نورین وہاں ہی تھی مجھے وہاں دیکھ کر نورین سکتہ میں رہ گئی جبکہ مہتاب کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا اس نے مجھے بیٹھنے کو کہا تو میں نے بیٹھنے سے انکار کر دیا اور نورین کو مخاطب کر کے کہا۔

میں تمہیں لینے آیا ہوں تمہیں اسی وقت میرے ساتھ چلنا ہوگا۔''

میرے لہجے میں غصہ اور ناراضگی کا عنصر نمایاں تھا اس لیے نورین نے کوئی بات نہ کی اور خاموشی سے میرے ساتھ چل پڑی میں نے راستہ میں بھی اس سے کوئی بات نہ کی رات کو جب ہم سونے کے لیے اپنے کمرے میں آئے تو میں نورین پر برس پڑا میں نے اپنے شک کا اظہار بھی کر ڈالا اور اس سے پوچھا کہ تین دن مہتاب کے گھر رہنے کا کیا مقصد ہے؟ اور پھر میرے علم میں لائے بغیر اور میری اجازت کے بغیر تم اس کے گھر میں کیوں ٹھہری میں تو تمہیں میکے چھوڑ کر آیا تھا تو پھر وہاں سے مہتاب کے گھر جانے اور وہاں ٹھہرنے کا کیا مقصد ہے۔ یقیناً کوئی ایسی بات ہے یا راز ہے جسے تم دونوں جانتی ہو؟''

میرا تیر نشانے پر لگا میرے آخری الفاظ سن کر نورین تڑپ اٹھی اس کی آنکھیں چھلک پڑیں نے آگے بڑھ کر میرے پاؤں چھو لیے اور بولی'' آپ مجھ پر شک نہ کرو الزام نہ لگاؤ کیوں کہ میں صرف آپ کی ہوں ایسا الزام لگانے سے بہتر ہے آپ میرا گلا گھونٹ دیں، آپ نے جو کچھ سمجھا ہے وہ غلط ہے آپ میری زندگی میں آنے والے واحد مرد ہیں میں جس روز کسی اور کا تصور

کروں، خدا کرے وہ دن میری زندگی کا آخری دن ہو حقیقت کچھ اور ہے میں نے کئی بار آپ کو بتانا چاہا پر ہمت نہ ہوئی۔ آج آپکا شک دور کرنے کے لیے میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گی مگر آپ کو ایک وعدہ کرنا ہوگا کہ حقیقت جان لینے کے بعد اور شک دور ہو جانے کے بعد آپ کو میری بھی ایک بات ماننی ہوگی۔"

میں نے نورین سے وعدہ کیا کہ وہ سب کچھ بتا دے میں اس کی بات ضرور مانوں گا نورین کو جب تسلی ہوگئی کہ میرا موڈ ٹھیک ہوگیا ہے تو وہ بولی۔

"میں آپ کو اپنے سے بڑھ کر چاہتی ہوں مگر آپ کے علاوہ بھی کسی سے بے انتہا محبت کرتی ہوں ہم ایک جان دو قالب ہیں اور ہم نے زندگی سنگ سنگ گزارنے اور کبھی جدا نہ ہونے کی قسم کھا رکھی ہے اور وہ ہے میری واحد سہیلی مہتاب! مہتاب مجھ سے بھی زیادہ خوب صورت ہے ہم دونوں ہم عمر ہیں ہم بچپن سے ہی ایک ساتھ پلی بڑھی ہیں اور کھیلی ہیں ہم ایک ساتھ اسکول آتی اور جاتی تھیں بچپن میں ہم ایک جان اور دو قالب کہلاتی تھیں اور اسکول سے واپسی پر کبھی میں اس کے گھر کبھی وہ میرے گھر آجاتی تھی ہم ایک دوسرے کی راز دان تھیں ہم اپنی ذرا ذرا سی بات جب تک ایک دوسرے کو نہ بتاتی ہمیں چین نہ آتا تھا پھر وقت اور عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ ہماری راز کی باتوں کے انداز بھی بدلنے لگے ہم دونوں ہنسا کرتی تھیں ہم دونوں کا پیار مثالی تھا اور ہم پرسکون زندگی سے لطف اندوز ہو رہی تھیں اور کبھی ہم دونوں ہی رو رو کر اپنے آپ کو ہلکان کر لیتی تھیں یہ دیکھ کر ہمارے گھر والے کہتے جب کل تم دونوں کی شادی ہو جائے گی تو پھر تم کیا کرو گی ہمارا جواب یہی ہوتا کہ ایسا نہیں ہوگا۔

پھر ہمارے لیے رشتے بھی آنے شروع ہو گئے کہ لڑکی کی شادی اور بابل کا گھر چھوڑنا بھی ایک اٹل حقیقت ہے اور ہم اور بھی پریشان ہو گئیں کہ ہم میں سے اگر کسی ایک کی بھی شادی ہوگئی تو ہمارے درمیان دوریاں حائل ہو جائیں گی جو ہمیں کسی صورت بھی گوارا نہ تھی اور ہم نے فیصلہ کر لیا کہ ہم اس کا موقع نہ آنے دیں گی اور اس کے لیے ہم دونوں ایک ہی مرد سے شادی کریں گی مرد کے لیے تو یہ ممکن ہے کہ وہ ایک سے زاید شادیاں کر سکتا ہے ہم نے قسم کھائی کہ ہم شادی کریں گی تو صرف ایک ہی مرد سے۔

☆......☆......☆

ہمارے اس فیصلے کا علم جب ہماری کالج کی دوستوں کو ہوا تو کچھ نے کہا...... یہ تو ناممکن ہے جب کہ کچھ یہ کہہ کر خوش ہوئیں کہ یہ ایک انوکھی شادی ہوگی جس کی دھوم مچے گی مگر تمہارا شوہر بے چارہ مارا جائے گا...... ایسا فیصلہ ہماری محبت کی انتہا تھی...... میں جانتی ہوں کہ ایسی محبت تو کہانیوں میں ملا کرتی ہے لیکن اب جب میں خود اس دور سے گزری ہوں تو احساس ہوا ہے کہ یہ ایک غیر اختیاری فعل ہوتا ہے جو کسی کے ساتھ بھی پیش آسکتا ہے۔

ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جس سہیلی کی شادی پہلے ہوگی یہ اس کی ذمہ داری ہے وہ اپنی سہیلی کی شادی اپنے خاوند سے کروائے گی تا کہ قسم اور عہد حقیقت میں بدل جائیں جب سے ہمارے رشتے آنا شروع ہوئے ہم دعا مانگتی تھیں کہ ہمیں ایسا شوہر ملے جو ہماری طرح وفا اور خلوص کا پتلا ہو اس لیے میں اور مہتاب کئی رشتے ٹھکرا چکی تھیں نہ جانے کیوں کسی پر اتنا اعتماد کرنے کو دل ہی نہ مانتا تھا بس یہی خوف رہتا تھا اگر شوہر سخت طبیعت کا مالک ہوا تو پھر کیا بنے گا جدائی کی دیوار اونچی اور طویل ہوگئی تو پھر کیا بنے گا ہم کیسے جی پائیں گے؟

پھر جب آپ میرا رشتہ مانگنے میرے گھر آئے تو میں بس آپ کو چھپ کر دیکھ رہی تھی نہ جانے آپ کو دیکھ کر ایسا کیوں محسوس ہوا کہ ہم دونوں جس کی تلاش میں تھیں وہ ہمیں مل گیا آپ پر اعتماد کرنے کو جی چاہا میں نے فیصلہ آپ کے حق میں کر دیا اور یوں میری اور آپ کی شادی ہوگئی شادی کے موقعے پر مہتاب نے آپ کو دیکھا تو اس نے میرے انتخاب کی داد دی اور کہنے لگی کہ......

نورین! اپنا وعدہ یاد رکھنا، کہیں جواد کی محبت میں کھو کر بھول نہ جانا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ ایسا ہرگز نہیں ہوگا اگر میری اور تمہاری چاہت سچی ہوئی تو میں جواد کو ضرور منالوں گی، کیوں کہ یہ کوئی غیر شرعی عمل تو نہیں ہوگا بس تم دعا کرنا کہ میں اپنے مشن میں کامیاب ہو جاؤں میں نے مہتاب کو مطمئن کر دیا اور آپ کی جیون

ساتھی بن کر یہاں آ گئی ...... آپ نے واقعی مجھے اتنی محبت دی ہے کہ جس کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا ...... آپ میری امیدوں پر پورے اترے ہیں۔

دوسری جانب میں مہتاب کی جدائی کی آگ میں جلتی رہی ہوں ...... ہم فون پر تو بات کر لیتی تھیں مگر میں اس وقت تک اس سے ملنا نہ چاہتی تھی جب تک میدان ہموار نہ ہو جائے اور میں اپنی قسم نبھا کر سرخرو نہ ہو جاؤں ...... میں ڈرتی بھی تھی کہ آپ سے ایسی بات کروں تو آپ نہ جانے کیا سوچیں گے کیا سمجھیں گے اور کیا جواب دیں گے؟ اسی لیے کئی بار یہ بات ہونٹوں تک آئی مگر آگے نہ بڑھ سکی آپ کی ناراضگی کا خوف دامن گیر رہا۔

یہ ہے تمام صورتحال اور پھر آپ نے مجھ سے وعدہ بھی کیا ہے آپ میری بات مانیں گے ...... اب آپ سے میری التجاء ہے کہ آپ میری سہیلی مہتاب سے بھی شادی کر لیں ...!!

نورین آخری الفاظ کہہ کر میرے قدموں میں جھک گئی اس کی آنکھیں برسنے لگیں میں نے اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور کہا۔

''نورین تم نے حقیقت بتا کر مجھے ایک بڑی الجھن سے بچا لیا ورنہ مجھے تو تمہارے کردار پر شک ہو چلا تھا۔ مجھے اس کا افسوس ہے تم واقعی وفا کی مورت ہو لیکن میں یہ نہیں جان سکا کہ تم کیسی عورت ہو جو اپنے ہاتھوں اپنے اوپر سوتن کا عذاب مسلط کرنا چاہتی ہو سوتن کا جلایا تو سب کچھ جلا کر راکھ کر ڈالتا ہے یہ ازل سے ہوتا آ رہا ہے اور ابد تک ہوتا رہے گا۔''

پھر میں نے تفصیل سے اپنے ماضی سے آگاہ کیا اور اپنے ابا جان کی تین شادیوں کی مثال دیتے ہوئے کہا ان کا حشر دیکھ کر میں نے یہ عہد کیا تھا کہ میں تمام عمر صرف ایک ہی بیوی کا ہو کر رہوں گا دوسری شادی کے نام سے مجھے نفرت سی ہو گئی تھی اس میں صرف اور صرف خرابی ہی خرابی اور گھاٹا ہی گھاٹا ہوتا ہے دو بیویوں میں کبھی بھی اتفاق اور محبت کا ناطہ قائم نہیں ہو سکتا کوئی بھی عورت اپنی محبت تقسیم ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم مجھے مجبور نہ کرو ورنہ ہم دونوں ہی گھاٹے میں رہیں گے۔

مگر نورین نے میری کوئی دلیل نہ مانی اور کہنے لگی۔

کیسی سوتن؟ ...... مہتاب میری دوست ہے میری سہیلی ہے وہ میرے دل کا ایک حصہ ہے اگر ہم ایک ساتھ نہ رہیں تو ہم جی نہ سکیں گی اس لیے آپ کو دو زندگیاں بچانے کی خاطر یہ قربانی دینا ہو گی ...... میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ ہمارے درمیان کبھی جھگڑا نہ ہو گا بلکہ پیار محبت امن اور اتفاق کے نغمے گونجا کریں گے گھر ایک مثالی گھر ہو گا ہم دنیا کے لیے ایک مثال بن کر جئیں گی تو ہماری محبت پر رشک کریں گے۔

جواد! آپ مالی لحاظ سے مضبوط ہیں اور ہم دونوں بھی کم نہیں اس لیے ہمیں کبھی مالی پریشانی نہ ہو گی اور ہم خدانخواستہ کبھی ایسا موقع آیا تو ہم روکھی سوکھی کھا کر گزارہ کر لیں گے۔

نورین کی محبت اور آنسوؤں نے مجھے بے بس کر ڈالا اور مجھے اپنا عہد توڑنا پڑا میں نے نورین کی خواہش کا احترام کیا اور مہتاب سے شادی کرنے کا وعدہ کر لیا اگر نورین راضی تھی تو بھلا مجھے کیا اعتراض تھا؟ مہتاب ویسے بھی مجھے نورین سے زیادہ حسین لگتی تھی میری امی نے بھی رضامندی ظاہر کر دی اور یوں پہلی شادی کے تین ماہ بعد میری دوسری شادی ہوئی اس شادی میں نورین اور مہتاب کے رشتے دار شریک ہوئے اور ہر ایک نے نورین کے جذبہ قربانی کی تعریف کی۔

مہتاب کے والدین نے بھی شادی پر جی بھر کر خرچ کیا نورین نے اپنے ہاتھوں سے مہتاب کو دلہن بنایا اور اپنے گھر میں پھولوں کی سیج بھی نورین نے تیار کی ...... سہاگ رات کو وہ مہتاب کو لیکر عروسی میں تنہا آئی اور پھر مجھے اس کمرے کے دروازے تک چھوڑ کر میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور پیار بھری نظروں سے دیکھا اور شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

میں نے دروازہ بند کیا اور مہتاب کی طرف بڑھ گیا۔ مہتاب دلہن کے روپ میں بہت پیاری لگ رہی تھی عورت کی خوب صورتی کا نقطہ عروج اس کے دلہن بنتے وقت ہی ہوتا ہے جیسے کوئی کلی چٹکنے اور گلاب بننے کے بعد انتہائی دلکش دکھائی دیتی ہے بالکل ایسے ہی مہتاب کی سج

دھج پہلے سے زیادہ ہوگئی تھی دلہن بننے کے بعد اس کے حسن میں اور بھی نکھار آ گیا تھا وہ میرے حواس پر نشہ بن کر چھا گئی تو میری چاہت کی دیوانگی اور بھی بڑھ گئی اس کے سحر نے مجھے جکڑ لیا۔

اس نے مجھے دیکھا تو میرے قدموں میں گر گئی اور کہنے لگی۔

آپ عظیم ہیں۔ میں آپ کی عظمت کو سلام کرتی ہوں آپ نے جو احسان مجھ پر کیا ہے وہ میں آپ کی ساری زندگی آپ کی خدمت کر کے بھی نہیں اتار سکتی آپ آسماں ہیں میں زمین کی خاک ہوں۔ مجھے اپنے قدموں ہی پر پڑا رہنے دیں یہی میری بندگی ہے، یہی میرا ایمان ہوگا۔

میں نے مہتاب کو شانوں سے پکڑ کر اوپر کیا اور اٹھایا اور کہا ''مہتاب! میں تم دونوں کو خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا تم نے اور نورین نے جو اعتماد مجھ پر کیا ہے میں اس پر پورا اتروں گا اپنی چاہت میں توازن برقرار رکھوں گا تم دونوں کو برابر کا حق دوں گا اگر پھر بھی کبھی غلطی سے پلڑا ایک طرف جھک جائے تو برابری کا ثبوت دینا کیوں کہ میں دانستہ کبھی ایسا نہیں کروں گا تم میری زندگی میں ایک امتحان بن کر آئی ہو خدا کرے میں اس امتحان میں کامیاب ہو جاؤں۔!!

☆......☆......☆

نورین اور مہتاب نہایت ہی مسرور تھیں کہ انہوں نے جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر انہیں مل گئی تھی جس کا ملنا اتنا آسان تو نہ تھا دونوں ہی میری احسان مند تھیں کہ میں نے ہی ان کے خواب کو حقیقت کا روپ دیا ہے دونوں ہی میری امی کی اتنی خدمت کرتی تھیں کہ میری امی ہر لمحہ ان دونوں کو دعائیں دیتی رہتی تھیں ماضی میں جو دکھ اور درد ہم نے جھیلے تھے اب اتنی خوشیاں پا کر ہم ماضی کو بھلا بیٹھے تھے ہم میں یہ معاہدہ طے پایا تھا کہ ایک رات نورین کے کمرے میں ایک رات مہتاب کے کمرے میں سویا کروں گا دونوں میں سے جو اکیلی ہوگی وہ امی کے کمرے میں سوئے گی اس معاہدہ پر عمل بھی ہو رہا تھا اور زندگی پر سکون گزر رہی تھی نورین اور مہتاب اس قدر اتفاق سے رہ رہی تھیں کہ جیسے ان کا خونی رشتہ ہو۔

میں بھی دونوں سے برابر سلوک کر رہا تھا اور نہایت ہی محتاط بھی رہتا تھا کہ کہیں میرے کسی عمل سے کسی ایک کے دل میں احساس کمتری نہ پیدا ہو جائے وہ دونوں ہی میرے طرز عمل سے مطمئن تھیں لگتا تھا کہ ہمارا گھر واقعی ایک جنت ہے جہاں ہر سو پیار اور محبت کی نہریں بہہ رہی ہیں ہمارے گھر میں ہر لمحہ قہقہے ہی گونجا کرتے تھے پیار اور محبت کے شوخ اور سریلے نغمے سنائی دیتے تھے لگتا تھا کہ ہم کسی انوکھی اور نرالی دنیا کے باسی ہیں جہاں دو سوکنیں اتفاق سے رہ رہی ہیں۔

☆......☆......☆

اچانک ہی ایک دن امی کی طبیعت خراب ہوگئی اور وہ ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں امی کی جدائی نے ہم سب کو افسردہ اور نڈھال کر ڈالا قہقہے آہوں میں ڈھل گئے۔ اس صدمہ نے ہم تینوں کو توڑ کر رکھ دیا مگر گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ صبر آ ہی گیا۔ آہستہ آہستہ گھر کی رونقیں لوٹ ہی آئیں نورین اور مہتاب کی محبت اور دوستی کے رنگ چاروں طرف پھیل گئے میں نے گھر کے کام کاج اور امی کی کمی کو پورا کرنے کے لیے نوکرانی رکھنا چاہی تو ان دونوں نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ وہ گھر کے کام خود ہی کریں گی۔

یوں ہی چھ ماہ کا مزید عرصہ بیت گیا وہ چھ ماہ میری نورین اور مہتاب کی زندگی کے قیمتی اور نایاب دن تھے جنہیں میں کبھی بھول نہیں پاؤں گا۔ وہ دن اتفاق اور چاہت کے یادگار دن تھے اور یہ واقعی سچ لگتا تھا کہ نورین اور مہتاب ایک جان دو قالب ہیں۔

☆......☆......☆

مہتاب کے امید سے ہونے کی خبر نے خوشیوں کو دوبالا کر دیا تھا مہتاب بھی خوش تھی کہ وہ ماں بن کر اس رشتے کی تکمیل کرنے والی ہے نورین بھی خوش تھی مگر میں نے یہ بات واضح طور پر محسوس کر لی کہ اسے وہ خوشی نہیں ہوئی جو اسے مہتاب سے تعلق کی وجہ سے ہونی چاہیے تھی ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ مہتاب کے ہونے والے بچے کو اپنا ہی بچہ ہی جانتی اور اتنی خوش ہوتی جتنا مہتاب ہوئی تھی مگر نورین نے ایسی خوشی کا اظہار نہ کیا جو اس کا حق بنتا تھا ...... میں جان گیا اور یہ حقیقت بھی کہ نورین کو دکھ ضرور ہو رہا ہوگا۔

کہ اس کی شادی تین ماہ پہلے ہوئی تھی اور وہ مجھے ابھی تک کوئی خوش خبری سنا نہیں سکی تھی خود میں نے بھی اس کمی کو محسوس کیا اور اسے لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گیا لیڈی ڈاکٹر نے نورین کے مختلف ٹیسٹ لیے پھر ادویات لکھ کر دیں اور تسلی دی کہ معمولی سا انفیکشن ہے جو دوا کھانے سے ختم ہو جائے گا اور نورین ماں بننے کے قابل ہو جائے گی۔

نورین نے ادویات باقاعدگی سے استعمال کیں مگر نورین کا دامن مراد نہ بھرا میں نے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھایا۔ عرصہ گزر گیا مگر مراد بر نہ آئی جس کی وجہ سے نورین کے مزاج اور رویہ میں تبدیلی آتی گئی مہتاب تو ہر لمحہ اس کی دلجوئی میں لگی رہتی نورین بھی بظاہر تو ہنستی اور مسکراتی...... مگر میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ اندر سے دکھی اور پریشان ہے کہ وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں یا نہ جانے وہ کب ماں بنے گی؟ میں نے دیسی حکیموں سے بھی علاج کرایا تعویز گنڈوں کا بھی سہارا لیا اور درباروں پر منتیں بھی مانگیں مگر نورین کی جانب سے کوئی خوش خبری نہ مل رہی تھی مہتاب کی زچگی کے دن قریب آ رہے تھے اور ڈاکٹر نے اسے مکمل آرام کا کہہ رکھا تھا نورین ہی گھر کے سارے کام کاج کرتی اور مہتاب کی خدمت بھی کرتی اور اس کا ہر طرح سے خیال بھی رکھتی بظاہر وہ بہت خوش دکھائی دیتی اور یہی کہتی تھی کہ مہتاب کا بچہ بھی تو اسی کا بچہ ہوگا مجھے تو بچے سے غرض ہے جو اس کے گھر کی خوشیاں دو چند کر دے گا کتنا خوش نصیب ہوگا آنے والا بچہ جو دو ماؤں کا پیار پائے گا۔

☆......☆......☆

مہتاب نے بیٹے کا تحفہ دے کر اس گھر کی خوشیوں میں اضافہ کر دیا تھا نبیل ہم تینوں کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔ ہمیں تو ایک کھلونا مل گیا نورین کی اداسی اور بے چینی اب میں واضح طور پر محسوس کر رہا تھا وہ نبیل کو گود میں لیے رہتی مگر اس کا دھیان کہیں اور ہوتا۔

اس کے دکھ کا مجھے احساس تھا اس لیے میں نے اس کے علاج پر دن رات ایک کر ڈالے تھے میں جانتا تھا کہ نورین کو ماں بننے کی شدید خواہش ہے جو ہر عورت کی

ہوتی ہے مگر دو سال سے زائد کا عرصہ گزر گیا تو ڈاکٹروں نے صاف کہہ دیا کہ نورین کبھی ماں نہیں بن سکے گی۔

اس روز نورین پہلی بار روئی تھی میری اور مہتاب کی آنکھیں بھی بھر آئیں تھیں ہم دونوں اس کے بیڈ پر آمنے سامنے بیٹھ گئے اور اسے تسلی دی کہ اولاد تو اوپر والا دیتا ہے یہ ڈاکٹروں کے بس کی بات نہیں ہوتی جب اللہ کو منظور ہوگا تو تمہاری گود ضرور ہری ہو جائے گی تم اس سے مانگو وہ تمہیں نا امید نہیں کرے گا کیوں کہ خلوص دل سے مانگی جانے والی دعائیں کبھی رائیگاں نہیں جاتیں وہ تمہارا دامن مراد یقیناً بھرے گا۔

بڑی مشکل سے نورین کو نارمل کیا مگر پھر بھی اس کے چہرے کی وہ رونق اور دلکشی ختم ہوگئی۔ جو شروع سے ہی نظر آتی تھی میں اور مہتاب ہر لمحہ اسے خوش رکھنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے مجھ سے نورین کی یہ محرومی اور اداسی نہ دیکھی جاتی تھی۔

میں اور مہتاب بھی نورین کے لیے دعائیں مانگتے مگر نہ جانے کیوں ہماری دعائیں قبول نہ ہو رہی تھیں......ادھر نورین نے مزید علاج کروانے اور کسی بھی قسم کی دوا کھانے سے انکار کر دیا تھا وہ اب زیادہ وقت نبیل کے ساتھ گزارنے لگی تھی مگر اس کی خاموشی اور اداسی ہمیں کاٹ کھانے کو دوڑ رہی تھی گھر کا ماحول نورین کے قہقہوں کو ترس گیا تھا۔

ایک سال مزید گزرا تو مہتاب نے ایک بچی کو جنم دیا ہماری خوشی تو یقینی تھی نورین کا اداس ہونا بھی یقینی تھا ہم نے بچی کی پیدائش پر جان بوجھ کر زیادہ خوشی نہ منائی کہ کہیں نورین زیادہ اداس نہ ہو جائے بظاہر تو وہ خوش ہی تھی مگر ہم جانتے تھے کہ اس کے اندر اولاد نہ ہونے کا دکھ لاوے کی مانند ابل رہا تھا۔

نورین کو دکھی دیکھ کر میں نے اور مہتاب نے یہ فیصلہ کر لیا کے ہم اس وقت تک مزید اولاد پیدا نہ کریں گے جب تک نورین ماں نہیں بن جاتی اس کے ساتھ ہی ہم نے فیصلہ کیا کہ میں اور نورین حج کا فریضہ ادا کرنے جائیں گے اور وہیں جا کر ربّ جلیل سے گڑگڑا کر معافی مانگیں گے اور اولاد کے لیے دعا مانگیں گے کیونکہ وہاں تو دعاؤں کو قبولیت کا درجہ ملتا ہے اور پھر خانہ کعبہ پر پہلی نظر پڑتے وقت جو دعا مانگی جائے وہ دعا قبول ہوتی ہے مجھے یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ ہمارا دامن مراد ضرور بھر دیں گے میں نے اپنے طور پر آئندہ سال حج کا ارادہ کر لیا.....نورین سے ابھی اس سلسلے میں بات نہیں ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

مہتاب کو ایک ہفتہ سے بخار تھا اس کی طبیعت کی خرابی کے پیش نظر میں نے ہر رات اس کے کمرے میں ٹھہرنا شروع کر دیا نورین سے میرا مہتاب کے کمرے میں مسلسل سونا برداشت نہ ہو سکا اور وہ پہلی بار مجھ سے الجھ پڑی۔

''جواد آپ معاہدے کی خلاف ورزی کر رہے ہیں جو مہتاب سے شادی کے بعد طے ہوا تھا آپ پورے ایک ہفتے سے میرے کمرے میں نہیں آئے یہ ناانصافی ہے جو میں برداشت نہیں کر سکتی''

نورین کے لہجے میں شکایت کا عنصر نمایاں تھا۔

میں نے اس کے اس انداز کو اہمیت نہ دی اور پیار بھرے لہجے میں کہا نورین مجھے اس بات کا احساس ہے ''مگر تمہیں تو معلوم ہے کہ نورین ہمارے گھر میں میرے اور تمہارے علاوہ اس کی تیمار داری کون کرے؟ اس مجبوری کی بنا پر میں رات کو مسلسل اس کے کمرے میں سو رہا ہوں مہتاب کی طبیعت بہتر ہو جائے تو میں تمہاری شکایت دور کر دوں گا''

نورین میری وضاحت سے مطمئن نہ ہوئی اور کہنے لگی۔

''صاف کیوں نہیں کہتے مجھ سے دل بھر گیا ہے''

''تم یہ کیسی باتیں کرنے لگی ہو میری جان تم سے بھر جائے یہ ناممکن سی بات ہے تم تو میری زندگی کی بہار ہو میرا پہلا پیار ہو چلو ایسا کرتے ہیں جب تک مہتاب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہو جاتی تم بھی اسی کمرے میں سویا کرو'' مگر نورین نہ مانی اور کہنے لگی۔

میں جان گئی ہوں اب تو میری حیثیت ایک پالتو پرندے کی سی ہوگئی ہے میں بانجھ جو ٹھہری مگر اس میں میرا کیا دوش ہے جو تم دونوں مجھے اس کی سزا دے رہے ہو میں یہ ناانصافی برداشت نہیں کر پاؤں گی نورین کے لہجے میں گلے ہی گلے تھے۔

نورین ! تمہیں کیا ہو گیا ہے ؟ تم کیوں احساس محرومی کا شکار ہو رہی ہو؟ تم تو ہم دونوں کے لیے قابل احترام ہو تم تو وفا اور قربانی کا مجسمہ ہو میں اور مہتاب تمہارے جذبے کی قدر کرتے ہیں اور تمہیں اپنے آپ سے بڑھ کر چاہتے ہیں۔

مگر میری کوئی دلیل نورین کو قائل نہ کر سکی شک اور نفرت کا ناگ اس کے من میں پلنے لگا...... نورین کے چہرے پر سختی آ گئی پتھریلا پن سا اتر آیا اور اس کے اندر محبت اور قربانی کا جذبہ سسک سسک کر دم توڑنے لگا۔

مہتاب نے بھی نورین کے اس روّیے کو محسوس کیا تو اس نے بھی احساس محرومی کم کرنے کی بہت کوشش کی اس کو یقین دلایا کہ ہم دونوں اس سے بے تحاشا محبت کرتے ہیں بلکہ ہماری محبت تو عقیدت کا روپ دھار چکی ہے نبیل اور مریم بھی تمہاری ہی اولاد ہیں جب تک ہم دونوں ایک جان اور دو قالب ہیں تو پھر اولاد کی بھی تفریق نہیں ہونی چاہیے میری اولاد تمہاری اولاد ہے میری ہر خوشی تمہاری ہے اور تمہارے دکھ اور درد میرے ہیں"...... مگر نورین پھر بھی مطمئن نہ ہوئی۔

نفرت کا جذبہ چڑھتا دریا ہوتا ہے جو اپنے پیچھے تباہی اور بربادی کا ایک نہ ختم ہونے والا صحرا چھوڑ جاتا ہے۔

اس روز پہلی بار نورین اپنی جان سے عزیز سہیلی اور اپنی سوکن مہتاب سے الجھ پڑی اس نے مہتاب کو جی بھر کر برا بھلا کہا کہ وہ اس کے حق پر ڈاکہ ڈال رہی ہے اس نے اس کا سکھ چین لوٹ لیا ہے مہتاب نے سب کچھ سنا اور سہہ لیا اور زبان سے ایک لفظ تک نہ نکالا اور نورین کی ہر بات برداشت کرتی رہی میں نے بڑی مشکل سے نورین کو علیحدہ کیا تو نورین مجھ پر برس پڑی اور کہنے لگی "جواد تم مجھے کس جرم کی سزا دے رہے ہو؟ میں نے تو نیکی کی تھی مگر شاید وہی میری غلطی تھی میں نے مہتاب سے تمہاری شادی کرائی مگر تم دونوں نے میری وفا کی قدر ہی نہیں کی اور میرے ارمانوں کا خون کر ڈالا میں جان گئی ہوں تمہیں مجھ سے زیادہ مہتاب سے محبت ہے اس لیے کہ وہ مجھ سے زیادہ خوب صورت ہے تمہاری شادی کرا دینے کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں تھا کہ تم اپنی ہی دنیا میں گم ہو کر مجھے بھول جاؤ، جواد! میں یہ زیادتی برداشت نہ کر پاؤں گی۔"

نورین بہت دیر تک بولتی رہی میں جتنا ہی اسے سمجھانے کی کوشش کرتا وہ اور بھی بھڑک اٹھتی۔ اس لیے میں نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ لیکن میں اور مہتاب دونوں ہی نورین کے اس روّیے سے پریشان ہو گئے گھریلو ماحول بھی تلخ سا ہو گیا اب نورین اپنی جان سے عزیز سہیلی کی دشمن بن گئی وہ سارا دن مہتاب سے لڑتی رہتی مگر آفرین ہے مہتاب پر کہ وہ خاموشی سے نورین کی بات سن لیتی اور کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لاتی۔

نورین کو سمجھانا اب ہمارے بس میں ہی نہ رہا تھا ہم جب بھی اسے یہ احساس دلاتے کہ ہمیں اس سے نفرت نہیں بلکہ ہم اس سے پہلے سے بڑھ کے محبت کرتے ہیں تو وہ اتنی ہی بگڑ جاتی اور پورے گھر کو سر پر اٹھا لیتی ...... میں ایسی ہی باتوں سے ڈرتا تھا اور اسی بنا پر دوسری شادی نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اب تو یہ سب کچھ سہنا پڑ گیا تھا میں دن رات پریشان سا رہنے لگا نورین جو میری پہلی محبت تھی اس کی حالت پر میرا دل دکھتا تھا میری چاہت میں تو کوئی کمی نہ آئی تھی مگر نورین سچائی قبول کرنے پر تیار نہ تھی۔

☆......☆......☆

اس رات میں نورین کے کمرے میں تھا اور بڑے پیار سے اسے سمجھا رہا تھا کہ وہ شک اور نفرت کرنا چھوڑ دے......

"جواد! تم مجھے کتنا چاہتے ہو؟" اس نے اچانک سوال کیا۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے نورین! میں تو تمہیں اپنے آپ سے بھی بڑھ کر چاہتا ہوں

"تو پھر میری ایک بات مانو...... مہتاب کو طلاق دے دو۔

نورین کے الفاظ برچھیوں کی مانند میرے دل دماغ میں اتر گئے مجھے پہلی بار نورین پر غصہ آیا اور میں چیخ اٹھا ۔نورین تم ہوش میں تو ہو نا......! یہ وہی مہتاب ہے جسے تم خود میری دلہن بنا کر لائی تھی تمہارے کہنے پر ہی میں نے

مہتاب سے شادی کی تھی اور اب تم خود ہی اسے طلاق دینے کا کہہ رہی ہو میں کسی کو بھی طلاق نہیں دوں گا نہ مہتاب کو اور نہ ہی تمہیں میں زمانے کی نظروں میں تماشا نہیں بننا چاہتا...... مہتاب نے تو کبھی شکوہ نہیں کیا مگر تم نے تو اس گھر کا سکھ اور چین برباد کر ڈالا ہے تمہیں اللہ کا واسطہ ہے اب اس آگ کو مزید نہ بھڑکاؤ میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتا۔!!

نورین کو مجھ سے شاید ایسی امید نہ تھی میرے انکار نے اسے اور بھی بھڑکا دیا وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی اور کہنے لگی اب میں بھی اپنی مرضی کروں گی...... اب اس گھر میں...... میں رہوں گی یا مہتاب رہے گی۔

اس دن سے گھر کا ماحول اور بھی خراب ہو گیا۔ قہقہوں کی جگہ سناٹے نے لے لی نورین کا رویہ دن بہ دن سخت ہوتا گیا اور میں چکی کے دو پاٹوں میں پسنے لگا ......

☆......☆......☆

کئی دنوں سے گھر کی فضا میں ایک سناٹا طاری تھا لگتا تھا کوئی طوفان آنے والا ہے نورین کھانا بھی اپنے کمرے میں کھانے لگی اور اس رات بھی میں اسی کے کمرے میں سویا تھا رات بارہ بجے کا وقت ہوگا کہ کہیں سے گولیاں چلنے کی آواز نے مجھے جگا ڈالا میں بدحواس سا ہو کر اٹھ بیٹھا۔

نورین بستر پر موجود نہ تھی...... میں مہتاب کے کمرے کی طرف بھاگا کیوں کہ آواز اسی طرف سے آئی تھی اس کمرے میں داخل ہوا تو اس کمرے کی لائٹ جل رہی تھی اور مہتاب اپنے ہی بیڈ پر خون میں لت پت پڑی تھی نبیل اور مریم رو رہے تھے قریب ہی نورین کھڑی تھی اس کے ہاتھوں میں میرا ہی ریوالور تھا

''نورین تم نے یہ کیا کر ڈالا۔ کیوں کیا تم نے یہ سب کچھ'' میں غصے سے دھاڑا تو نورین نے میری طرف دیکھا اور بولی۔

ہاں میں نے اسے مار ڈالا ہے۔ میں اپنی محبت کی تقسیم برداشت نہ کر سکتی تھی اس لیے کہ تم پر صرف اور صرف میرا حق ہے۔

یہ کہہ کر وہ میری جانب بڑھی تو میں پیچھے ہٹ گیا اور کہا۔

''خبردار! میری طرف مت آنا نورین تم قاتلہ ہو میں تمہیں قانون کے حوالے کروں گا۔''

میں نے جلدی سے باہر نکل کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور پولیس کو فون کیا۔ جب پولیس پہنچی اور انھوں نے نورین کو گرفتار کیا تو وہ اس وقت بے ہنگم قہقہے لگا رہی تھی شاید وہ دماغی توازن کھو بیٹھی تھی مگر پھر بھی اسے تھانے لے جایا گیا بعد میں معلوم ہوا کہ وہ واقعی میں پاگل ہو گئی ہے لہٰذا اسے پاگل خانے بھیج دیا گیا۔

مگر میرا گھر تو اجڑ گیا...... مہتاب اور نورین دونوں ہی میری زندگی سے نکل گئی تھیں اور میرے پاس صرف نبیل اور مریم رہ گئے...... واہ رے عورت تو نام ہے ست رنگی کہکشاں کا۔ چپکے تو سونا اور بپھر جائے تو ناگن کا روپ دھار لیتی ہے...... اسی عورت نے میرا ہنستا بستا گھر اجاڑ ڈالا میرا تو کوئی قصور نہ تھا مگر پھر بھی سزا میں ہی جھیل رہا ہوں۔

☆......☆......☆

سات سال گزر گئے ہیں اس حادثہ کو نورین ابھی تک پاگل خانے میں ہے میں اس سے ملنے نہیں جاتا کیوں کہ مجھے اب اس سے نفرت ہے اسی نے تو میرے گلشن کو اجاڑا ہے مہتاب کی یاد آتی ہے تو میری آنکھیں چھلک اٹھتی ہیں کہ وہ ایک صابر عورت تھی اس نے دوستی اور شوہر پرستی کا صحیح معنوں میں حق ادا کیا۔

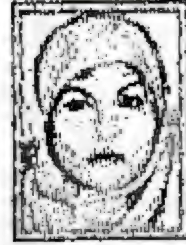
ہر طرف سے مایوس اور تنہا ہو کر میں نے اپنے آبائی گھر کا رخ کیا وہاں جا کر پتہ چلا کہ ابا جان اب اس دنیا میں نہیں رہے اور تمام کاروبار اور جائیداد سوتیلی ماں اور بھائیوں کے قبضہ میں ہیں ان لوگوں نے مجھے پہچاننے سے ہی انکار کر دیا تو میں واپس لوٹ آیا۔

اب بھی مجھے دنیا کی ہر چیز اور ہر آسائش میسر ہے مگر چین نہیں ہے اور اب میں نبیل اور مریم کے لیے جی رہا ہوں میں نے انھیں ماں باپ دونوں کا پیار دے رکھا ہے ...... میرے دوست احباب مجھے شادی کے لیے کہتے ہیں مگر میں سوتیلی ماں اپنی اولاد پر مسلط نہیں کروں گا ...... ڈرتا ہوں کہیں پھر کسی نورین سے واسطہ نہ پڑ جائے اور بچا کچھا سکھ چین بھی جاتا رہے

☆☆......☆☆

دوسری سچ بیانی

بابل کی پری



جمیل میتلو

انسانی سفاکی کی ایک داستان، کراچی سے

اختر اور آصف دونوں بچپن کے دوست، پڑوسی اور کلاس فیلو تھے۔ ایک ہی محلے میں رہنے کی وجہ سے بڑوں میں بھی محبت اور بھائی چارہ تھا۔ ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں بھی ہر حال میں شریک ہوتے تھے اور ہر اونچ نیچ میں ایک دوسرے کا خیال رکھتے تھے۔ اُن میں خونی رشتوں سے زیادہ محبت تھی۔ اختر کے والدین اور آپا، آصف کو بیٹے اور بھائی جیسا سمجھتے تھے۔ جب بھی وہ اختر کے گھر جاتا، آپا بہت پیار دیتیں۔ آصف بھی اکلوتا ہونے کی وجہ سے زیادہ تر اختر کے ساتھ ہی ہوتا۔ اسی طرح دونوں نے اسکول کے بعد ساتھ ہی گریجویشن مکمل کرلیا۔ والدین بہت خوش ہوئے مٹھائیاں بانٹی گئیں۔ اب نوکری کی تلاش شروع ہوگئی۔

''آج سے دو دہائیوں پہلے اتنی نفسانفسی اور بے روزگاری نہیں تھی۔ اس لیے اختر کو گیس کمپنی میں اچھی نوکری مل گئی اور آصف محکمۂ پولیس میں برسرِ روزگار ہوگیا۔ اب گھر والوں کو ان کے سروں پر سہرے سجانے کی تمنا جاگی۔ اب جب بھی وہ دوسرے شہروں سے مہینے، دوسرے مہینے گھر آتے تو سب کے لیے اُن کی شادی یہ خاص موضوع ہوتا۔

آپا کی منگنی پہلے ہی ہوچکی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ جلد از جلد اختر کی بھی شادی ہوجائے۔ خاندان میں اور باہر لڑکیاں دیکھی جارہی تھیں۔ اختر بہت خوبصورت رنگ و روپ کا مالک تھا۔ اکثر کہتا کہ لڑکی میرے جیسی ہونی چاہیے۔ آپا مذاق میں کہتیں۔

''مجھے تو سانولی لڑکیاں پسند ہیں۔'' تو اختر کہتا۔

''ہاں، ہاں...... بہنیں تو اپنے کالے کلوٹے بھائیوں کے لیے بھی چاند کا ٹکڑا ڈھونڈتی ہیں اور آپ ہیں کہ......'' وہ بھی جھوٹ موٹ کا ناراض ہوتا۔ آپا اور آصف اُس کے اِس انداز پر خوب ہنستے۔

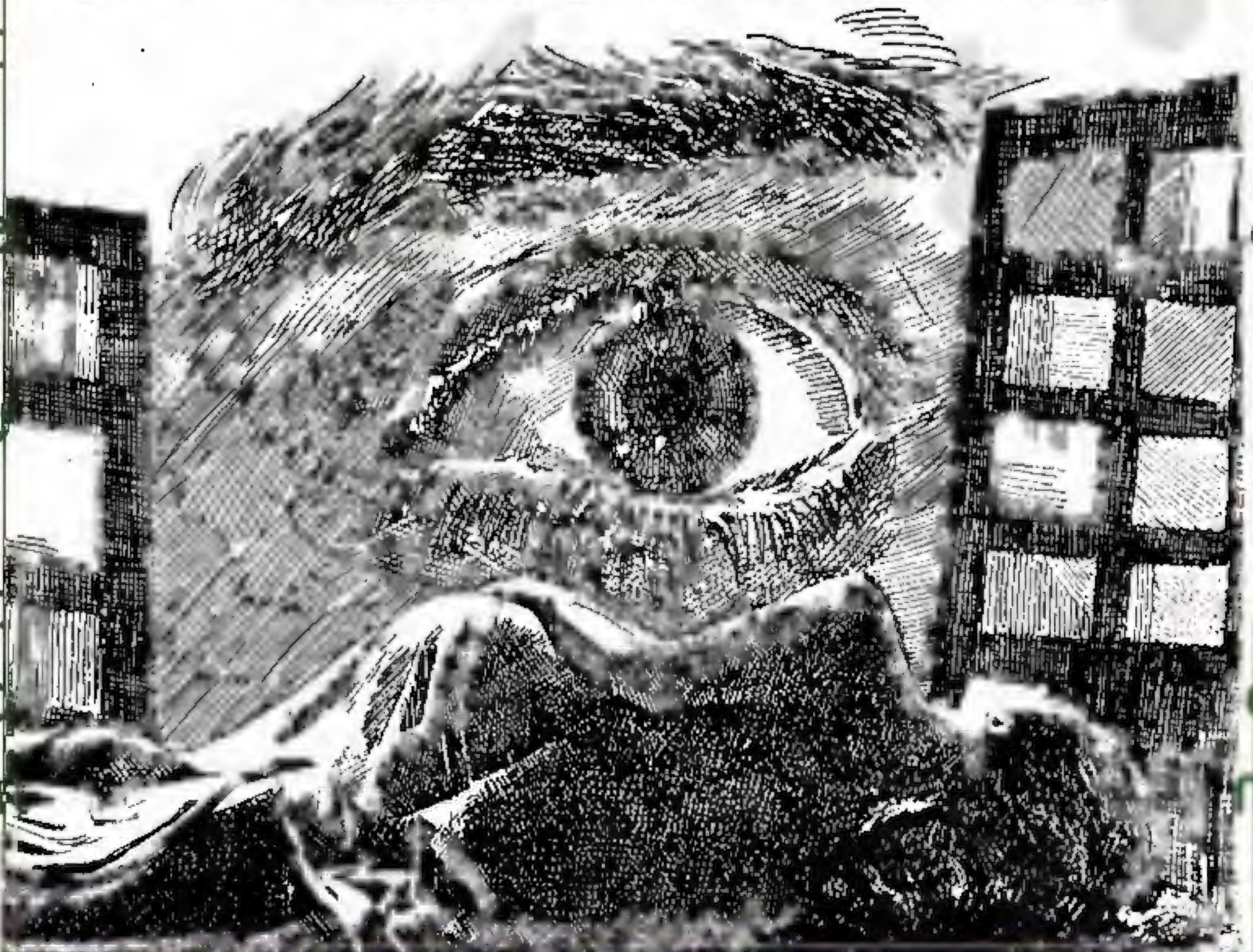
آپا دونوں کے لیے خوب اہتمام کرتیں۔ اچھے اچھے کھانے بنا بنا کر کھلاتیں، اختر خوب فرمائشیں کرتا اور اکثر دونوں گھروں میں دعوتوں کا سلسلہ چلتا رہتا۔

دونوں جب بھی گھر آتے سب کے لیے تحفے تحائف لاتے۔ زندگی میں چین ہی چین تھا۔ اُداسی تب چھانے لگی جب آپا کی آنے والی عید کے بعد شادی رکھی گئی۔ تب جیسے سب کو اُداسی کا شدید احساس ہونے لگا۔ لیکن بیٹی کو اپنے گھر تو جانا ہی ہوتا ہے۔

☆......☆......☆

گھر بھر میں شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ جمیل

بھائی اختر کے کزن اور بہنوئی تھے۔ شادی ہوئی سب نے دعاؤں کے ہمراہ بخیر وخوبی آپا کو رخصت کیا۔
شادی کے بعد جب وہ جمیل بھائی کے ساتھ آئیں تو بہت خوش تھیں کیونکہ شادی میں آنے والے مہمانوں میں سے ایک مدیحہ بھی تھی جو کہ بی اے آنرز کرنے کے بعد فارغ تھی۔ اپنی امی کے ساتھ اندرون سندھ سے شادی میں شرکت کرنے آئی تھی۔
اس کی موہنی سی صورت سب کو پسند آئی تھی۔ جب اختر سے آپا نے رائے پوچھی تو...... اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے مسکرا کر شرارت سے سوچنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔
''ہوں اچھی...... تو ہے۔''
''آپ کو پسند ہے تو ٹھیک ہے۔'' آپا نے اس کے سر پر پیار سے چپت لگائی۔
جب تک مدیحہ مہمان بن کر رہی اختر کی آنکھوں میں جگنو...... جگمگاتے رہے۔ امی نے بھی مدیحہ کی والدہ سے بات کرلی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ مدیحہ کے ابا سے صلاح مشورے کے بعد وہ فون پر انہیں آگاہ کردیں گی۔
شادی کے ہنگامے ختم ہوئے۔ اختر اور آصف اپنی اپنی جاب پر روانہ ہوئے۔ اور پھر جیسے ہی مدیحہ کے والدین نے رضامندی ظاہر کی چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق شادی کردی گئی۔ مدیحہ بہت پیاری اور سلیقہ مند ثابت ہوئی۔ اختر بہت مطمئن تھا۔ اور گھر والے بھی مدیحہ کے گرویدہ ہوچکے تھے۔ سوات، اسلام آباد اور مری میں ہنی مون ٹرپ گزارنے کے بعد اب وہ گھر آچکے تھے۔ ابھی اختر کی ایک ماہ کی چھٹی باقی تھی۔ اسی دوران آصف کی بھی شادی طے پائی۔
آصف کی شادی میں اختر اور آپا نے خوب حصہ لیا۔ آصف کو بھائی بہن کی کمی محسوس ہونے نہیں دی۔'' آپا نے گھر سنبھالا تو اختر نے سارے باہر کے کام کیے، اس طرح آصف بھی صاحب بیگم ہوگئے۔
ہنسی خوشی زندگی اسی شاہراہ پر گامزن ہوگئی۔ وقت پر لگا کر اڑنے لگا۔ اسی وقتی اڑان کے دوران آپا کے یہاں جڑواں بیٹے پیدا ہوئے اور آصف کے گھر بھی بیٹا



ہوا..... لیکن دو سال گزرنے کے بعد مدیحہ کی گود خالی تھی۔

اختر اور مدیحہ کی محبت والہانہ تھی اس لیے اس میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

اسی طرح تیسرا سال بھی سرک گیا۔ اب مدیحہ کو گھر کا سونا آنگن کھلنے لگا۔ لیکن اختر نے کبھی مدیحہ کو یہ احساس نہیں دلایا۔

☆......☆......☆

آپا کے یہاں بیٹی ہوئی تھی۔ سب چھٹی پر جمع تھے اور آپا کی چھوٹی سی گل گوتھنی سی بیٹی سب کی نگاہوں کا مرکز تھی۔ اختر اور آپا کے دونوں بیٹے بڑے والہانہ انداز میں بچی کو دیکھ رہے تھے آپا کے چہرے پر ممتا کی چمک تھی۔ وہ اطمینان سے لیٹی سب سے مبارک باد وصول کر رہی تھی۔ اور ایسے میں جمیل بھائی نے مٹھائی کھاتے ہوئے کہا۔

''لو بھائی شہزادے!'' (وہ اختر کو شہزادہ ہی کہتے تھے) ''ہماری فیملی تو اب مکمل ہوئی۔ تم کب خوش خبری سنا رہے ہو۔''

''دولہا بھائی..... آپ زیادہ مت اترایئے۔ ہم بھی آپ سے اسی سال داد وصول کریں گے۔'' اختر نے مذاق میں چھاتی ٹھونکتے ہوئے کہا۔

''ضرور..... ضرور.....'' جمیل میاں بھی ان کی ادا پر ہنسنے لگے۔

رات کو مدیحہ نے اختر سے کہا۔

''خدا نا معلوم کب ہمارے گھر اولاد کی خوشی دے گا۔''

''ارے بھئی خدا سے شکوے نہ کرو، شکر کرو۔ جب اس نے اتنی پیاری بیوی دی ہے، تو اولاد بھی انشاء اللہ ضرور دے گا۔''

اس نے مدیحہ کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا اور ''آمین'' کہتے ہوئے مدیحہ نے آنکھیں موند لیں۔

☆......☆......☆

آخر کار دعاؤں اور منتوں مرادوں کے بعد اللہ سائیں مہربان ہو ہی گیا۔ مدیحہ اُمید سے ہوگئی۔ بس اب تو اس پل کا سب کو پل پل کا انتظار تھا کہ گھر میں بچے کی کلکاریاں گونجیں۔ سب بہت خوش تھے پھر وہ آخر کار خوش نصیب دن آ ہی گیا۔ جب اختر ایک چاند سی بچی کا باپ بن گیا۔ ماں باپ کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ دھوم دھام سے عقیقہ اور چھٹی کی گئی، خوب خیرات ہوئی اور مٹھائیاں بانٹی گئیں۔

اختر اور مدیحہ نے ڈھیروں مبارکباد بھی وصول کیں۔ اولاد تو ویسے ہی اللہ کا تحفہ ہوتی ہے اور پھر رحمت کی صورت میں تو ایک انعام تھی۔

آپا اپنے بچوں کے ساتھ آئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اس خوشی کے موقع پر بھائی اور بھابی کو خوبصورت تحفے دیے۔

اختر بار بار بچے کے گالوں کو چھو رہا تھا اور مسرت اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔

☆......☆......☆

ننھی پری سب کی آنکھ کا تارا تھی۔ اس کے وجود سے گھر میں رونق تھی۔ پری اس کا پیار کا نام تھا جو اختر نے اُس کی معصومیت اور خوبصورتی پر دیا تھا۔ سب باپ کو بابا ابو کہتے ہیں لیکن وہ اپنے بابا کو بابل کہتی تھی اور اس کے بابل کہنے پر اختر نثار نثار جاتا تھا۔ وقت پر لگا کر اُڑ رہا تھا۔ پری کی تیسری سالگرہ پر شہزاد پیدا ہوا تو سالگرہ کی خوشی دوبالا ہوگئی۔

''یہ کون ہے بابل۔'' پری نے اختر سے سوال کیا۔

''یہ تمہارا بھائی ہے۔'' اختر نے دُلار سے کہا۔

''یہ میری برتھ ڈے پر آیا ہے بابل۔'' پری نے معصوم سا سوال کیا تو اس بات پر سب مسکرانے لگے۔

''ہاں، ہاں..... بابل کی جان۔'' اختر نے اُسے بانہوں میں سمیٹتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

ابھی شہزاد چار ماہ کا تھا کہ مدیحہ کو کمزوری محسوس ہونے لگی اور وہ تیزی سے خون کی کمی کا شکار ہوتی چلی گئی۔ دبلی پتلی تو ویسے ہی تھی لیکن بخار ہر وقت رہتا تھا۔ پھر اُس کے سینے پر پھنسی سی بن گئی۔

اختر کا تبادلہ نواب شاہ ہو چکا تھا۔ وہ پندرہ دن بعد آتا تھا۔ اب کی بار جب وہ آیا تو مدیحہ کو دیکھ کر وہ فکر مند ہو گیا اور چھٹی کر کے اسے کراچی لے آیا۔ معائنے کے

بعد ڈاکٹروں نے بریسٹ کینسر کی تشخیص کی وہ بھی آخری اسٹیج پر۔

اختر پر تو جیسے بجلی گر پڑی تھی۔ سب دم بخود تھے۔

اندرونِ سندھ رہائش کی وجہ سے مرض کی دیر سے تشخیص ہونے کے باعث اب یہ بہت بڑھ چکا تھا۔ اب اس کا آخری علاج لیزر شعاعوں سے کیا گیا لیکن مرض چونکہ اتنا بڑھ چکا تھا کہ اب کوئی آسرا باقی نہ رہا تھا۔

اور اس طرح پانچ ماہ میں مدیحہ برف کی طرح گھل کر ختم ہوگئی۔

میں جب مدیحہ کو دیکھنے گئی تو وہ ہچکیاں لے رہی تھی۔ سب قرآن پاک پڑھ رہے تھے۔ اختر بے حال تھا۔ آپا اور اماں کی آنکھیں رو رو کر لال ہو چکی تھیں پری...... اور شہزاد کو خالائیں لے گئی تھیں۔ کیونکہ پری کے سوالات کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ ماں کے پاس سے ہٹی نہ تھی۔

میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ صرف ایک سال میں مدیحہ کو کینسر نے کیسے ختم کر دیا تھا کہ وہ پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ بس اسی رات کی وہ مہمان تھی، صبح تک وہ سفرِ آخرت پر جا چکی تھی۔

پری کی چیخیں...... شہزاد کا رونا سب بیکار تھا۔ وہ سب سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ ہنس مکھ سا اختر گم صم ہو کر رہ گیا تھا۔

''یار گھر کے ساتھ میرا گھر بھی خالی ہو گیا ہے۔ جی چاہتا ہے میں بھی مدیحہ کے پاس چلا جاؤں۔'' وہ مایوسی سے آصف سے کہہ رہا تھا۔ آصف نے اس کی طرف دیکھا۔ اُترا ہوا چہرہ، بکھرے بال، خوبرو سا اختر سخت ڈپریشن کا شکار تھا۔

''اگر مجھے بروقت بیماری کا پتا چل جاتا تو میں اسے اپنے ساتھ لے جا کر علاج کرواتا۔ لیکن...... میں کچھ نہ کر سکا۔'' وہ پھر رونے لگا۔

اختر! یار بھابی کا جانا اسی طرح لکھا تھا۔ ان کی اتنی ہی زندگی تھی۔'' آصف نے اُسے گلے لگا کر تسلی دی۔ اس کے لیے کوئی کیا کر سکتا تھا۔ اسی دوران آصف کی نظر صحن میں بیٹھی ہوئی پری پر پڑی۔ وہ آپا، فاکیہ اور دیگر خواتین کے ساتھ بیٹھی تھی اور حسرت سے باپ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''وہ دیکھو! پری کو دیکھو۔'' آصف نے اختر کا دھیان بٹا دیا۔ اختر نے پری کو اشارے سے پاس بلا لیا۔

''تم دور کیوں ہو جانِ بابل۔'' اختر نے پری کو گود میں سموتے ہوئے پوچھا۔

''وہ پھوپو نے کہا تھا کہ بابل کو مت پریشان کرنا۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے میں ڈر گئی تھی کہ...... آپ بھی مجھے چھوڑ کر مما کے پاس نہ چلے جائیں۔ اللہ میاں کے پاس۔'' اور اختر نے تڑپ کے پری کو گلے لگا لیا۔

☆......☆......☆

چاہے مرنے والا کتنا ہی عزیز ہو۔ انسان کو اُسے بھلانے کے لیے بہلنا ہی پڑتا ہے۔ بس اختر بھی اپنے بچوں کے ساتھ بہلنے لگا۔ اور پھر چالیسویں کے بعد اماں اور بچوں کے ساتھ نواب شاہ چلا گیا۔ وہیں اُس کی جاب بھی تھی۔ اب وہ پری کو اسکول چھوڑنے کے بعد دفتر جاتا اور چھٹی کے وقت پری کو گھر چھوڑ کر لنچ کر کے پھر آفس چلا جاتا۔ پانچ بجے تک بچے آپا اور دادی کے پاس رہتے پھر رات کو پری اسکول کی ساری باتیں اپنے بابل کے سینے پر سر رکھ کر سناتے ہوئے سو جاتی۔

''دادی ننھے شہزاد اور پری نے ایک بڑے کمرے کو بیڈ روم بنا لیا تھا۔ خبریں سننے کے بعد 9 بجے سب سونے کے لیے بیڈ روم میں آتے۔

ہر دوسرے تیسرے ویک اینڈ پر آپا بچوں سمیت یا آصف اپنے دونوں بچوں اور بیوی کے ساتھ آتا یا پھر اختر چلا جاتا اسی طرح زندگی چل رہی تھی کہ پھر اماں بھی ایک رات راہیِ عدم ہو گئیں۔

وہ ویک اینڈ تھا۔ سب آئے ہوئے تھے۔ آج اماں اور آپا بچوں اور ننھے شہزاد کے ساتھ دوسرے بیڈ روم میں تھیں کہ صبح فجر کی اذان کے بعد اماں کو آپا نے نماز کے لیے آواز دی۔ اور خود نماز ادا کرنے کے بعد آئیں تو اماں ویسے ہی لیٹی ہوئی تھیں۔ تہجد پڑھنے والی اماں کے چہرے پر نور ہی نور تھا اور وہ کب کی اس دنیا سے جا چکی تھیں۔

سب اپنے کمروں سے نکل کر اماں کے گرد جمع چکے

تھے۔

"یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے آپا۔" اختر سسک رہا تھا۔

"بس میرے بھائی یہاں کس نے رہنا ہے۔ موت کا دن سب کے لیے مقرر ہے۔"

پھر آپا دو سالہ شہزاد کو اپنے ساتھ لے گئیں کیونکہ آیا کے حوالے دن بھر بچہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کوئی اپنا ضرور دیکھ بھال کے لیے ہونا چاہیے۔

اختر نے آیا کا انتظام آپا کے گھر کر دیا تھا۔ شہزاد کے لیے۔ جمیل بھائی خود شہزاد کو لے کر گئے۔ اب ساری توجہ پری پر تھی۔ اختر گھر میں پری کے سب کام خود کرتا۔ وہ شرارت کرتی تو وہ ہنستا ورنہ ایک سنجیدگی چھا گئی تھی ہنس مکھ سے اختر پر۔ اب اس کی جان پری میں تھی۔ اگر وہ ذرا سا بھی پریشان ہوتی تو اختر تڑپ تڑپ جاتا۔

☆......☆......☆

پری نے کے جی ٹو میں فرسٹ پوزیشن لی تھی اور پری کی سالگرہ بھی اگلے ہفتے آنے والی تھی، اسی بہانے اختر نے آنے والے ویک اینڈ پر ایک چھوٹی سی پارٹی رکھنے کا سوچا تھا۔ اور فون پر سب کو بچوں کے ساتھ آنے کا بھی کہہ دیا تھا تاکہ سالگرہ میں خوب ہلہ گلہ ہو۔

"بابل مجھے نا، نیٹ والی جو گڑیا تھی نا وہ چاہیے۔ اور چابی اور سیل والا جھولا بھی جس میں باربی ڈول بیٹھی ہو اور شہزاد بھیا کے کھلونے، ڈریس اور میرے لیے پنک ڈریس، مہندی اور چوڑیاں، کلپ، بندے......" وہ معصومیت سے بولی۔

"ہاں ہاں بابل یہ سب تو بھول گیا تھا۔" اختر نے کہا۔ دوسرے دن پری نے اپنے بابل کے ساتھ مل کر سب کے لیے تحفے خریدے۔

☆......☆......☆

سالگرہ والے دن پری بہت خوش تھی۔ ویسے تو سارے ہی بچے بڑے بچوں کی خوشی میں خوش تھے۔ لیکن اختر کو اپنے بچوں کی جوڑی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ وہ نظروں ہی نظروں میں ان کی بلائیں لے رہا تھا۔ ایک طرف سے شہزاد نے انگلی پکڑی ہوئی تھی دوسری طرف سے پری نے، ایسے میں اختر کو مدیحہ کی کمی بہت محسوس ہو رہی تھی۔ اختر کی آنکھیں بھیگنے لگیں تو جلدی سے اس نے خود کو سنبھالا اور پھر تالیوں اور میوزک کے ہلکے ہلکے شور میں ہیپی برتھ ڈے...... کہتے ہوئے کیک کاٹا گیا۔

آصف نے پری کو پیار کرتے ہوئے ڈھیروں دعائیں دیں۔ آپا نے بھائی نے بن ماں کی بچی کو بہت پیار دیا۔ سب بچوں اور دوستوں نے خوب تحائف دیے اور اس پُر مسرت ماحول میں کھانا بھی کھایا گیا۔

رات گئے بچوں نے موج مستیاں کیں۔

دوسرے دن اتوار تھا سب دیر سے اٹھے پھر لنچ ٹائم پر ناشتہ کر کے سب اپنے اپنے گھر روانہ ہو گئے۔

دوپہر کو تنہا گھر میں گھومتے پھرتے پری نے کہا۔

"بابل...... پھوپو کے ساتھ شہزاد بھی چلا گیا۔ کیسا اکیلا گھر ہو گیا ہے۔"

"ارے جانِ بابل۔" اختر نے اُسے پیار کرتے ہوئے کہا۔ "جب وہ اسکول جانے لگے گا نا تب ہم اُسے لے آئیں گے۔ پھر وہ تمہارے ساتھ اسکول جائے گا۔ اسکول سے آنے کے بعد تم دونوں کھیلا کرنا۔ ٹھیک ہے نا۔"

"ٹھیک ہے۔" پری نے گردن ہلائی۔

"آؤ ہم تحفے دیکھتے ہیں۔"

"ہاں ہاں۔" پری بہل گئی۔ شام تک وہ اسی میں مصروف رہی۔

شام کو وہ لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے بہار کا موسم تھا۔ ڈال ڈال پھول کھلے ہوئے تھے، معطر ہوا میں چل رہی تھیں۔ بہت دلکش موسم تھا۔ تتلیاں اُڑ رہی تھیں۔

"بابل وہ جو پھوپو نے بولنے والی گڑیا دی ہے نا اس کے لیے میں ان سفید کلیوں کا ہار بناؤں گی۔ بہت پیاری لگے گی نا وہ پھر۔"

"ہاں ہاں بہت پیاری لگے گی۔" اختر نے چائے کا سپ لیتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

دوسرے دن حسبِ معمول پری اور اختر ساتھ ہی آئے اور لنچ کرنے کے بعد تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔ پری بھی بیڈ پر کھلونوں سے کھیل رہی تھی اور باتیں بھی جاری تھیں۔ اسی دوران اختر کی آنکھ لگ

گئی۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد اختر کی نیند ٹوٹی تو دیکھا کہ پری وہاں موجود نہیں تھی۔ بیڈ پر تازہ کلیوں اور پھولوں کی چھوٹی سی پلاسٹک کی ٹوکری بھری رکھی تھی، کچھ کلیاں دروازے کے پاس بکھری پڑی تھیں اور بیڈ روم کا دروازہ بھی کھلا تھا۔ اختر کو عجیب سی خاموشی کا احساس ہوا۔ وہ جلدی سے اُٹھا اور پری کو پکارنے لگا۔ اور پری تو نہیں آئی مگر مائی خیرو ہانپتی ہوئی آئی۔ اسے صبح سے ہلکا ہلکا بخار تھا۔ اور تیزی سے چلنے کی وجہ سے وہ ہانپ رہی تھی۔

''پری کہاں ہے؟'' اختر نے پوچھا۔

''ہم کو نہیں پتا ہم تو آپ کی دی ہوئی گولی لے کر سویا تھا۔ ہم کو تو بالکل خبر نہیں تھی کہ کہاں ہے۔ واش روم میں تو ہوگا۔ ابھی دیکھتی ہوں۔''

لیکن سارے گھر میں پری کا پتا نہیں تھا۔ باہر لان میں پری کی چپل پڑی تھی۔ اختر نے جلدی سے آصف کو فون کیا۔ اور وہ پلک جھپکتے میں پہنچ گیا۔ اسی اثنا میں اختر نے محلے کے ہر گھر کا دروازہ بجا کر پری کا پوچھا۔ لیکن پری ہوتی تو ملتی۔

صبح ہوگئی پری کو ہر جگہ ڈھونڈ لیا لیکن ننھی پری کا کہیں نام و نشان نہ ملا۔ ریڈیو، ٹی وی، اخبار میں اشتہار فوٹو سمیت دیا گیا۔

ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اختر کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ آصف کا بس چلتا تو کسی بوتل کے جن کی طرح پری کو اختر کے سامنے پیش کر دیتا۔ سارے ڈسٹرکٹ کی پولیس حرکت میں تھی۔

یہ رات اختر کے گھر والوں کے لیے بڑی ہیبت ناک اور سنسان تھی۔ سب فکر مند اور پریشان تھے۔ اختر جیسے نیم بے ہوش تھا۔ ایک چپ تھی اس کے ہونٹوں پر، وہ جھرجھری لے کر اٹھا اور آصف کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا۔

''یار آصف تم تو پولیس میں ہو۔'' اور آنسو اس کے گالوں پر پھسلنے لگے۔ اس کا دل کٹنے لگا۔

''انشاء اللہ پری مل جائے گی۔'' آصف اُسے تسلی دینے لگا۔ جو اُسے کھوکھلی سی لگ رہی تھی۔ اتنے میں اذان کی آواز گونجنے لگی۔

اس نے اختر سے کہا۔ ''آؤ نماز کے لیے چلتے ہیں۔'' اختر کسی معمول کی طرح اُس کے پیچھے ہولیا۔ اختر کے دروازے کے تین زینے سے بنے ہوئے تھے پھر ا کیاری تھی جس میں چند درخت اور پھول پودے لگے ہوئے تھے۔ جیسے ہی آصف نے آخری زینے پر پیر رکھا کوئی چیز پیر سے ٹکرائی۔ آصف نے ٹارچ کی روشنی اُس پر ڈالی تو دل دھک سے رہ گیا۔ کیونکہ یہ ایک چھوٹی بوری تھی جس کا منہ آدھ کھلا تھا اور اس میں سے سر کے بال اور چہرہ صاف نظر آ گیا۔ وہ چہرہ پری کے سوا کسی کا نہ تھا۔

ایک دھپ سی آواز کے ساتھ ہی کوئی آواز نکالے بغیر اختر بے ہوش ہو کر نیچے زمین پر گر گیا۔ آصف نے فوراً ایمبولینس اور پولیس کو فون کیا۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق پری کو زیادتی کے بعد گلا گھونٹ کر مارا گیا تھا۔ ملزم نامعلوم تھا اختر تو خود آئی سی یو میں داخل تھا۔

پری کی تدفین کے بعد آتے ہوئے آصف کو لگ رہا تھا کہ پری کا دکھ گھر والوں محلے والوں کے سوا گلی کے درختوں، پھولوں، پودوں کو بھی ہوا اور سب جیسے سر جھکائے گم سم کھڑے تھے۔ عجیب سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سارے محلے میں سورج بھی جیسے سوا نیزے پر آ گیا تھا۔ لیکن وہ ظالم جو چھوٹے چھوٹے معصوموں پر ظلم کرتے ہیں وہ اپنے بچوں کو بھول جاتے ہیں اگر یہی ظلم اُن کے ساتھ ہو تو...... خدا بھی حساب چھوڑتا نہیں ہے دیر بدیر وہ انصاف ضرور کرتا ہے۔

آصف یہ سوچتا ہوا گھر میں داخل ہوا، جہاں ہر کوئی سوگوار تھا، دکھی تھا، وہ دکھی دل کے ساتھ ان میں شامل ہو گیا۔

وقت کا کام تو گزرنا ہے یہ تکلیف گزرتے گزرتے چار ماہ ہو گئے۔ پری کے مجرم کو نہ ملنا تھا نہ ملا۔ اختر گھر آ چکا تھا لیکن اب وہ پہلے والا اختر نہیں تھا۔ گم صم چپ خاموش بس ایک جملہ اکثر بولتا ''پری آ گئی۔'' اور سب رونے جیسے ہو جاتے۔ آپا گالوں سے آنسو پونچھتے نظر آتیں۔ انسان کا خیال ہی تو ہے جو اُمیدیں اُنگلیں جگاتا ہے۔ اور اس سانحے کے بعد اختر کا خیال تو زمین آسمان کے درمیان ٹھہر گیا تھا۔ وہ خالی نظروں سے سب کو دیکھتا رہتا اگر کھانا دیتے تو کھا لیتا ورنہ بس، کہاں کا گھر کہاں کی

نوکری..... پری کے کھلونے شاپر میں رکھتا کبھی سمیٹ کر کبھی چھپالیتا۔

اُسے دیکھ کر سب کا جگر کٹتا تھا۔ آخر آپا نے اور آصف نے باہم صلاح ومشورہ کیا اور اختر کا گھر بند کرکے اختر کو بھی آپا اپنے گھر لے گئیں۔ وہاں آپا کے بچے خود اختر کا بیٹا وہ سب اس کا خیال رکھتے لیکن وہ چپ چاپ بیٹھا رہتا۔ خلاؤں میں گھورتا رہتا۔

آپا اپنے لاڈلے بھائی کو دیکھ کر کڑھتی رہتیں۔

ایک دن آپا بازار چلی گئیں شاپنگ کرنے۔ گھر میں بہت سی چیزیں ضروری ہوتی ہیں، چاہے کچھ بھی ہو مگر جانا تو پڑتا ہے۔

اختر نے بچوں سے پوچھا۔ ''آپا کہاں ہیں؟''

بچوں نے کہا کہ وہ بازار گئی ہیں۔

تو اختر نے کہا مجھے بھی جانا ہے۔ پری کے لیے بہت چیزیں لینی ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ بھی گھر سے نکل گیا۔

آپا آئیں تو بچوں نے بتایا کہ ماموں تو آپ کے پیچھے بازار چلے گئے تو..... آپا کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ شام اور پھر رات ہوگئی۔ آپا نے رو رو کر آنکھیں سجالیں۔ ساری رات سب کی بے چینی میں گزری۔ صبح ہی صبح سے افضل اور آصف نے اختر کی تلاش شروع کی، ہر جاننے والے عزیز رشتے دار سب دیکھ لیے ٹی وی اخبار ریڈیو وغیرہ سب میں اشتہار دیے گئے لیکن اختر کو نہ ملنا تھا نہ ملا۔ جانے والے کی کئی سمتیں، ڈھونڈنے والوں کی ایک سمت آخر تھک ہار کر سب بیٹھ گئے۔ اسی آس پر کہ شاید اختر خود ہی لوٹ آئے۔ آپا اور دیگر سب افراد دعائیں مانگ سکتے تھے، وہ دل سے مانگ رہے تھے۔ دل دکھ سے بوجھل تھے۔

☆......☆......☆

ایک دن آصف کسی کام سے جارہا تھا کہ ایک سگنل پر گاڑی رکی تو اچانک جیسے ہی اس نے فٹ پاتھ پر کھڑے لوگوں کی طرف نگاہ کی تو اُسے اختر نظر آگیا۔ اپنے بچپن کے دوست کو تو وہ ہزاروں میں بھی پہچان سکتا تھا۔ اُس نے فوراً گاڑی سے اُتر کر اختر کو جاکر بازو سے پکڑلیا۔ اختر نے اُسے یوں دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کررہا ہو۔

''میں آصف ہوں میرے بھائی۔''

''کون؟''

''اختر کون آصف.....'' اختر نے بازو چھڑایا۔ لیکن آصف کی گرفت مضبوط تھی اور اختر نے بے بسی سے اُسے دیکھا اور پھر آصف نے اُسے گاڑی کی اگلی سیٹ پر اپنے برابر بٹھایا اور گاڑی چلانے لگا۔

اختر سوکھ کر ڈھانچہ ہوچکا تھا۔ میلے اور پرانے پھٹے کپڑوں میں وہ کہیں سے بھی پڑھا لکھا آفیسر نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی وہ خوبصورتی، تعلیمی دور میں مشہور تھی نہ جانے کہاں کھوگئی تھی۔ کھو تو وہ خود سے بھی اور گھر والوں سے چکا تھا۔ اپنے بھائی جیسے دوست کی حالت پر اس کا دل دکھ سے اور آنکھیں اشک سے بھرنے لگیں۔ اس نے اختر کی طرف دیکھا وہ بت بنا سامنے دیکھ رہا تھا۔ ہاتھ میں ایک پھٹے ہوئے شاپر میں کچھ رنگین کاغذ گتے اور ٹوٹے کھلونے نظر آرہے تھے۔ شاپر گھٹنوں پر رکھا تھا جیسے کوئی بچہ گود میں ہو۔

''تم کہاں تھے اختر۔ ہم نے تمہیں بہت تلاش کیا۔ آپا بہت پریشان رہتی ہیں۔ سب تمہیں یاد کرتے ہیں۔'' وہ خاموش بیٹھا تھا اجنبی بنا۔ جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔''

''اختر بتاؤ..... بتاؤ نا، تم نے سب کو فراموش کردیا۔ ہم سب چاہتے ہیں کہ تم ہمارے ساتھ، ہمارے سامنے رہو۔ دیکھو تمہاری کیا حالت ہورہی ہے۔'' وہ اُسے بولنے پر اکسانے لگا۔

''تم کہاں تھے تم؟''

''میں اپنی پری کے پاس تھا۔'' اس نے صرف اتنا کہا اور پھر گھر تک وہ چپ تھا۔ اختر بھی چاپ چاپ ڈرائیونگ کررہا تھا۔ گھر پہنچ کر اس نے اردلی سے کہا نائی کو بلائے۔ نائی نے اختر کے بال بنائے، شیو کی وہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اور پھر اُسے نہلا کر کپڑے وغیرہ پہنائے۔ اس کے پاس موجود شاپر لینے پر اس نے تھوڑی مزاحمت کی لیکن جب اختر نے اسے کہا کہ یہ میں ہاتھ میں رکھتا ہوں۔ جب تم فارغ ہوجاؤ تو مجھ سے لے لینا۔'' اور وہ خود اس کے سامنے ہی رہا۔ اور اپنی نگرانی میں استری کیے کپڑے پہنائے تو آصف کو اُس میں پہلے والے اختر کی جھلک نظر آئی۔ بے اختیار اس نے اُسے

سینے سے لگالیا۔ آصف بہت خوش ہو رہا تھا۔ پھر آصف نے کھانا لگوایا اور ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ آصف نوٹ کر رہا تھا کہ اختر گم صم سا کھا رہا تھا۔ ایک نوالہ لینے کے بعد وہ کہیں کھو سا جاتا۔ جب وہ اُسے متوجہ کرتا تب وہ چونک کر دوسرا نوالہ لیتا۔ پھر آصف نے اُسے اپنے ہاتھوں سے کھلانا شروع کیا۔ وہ کھانے لگا۔ آصف نے اُسے باتوں میں بھی لگا رکھا تھا۔ وہ جواب کسی بات کا نہیں دے رہا تھا لیکن کھانا کھا رہا تھا۔

''اختر آپا ہمیں کہتی تھیں کہ آصف تم تو پولیس میں ہو۔ تم اختر کو ڈھونڈ لاؤ اور میں اکثر شرمندہ ہو کر کہتا ہوں کہ آپا میں تو اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہا ہوں۔ لیکن اب میں کل تمہیں لے جاؤں گا۔ اور کہوں گا دیکھیے اختر کو میں ہی تلاش کر کے لایا ہوں۔ دیکھنا آپا بہت خوش ہوں گی۔'' آصف نے خوشی سے کہا۔ وہ اُٹھ گیا اور کہا۔

''بس اب مجھے نیند آ رہی ہے۔ مجھے پری کے پاس بھی جانا ہے۔'' اس نے آصف کے ہاتھ سے چمچ لیتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' آصف نے اُسے پانی دیا جو کہ اس نے پی لیا۔

''پری...... پریا......'' وہ بڑبڑا رہا تھا۔ ساتھ جیسے اختر پر غنودگی چھا رہی تھی۔ آصف اُسے تھام کر اپنے بیڈ روم میں لایا اور لٹا دیا۔ دوسرے دن دفتر کے ضروری کام نبٹائے اور اُسے لے کر نواب شاہ کے لیے روانہ ہو گیا۔

دوپہر کو آصف اچانک آپا کے گھر اختر کو لے کر پہنچا تو آپا کو بخار تھا لیکن اختر کو دیکھ کر تو وہ خوشی سے نہال ہو گئیں۔ سب گھر والے اختر کے گرد جمع تھے۔ آپا اس کی خدمت کرنے لگی تھیں۔ بار بار آتیں پڑھ کر منہ پر ہاتھ پھیرتیں بال سنوارتی یہ محبت کی عجیب کیفیت تھی۔ سب کو رشک آ رہا تھا۔ اختر بھی چپ بیٹھا تھا۔

صبح میں اپنی ڈیوٹی پر واپس آ گیا۔ اختر کو آپا اور افضل بھائی کے گھر چھوڑ کر۔ فون پر بات ہوتی تھی آپا سے اختر کی وہی کیفیت تھی، کھانا کھلا دیا تو کھا لیا ورنہ گم صم رہتا۔ بس کبھی کہتا پری کے پاس جانا ہے۔

''باٹل...... باٹل وہ بلا رہی ہے۔ آپا نے مجھ سے کہا کہ آصف کسی اچھے ڈاکٹر سے ٹائم لو۔ اختر کا علاج کروائیں۔ اور حیدر آباد، کراچی سکھر بہت علاج کروایا لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ کوئی فرق نہ ہوا بلکہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی والی مثال تھی۔

میں اختر سے ملنے گیا ہوا تھا وہ ویسے ہی کمبل میں لپٹا بیٹھا تھا۔

آپا نے بتایا کہ آج بہت سردی تھی میں بار بار اُسے کمبل لپیٹتی ہوں ورنہ یہ تو ہر بات سے بے خبر رہتا ہے۔ کیا سردی، کیا گرمی، انہی باتوں کے دوران وہ اُٹھ کر پہلے واش روم گیا پھر اپنے بیٹے شہزاد جو کہ اب آٹھ سال کا ہو چکا تھا۔ بالکل اختر کی فوٹو کاپی کو گود میں لیے بیٹھا رہا پھر اُٹھ کر صحن میں چلا گیا۔ میں نے کہا۔

''اختر آؤ میرے پاس بیٹھو۔'' لیکن اس نے جیسے سنا نہیں۔ تو میں ہی اُٹھ کر صحن میں آ گیا وہ وہیں دروازے کے پاس ایک شاپر سے کھلونے جو کہ آپا نے نئے لے دیے تھے نکال نکال کر دیکھ رہا تھا۔ اندر سے افضل بھائی کے بات کرنے کی آواز آئی تو میں اُٹھ کر اندر گیا۔

جب ہم لوگ باہر آئے تو اختر نہیں تھا۔ آپا نے کہا جاؤ اُسے لے آؤ باہر زیادہ دیر ہم اُسے جانے نہیں دیتے۔ ہم دونوں افضل اور میں باہر آ گئے۔ گلی خالی تھی۔ دوسری گلی کے بعد مین روڈ تھا۔ جب ہم لوگ روڈ پر آئے تو روڈ پر رش تھا اور ٹریفک جام لگ رہا تھا۔ ہم دوڑ کر روڈ پر آئے تو کسی نے کہا کہ پاگل تھا کوئی ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔

''پاگل۔'' دل دھک سے رہ گیا۔ بھیڑ چیر کر دیکھا تو...... واقعی وہ اختر ہی تھا۔ روڈ پر خون ہی خون تھا۔ اختر کی ٹانگوں پر سے تیز رفتار ٹرک گزر گیا تھا۔ ٹریفک پولیس آ گئی تھی لیکن ٹرک والا ٹرک سمیت فرار ہو چکا تھا۔ فون کر کے ایمبولینس کو بلوایا۔

اختر فوت ہو چکا تھا دور تک روڈ پر کھلونے بکھرے پڑے تھے۔ افضل بھائی سڑک کنارے سر پر ہاتھ رکھے غم سے چور بیٹھے تھے۔ اور میں اختر کو پری کے پاس (جیسے اختر نے تھوڑی دیر پہلے شہزاد کو گود میں بٹھایا ہوا تھا) بالکل اسی طرح پری کو گود میں بٹھایا ہوا مجھے محسوس ہو رہا تھا۔

''باٹل...... باٹل'' پری کی آواز چہک رہی تھی۔

☆☆......☆☆

تیسری سچ بیانی

مردِ مجاہد



شعبان کھوسہ

وطنِ عزیز پر قربان ہونے والے بہادر سپاہی کی کہانی، کوئٹہ سے

وطنِ عزیز پہ
جان قربان ہونے والے
مردِ مجاہد کبھی بھی
دل سے بھلائے
نہیں جاتے......!

میں رات کو ضلع گشت کے لیے روانہ ہو رہا تھا کہ مجھے خبر ملی۔

''محمد علی دہشت گردوں کے حملے میں شہید ہوگئے ہیں۔'' یہ خبر میرے لیے کسی بم دھماکے سے کم نہیں تھی۔ مجھے یقین بھی نہیں آ رہا تھا کہ محمد علی یوں ہم سب کو چھوڑ کر جاسکتے ہیں۔ جیسے میری قیمتی چیز مجھ سے کھوگئی ہو۔ وہ میرا کزن ہی نہیں بلکہ میرے لیے ایک دوست جیسا بھائی تھا۔

محمد علی کھوسہ 1972ء میں ضلع جعفر آباد کے گاؤں دمبڑی میں پیدا ہوئے وہ اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ مجھے یاد ہے جب بچپن میں گاؤں کی گلیوں میں رات کے وقت چور سپاہی کھیلا کرتے تھے۔ وہ اکثر ضد کرتا کہ مجھے سپاہی بننا ہے۔ آپ سب بے شک چور بن جاؤ۔ مجبوراً انہیں ہی چور بننا پڑتا اور وہ ایک پولیس آفیسر کی طرح پکڑ کر ہم سب کی درگت بناتا۔

محمد علی تھوڑے بڑے ہوئے تو گاؤں کے اسکول میں داخل کروایا گیا۔ اُسے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ کھیلوں کے ساتھ ساتھ تقریری مقابلوں میں حصہ لیتے اپنی کلاس میں ہمیشہ پہلی پوزیشن لیتے، ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کیڈٹ کالج زرگ چلے گئے۔ وہاں آپ نے دل لگا کر پڑھا۔

اس کے بعد ٹنڈو جام ایگری کلچر یونیورسٹی چلے گئے۔ وہاں آپ نے بی اے کیا۔ آپ لاتعداد صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اُسے خود کو منوانا خوب آتا تھا۔ وہ عزت کرنا اور کروانا خوب جانتے تھے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد 2002ء میں بلوچستان پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کیا۔ اور بلوچستان لیویز میں بطور رانویسٹی گیشن آفیسر بن گئے۔ اُسے پولیس آفیسر بننے کا بہت شوق تھا۔

یہی محنت اُسے اس فیلڈ کی طرف لے آئی۔ وہ اکثر کہتا کہ اپنے ملک کا نام روشن کروں گا۔ محمد علی کے خواب سچ ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔

محمد علی خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ اُس کی کامیابی پر پورا گاؤں خوش تھا۔ وہ اپنے گاؤں کا

پہلا شخص تھا جو اتنے بڑے عہدے پر پہنچا۔

جگہ جگہ مٹھائیاں تقسیم کی گئیں۔ اُس کی کامیابی کے لیے مزید دعائیں مانگی گئیں کچھ عرصے تک لیویز میں بطور رانوسٹی گیشن اپنی ڈیوٹی خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے رہے۔ بعد میں بلوچستان لیویز کو بلوچستان میں ضم کیا گیا۔ تو آپ بطور ڈی ایس پی بلوچستان پولیس میں اپنی خدمات سرانجام دینے لگے۔

آپ کا ترقی کا سفر جاری وساری رہا۔ آپ کو خوب سے خوب تر کرنے کا شوق تھا۔ اُس کی یہی کوشش تھی کہ کچھ ایسا کر جاؤں جس سے ملک و قوم کا نام روشن ہو، آپ اپنے علاقے کے بارے میں ہمیشہ فکر مند رہتے۔ غربت اور جہالت کا خاتمہ چاہتے تھے۔

اِسی دوران پھر بلوچستان پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کر کے ایس ڈی او ایگری کلچر کا امتحان پاس کیا۔ لیکن اپنی وطن سے محبت کی وجہ سے اپنی خدمات بلوچستان پولیس کے لیے وقف کر دی۔ آپ نے ملک دشمن عناصر کے خلاف لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ویسے بھی پولیس کا مجموعی کردار عوام کی نظروں میں کبھی خاص نہیں تھا۔ عوام کا پولیس سے اٹھتا ہوا اعتماد گرتا ہوا معیار فکر مند رکھتا۔ آپ پولیس کا معیار بلند کرنا چاہتے تھے۔

آپ نے PTC پولیس ٹریننگ ایڈوانس کورس کرنے کے بعد سب سے پہلے اپنی پوسٹنگ اپنے علاقے میں لی۔

تھانے میں کسی قسم کی شکایت آتی تو محمد علی دونوں فریق کو بلوا کر اُن کے درمیان راضی نامہ کرواتے۔ خوش مزاجی اور اچھے اخلاق کی وجہ سے دونوں فریق شیر وشکر ہو جاتے۔ آپ ہر دلعزیز شخصیت کے مالک تھے۔ علاقے کا ہر فرد آپ کو بخوبی جانتا تھا۔ علاقے کا ہر آدمی آپ کی بہادری دلیری کی تعریف کرتا۔ خوش مزاجی آپ کی رگ رگ میں بسی ہوئی تھی۔

آپ کے دورانِ تعیناتی مختلف علاقوں میں کافی حد تک اغواء برائے تاوان، چوری، ڈکیتی، منشیات فروشوں کے گروپوں کا خاتمہ کر دیا۔

آپ کی جس بھی علاقے میں تعیناتی ہوتی آپ وہاں کے رئیس وڈیروں کی ایک میٹنگ بلاتے۔ اور اِس بات پر آمادہ کرتے تھے کہ علاقے میں امن وامان اور کسی مسکین یا غریب کی حق تلفی نہ ہو۔ چوروں



اور لٹیروں کے خلاف وارننگ جاری کرتے کہ اگر اس علاقے میں رہنا ہے تو امن بھائی چارے کے ساتھ رہیں ورنہ علاقہ چھوڑ کر چلے جائیں۔

علاقے کو محمد علی جیسا بہادر پولیس آفیسر مل گیا تھا جرم کی شرح گرتی چلی گئی۔

آپ رات کے وقت کبھی نہیں سوتے تھے ہمیشہ علاقے کے امن وامان کے لیے فکرمند رہتے خود بھی بیدار رہتے اور جوانوں کو بھی اس کی ہدایت کرتے۔

ایک دفعہ ضلع جعفرآباد تحصیل صحبت پور کے اوپری علاقہ آپ کو سونپا گیا یہ علاقہ شرپسند عناصر کا گڑھ سمجھا جاتا تھا۔ آپ وہاں کے سرکل سکیورٹی انچارج تھے۔ سوئی کے علاقے سے قبائلی گوریلے پولیس چوکی کو خاطر میں لائے بغیر صحبت پور کے نچلے علاقوں میں واردات کر کے باآسانی فرار ہو جاتے۔ ان وارداتوں کی وجہ سے علاقے میں سخت بے چینی پائی جاتی تھی۔ آپ نے جوانوں کو سختی سے حکم دیا کہ قبائلی گوریلے کسی بھی صورت نچلے علاقے میں نہیں آنے چاہئیں۔ ایک رات زبردستی گوریلے چوکی کراس کر کے نچلے علاقے کی طرف نکل گئے۔ جوانوں نے وائرلیس کنٹرول کے ذریعے ضلعی پولیس کو اطلاع دی۔ آپ اُسی وقت پولیس ٹیم کے ساتھ پولیس چوکی پر پہنچے جوانوں کی نشان دہی پر علاقے کا گھیراؤ کر لیا۔ جگہ جگہ ناکہ بندی کر کے شرپسند عناصر کا گھیراؤ کیا گیا۔ شدید فائرنگ کے بعد شرپسند عناصر کو گرفتار کر لیا گیا۔ آپ جب تک وہاں تعینات رہے کسی گوریلے کی جرأت نہیں ہوئی کہ وہ آپ کے علاقے میں واردات کرتے۔

26 اگست 2007ء کو نواب اکبر بگٹی کو شہید کیا گیا تب سے بلوچستان کے حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ دہشت گردی کے واقعات رونما ہونے لگے۔ بے گناہ لوگوں کو لاتعداد خودکش حملوں، بم دھماکوں، ٹارگٹ کلنگ میں مارا گیا۔ اغواء برائے تاوان، اغواء نما گرفتاری، اندھا دھند فائرنگ، قتل و غارت لوٹ مار کا بازار گرم ہوا۔

بلوچستان بُری طرح دہشت گردی کی لپیٹ میں آ گیا۔ امن وامان کو قائم کرنے کے لیے پولیس میدان میں آ گئی۔ جس کی وجہ سے پولیس ATF اور آر آر جی کے جوان بھی نہ بچ سکے۔ پولیس کے جوانوں کو چُن چُن کر شہید کر دیا گیا۔ بہت سے جوانوں نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے اپنے وطن کی پاسبانی کی۔

30 اگست 2009ء کو ضلع نصیرآباد، تحصیل چھتر کے علاقے میں کچھ شرپسند عناصر نے ریتی اٹھانے والے غریب مزدوروں کو اغواء کر لیا۔ جس کی اطلاع ڈی پی او اور ڈی ایس پی محمد علی کھوسہ کو ملی۔ آپ نے فوراً ایک ضلعی ڈسٹرکٹ پولیس ATF کی ٹیم تشکیل دی۔

SHO تحصیل چھتر احسان علی کھوسہ پہلے ہی شرپسند عناصر کے پیچھے روانہ ہو چکے تھے۔ آپ تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ دہشت گردوں نے چاروں طرف سے گھیراؤ کر کے آپ کو بھی اغواء کر لیا۔ SHO احسان علی کھوسہ نے اُسی وقت ڈی ایس پی محمد علی کھوسہ کو وائرلیس کنٹرول پر اطلاع دی کہ مجھے اغواء کر لیا گیا ہے۔ آپ نے ضلعی پولیس کو اطلاع دی کہ ہمارے پیچھے نہ آئیں۔ یہ ان کا ایریا ہے کہیں جوانوں کو نقصان نہ پہنچائیں مگر آپ کے ضمیر نے گوارہ نہیں کیا۔ آپ غریب مزدوروں اور پولیس جوانوں کو ان دہشت گردوں کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑ سکتے۔

ڈی پی او نصیرآباد ڈی ایس پی محمد علی کھوسہ ڈی ایس پی جان محمد کھوسہ ATF کمانڈوز ڈسٹرکٹ پولیس جوانوں کے ساتھ شرپسند عناصر کے پیچھے روانہ ہوئے۔ پوری ٹیم نے دہشت گردوں کا محاصرہ کر لیا۔ دہشت گردوں نے پہاڑیوں میں مورچے سنبھال لیے۔

آپ کی پوری ٹیم میدان میں تھی۔ جہاں آڑ کی کوئی جگہ نہیں۔ بارشوں کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی ندیاں بن گئی تھی۔ جوانوں نے اُن چھوٹی ندیوں کی آڑ لے کر دہشت گردوں کا مقابلہ شروع کر دیا۔

آپ کے جوانوں کی ٹیم میں پینتیس کی تعداد تھی۔ اور دہشت گردوں کی تعداد دگنی تھی۔ پھر بھی کمانڈوز نے ہمت نہیں ہاری۔ اور مقابلہ کرتے رہے۔ ڈسٹرکٹ پولیس اور ATF کی ٹیم جواں مردی کے ساتھ دہشت گردوں کا مقابلہ کر رہے تھے

کہ ایک دہشت گرد نے چٹان کی آڑ لے کر آپ پر فائر کر دیا۔ چونکہ آپ میدان میں تھے اور صاف دہشت گردوں کے نشانے پر تھے۔ آپ کے پیٹ اور سینے پر گولی لگی۔ آپ گر گئے دوبارہ اٹھے اور اپنے ایک ساتھی کو دہشت گرد کی طرف اشارہ کیا کہ اس طرف سے فائرنگ ہو رہی ہے اور مجھے گولی لگی ہے۔ جوان نے اُسی وقت دہشت گرد کو جہنم واصل کیا۔ آپ شدید زخمی ہو گئے۔ ڈی ایس پی جان محمد صاحب نے آپ کو گاڑی میں رکھا اور سٹی کی طرف تیز رفتاری سے روانہ ہوئے۔

آپ شدید زخمی تھے آپ کو زخموں کی وجہ سے شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ آپ پورے راستے میں کلمہ طیبہ پڑھتے رہے۔ اور بالآخر زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے شہید ہو گئے۔ (اناللہ وانا الیہ راجعون)

دوسری طرف مردِ مجاہد میدان میں ڈٹے رہے ایک ایک کر شہید ہوتے گئے مگر پیچھے نہیں ہٹے۔ انسپکٹر شعیب احمد، احسان علی کھوسہ، مستی خان، ظہور احمد اور 22 کمانڈوز مجاہدوں نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے اپنی قوم، اپنے وطن اور محکمہ پولیس کا نام روشن کیا۔ محکمہ پولیس ہمیشہ ایسے مردِ



شہید محمد علی کھوسہ کی ایک یادگار تصویر

مجاہد پر فخر کرے گی۔

شہید کی بیوہ کہتی ہیں۔ "میرے شوہر بہت پیار کرنے والے تھے۔ مجھ سے اپنے بچوں اور اپنی پوری فیملی سے بے حد پیار کرتے تھے۔" اور کہتی ہیں کہ میرے شوہر زندہ ہیں۔ شہید کبھی مرتے نہیں۔ میں اپنے شہید شوہر کو اپنے آس پاس محسوس کرتی ہوں۔

12 سالہ محمد خرم اور صفا علی کو اپنے باپ کی شہادت پر فخر ہے۔ محمد خرم کو بڑا ہو کر پولیس آفیسر بننے کا شوق ہے اور اپنے وطن عزیز کے دشمنوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانا چاہتے ہیں۔

5 سالہ مینا علی کو ایئر فورس میں پائلٹ بننے کا شوق ہے۔

شہید ڈی ایس پی محمد علی کھوسہ کی شہادت پر بلوچستان کیا پورے پاکستان بھر میں ہر ایک آنکھ اشکبار تھی۔ جگہ جگہ شہید کے ایصال ثواب کے لیے قرآن خوانی کی گئی۔

آپ کو سابق صدر پاکستان آصف علی زرداری کی جانب سے قائداعظم پولیس میڈلQPM سے نوازا گیا۔

کہتے ہیں شہید کبھی مرتے نہیں۔ شہید ڈی ایس پی محمد علی کھوسہ ہمیشہ ہم سب کے دلوں میں زندہ رہیں گے۔

☆☆......☆☆



شہید محمد علی کھوسہ کی لاڈلی بیٹی صفا علی

چوتھی سچ بیانی

بہاریں روٹھ نہ جائیں



بابر نایاب

ساہیوال سے ایک انسان ناشناس دوشیزہ کی روئیداد

موسم بہار کی آمد آمد تھی رنگ برنگے پھول تتلیوں کے ساتھ کھیل رہے تھے ،تازہ ہوا کے جھونکے آوارہ بادلوں کی طرح ہر جگہ چکر لگا رہے تھے۔ یونیورسٹی کے گارڈن میں کافی گہما گہمی تھی، یونیورسٹی کے لڑکے اور لڑکیوں کے جھرمٹ موسم کی صباحت سے کافی محظوظ ہو رہے تھے، جوانی کے خمار میں ڈوبی کھلکھلاہٹیں مسکراہٹیں

موسم کے مزاج کے مطابق اپنے عروج پر تھیں، آنے والے لمحات سے بے خبر شوخ جذبات مستقبل کے سپنے بُن رہے تھے، قہقہوں کی محفل سے الگ تھلگ بیٹھی سندیلا بے خبر نوٹس بنانے میں مصروف تھی۔ آج ویسے بھی اُس کی سائیکولوجی کی کلاس آف تھی۔

بہار کے شرارتی جھونکے بار بار سندیلا کے آنچل کو گرا کر اُس کی کالی گھنی زلفوں کے ساتھ کھیلنے کی اپنی ناکام سی کوشش کرتے تھے، بڑی بڑی آنکھیں کشادہ پیشانی پر سجی گہری ذہانت اور سنجیدگی سندیلا کے وقار میں مزید اضافہ کر رہی تھی، گلاب کی طرح مہکتا رنگ، کلیوں کی طرح بے داغ سفید رنگت، شبنم کے قطروں کی طرح صاف شفاف وجود نے سندیلا کو حسن و جمال کے تمام رنگوں سے بھر دیا تھا لڑکے اور لڑکیوں کی سجی محفل میں سے بار بار اُٹھتی نظریں سندیلا کے وجود کا طواف کر رہی تھیں مگر سندیلا حسن کے مجسم کی طرح ساکت تھی۔

''یار کبھی سندیلا بھی ہماری کمپنی کو جوائن کر لیتی تو محفل کو چار چاند لگ جاتے۔'' ایک شرارتی لڑکے نے فقرہ اُچھالا۔ اُدھر دال گلنے والی نہیں جناب۔ وہ محترمہ تو ہم فی میل کلاس فیلوز کو لفٹ نہیں کرواتی آپ کس باغ کی مولی ہو۔'' رخسار کے جواب نے شرارتی لڑکے کا منہ بند کر دیا۔

''آہ قسمت والوں کو ہی سندیلا جیسا ہم سفر ملے گا ہم جیسوں کو تو صرف سفر ہی سفر ملے گا۔'' وقار نے دل پر ہاتھ رکھ کر بڑی سے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''یار محفل ہماری ہو رہی ہے پھر سندیلا کا تذکرہ لے کر بیٹھ جاتے ہو ہمیں کیا ضرورت ہے انا کے بت کو اپنی محفل میں لانے کی۔'' نازش نے انتہائی ناگوار لہجے میں کہا۔

''ارے واہ انا کا بت کیا نام دیا ہے۔'' امجد کے ہنسنے پر سب ہنس پڑے، محفل میں خاموش بیٹھا شاہنواز کی آنکھیں اچانک پھر سندیلا کے وجود سے ٹکرا گئی بس وہی ایک جذباتی لمحہ تھا جب شاہنواز لٹ چکا تھا اور دل ہی دل میں شاہنواز نے چپکے سے عہد کر لیا کہ اس انا کے بت کو موم بنا کر ہی چھوڑوں گا۔

☆......☆

غلام حسین اپنے کمرے میں لیٹا دروازے کو دیکھ رہا تھا غلام حسین کی چارپائی کے پاس ایک پرانے خستہ حال میز پر دوائیوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا، وقفے وقفے سے غلام حسین کی کھانسی کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی، اچانک دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور سندیلا تھکن سے چور کمرے میں داخل ہوئی۔ ''اسلام وعلیکم ابا کیسے ہیں آپ۔'' سندیلا نے انتہائی پیار سے اپنے ابا کو سلام کیا اور چارپائی پر اُن کے پاس بیٹھ گئی۔

''وعلیکم السلام بیٹا بس زندگی کے دن پورے ہو رہے ہیں۔'' غلام حسین نے بمشکل بیٹھ کر اپنی اکلوتی بیٹی سندیلا کی پیشانی پر بوسہ دیا، غلام حسین کی اُداس آنکھیں بیٹی کے آنے پر روشن ہو گئیں۔

''ابا آپ کو میری زندگی بھی لگ جائے ایسی باتیں مت کیا کریں۔'' سندیلا نے فکر مندی سے کہا۔

''بیٹا بڑھاپا تو خیالوں، یادوں اور تنہائیوں کا گھر ہے۔ تیرے آنے سے پہلے ہی میں تیرے بارے میں سوچ رہا تھا۔ تمہیں تو پتا ہے میرے دل کی راحت تو ہے، اللہ بخشے تیری ماں کے انتقال کے بعد تو بہت چھوٹی سی تھی تیرا ننھا سا وجود نے تمہاری ماں کی جدائی کا غم آدھا کر دیا آج تم بڑی ہو گئی ہو، مگر میرے لیے وہی سندو ہو جو میرے کندھے پر بیٹھ کر دکان سے چیز لینے جاتی تھی۔ ہمیشہ پروردگار سے تمہاری سلامتی کی دعائیں مانگتا رہتا ہوں۔ اللہ پاک تمہیں خوشیاں والا گھر دے۔ بس اب ایک ہی آرزو رہ گئی ہے کہ تجھے کوئی اچھا جیون ساتھی مل جائے تب میں آرام سے مر سکوں۔'' آہستہ آہستہ یہ کہتے ہوئے غلام حسین کی کھانسی شروع ہو گئی سندیلا نے جلدی سے جگ سے پانی گلاس میں ڈال کر اپنے ابا کو پلایا اور ساتھ ہی کھانسی کا سیرپ بھی پلا دیا۔

''ابا آپ میرے بارے میں فکر مند مت ہوں۔ میری زندگی کا مقصد ہی آپ کی خدمت کرنا ہے۔ آپ نے اپنی زندگی میری پرورش میں گزار دی۔ میں کیسے آپ کو تنہا چھوڑ کر سکتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے سندیلا کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''بیٹا میرا تو دل کرتا ہے تو ہمیشہ میری آنکھوں کے سامنے رہے مگر خدا نے جو کائنات کا نظام بنایا ہے سب کو اس نظام کے تحت ہی چلنا پڑتا ہے بیٹیاں تو شروع سے ہی پرایا دھن ہوتی ہیں۔ خیر وہ اپنے محلے کا رضوان ہے نا تیرے جانے کے بعد وہ آ جاتا ہے میری خدمت کرتا ہے دوائی وغیرہ پلا دیتا ہے بڑا نیک بچہ ہے اللہ اُسے خوش رکھے۔'' غلام حسین نے کہا، رضوان کا نا



سن کر سندیلا کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا یونیورسٹی سے واپسی پر اکثر رضوان سے اس کا ٹکراؤ ہو جاتا تھا۔ تب رضوان نماز ظہر ادا کرنے مسجد جا رہا ہوتا تھا۔ اُدھر سندیلا بھی گھر واپس آ رہی ہوتی تھی۔ رضوان میں ایک عجیب سی بات یہ تھی کہ اُس کی آنکھیں ہمیشہ جھکی ہوئی ہوتی تھیں مگر جب سندیلا کی نظر اُس پر پڑ جائے سندیلا کو بڑا عجیب سا محسوس ہوتا تھا جیسے رضوان کی جھکی ہوئی نظریں کوئی پیغام دے رہی ہوتی تھیں۔

جب سے سندیلا نے اس محلے میں آنکھ کھولی اُس نے رضوان کو پانچ وقت کا نمازی ہی پایا، لوگوں کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہی پایا محلے کے دوسرے لڑکوں کی طرح کبھی اُس کی آواز اُونچی نہیں سنی اب جب ابا کی زبانی یہ بات سنی کہ رضوان ابا کی دیکھ بھال بھی کرتا رہتا ہے تو سندیلا کے دل میں رضوان کی قدر و منزلت مزید بڑھ گئی۔

☆......☆

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں۔" شاہنواز نے نوٹس بناتی سندیلا کو کہا جو دنیا مافیا سے بے گانہ اپنے کام میں مگن تھی، سندیلا نے نظر اُٹھا کر شاہنواز کو دیکھا۔

"جی بیٹھ جائیں سندیلا نے سے آہستہ سے جواب دیا اور دوبارہ اپنے نوٹس بنانے لگ پڑی۔

"میں یہاں آپ سے باتیں کرنے آیا ہوں آپ کو دیکھنے کے لیے نہیں کیونکہ یونیورسٹی میں آپ انا کے بت کے حوالے سے مشہور ہو چکی ہیں۔"

شاہنواز نے انتہائی دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ سندیلا سے آج تک کسی نے اس انداز میں بات نہیں کی تھی۔ سندیلا کے چہرے پر غصے کے تاثرات اُبھر آئے، دیکھیں معاف کیجئے میرا مقصد آپ کی دل آزاری کرنا نہیں حقیقت حال سے باخبر کرنا ہے اور میں آپ سے دوستی کا خواہشمند بھی ہوں اگر آپ چاہیں تو۔"

شاہنواز نے پھر بے باکی سے کہا۔

"دیکھیں مسٹر اپنی لمٹ کراس مت کریں۔ میں کسی لڑکے سے بات نہیں کرتی اور نا ہی میں آپ جیسے لوگوں کے ماحول کی عادی ہوں۔" سندیلا نے سرد مہری سے جواب دیا۔ "ٹھیک ہے آپ کی مرضی اگر آپ تنہا ہی رہنا چاہتی ہیں تو پھر رہیں، شاہنواز اُٹھ کھڑا ہوا، مگر ایک بات ضرور یاد رکھیے گا اچھے لوگوں کو ٹھکرا دینا بعد میں زندگی کا پچھتاوہ بھی بن جاتا ہے۔۔" شاہنواز اپنے فقرے کی بازگشت چھوڑ گیا۔

سندیلا کو آج حد سے زیادہ شرم محسوس ہو رہی تھی اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ شاہنواز اُس کا کلاس فیلو اتنی باتیں کہہ گیا جس کا سندیلا تصور نہیں کر سکتی تھی۔ سندیلا کو اپنی خوبصورتی کا پتا ضرور تھا مگر یہ علم نہیں تھا کہ یونیورسٹی کا سب سے ہینڈسم امیر و کبیر شاہنواز اُس کی دوستی کا خواہشمند ہوگا، سائیکلوجی کا فائنل سمسٹر شروع ہو چکا تھا ساتھ ہی شاہنواز اور سندیلا کے ریلیشن کے چرچے بھی آجکل زیر بحث تھے سندیلا کے کلاس فیلوز اور سب جاننے والوں کے لیے وہ دن حیرت کا تھا جب سندیلا اور شاہنواز اکٹھے نظر آنے لگ گئے۔ سندیلا کو پتا ہی نہیں چلا وہ کب شاہنواز کی میٹھی میٹھی باتوں میں آ گئی شاید جب جذبات غالب آ جائیں تو عقل اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں وقتی طور پر معطل ہو جاتی ہیں۔

امیر و کبیر شاہنواز اور حسن و جمال کی ملکہ سندیلا ایک دوسرے کی جان بن گئے وقت پر لگا کر اُڑنے لگا۔ سندیلا کی سنجیدگی اور خاموشی کا لبادہ جیسے ہی اُترا تب اُسے احساس ہوا وہ تو کسی کو ٹوٹ کو چاہنے لگی ہے۔ کیا محبت اتنی جلدی اپنی سحر میں جکڑ لیتی ہے؟ یہی سوال سندیلا کے ذہن میں بار بار آ رہا تھا، بہار اپنی رعنائیوں کے ساتھ اپنی واپسی کی تیاریوں میں لگ گئی اور سندیلا کے دل و دماغ پر لطیف جذبات نے اپنا مسکن بنا لیا سنجیدگی کے خول کو توڑ کر سندیلا باہر آ گئی۔ باہر آنے پر احساس ہوا کہ زندگی تو بڑی حسین ہے۔ سندیلا کی زندگی کا وہ خوبصورت دن بھی آ گیا جب شاہنواز اپنی ممی کو لے کر غلام حسین کے بوسیدہ سے گھر میں داخل ہوا، مسز نزہت جیلانی نے تنقیدی نظروں سے گھر کو دیکھا اور پھر غصے کی ایک نگاہ اپنے ضدی لاڈلے بیٹے پر ڈالی اور پھر سندیلا کی رہنمائی میں غلام حسین کے کمرے میں داخل ہوئی۔ سندیلا شرم سے سمٹ سمٹ کر مہمانوں کی خوب خاطر مدارات کرنے لگ پڑی، مسز نزہت جیلانی نے اپنے لاڈلے بیٹے شاہنواز کے لیے غلام حسین سے سندیلا کو مانگ لیا، غلام حسین نے اپنی بیٹی کے شرم و حیا والے چہرے پر پھوٹتی خوشی کی کرن کو محسوس کر کے ہاں کہہ دی۔ بہار کے جانے کے ساتھ ہی سندیلا بھی پیا گھر سدھار گئی۔

کبھی کبھی پکے ہوئے پھل کی طرح خوشیاں خود بخود جھولی میں آ کر گر جاتی ہیں سندیلا نے شاہنواز کے گھر جاتے ہی اپنے سگھڑپن، شائستگی کردار و عمل سے اپنی انفرادیت قائم کر دی۔ مگر کبھی خوشیاں چمکتی دمکتی چیزوں کی مانند بھی ہوتی ہیں جو دور سے بہت بھلی لگتی ہیں، مگر قریب جانے پر اُن کی چمک دمک سونے کے پانی کی طرح اُتر جاتی ہیں شاید یہی سندیلا کے ساتھ ہوا۔ جب شاہنواز رات کو دیر سے گھر آنے لگا اور اکثر اپنی فی میل کزنز کے ساتھ باہر سیر سپاٹا کرنے نکل جاتا۔ جب سندیلا نے مسز زہت جیلانی کو کہا کہ وہ اپنی بھتیجیاں اور بھانجیوں کو یوں اس طرح شاہنواز کے ساتھ کھلنے ملنے سے منع کریں تو مسز زہت جیلانی نے نخوت اور تکبر کے انداز سے جواب دیا کہ ہمارا ماحول تم جیسے پسماندہ اور گندی نالی کے کیڑوں کی طرح نہیں ہے یہ ہمارا ماحول ہے اگر ایڈجسٹ کرنا ہے تو کر لو ورنہ چلی جاؤ یہ تو میں نے اپنے بیٹے کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تھے ورنہ تم جیسی غریب بستیوں کے مکینوں کو میں انھی کی اوقات پر رکھنا جانتی ہوں۔ یہ جواب تھا گویا کوئی بم جو سندیلا کے دماغ پر لگا تو محسوس ہوا کہ اُس کے وجود کے چیتھڑے اُڑ گئے ہوں۔ سارا دن سندیلا کا روتے ہوئے گزرا۔ رات کو شاہنواز آیا تو سندیلا نے کہا۔

”میں تمہاری شریک حیات ہوں مگر میری حیثیت ایک ملازمہ کی طرح رہ گئی ہے۔ کیا یہی دن دکھانے کے لیے تم نے مجھے اپنی جھوٹی محبت کے جال میں پھنسایا تھا۔“ ”دیکھو سندیلا مما جو کہتی ہیں ویسا ہی کرو۔ ہاں میں اعتراف کرتا ہوں میں تمہارے حسن سے متاثر ہو گیا تھا مگر ہماری سوسائٹی میں برابر کے رشتے ہوتے ہیں۔ جہاں سے ہمیں مالی مفاد بھی ملتے ہیں اور تمہاری اطلاع کے لیے بتانا چاہوں میں جلد اپنی کزن کے ساتھ شادی کرنے والا ہوں۔ اب تمہاری مرضی یہاں رہ کر صبر کرو یا.....“ اتنا کہتے ہوئے شاہنواز کے ہونٹوں پر خباثت بھری مسکراہٹ ناچنے لگی۔ سندیلا کے لیے یہ صرف لفظ نہیں تھے بلکہ ہتھوڑے تھے جو سندیلا کے دل و دماغ پر لگ رہے تھے۔ اب سندیلا کے لیے مزید برداشت کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ جس انسان کے لیے اُس نے سپنے دیکھے کیا یہ وہی انسان تھا، کیا محبت کرنے والے اتنے سفاک بھی ہو جاتے ہیں، مگر سندیلا جان گئی کہ وہ محبت صرف ایک ڈرامہ تھا۔ شاہنواز نے یونیورسٹی میں اپنا رعب بٹھانے کے لیے سندیلا کو اپنے جال میں پھنسایا اب سب کچھ کھل کے سامنے آ گیا تھا۔ سندیلا کو شاہنواز کے گھر سے گھٹن محسوس ہونا شروع ہو گئی۔ غم و کرب سے سندیلا کے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے اور کوئی ایسا تھا بھی نہیں جو اُسے حوصلہ دے، اُس کی ڈھارس بنے۔ یہاں تو سب اجنبی، بے گانے، بے حس، بے مروتوں کا گھر تھا۔ آدھی رات کے بعد سندیلا نے فیصلہ کر لیا۔

شاہنواز میں نفسیات کی ڈگری لے کر بھی تمہیں نہیں پہچان سکی مجھے ساری عمر دکھ رہے گا کہ میں نے جانور کے روپ میں انسان کو پایا۔ تم جیسے کاغذی و بناوٹی لوگ معاشرے کا ناسور ہو، گدھ ہو جو صرف لوگوں کے آرمانوں کو نوچنا کھسوٹنا اور آرزوؤں کی چتا جلانا جانتے ہو۔ تم جیسے لوگوں کا حشر بہت عبرتناک ہوتا ہے، آج تک میں نے کسی کو بد دعا نہیں دی، مگر تمہیں دیتی ہوں۔ خدا ہمیشہ تمہیں بے سکون رکھے یہ کہہ کر اور آنسوؤں کے سیلاب کو اپنے سینے میں دبا کر سندیلا واپس اپنے ابا کے گھر آ گئی۔

☆......☆

غلام حسین جاگا تو دیکھا سندیلا اُس کے پاس چارپائی پر بیٹھی ہے اور انتہائی غمزدہ لگ رہی ہے۔

”میری جان کے ٹکڑے کیا ہوا کب آئی ہو۔“ غلام حسین نے انتہائی فکر سے سندیلا سے پوچھا۔

”ابا میں شاہنواز کو پہچان نہ سکی ابا مجھے معاف کر دو۔ میں نے بہت بڑی غلطی کر دی ابا۔“ یہ کہہ کر سندیلا غلام حسین کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ پڑی۔

”بیٹا صبر کر، میری جان کے ٹکڑے! اللہ پاک نے صحیح سلامت تمہیں مجھ تک پہنچا دیا یہی اُس کا شکر ہے اے پروردگار تیرا شکر ہے تو نے جلد ہی چہروں کو واضح کر دیا۔ میرے جانے کے بعد کرتا تو نا جانے کیا ہوتا۔“ غلام حسین کی بوڑھی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

”بیٹی اب تو سب کچھ بھول جا جو کچھ بھی ہوا۔ اگر تم اسی طرح غمزدہ رہیں تو یہ تیرا بوڑھا باپ برداشت نہیں کر پائے گا۔“ غلام حسین نے سندیلا کے چہرے سے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے گھمبیر سے لہجے میں کہا۔

”ابا میری بھول کی مجھے سزا مل گئی میں نے تو آپ کو بھی سوچنے سمجھنے کا موقع نہ دیا آپ نے میری خوشی کی خاطر ہتھیار

ڈال دیئے اب میں صرف آپ کے پاس ہی رہوں گی۔"

سندیلا نے اپنے غم کو بھلانے کے لیے خود کو مصروف کر لیا۔ دن رات ٹیوشن اکیڈمیوں میں پڑھانا شروع کر دیا۔ کچھ عرصے بعد شاہنواز کی طرف سے باقاعدہ طلاق موصول ہوگئی۔ طلاق موصول ہونے پر سندیلا کے احساسات پر کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ کبھی کبھی جب سندیلا گھر جلدی واپس آ جاتی تو غلام حسین کے کمرے میں رضوان کو بیٹھا ہوا پاتی جو سندیلا کے آنے پر گھبرا کر چلا جاتا۔ ایسے ہی ایک دن جب رضوان سندیلا کو دیکھ کر چلا گیا تو غلام حسین نے ایک گہری نظر سندیلا پر ڈالی اور کہا۔

"بیٹا آج میں نے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ ادھر میرے پاس آ کر بیٹھ جاؤ۔" سندیلا جلدی سے اپنے ابا کی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"بیٹا میری زندگی کا اب کوئی بھروسہ نہیں، کوئی پتا نہیں کب سانسوں کی ڈور ٹوٹ جائے۔ میری راحت تیری راحت میں ہے۔ تو نے پتا نہیں اپنا کیا حال بنا رکھا ہے تجھے اس طرح پریشان دیکھ کر میرا دل ڈوبتا ہے۔ تیرے بوڑھے باپ کی آخری خواہش ہے اگر تو پورا کر سکے تو میں آرام سے مر سکوں گا۔ میں تجھ سے ہی تیری خوشی کی بھیک مانگتا ہوں۔ اگر تو سمجھتی ہے کہ تو مجھے موت سے پہلے خوش کرنا چاہتی ہے تو پھر رضوان سے شادی کر لے۔ بڑا نیک بچہ ہے بیٹا وہ منافق نہیں، وہ دھوکے باز نہیں، وہ جھوٹا نہیں، تیری شادی کے بعد بھی وہ میری اُسی طرح خدمت کرتا رہا۔ وہ تجھے بہت خوش رکھے گا۔"

غلام حسین کی بات سن کر سندیلا نے کہا۔

"ابا میں نے سوچا تھا کہ اب کبھی شادی نہیں کروں گی جو صدمہ مجھے ملا ہے اب مزید کسی آزمائش میں نہیں پڑنا چاہتی تھی پر آپ کا حکم مجھے دل و جان سے زیادہ عزیز ہے۔ مجھے اپنے رب کے بعد آپ پر بھروسہ ہے میں جانتی ہوں آپ کی سوچ آپ کا تجربہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا، غلام حسین نے یہ سن کر سندیلا کو گلے سے لگا لیا اور کہا۔

"خدا تجھے خوش رکھے تو ہمیشہ سلامت تا قیامت رہے۔"

آخر ایک طویل عرصے بعد پھر موسم بہار کی آمد آمد ہوئی۔ ہر اک چیز نکھر گئی۔ سب کچھ واضح ہو گیا۔ تاریک رات صبح کے خوبصورت اُجالے میں ڈوب گئی، سادگی کے ساتھ غلام حسین کی موجودگی میں سندیلا کے ساتھ رضوان کا نکاح ہوا اور سندیلا چپ چاپ اپنے ہی محلے میں دلہن بن کر آ گئی، محلے کی عورتیں سندیلا کو دیکھ کر ماشاء اللہ سبحان اللہ کہتے نہ تھکتیں۔

سندیلا پھر ایک گھر میں داخل ہوئی مگر یہ گھر ماضی کے اُس گھر کی طرح بڑا تو نہ تھا مگر گھر کے مکین محبت کی تصویر بنے سندیلا کے آگے بچھ بچھ جا رہے تھے، رضوان نے چپکے سے سندیلا کا گھونگٹ اُٹھایا اور دیکھتے ہی کہا۔

"ماشاء اللہ آپ کو دیکھ کر تو چاند بھی شرما جائے۔"

رضوان کے دھیمے سے لہجے میں اپنی تعریف سن کر سندیلا نے جو نظر اُٹھا کر دیکھا گھنی خوبصورت داڑھی سجائے آنکھوں میں محبت و اُلفت کے جذبات سے لبریز رضوان اسے اتنا اچھا لگا کہ سندیلا کا دل چاہا کہ وہ رضوان کو اپنی آنکھوں میں ہی بسا لے، محبت اور پاکیزہ جذبات سے لبریز رات تمام ہوئی۔

صبح کی اذان کے ساتھ ہی رضوان اُٹھا، پہلے دو نفل شکرانے کے ادا کیے اور پھر دعا مانگتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ پڑا اور کہنے لگا۔ "اے میرے پروردگار تو کتنا رحیم ہے تو کتنا شفیق ہے، تو نے اپنے ایک حقیر سے بندے کی ایسی خواہش کو تکمیل کی سرحدوں تک پہنچا دیا جس کا اس ناچیز نے تصور بھی نہ کیا تھا۔ میں تو سمجھا تھا کہ میری آرزو لاحاصل رہ جائے گی زمین اور آسمان کا کیا مقابلہ، مگر تو کریم ہے تو مسبب الاسباب ہے۔ بے شک تو میری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ تو نے بن مانگے ہی مجھ کو عطا کر دیا۔ اے میرے رب بس میری شریک حیات کو کبھی مجھ سے جدا مت کرنا۔"

رقت آمیز دعا سندیلا سن چکی تھی۔ موتیوں جیسے لفظ سندیلا کے وجود میں اُترتے چلے گئے۔ خوشی کے زار و قطار آنسو سندیلا کے گلابی گالوں پر بہنے لگے ساتھ ہی یہ سوچ بھی آنے لگی کہ وہ کتنی نادان تھی کہ ایک ہیرے کو چھوڑ کر دھوکے باز کے نرغے میں آ گئی، ظاہری چمک و دمک بناوٹی و کاغذی چہرے اندر سے کتنے کھوکھلے ہوتے ہیں اور سادہ سے لوگ دنیا کے کتنے عظیم لوگ ہوتے ہیں۔ رضوان کی بے پناہ محبت نے سندیلا کے ماضی کے سب غم مٹا دیے، سندیلا کو لگا کہ وہ نفسیات کی ڈگری لیکر بھی انسان شناس نہ بن سکی اور اُس کا ان پڑھ ابا حقیقت میں انسان شناس تھا تبھی سندیلا نے روٹھ جانے والی خوشیاں کو دوبارہ سے پا لیا۔

☆☆......☆☆

پانچویں سچ بیانی

کیوں اعتبار نہ کیا؟

نسیم سکینہ صدف

ڈسکہ سے، ایک عزت دار لڑکی کی بپتا، جو بے اعتباری پر قربان ہوگئی



دلدوز چیخوں سے گاؤں میں اُلچل مچ گئی۔ کچی پکی گلیوں میں شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ ہر کوئی بولایا ہوا۔ لوگ ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ ”کیا ہوا؟ آواز کہاں سے آ رہی ہے؟“

”رب خیر کرے۔“

”ہائے ربّا یہ کیا ہو گیا۔“ سب تاسف سے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ چیخیں آسمان کو چھو رہی تھیں۔ ان کا مرکز آشا اور سلطان کا گھر تھا۔

شام کا جھٹ پٹا تھا اور جاتی سردیوں کی ایک اُداس شام تھی۔ سب ان ہانی میں لگے تھے کہ دل کو جامد کرنے والی کرلاہٹ سے بستی کے لوگوں کے ہاتھ پیر پھول گئے تھے اور یہ آوازیں آشا کے گھر سے آ رہی تھیں۔ جس کا گلی کے کونے والا گھر تھا، سب بھاگے بھاگے اُس کے ہاں پہنچے تو پورے گھر میں مٹی کے تیل کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ اور وہ جل رہی تھی۔

تمام لوگ دور کھڑے بے بسی سے یہ دردناک نظارا دیکھ رہے تھے۔ کہیں کسی کے پاس اس کا حل نہیں تھا۔ لوگوں کے حواس بحال ہونے تک وہ پوری جل چکی تھی، پوری گلی میں گوشت کے جلنے کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ اُس کے تین بیٹے جو سمجھ اور ناسمجھی کی عمر کے تھے دہاڑیں مار مار کے رو رہے تھے۔ وہ معصوم بچی جو خدا سے مانگ مانگ کے لی تھی۔ جہاں کوئی مزار دیکھتی۔ بیٹی کی دعا ضرور مانگتی۔ میرے گھر میں رحمت نہیں۔ فقیر جو ہاتھ پھیلاتا گھر کے دروازے پہ تو اس کے سامنے بھی اپنی التجا رکھ دیتی اور وہ اس کی نم آنکھوں کو دیکھ کر اُس کے سر پر ہاتھ رکھ دیتا۔ بیٹی اللہ تمہیں بیٹی ضرور دے گا جبکہ سلطان اس معاملہ میں خدا کی مرضی کو اہم سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا وہ بیٹھا ہے نا دو جہاں کا مالک، وہ جسے چاہے بیٹے دے، جسے چاہے اُس کی قسمت میں بیٹیاں کر دے۔ مگر آشا کے دل کو قرار کہاں تھا۔

سلطان اور آشا کی زندگی بہت خوش گوار طریقے سے گزر رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے پر جان دیتے تھے۔ خالہ زاد کزن تھے، بچپن کی سنگت تھی، ایک دوسرے کی دھڑکن بن کے جیتے تھے۔ سلطان کو شام کو آنے میں ذرا سی دیر ہو جاتی تو آشا آنکھیں سرخ کر لیتی۔ لہٰذا وہ اس پگلی کی خاطر سب چھوڑ چھاڑ ٹائم پر گھر آ جاتا۔

ساس ان کو دیکھ دیکھ کر جیتی تھی۔ اکلوتا بیٹا تھا اور یہی ہر ماں کا خواب ہوتا ہے کہ بہو بیٹے کو چاہنے والی ہو اور بیٹے کی زندگی مطمئن ہو اور اُسے دائمی خوشیاں حاصل ہوں۔

ساس کے انتقال پر جہاں پُرسے کے لیے خاندان کے اور لوگ آئے وہیں ان میں آشا کا ایک چچازاد کزن بھی تھا جو اب ان کے گھر کبھی کبھی آنے لگا۔ اور وہ ہی عذاب کا باعث ٹھہرا۔

سلطان کو نہ جانے وہ کیوں اچھا نہیں لگتا تھا۔

”آشا! اماں کے زمانے میں تو وہ اِدھر پھٹکتا بھی نہیں تھا اور اب کیوں اُس کا آنا جانا بڑھ گیا ہے۔“

”سلطان آپ کو مجھ پہ شک ہے؟“

”نہیں جان! تم تو پاک باز عورت ہو بہت اچھی ہو، زمانہ ٹھیک نہیں ہے اور اب اماں بھی نہیں۔ تو لوگ باتیں بناتے ہیں کہ جب تم گھر نہیں ہوتے تو وہ آتا ہے۔“

”سلطان! لوگ تو بکواس کرتے ہیں گھر اجاڑنا چاہتے ہیں، آپ کو اپنی آشا پر یقین نہیں۔“ اُس نے آنکھیں پھیلا کر لاڈ سے سلطان کے گلے میں بانہیں ڈالیں تو اس کا دل پل بھر میں موم ہو گیا۔

”تم پہ تو اپنی جان سے بڑھ کے یقین ہے“ آشا کے ہونٹوں پر چھوٹی سی گستاخی کرتے ہوئے بولا اور آشا مسکراتے ہوئے سر جھٹک کے کمرے سے باہر چلی گئی اور وہ سونے کے لیے لیٹ گیا۔

آشا کی دعائیں۔ مزاروں پہ مانگی ہوئی منتیں کام آ گئیں۔ اس کی جھولی میں اللہ تعالیٰ نے ایک سرخ و سفید گڑیا ڈال دی جسے پا کر آشا خوشی سے پھولی نہ سمائی۔

”سلطان دیکھیں یہ میری خواہش میرے رب نے پوری کر دی۔“ اور سلطان مسکرا دیتا۔

”آشا! جب ہم سچے دل سے اپنے رب سے مانگتے ہیں تو وہ ضرور دیتا ہے، ستر ماؤں جتنا پیار کرتا ہے وہ ہم انسانوں سے۔“

آشا اپنے در پہ آنے والے ہر فقیر کو صدا لگانے سے پہلے ہی خیرات دے دیا کرتی تھی۔ اب وہ گڑیا کا صدقہ بلا ناغہ دیا کرتی تھی۔

آپ بھی لکھاری بن سکتے ہیں!!

آیئے! سچی کہانیاں کے قلم قبیلے میں شامل ہوجایئے۔

یہ کارواں آپ کو خوش آمدید کہتا ہے......

خود کو منوایئے، اپنے قلم سے......

اگر آپ کا مشاہدہ اچھا ہے۔

اگر آپ کو اپنے آس پاس ہوئے، انہونے اور لرزا دینے والے واقعات یاد رہتے ہیں اور آپ چاہتے ہیں کہ ان واقعات سے دوسرے بھی سبق سیکھیں، تو پھر فوری طور پر ان واقعات و حادثات کو صفحہ قرطاس پر ڈھال کر ہمیں بھیج دیجیے۔

نوک پلک سنوار کر اُسے کہانی کی شکل ہم خود دے دیں گے۔

تو پھر قلم اٹھایئے اور کسی بھی عبرت ناک، اور سبق آموز سچ کو کہانی میں ڈھالنے کی صلاحیت کو آزمایئے۔

ماہنامہ سچی کہانیاں آپ کی تحریروں کو، آپ کو خوش آمدید کہتا ہے۔

تحریر بھیجنے کے لیے ہمارا پتا:

110، آدم آرکیڈ، شہید ملت روڈ/ بہادر شاہ ظفر روڈ۔ کراچی

ای میل pearlpublications@hotmail.com

"ہاں جی! اس نے اگلے گھر جانا ہے۔ اسے بھی تو میرے سلطان جیسا پیار کرنے والا جیون ساتھی ملنا چاہیے نا۔" اور سلطان اس کی دیوانگی دیکھ کر چپ ہو جاتا۔

تینوں بیٹے باری باری اُس کو گود میں اُٹھائے پھرتے۔

☆......☆

فضا میں چاروں جانب انسانی گوشت جلنے کی بو پھیلی ہوئی تھی، اس کی چیخیں کراہٹ میں بدل چکی تھیں، آنکھوں میں اس قدر بے بسی، کسی سے وہ منظر دیکھا نہیں جا رہا تھا۔

"ہائے نی منگ منگ کے نی رانی لئی سوں۔ اُن وی ساری عمر رون جوگا چھڈ گئی۔" آپا صغراں ساتھ والی ہمسائی بین کر رہی تھی، اس کا آشا کے ساتھ بڑا دوستانہ تھا جو بھی پکتا ایک دوسرے کو دیے بغیر نہ کھاتیں۔ چھ ماہ کی چینی کی گڑیا۔ جسے نہیں معلوم تھا، سکھ کی دعا مانگنے والی ماں اُس کے لیے آنسو چھوڑ گئی ہے عمر بھر کے لیے اور جب ایمبولینس بلا کر اُسے اسپتال لے جانے لگے تو دھاڑیں مارتا سلطان جانے کہاں سے آ گیا۔ سب نے اُسے گھیر لیا۔

"وے جیون جوگیا۔ کی آ کھیا سی؟ کہڑی گل دل نوں لائی۔"

آپا نوراں، باجی چھمی، سب بول رہے تھے۔

"وہ مٹی دا تیل سٹ کے اگ لائی۔ وے تو اڈا تے پیار ای بڑا سی، دس وے سلطانیا، بول وے کی ہویا اے۔" اور وہ پتھر بن گیا۔ اُسے تو خبر ہی نہ تھی کہ اتنی سی بات آشا دل پہ لے لے گی۔

گاؤں کی عورتوں نے گھیرا ڈال لیا اور وہ گم صم سوچوں میں گھرا تھا۔ طرح طرح کے سوال کر رہے تھے، گاؤں کے لوگ۔ مجمع کو چیرتا ہوا سلطان کا دوست چوہدری افضل آیا اور سلطان کا ہاتھ پکڑ کر ایمبولینس میں بٹھا کر چلتا بنا۔

"یہ وقت ان باتوں کا نہیں، ہمیں آشا بہن کی زندگی بچانی ہے۔ وہ گاؤں چھوڑ کر اُس کے والدین تھے۔ وہ بھی روتے پیٹتے اسپتال پہنچ گئے۔ انہیں اندر ایمرجنسی میں جانے نہیں دیا۔ وہ ڈاکٹروں کے آگے ہاتھ جوڑتے رہے۔ ہمیں اپنی بیٹی کو ایک نظر دیکھنے دیں، ڈاکٹرز دو گھنٹے اُس کی زندگی بچانے کی کوشش کرتے رہے، لیکن بچا نہ پائے۔

آشا نے کسی کی فریاد نہ سنی، وہ ایک پاک عورت تھی، الزام اُس سے سہا نہیں گیا، اللہ نے بھی اُسے پردہ دے دیا، بات صرف اتنی معمولی تھی۔ آج پھر اُس کا کزن آیا تھا، چائے پی کر وہ ابھی گھر سے نکلا تھا۔ سلطان بھی آ گیا تھا، جب تک سلطان اس کے نزدیک پہنچتا وہ دوسری گلی مڑ گیا، سلطان مگر اُسے دیکھ چکا تھا، گھر آ کر اُس نے آشا سے گرما گری کی۔ اُس نے قسمیں کھائیں۔

"سلطان میرا ایسا کوئی گندہ تعلق نہیں ہے جو تم خوامخواہ الزام دھرتے جا رہے ہو۔" سلطان بھی زیادتی کر گیا۔ کافی باتیں سنا گیا، اور وہ تو اس روز بہت خوش تھی۔ بیٹی کو اپنا دودھ پلایا اُس کو نہلا کر کپڑے پہنائے، بالک گوشت کا سالن بنا کے رکھا ہوا تھا۔ آٹا گوندھنے لگی تھی کہ سلطان سے تو تو میں میں ہو گئی۔ وہ گھر سے نکل گیا۔ اچانک اسے کیا ہوا گرم چولہے سے مٹی کا تیل نکالا اور سر سے پاؤں تک ڈال کے آگ لگائی۔

جلی ہوئی لاش اسپتال والوں نے ایمرجنسی سے باہر نکال کر گھر والوں کے حوالے کر دی۔ جس گھر میں ایک دن پہلے خوشیاں تھیں وہاں درجنوں لوگ سوگ میں بیٹھے تھے۔ آشا کی چھوٹی جو شہر میں بیاہی ہوئی تھی، وہ آ گئی تھی اُس کے بین نہیں سنے جا رہے تھے۔ لاش پوسٹ مارٹم والوں کے پاس تھی۔ والدین سر جھکائے، آنسو بہاتے بیٹھے تھے، سلطان کو پوچھ گچھ کے لیے پولیس تھانے لے گئی تھی اور معصوم بچے خالہ کے ساتھ لپٹ کر دھاڑیں مار کے رو رہے تھے۔

آشا اس مردوں کے معاشرے میں اپنی بے گناہی کا ثبوت بھلا کس طرح دے سکتی تھی، زندہ جہنم جینے سے بہتر اُس نے حرام موت والی جہنم کا راستہ چن لیا تھا، اور گڑیا معصومیت سے آنکھیں گھما گھما کے سبھی دیکھ رہی تھی، اپنی ماں کو کھوجتی آنکھوں کو اب ہمیشہ اسی طرح سے کھوجنا تھا۔

☆☆......☆☆

یہی دنیا ہے

رفعت محمود

مکافاتِ عمل کی ایک تصویر، راولپنڈی سے

میاں اجمل کی بیگم زہرہ سرکاری اسپتال کے گائنی وارڈ میں داخل تھی۔ اس کے ہاں پانچویں بچے کی پیدائش متوقع تھی۔ میاں اجمل کے بہنوئی خورشید صاحب اور ان کی بیگم عطیہ بانو بھی اسپتال میں موجود تھے۔ وہ لاہور سے سیدھے اسٹیشن پر اُتر کر اسپتال آگئے تھے۔ وہ دونوں دعائیں مانگ رہے تھے کہ خدا کرے زہرہ بیگم بیٹے کو جنم دے۔ اس سے پہلے زہرہ بیگم کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ اجمل ایک سرکاری ادارے میں کلرک تھے۔ تنخواہ بھی زیادہ نہ تھی مکان بھی کرائے کا تھا۔ اس لیے گزر بسر مشکل سے ہوتی تھی۔ پھر بھی وہ اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھے ہوئے تھے اور کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے تھے۔

ان کے بہنوئی خورشید بھی امیر کبیر تو نہ تھے مگر پھر بھی ان کی مالی پوزیشن اجمل سے بہتر تھی۔ گھر بھی ان کا اپنا تھا۔ انارکلی بازار میں ان کی چھوٹی سی دکان تھی۔ جہاں گوٹہ کناری، لیس، نلکیاں اور بٹن وغیرہ فروخت ہوتے تھے۔ ان کی گزر بسر بہتر انداز میں ہو رہی تھی۔ کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ ہاں اگر کمی تھی تو اولاد کی۔ ان کی اور عطیہ کی شادی ہوئے دس سال بیت گئے تھے۔ مگر وہ ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ ان دونوں میں بظاہر کوئی نقص نہ تھا۔ پھر بھی انہوں نے ہر طرح کا علاج کرالیا۔ درباروں اور خانقاہوں پر حاضری دی۔ منتیں مانیں، مگر ان کا دامن مراد خالی ہی رہا۔ دونوں کو ایک اولاد کی بہت ہی تمنا تھی۔ یہ تو وہ واحد شے ہے جو بازار میں نہیں ملتی۔ یہ مولا کی دین ہوتی ہے۔ جسے دے دے اور جس کے گھر یہ پھول نہ ہو۔ لوگ ترس کھاتے ہیں کہ اس بیچارے کا کوئی نام لیوا ہی نہیں۔

خورشید اور عطیہ کی بھی یہی کیفیت تھی۔ ان کے اس دکھ کا احساس سب کو ہی تھا۔ جب انہیں اولاد کی کوئی اُمید اور آس نہ رہی تو انہوں نے بچہ گود لینے کا فیصلہ کرلیا۔ ان ہی دنوں زہرہ اُمید سے تھی۔ انہوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار اجمل اور زہرہ سے کیا۔ تو ان دونوں نے ان کا مان نہ توڑا اور ان کی خواہش کی تکمیل کرنے کا ارادہ کرلیا۔ طے یہ پایا کہ آنے والا بچہ لڑکا ہو یا لڑکی ...... وہ ان کو دے دیں گے۔ اس معاملہ میں راز داری برتنے کا بھی وعدہ ہوا کہ اس بار زہرہ بیگم بیماری کے بہانے اسپتال میں داخل ہوں گی۔ تاکہ کسی کو معلوم نہ ہو کہ وہ ڈلیوری کے لیے اسپتال گئی ہیں۔ ڈلیوری کے موقع پر خورشید اور عطیہ اسپتال ہی آئیں گے اور ڈلیوری کے بعد بچہ

دہاں سے ہی لے کر واپس لاہور چلے جائیں گے۔ یہ بات ان چاروں کے درمیان رہتی تھی۔ برادری والوں کو بھی بعد میں یہی بتایا جاتا تھا کہ وہ بچہ خورشید اور عطیہ کا ہے۔

☆......☆......☆

خورشید اور عطیہ کی دعائیں قبول ہوگئیں۔ زہرہ نے ایک اور بیٹے کو جنم دیا۔ دن رات زہرہ نے اسپتال میں ہی گزارا اور اگلے روز خورشید اور عطیہ بچے کو لے کر لاہور چلے گئے اور اجمل زہرہ کو لے کر گھر آ گیا۔ جاننے والوں کو انہوں نے یہی بتایا کہ بچہ ضائع ہوگیا ہے اور زہرہ اسی سلسلے میں اسپتال میں داخل ہوئی تھی۔ ان کے پہلے بچے تو اتنے چھوٹے تھے کہ ان کو اس بات کا احساس ہی نہ تھا کہ ان کی ماں اسپتال میں کیوں داخل ہوئی ہے۔

خورشید اور عطیہ بہت ہی خوش تھے۔ انہوں نے اس بچہ کا نام نواز رکھا۔ اور اس کی پرورش کے لیے دن رات ایک کر ڈالا۔ انہوں نے نواز کا اتنا خیال رکھا۔ اسے اتنی چاہت دی کہ شاید ان کی سگی اولاد ہوتی تو وہ اسے اتنی محبت نہ دے پاتے۔ اجمل اور زہرہ نہایت ہی مطمئن تھے کسی قسم کا پچھتاوا ان کو نہ تھا۔ ان کو تو اس بات کی تسلی اور اطمینان تھا کہ نواز کی پرورش دوسرے بچوں سے بہتر انداز میں ہو رہی ہے۔ وہ ان کے پاس ہوتا تو وہ اس کی پرورش اس انداز میں نہ کر پاتے۔ ان کے گھر میں رہ کر وہ اتنی چاہت بھی حاصل نہ کر پاتا۔

یوں ہی وقت گزرنے لگا۔ چند برس بیت گئے۔ خورشید اور عطیہ نے نواز کی تعلیم و تربیت بہتر انداز میں کرنے کی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اسے اچھے تعلیمی ادارے سے تعلیم دلوائی۔ اب بھی کبھی کبھار ہی وہ اجمل اور زہرہ سے ملنے آتے تھے۔ البتہ ٹیلی فون پر اکثر ان کی گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ سب لوگ ہی مسرور اور مطمئن تھے۔ خورشید اور عطیہ جب بھی اجمل اور زہرہ سے ملنے آتے تو نواز بھی ان کے ہمراہ ہی ہوتا تھا۔ اجمل و زہرہ کے بچے نواز کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر نہ



صرف حیران ہوتے بلکہ احساس کمتری کا بھی شکار ہو جاتے۔ مگر نواز کا ان کے ساتھ برتاؤ دوستانہ تھا۔ وہ انہیں ماموں کی اولاد سمجھتا اور ان کے ساتھ کھیلتا کودتا۔

وقت گزرتا رہا۔ سارے بچے جوان ہو گئے نواز ان دنوں کالج میں پڑھ رہا تھا۔ اس کا شمار ذہین طلبا میں ہوتا تھا۔ جبکہ اجمل اور زہرہ کے دونوں بیٹے نکھٹو ہی نکلے۔ انہوں نے معمولی تعلیم حاصل کی اور کسی فیکٹری میں مزدوری کرنے لگے۔ اجمل نے بڑی بیٹی کی شادی برادری میں ہی کر دی۔ وہ لوگ بھی ان کے ہی ہم پلہ تھے۔ چھوٹی بیٹی فائزہ دسویں کلاس میں پڑھ رہی تھی۔ اس نے خوب قد کاٹھ نکالا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کا حسن اور شباب بھی لاجواب تھا۔ وہ لاکھوں میں ایک لگتی تھی۔ پوری برادری میں اس جیسی خوبصورت لڑکی نہ تھی۔ ہر کوئی اس کے حسن کے قصیدے کہتا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ نہایت ہی شریف، باپردہ اور سعادت مند تھی۔ اس نے کبھی کوئی خواب نہ دیکھا تھا۔ ہاں اسے پڑھنے کا شوق ضرور تھا۔

برادری میں ایک شادی تھی۔ تین برس بعد خورشید اور عطیہ شادی میں شرکت کے لیے اپنے آبائی شہر آئے تو نواز بھی ان کے ہمراہ تھا۔ نواز بھی مردانہ حسن و جمال میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ وہ اب بھرپور جوان تھا۔ برادری کی کئی لڑکیوں نے اسے دیکھ کر آہیں بھریں اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ کاش نواز اس کا جیون ساتھی بن جائے۔ مگر نواز نے کسی کی طرف بھی نگاہِ التفات نہ ڈالی۔ اسے تو اجمل اور زہرہ کی بیٹی فائزہ بھا گئی تھی۔

بس وہ اُس کے ملن کے خواب سجائے واپس لوٹ آیا۔ اس نے فائزہ کو ایک ہی نظر میں پسند کر لیا تھا۔ دونوں کے مابین کسی قسم کے پیغامات کا تبادلہ نہ ہوا تھا۔ نواز نے ایک نظر فائزہ کو دیکھا اور پسند کر لیا۔

اِدھر خورشید اور زہرہ نے بھی ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ خورشید اپنے ایک دوست کی بیٹی کے ساتھ نواز کی شادی کرنے کا خواہش مند تھا۔ ان دونوں گھرانوں کی آپس میں خوب بنتی تھی۔ زہرہ بھی یہی چاہتی تھی۔ ان کا ارادہ تھا کہ جوں ہی نواز کالج سے تعلیم مکمل کر کے فارغ ہو گا تو وہ اس کی شادی کر دیں گے۔

نواز کو بھی کچھ نہ کچھ معلوم تھا کہ اس کے والدین اس کی شادی کہاں کرنا چاہتے تھے۔ مگر اب تو اس نے اپنی مرضی سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یوں ہی دو سال کا عرصہ گزر گیا۔ نواز تعلیم مکمل کر کے سروس کی تلاش میں تھا کہ اس کے والدین نے اس پر شادی کے لیے زور دینا شروع کر دیا۔ مگر نواز ملازمت ملنے سے قبل شادی کے معاملہ میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔

☆......☆......☆

بالآخر نواز کو ایک سرکاری ادارے میں اسسٹنٹ کی جاب مل گئی۔ سروس ملنے کے بعد جب اس کے والدین نے شادی کا موضوع چھیڑا تو اس نے اپنی مرضی سے شادی کا عندیہ دیا تو خورشید اور عطیہ نے نواز کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اسے کہا کہ وہ اُس کی شادی اس کی مرضی سے ہی کریں گے۔ نواز خوش ہو گیا اور کہنے لگا۔

''آپ برادری سے باہر شادی کرنے کا کیوں سوچ رہے ہیں۔ برادری میں بھی ایک لڑکی ہے جو مجھے پسند ہے۔'' عطیہ بیگم نے شک بھرے لہجے میں کہا۔

''ہاں...... ہاں...... کیوں نہیں۔ جہاں تم چاہو گے وہاں ہی تمہاری شادی ہو گی۔''

''امی جان! آپ پریشان کیوں ہوتی ہیں۔ لڑکی تو گھر میں ہی موجود ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو بیٹا؟'' عطیہ بیگم نے پریشان کن لہجے میں کہا۔ کیونکہ ان کی چھٹی حس ان کو کسی خطرے کی نشاندہی کر رہی تھی۔

''میں ماموں اجمل کی بیٹی فائزہ کو پسند کرتا ہوں آپ اس کے ساتھ میری شادی کر دیں۔'' نواز کے الفاظ کسی دھماکے سے کم نہ تھے۔ عطیہ بیگم لرز کر رہ گئی۔

''نہیں نواز نہیں...... ایسا مت کہو۔ فائزہ سے تمہاری شادی نہیں ہو سکتی۔'' عطیہ نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''کیوں امی جان؟ فائزہ میں کیا خامی ہے۔ وہ جوان ہے پڑھی لکھی اور خوبصورت بھی ہے اور پھر آپ کی بھتیجی بھی ہے۔'' نواز نے انہیں قائل کرنا چاہا۔

''مگر پھر بھی یہ شادی نہیں ہوسکتی۔'' عطیہ بیگم نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

''کیوں نہیں ہوسکتی؟ میں فائزہ کو پسند کرتا ہوں۔ میری شادی صرف فائزہ سے ہوگی۔'' نواز کا لہجہ بھی اٹل تھا۔

''میں نے کہا ناں..... نہیں ہرگز نہیں۔ تم کوئی اور لڑکی برادری کی پسند کرلو۔''

''مگر فائزہ میں کیا خامی ہے؟'' نواز کا لہجہ تلخ ہوگیا اور وہ غصے میں گھر سے باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

عطیہ بیگم پریشانی میں گھر گئی۔ اسے یہ اُمید نہ تھی کہ نوبت یہاں تک آجائے گی کہ نواز اپنی ہی بہن سے شادی کے لیے کہے گا۔ پچھتاوؤں نے انہیں گھیر لیا کہ کاش وہ نواز کو بیٹا بنانے کو راز نہ رکھتیں۔

عطیہ نے فون کرکے خورشید کو گھر بلایا اور اس کو نواز کی تمام گفتگو سنادی۔ خورشید بھی پریشان ہوگیا کہ اب کیا ہوگا۔ نواز کتنا ضدی ہے، وہ خوب جانتے تھے ان کے بے پناہ لاڈ اور پیار نے ہی اسے ضدی بنایا تھا۔ خورشید بھی پچھتانے لگا کہ کاش انہوں نے نواز سے کچھ نہ چھپایا ہوتا۔ انہوں نے تو اسکول کے داخلہ فارم اور شناختی کارڈ میں بھی ولدیت کے خانے میں اپنا نام لکھوایا ہوا تھا۔ جس کی رُو سے نواز ان کا سگا بیٹا تھا۔ اور وہ ان کا اکلوتا وارث بھی تھا۔

نواز کی فائزہ سے شادی کرنے کی ضد کو دیکھ کر دونوں میاں بیوی نے نواز کو حقیقت بتانے کا فیصلہ کرلیا۔ کیونکہ یہ کوئی جرم اور گناہ تو تھا نہیں۔ محض ایک راز تھا۔ جو چار لوگوں کو معلوم تھا۔ نواز رات گئے واپس لوٹا تھا۔ اس لیے اس وقت انہوں نے اس سے کوئی بات نہ کی۔ انہیں اُمید تھی کہ نواز حقیقت جان کر کسی قسم کے جارحانہ ردِعمل کا مظاہرہ نہیں کرے گا۔ اور حقیقت کو دل سے تسلیم کرکے ان دونوں کا مان رکھے گا۔

☆......☆......☆

اگلی صبح ناشتے کے بعد خورشید نے خود ہی نواز کی شادی کا موضوع چھیڑا۔ تو نواز نے ان سے بھی اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ تو خورشید نے بھی یہی کہا کہ تمہاری شادی فائزہ سے نہیں ہوسکتی۔

''مگر کیوں؟'' نواز نے وہی سوال پھر دہرایا۔

''اس لیے کہ فائزہ تمہاری سگی بہن ہے۔ تم اجمل اور زہرہ کی اولاد ہو۔ تم نے جس روز جنم لیا تھا۔ اس سے اگلے روز ہم تمہیں اسپتال ہی سے لے کر یہاں آگئے تھے۔''

''کیا کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' نواز نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

جواب میں خورشید اور زہرہ نے اسے تمام بات

انقلاب، نیا نہ پرانا، صرف پاکستان

آج کل پاکستان ایک عجیب و غریب کیفیت سے دوچار ہے۔ کہیں انقلاب، کہیں نیا پاکستان اور کہیں فرسودہ جمہوریت کے نعرے لگائے جارہے ہیں۔ اس موجودہ صورتحال سے پاکستان کے عوام اور معیشت شدید متاثر ہورہی ہے۔ یہ انتشار اور انارکی کی سیاست ہمیں معاشی اور سیاسی طور پر ایک ناکام ریاست کی طرف دھکیل رہی ہے۔ لہٰذا ہم سب کو ذاتی مفادات اور خواہشات کو ایک طرف رکھ کر ملک کی سلامتی اور بقاء کے لیے کام کرنا چاہیے، تاکہ ہمارا ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہوسکے۔ جہاں عوام کو برابر حقوق دیے جائیں اور عالمی طور پر پاکستان کے وقار میں اضافے کی کوشش ہمارا نصب العین ہونا چاہیے۔

حسنِ خیال: میاں عاشر چغتائی۔ کراچی

بتادی اور اس سے کہا کہ ہم نے کوئی جرم یا گناہ تو نہیں کیا۔ بس یہ غلطی ہوگئی کہ ہم نے اس بات کو راز رکھا۔ پھر بھی ہم تم سے معذرت چاہتے ہیں۔ ہم نے تو اس راز کو راز ہی رکھنا تھا۔ مگر آج نوبت ہی ایسی آگئی ہے کہ مجبوراً اس سے پردہ اٹھانا پڑا ہے۔

نواز نے ساری بات سنی۔ تو اس نے بظاہر کسی قسم کے ردِعمل کا اظہار نہ کیا کیونکہ یہ کوئی بڑی بات نہ تھی۔ اُس نے حقیقت کو تسلیم کرلیا۔ اور خاموشی سے دفتر روانہ ہوگیا۔ دفتر میں سارا دن وہ سوچوں میں گم رہا۔

ایک خلش اسے چین نہ لینے دے رہی تھی کہ ''اس نے اپنی ہی بہن کو شادی کے لیے منتخب کیا۔ گویا اس نے ایک جرم کیا ہے۔ اور یہ ایک جرم ہے کہ جس کی سزا وہ خود کو دینے کا سوچنے لگا۔ کاش اس کے والدین یا خورشید اور پھوپی عطیہ اس کو حقیقت بتادیتے تو وہ ایسی غلطی نہ کرتا۔'' اس کا ضمیر اسے ملامت کرنے لگا۔ وہ ہر وقت ان ہی سوچوں میں گم رہنے لگا کہ وہ اپنے ہی ضمیر کا قیدی بن گیا۔

☆......☆......☆

خورشید نے اجمل کو فون کر کے ساری بات بتادی تھی۔ ایک ہفتہ بعد خورشید عطیہ اور نواز واپس آبائی شہر آگئے۔ اور تمام برادری کو حقیقت بتادی کہ نواز ان کا نہیں بلکہ اجمل اور زہرہ کا بیٹا ہے۔ برادری میں چند دن اس کا چرچا رہا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ پھر آہستہ آہستہ سب کچھ معمول پر آگیا۔

نواز نے بظاہر تو اس حقیقت کو قبول کرلیا اور واپس لوٹ آیا تھا۔ مگر ضمیر کی کسک اسے چین نہ لینے دیتی تھی کہ اس نے اپنی سگی بہن کو بھائی کی نظروں سے کیوں نہ دیکھا؟ بس یہی خلش اسے بیقرار رکھتی۔

اس دن سے نواز نے خاموشی سی اختیار کرلی۔ مسکراہٹ اس کے لبوں سے غائب ہوگئی اور اس کی جگہ اضطراب اور بے چینی نے لے لی۔ حالانکہ یہ کوئی بڑی بات نہ تھی۔ مگر اس معمولی سی بات نے نواز کے دل میں گھر کرلیا۔ فائزہ کو تو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ نواز نے خورشید اور عطیہ سے کیا بات کی ہے اور برسوں پرانا راز کیوں عیاں کیا گیا ہے۔ وہ تو خوش تھی کہ نواز اس کا سگا بھائی ہے۔ نواز کا رویہ خورشید اور عطیہ بیگم کے ساتھ بھی کھر درا سا ہوگیا۔ وہ ان کی ہر بات کو نظر انداز کرنے لگا اور کبھی کبھار بدتمیزی بھی کرنے لگا۔ اس نے ان کو صاف کہہ دیا کہ وہ اس کے لیے کوئی لڑکی تلاش نہ کریں وہ اپنی پسند سے شادی کرلے گا۔''

خورشید اور عطیہ نے اس کی بات مان لی کہ وہ اب اس کے لیے خود سے کوئی لڑکی تلاش نہ کریں گے۔ خورشید اور عطیہ کے دلوں میں تو نواز کی محبت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ کیونکہ وہی تو ان کا آخری سہارا تھا۔ مگر نواز کے دل میں ان کے لیے نفرت پیدا ہوگئی۔ اس نے اپنے سگے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے ساتھ بھی سرد رویہ اپنا لیا۔ ایسے جیسے وہ سب اس کے کچھ نہ لگتے ہوں۔ اس نے راتیں بھی گھر سے باہر گزارنی شروع کردیں۔ اسے کسی کا بھی احساس اور خیال نہ رہا۔

تب خورشید اور عطیہ نے رو رو کر اس سے اپنی غلطی کی معافی مانگی۔ مگر وہ اس کا دل موم نہ کرسکے۔ خورشید نواز کے رویے سے پریشان رہنے لگا۔ اُسی اُلجھن نے اس کو بیمار کر ڈالا۔ اس کو دل کی تکلیف ہوگئی اور بیڈ سے لگ گیا۔

نواز نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور انارکلی والی دکان ہی فروخت کر ڈالی۔ اس کے علاوہ بھی اس نے خورشید کے نام کی تمام جائیداد بھی فروخت کر ڈالی۔ خورشید یہ صدمہ برداشت نہ کرسکا اور زندگی سے ناتا توڑ گیا۔

دو ماہ بعد ہی نواز نے شادی کرلی۔ روزینہ سے اس نے محبت کی شادی کی تھی۔ روزینہ ایک اسکول میں ٹیچر تھی۔ وہ حسن و جمال میں بھی لاکھوں میں ایک تھی۔ عطیہ بیگم نے روزینہ کو دل سے اپنی بہو تسلیم کرلیا اور اسے نہ صرف ساس بلکہ ایک ماں کی محبت دی۔ مگر نواز اور روزینہ نے ان کی محبت کی قدر نہ کی۔ گھر میں عطیہ بیگم کی حیثیت ایک نوکرانی کی سی ہوگئی۔ نواز کی بے رُخی اور بے اعتنائی نے عطیہ بیگم کو دکھی کر ڈالا۔

نواز کی اسی بے رخی اور ستم ظریفی نے ایک روز عطیہ بیگم کی بھی جان لے لی۔ اب سب کچھ نواز کا تھا۔

اسے اب مکمل آزادی مل گئی۔ کوئی اسے روک ٹوک کرنے والا نہ رہا تھا۔

☆......☆......☆

نواز اور روزینہ ایک دوسرے کو بے حد چاہتے تھے اور ایک دوسرے کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ نواز کے کہنے پر روزینہ نے ملازمت چھوڑ دی۔ گھر اپنا تھا، اس لیے نواز کی تنخواہ سے گزر بسر بہتر ہونے لگی تھی۔ انہیں کسی قسم کا دکھ تکلیف اور پریشانی نہ تھی۔ دونوں میں اتفاق اور پیار تھا۔ ان کی شادی ہوئے دو سال گزر گئے۔ مگر روزینہ کی کوکھ ابھی تک خالی تھی۔ نواز کے دفتر چلے جانے کے بعد وہ بالکل اکیلی رہ جاتی تھی۔ وہ سوچتی "اگر اس کی گود میں ننھا کھلونا ہوتا تو وہ تنہائی کا شکار نہ ہوتی۔ وہ اس سے کھیلتی باتیں کرتی۔"

سوچتے سوچتے جب وہ تھک جاتی تو تب اسے خدا یاد آ جاتا۔ اور وہ نماز کے لیے کھڑی ہو جاتی کہ اولاد دینے والی تو وہی ذات ہے۔ اس سے مانگنا چاہیے۔

نواز بھی فکر مند تھا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ ان کی دعاؤں اور فکر میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

شادی ہوئے سات سال بیت گئے تھے۔ اور ان کا آنگن سونا تھا۔ روزینہ تو تقریباً مایوس ہی ہو چکی تھی کہ قدرت کو اس پر رحم آ گیا۔ وہ اُمید سے ہوئی تو نواز کی رگوں میں بھی توانائی سی آ گئی۔

آخر وہ دن آ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے نواز اور روزینہ کی سن لی۔ روزینہ نے بیٹے کو جنم دیا تو ان کے گھر میں خوشیوں کی بارات اُتر آئی۔ زندگی حسین ہو گئی۔ چاروں طرف رنگ برنگے پھول کھل اٹھے۔ انہوں نے بیٹے کا نام پہلے ہی سوچ لیا تھا "دانیال" ان دونوں کا پسندیدہ نام تھا۔

دانیال ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھا۔ جان سے بڑھ کر پیارا تھا۔ روزمرہ کے معمولات بدلنے لگے۔ اخراجات کی حدیں بڑھنے لگیں۔ اضافی بِل بھی آنے لگا۔ ڈاکٹروں کے پاس چیک اپ کے لیے جانے کی فیس اور دیگر اخراجات نے گھر کے بجٹ کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔ نواز نے اپنے ذاتی اخراجات میں کمی کر دی۔ وہ اچھے کپڑے پہنا کرتا تھا مگر اب اس طرف سے بھی لاپروا ہو گیا۔ اب تو یہ بھی ضروری تھا کہ ہر ماہ کچھ نہ کچھ رقم جمع کی جائے تاکہ وہ دانیال کے کام آ سکے۔

☆......☆......☆

دانیال اب پانچ سال کا ہو چلا تھا۔ اب اس کے اسکول میں داخلے کا مسئلہ تھا۔ قریبی اسکولوں میں داخلہ مل رہا تھا مگر روزینہ کا خیال تھا بلکہ ضد تھی کہ بیٹا انگلش میڈیم اسکول میں ہی پڑھے گا۔ بڑا اسکول ان کے گھر سے دس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ داخلہ فیس، ماہانہ فیس، ویگن کا خرچ یونیفارم، کتابیں، کاپیاں، کھیل، تقریبات یہ سب مل کر نواز کی آدھی تنخواہ کے قریب بن جاتا تھا۔ بقول روزینہ کے بڑا آدمی بننے کے لیے بڑے اسکول میں داخل کرانا ضروری تھا۔

بہت سوچا گیا۔ نواز نے کئی مثالیں دیں اور دلیلوں سے ثابت کرنے کی کوشش کی مگر اس کی ایک نہ چل سکی۔ طے پایا کہ روزینہ پھر سے نوکری کرلے۔ لہٰذا اولاد کے بہتر مستقبل کے لیے روزینہ ایک بار پھر گھر سے نکل پڑی۔ نواز اس کے حق میں نہ تھا۔ مگر روزینہ نے کچھ اپنی ضد سے کچھ دلائل سے کچھ اداؤں سے نواز کو منا ہی لیا تھا۔ بچے کے سنہری مستقبل کے لیے وہ یہ کڑوا گھونٹ پی گیا۔

روزینہ کی نوکری سے نواز کی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئیں۔ اب ان تین بندوں کا قافلہ صبح سویرے ایک ساتھ گھر سے نکلتا۔ پہلے روزینہ اپنے اسکول اترتی، پھر دانیال اور آخر میں نواز اپنے دفتر جاتا۔ دانیال کے حسین مستقبل کے آگے اسے یہ محنت ایک عبادت کی مانند تھی۔

☆......☆......☆

وقت پر لگا کر اُڑتا رہا۔ دانیال تین پہیوں والی سائیکل سے موٹر سائیکل پر آ گیا۔ اور نواز موٹر سائیکل سے ایک سیکنڈ ہینڈ گاڑی پر۔ روزینہ بھی ترقی کر کے اب سیکنڈ ہیڈ مسٹریس بن چکی تھی۔ دانیال اب سینئر کیمبرج میں تھا۔ دونوں میاں بیوی ساری دنیا کو بھلا کر بچے کے شاندار کل کے لیے معمول سے ہٹ کر

محنت کر رہے تھے۔ پھر بھی دونوں میاں بیوی کی تنخواہ میں سے ایک تنخواہ دانیال کا مستقبل کھا رہا تھا۔ دانیال زندگی کے مسائل اور اُلجھنوں سے دُور اس سُنہری منزل اور شاندار مقام کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ جو اس کے ماں باپ نے سوچ رکھا تھا۔ حسب توفیق دانیال کی ہر خواہش پوری کی جاتی۔ گھر آ کر ایک ٹیچر اسے پڑھاتا بھی تھا۔ وہ بھی والدین کی ان قربانیوں کا حق ادا کر رہا تھا۔ اس کا تعلیمی ریکارڈ اب تک بہت اچھا جا رہا تھا۔ اسے اپنے ماں باپ سے بھی بہت محبت تھی اور ان دونوں کا تو سارا پیار ہی دانیال کے لیے مخصوص تھا۔

دانیال نے سینئر کیمبرج شاندار نمبروں اور پوزیشن کے ساتھ پاس کیا۔ روزینہ کی خواہش تھی کہ دانیال کو اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ بھیجا جائے۔

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے نا، یہاں تک تو ہماری کوشش اور حیثیت کے مطابق تھا۔ اب آ کے انگلینڈ کی تعلیم کے اخراجات میرے بس میں نہیں۔'' نواز بولا۔

''کوشش تو کریں۔ اِدھر اُدھر دیکھیں۔ ہاتھ پاؤں ماریں تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔'' روزینہ نے کہا۔

''مگر کیسے؟'' نواز بولا۔

''دیکھو نواز! میں بتاتی ہوں، آپ اپنی گاڑی فروخت کر دیں۔ دفتر سے ایڈوانس لے لیں۔ میں کچھ اپنا زیور بیچ دیتی ہوں۔ آخر یہ سب کچھ اُسی کا تو ہے۔ پھر یہ آج ہی اس کے کام کیوں نہ آئے۔'' روزینہ نے نواز کو قائل کرتے ہوئے کہا۔

اور پھر نواز نے دفتر سے ایڈوانس لے لیا۔ کار بھی فروخت ہوگئی۔ کچھ زیور بھی بکا، اور پھر وہ وقت آن پہنچا جب نواز اور روزینہ نے اپنے لختِ جگر کو آنسوؤں کے ساتھ دعاؤں کی چھاؤں میں رُخصت کیا۔

☆......☆......☆

دانیال کو انگلینڈ گئے تین سال گزر گئے تھے۔ روزینہ نے اب نوکری چھوڑ دی تھی اب اس کا سارا وقت توجہ گھر پر ہی تھی۔ دونوں میاں بیوی اب بہت اکیلا پن محسوس کرتے تھے۔ دانیال کا ایک سال کا کورس باقی تھا اور پھر اس نے لوٹ کر ماں باپ کے پاس آنا تھا۔

نواز اور روزینہ کے سامنے اب ایک ہی خوشی تھی۔ دانیال کی واپسی اور اس کے سر پر سہرا بندھا دیکھنا۔ انہوں نے تو اس کے لیے لڑکی بھی پسند کر لی تھی۔ اور بات بھی پکی کر لی تھی۔ اس دوران دانیال کے خطوط بھی آتے تھے اور کبھی کبھار فون بھی...... وہ وہاں محنت سے پڑھ رہا تھا۔ اور شاید پارٹ ٹائم جاب بھی کر رہا تھا۔ اسے وہاں تک پہنچانے اور سیٹ کرنے تک تو نواز کی ہمت تھی۔ مگر وہاں کے تعلیمی اخراجات اور دیگر روزمرہ کے اخراجات اس کے بس سے باہر تھے۔

دانیال اب بھی کسی نہ کسی بہانے کسی آنے جانے والے کے ہاتھ کچھ نہ کچھ رقم منگواتا ہی رہتا تھا۔ اس نے اپنی تصویریں بھی بھیجی تھیں۔ اس کی صحت بہت اچھی ہوگئی تھی۔ وہ ایک خوبصورت نوجوان نظر آتا تھا۔ یونیورسٹی کے لان میں اس کی ایک تصویر میں اس کے ساتھ ایک گوری لڑکی بھی کھڑی تھی۔ جو دانیال کو پیار بھری مسکراہٹ سے دیکھ رہی تھی۔ روزینہ نے فوراً ہی قینچی سے اس گوری کی تصویر کاٹ کر علیحدہ کی اور پھر اسے آگ لگا دی اور بولی۔ ''یہ ڈائن کہیں میرے بیٹے پر قبضہ ہی نہ کر لے۔''

لیکن یہ حقیقت تھی کہ دانیال نے مارگریٹ سے شادی کر لی تھی۔ اور اب وہ برطانیہ کا شہری بن گیا تھا۔ اس نے اپنے ماں باپ کو اس سے بے خبر رکھا ہوا تھا۔ اُس نے تعلیم بھی مکمل نہیں کی تھی۔ مارگریٹ کی صحبت میں کھو کر وہ اپنے وطن اور ماں باپ کو بھول گیا تھا۔ بس کبھی کبھار وہ ان کو یاد کر لیتا تھا۔ مارگریٹ کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا۔ جو جرائم پیشہ تھا۔ لہٰذا اس نے دانیال کو بھی اسی رنگ میں رنگ لیا تھا۔ دانیال کو اب وہ لوگ ''دانی'' کہہ کر بلاتے تھے۔ دانی ان لوگوں کی بات مان کر کامیابیاں حاصل کر رہا تھا۔

مارگریٹ کی محبت اور دولت کی ریل پیل نے دانی کو ہر فکر سے آزاد کر رکھا تھا۔

نواز اور روزینہ کا اصرار بڑھ رہا تھا کہ وہ اب واپس لوٹ آئے مگر دانیال کا اب واپس آنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ بالآخر پانچ سال کے بعد دانیال نے پاکستان آنے کا پروگرام بنایا۔

☆......☆......☆

نواز نے روزینہ کو دانیال کے آنے کی اطلاع دی تو وہ بہت ہی خوش ہوئی۔

''کتنی جلدی پانچ سال بیت گئے۔ ابھی کل ہی کی بات لگتی ہے۔'' نواز خوشی سے بولا۔

''آپ کو لگتی ہوگی۔ میرے دل سے پوچھیں کتنی صدیاں بیت گئی ہیں۔'' روزینہ بولی۔

تین دن بعد دانیال اپنے ماں باپ کے پاس تھا۔ نواز اور روزینہ کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور ان کی خواہشوں کی تکمیل کی صورت دانیال ان کے سامنے تھا۔ مگر وہ اکیلا نہ تھا۔ مارگریٹ بھی اس کے ہمراہ تھی۔ دانیال نے ماں باپ سے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''یہ مارگریٹ ہے میری محبت اور میری بیوی۔''

نواز کا پارہ چڑھ گیا۔ اور وہ چلایا۔ ''کیا تجھے اسی لیے باہر بھیجا تھا کہ تو عشق لڑاتا پھرے۔''

''صرف عشق نہیں ابو۔ مجھے وہاں کی نیشنلیٹی بھی مل گئی ہے۔'' دانیال نے کہا۔

''کس نے تجھے یہ حق دیا ہے، کس کے مشورے سے تُو نے شادی کی ہے۔'' اب روزینہ بولی تھی۔

''یہ میری زندگی اور مستقبل کا سوال تھا۔'' دانیال نے ان کو قائل کرنا چاہا۔

مگر وہ دونوں ہی غصہ سے بے قابو ہونے لگے۔ دانیال نے جب دیکھا تو کہنے لگا۔

''آپ بے فکر رہیں، میں دو ہفتے بعد واپس چلا جاؤں گا۔ ہم دونوں کسی کام کے سلسلے میں آئے ہیں۔ یہاں کچھ لوگوں سے ملنا ہے اور پھر لوٹ جائیں گے۔''

نواز اور روزینہ ہاتھ ملتے رہ گئے۔ دانیال نے ان کی ایک نہ سنی۔ وہ ان کو یوں نظر انداز کرنے لگا۔ جیسے وہ ان کی اولاد ہی نہ ہو۔ وہ اور مارگریٹ صبح صبح گھر سے نکل جاتے اور رات گئے گھر لوٹتے۔

نواز اور روزینہ کو ان دونوں کی سرگرمیاں مشکوک لگنے لگیں۔ مگر انہوں نے اس طرف زیادہ توجہ نہ دی۔ ان کی یہی کوشش تھی کہ دانیال اب واپس انگلینڈ نہ جائے اور مارگریٹ کو طلاق دے کر واپس بھیج دے۔ مگر دانیال تو ان کو بات کرنے کا وقت ہی نہ دیتا جیسے وہ اس کے ماں باپ ہی نہیں۔ مارگریٹ کی چاہت اور دولت کی ہوس نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔

نواز کی شفقت اور روزینہ کے آنسو بھی دانیال کا دل موم نہ کر سکے۔ روزینہ نے اس کی منتیں کیں۔ ہاتھ جوڑے اپنی ممتا کا واسطہ دیا۔ مگر دانیال پر کسی بھی آہ اور فریاد کا اثر نہ ہوا۔ وہ نہ جانے کس مشن پر پاکستان آیا تھا۔

پندرہ دن گزر گئے۔ دانیال نے واپسی کی تیاری کر لی۔ ماں اور باپ کی محبت کی زنجیر بھی اسے نہ روک سکی اور وہ ان دونوں کو بے سہارا چھوڑ کر جہاز پر سوار ہو گیا۔

دانیال کی اس بے رخی نے روزینہ کو اتنا دکھ دیا کہ وہ چارپائی سے لگ گئی اور آنسو اس کا مقدر بن گئے۔ مانچسٹر ایئرپورٹ پر جوں ہی دانیال اور مارگریٹ اُترے تو مارگریٹ اس سے علیحدہ ہو گئی۔ دانیال کے سامان سے بھاری مقدار میں ہیروئن برآمد ہوئی اور وہ گرفتار ہو گیا جبکہ مارگریٹ صاف بچ گئی۔ دانیال کو لمبی سزا ہو گئی۔

☆......☆......☆

برسوں بیت گئے ہیں۔ دانیال ابھی تک جیل میں ہی ہے۔ اس کی سزا ختم نہیں ہوئی۔ مگر پاکستان میں اس کا سب کچھ ختم ہو گیا ہے روزینہ دنیا میں نہیں رہی۔ نواز نے دانیال کے لیے وکیل کرنے پر اس کی فیس کے لیے اپنا مکان بیچ دیا تھا۔ نواز اب ایک چوراہے پر بھیک مانگتا نظر آتا ہے۔

☆☆......☆☆

ساتویں سچ بیانی

اعتراف

راوی: بشریٰ

تحریر و ترتیب: شاہانہ خان

ضمیر کے بوجھ تلے دبی اِک دوشیزہ کی سچ بیانی

میں اعتراف کرتی ہوں کہ میں نے اس شخص کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ جبکہ وہ اچھا انسان تھا۔ ہینڈسم، گریس فل، تعلیم یافتہ باہنر لیکن وہ شادی شدہ تھا۔ اور یہ بات مجھے ہضم نہیں ہوتی تھی۔ نجانے کیوں......؟ حالانکہ اس پر میرا کوئی حق نہیں تھا۔ وہ کسی کا شوہر تھا۔ بچوں کا باپ تھا لیکن مجھے اچھا لگتا تھا۔ سچی کہانیاں میں کئی سال پہلے غالباً نومبر 2007ء میں اس کی کہانی'......اے کاش '' شائع ہوئی تو کہانی کے ساتھ اس کی تصویر بھی تھی۔ میں جو پہلے اس کے نام سے غائبانہ محبت کرتی تھی۔ تصویر دیکھ کر میں اس کی ذات سے محبت کرنے لگی۔ وہ ایک صحافی فنکار، اسٹیج سنگر رائٹر گویا بہت ساری خوبیوں کا مالک تھا مختصراً وہ ایک وجیہہ مرد تھا۔ کاش تو مجھے مل جائے سچی کہانیاں میں اس کی تصویر دیکھ کر میرے منہ سے غیر دانستہ الفاظ نکل گئے۔

وہ (''چوپال'' جو بعد میں ''محفل دوستاں'' کے نام سے معروف کالم تھا) بڑی تیز اور نوک دار نوک جھونک کرتا، انداز مزاحیہ اور سب سے منفرد یہ حقیقت ہے کہ وہ ستارہ بن کر چمکا۔ وہ دوسری قاریہ سے مذاقاً کوئی جملہ کہتا تو نجانے مجھے کیوں جلن ہونے لگتی ہے وہ ہر مخاطب قاریہ کے نام کے ساتھ ''جی'' لکھ کر بات مکمل کرتا۔ تو مجھے بہت غصہ آتا کہ وہ صرف مجھے ''جی'' کہے اور کسی کو نہیں شاید میرے اندر کوئی ایسا جذبہ تھا جسے محبت کہتے ہیں کوئی اسے بھائی کہتی کوئی چاچو کوئی انکل لیکن میں کسی رشتے کا سہارا لیے بغیر اسے رائٹر ساتھی مخاطب کرتی۔ پھر اس کی کئی کہانیاں چھپیں لفظوں میں درد پرونے والا یوں لگتا وہ میری دلی کیفیتوں کو صفحہ قرطاس پر بکھیرتا۔

ایک دن اس نے ''محفل دوستاں'' میں اعلان کر دیا کہ وہ سچی کہانیاں سے مستعفی ہو رہا ہے۔ یہ پڑھ کر مجھے گہرا شاک لگا۔ میں نے اگلے شمارے میں اس کی سخت سرزنش کی کہ اپنا استعفیٰ واپس لو......نہیں جاؤ گے تم اسی پناہ کے بہت سے خطوط میں یہی مطالبہ تھا۔ کہ اپنا استعفیٰ واپس لو......

آج مجھے ٹی میل کے خطوط میں مطالبے پر کوئی غصہ نہ آیا بلکہ خوشی ہوئی کہ ہم سب ایک power بن کر اسے روک لیں گی۔ حالانکہ اس نے قلمدان بیٹی کو تھما دیا تھا۔ ہم سب دوستوں کا فل پریشر اسے واپس لے آیا۔ وہ لوٹ آیا، وہ لوٹ آیا۔ میں نے تو شکرانے کے نوافل ادا کیے۔

لیکن پھر چند ماہ کے اندر وہ سچی کہانیاں سے کنارہ کش ہوگیا۔ اس کے مدمقابل ایک رائٹر دشمن بن کر آ گیا



۔ مجھے اس شخص پر بہت غصہ آیا مگر کیا کر سکتی تھی۔ چپ چپ بجھی بجھی سی رہتی نہ کوئی بندہ اچھا لگتا نہ کام۔ آخر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ میری ایک دوست نے مجھے اس کا نمبر send کیا۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی لیکن میری دوست نے اس کے خلاف جو زہر اگلا اس سے میں کچھ دیر کے لیے پریشان بھی ہوئی لیکن فون نمبر ملنے کی خوشی میں میں نے ان باتوں کو نظر انداز کیا۔

اس شخص کو پہلا میسج کیا جو ایک رومانی نظم تھی۔ اس کی طرف سے کوئی رسپانس نہ پا کر میں نے اپنے ان بکس میں چند خاص خاص میسج سلیکٹ کر کے اسے سینڈ کیے ۔ آخر اس کا (REPLY) آیا، آپ کون......؟......جی میں ''ثناء'' ہوں۔ جواب آیا کوئی اور در تلاش کرو یہ پڑھ کر تو میرا غصے سے برا حال ہو گیا۔ لیکن میں نے تحمل سے کام لیا اور اسے لکھا اتنے بڑے رائٹر ہو اور اتنی چھوٹی سوچ ہے آپ کی، افسوس ہوا۔ جواب آیا مجھے تم جیسے لوگوں پر کوئی اعتبار نہیں۔

لڑکے وائس چینجر لگا کر لڑکیاں بن کر دوسروں کو دھوکا دیتے ہیں ، میں آپ سے پہلے کئی ایک پر لعنت بھیج چکا ہوں......

پلیز ...... میں پہلے ہی بہت دکھی انسان ہوں......؟......میں نے لکھا میں لڑکا نہیں عامر جی ......لڑکی ہوں خدا کی قسم لڑکی ہوں۔ اگر یقین نہیں آ رہا تو کال کرلو۔

جواب آیا میرے موبائل میں I have no balance بیلنس نہیں ہے......؟ مجھے بڑا افسوس ہوا بیلنس میرے پاس بھی کم تھا خیر میسج پر ہی سلسلہ چلایا۔

اگلے دن شام سے کچھ پہلے اس نے کال کی میں نے اسکرین پہ اس کا جگمگاتا نمبر دیکھ کر کچھ دیر کے لیے سوچا کہ ریسیو کروں یا نہ کروں کیونکہ میں اس وقت مکان کی چھت پہ بیٹھی سہیلی کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ وہ میری ہم راز بھی اور موضوع بھی عامر تھا خیر اٹینڈ کرلیا سلام کے تبادلے کے بعد اس نے کہا سچ بتاؤ تم لڑکی ہو یا لڑکا میں نے آپکو یقین دلایا تھا کہ میں لڑکی ہوں۔ کیا کرتی ہیں آپ اس نے یقین کرنے کے بعد پہلا سوال کیا،

میں گھر میں ہی BA کی تیاری کر رہی ہوں۔ ابو کیا کرتے ہیں اور بھائی کتنے ہیں اور بہنیں؟ میں نے کہا ابو زمینوں کی دیکھ بھال میں امی گھر پہ ہی ہوتی ہیں کوئی جاب نہیں کرتیں بھائی ایک ہی ہے بیرون ملک میں ہے اور ہم تین بہنیں ہیں میرا نمبر کہاں سے لیا اُس نے پوچھا......؟

بس سچے دل سے جو اللہ سے مانگا جائے مل کر ہی رہتا ہے۔ آپ......کال ڈراپ ہوگئی شاید اُس کا بیلنس ختم ہوگیا تھا۔

رات مجھے نیند نہیں آ رہی تھی کافی دیر تک کروٹیں بدلتی رہی سچی کہانیاں بھی پڑھ کر ختم کر چکی تھی بور ہونے لگی، خیالات میں عامر تھا آخر رات کے دو بجے میں نے اسے مس کال دی یہ تسلی کر لینے کے بعد کہ نمبر آن ہے میں نے دو میسج لکھے عامر جی پلیز کال می ......؟ عامر میری جان نکلنے کو ہے پلیز کال کرو اُس نے کال نہ کی شاید بیلنس نہ ہو،

البتہ REPLY آ گیا۔ کیا مسئلہ ہے؟ اُس نے پوچھا

"کیا آپ ابھی کال کر سکتے ہیں؟ نو بیلنس OK میں نے مایوسی سے لکھ کر سینڈ کر دیا کم بخت بیلنس کا ستیاناس جائے کس قدر ذلالت ہے میں موبائل کمپنیوں کو کوسنے دینے لگی اس طرح یہ سلسلہ SMS کے تھرو ہی چلا کال ZEERO % تھی اور میسج 100 % تھے۔

آپ کے کیا مشاغل ہیں؟ مجھے تاریخی جگہیں اور شمالی علاقے انسپائر کرتے ہیں، فوٹو گرافی ،مطالعہ اور شاعری فرینڈ شپ۔ شاعری کرتی ہوں پبلش نہیں کروائی (جب کہ یہ جھوٹ تھا)

آپ سچی کہانیاں پڑھتی ہیں عامر نے پوچھا جی نہیں میں نہیں پڑھتی اس کی کوئی خاص بات نہیں (یہاں بھی مین نے جھوٹ بولا ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا) "خاص بات"......؟

خاص بات یہ ہے کہ میں اُس میں لکھتا ہوں آپ شدی شدہ ہیں یہ تو مجھے پتہ ہے۔ آپکی شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے، جواب آیا (20 سال ہو چکے ہیں ماشاءاللہ دو بیٹے تین بیٹیاں ہیں)

میں نے اندازہ لگایا۔ عامر انتہائی شریف اور سادہ ہے اتنے دن ہوگئے اس نے مجھ سے کوئی بے ہودہ بات نہیں کی دوسرا وہ میرا جھوٹ پکڑ سکتا تھا۔ وہ اگر پوچھ لیتا کہ آپکو کیسے پتا کہ میں شدی شدہ ہوں۔ جبکہ آپ سچی کہانیاں نہیں پڑھتیں تو میرے جھوٹ کا پول کھل جاتا پر شاید قسمت مہرباں تھی مجھ پر۔

3 دسمبر 2010ء میں صبح ڈائری میں ایک غزل لکھ رہی تھی جو بعد میں عامر کو سینڈ کر دی اور تقریباً سارا دن رومانی میسج کا سلسلہ چلتا رہا میں نے لکھا رکھو لو رابطہ جب تک ہم زندہ ہیں، پھر نہ کہنا چلے گئے دل میں یاد بسا کر۔ آگے لکھا آج رات سے پہلے جتنی باتیں کرنی ہیں کر لو جتنے میسج کرنے ہیں کرلو شاید پھر میں آپ سے نہ مل سکوں

جواب آیا کیوں کل قیامت آ جائے گی، عامر نے کہا ہاں ہاں ہاں کل قیامت ہی تو آئے گی پلیز مرنے قبل مجھے اس لڑکی کے بارے مین بتائیں جو آپ کے خواب میں آئی تھی اور اُس پر آپ نے خواب میں غزل تخلیق کر ڈالی تھی۔ جواب آیا OK آج رات گیارہ بجے

میں آپکو اُس لڑکی کے بارے میں بتاؤں گا۔رات گیارہ بجنے میں ابھی 7 گھنٹے باقی تھے میں نے ایک ایک لمحہ کانٹوں پر گزارا۔

رات گیارہ بجے میسج آنا شروع ہو گئے۔لکھا تھا......

''وہ نیو قاریہ تھی اُس کا نام من کو موہ لینے والا تھا ابتدائی طور پر اس نے شاعری کو ذریعہ اظہار بنایا۔اُس کی شاعری میں دکھ سموئے ہوتے۔پھر جب اس نے کہانیاں لکھنا شروع کیں تو کہانیوں میں بھی وہ لفظوں میں اپنے دکھ پرو دیتی۔میں خود دکھوں کا سمندر رجھاگ کر آیا تھا اس لڑکی کے غم مجھے اپنے لگتے میں آہستہ آہستہ اس کے نام سے محبت کرنے لگا پھر وہ نام میرے حواس پر چھا گیا میں اس کے نام سے عشق کرنے لگا میرا جی چاہتا وہ مجھے ملے، میں اسے دیکھوں اُسے چھولوں، محسوس کروں اور کہہ دوں مجھے تم سے ''محبت'' ہے میں نماز پڑھتا تو وہ آجاتی، ڈسٹرب کرتی مجھے بہت ستاتی اُس کا ستانا مجھے اچھا لگتا، میں اُس کے لیے روتا۔دعاؤں میں اُسے اپنے رب سے مانگتا یا اللہ اُس کا دیدار کرادے۔دعا قبول ہوئی وہ میرے خواب میں چلی آئی ایک خوبصورت پہاڑی مقام۔پہاڑوں کی چوٹی پر ایک محل ہے صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی فرحت بخش باد صباء چل رہی ہے نرم و گداز کارپٹ بچھے ہوئے ہیں دروازے کھڑکیوں میں دیدہ زیب نیم فیروزی پردے ہوا میں جھولا رے کھا رہے ہیں پنک اور فیروزی رنگ کی پوشاک پہنے وہ تخت پر بیٹھی بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔میں آگے بڑھا پیکر پری کو اُس کے نام سے مخاطب کیا اس نے پلکیں اٹھائیں۔اللہ اُکبر اتنا حسن کہ میں آنکھ جھپکنا بھول گیا آسمان سے اُتری حور لگ رہی تھی جس کے اردگرد موتیوں اور گلاب کے پھولوں سے تخت بھرا ہوا تھا خوشبوؤں سے بھرے اس ماحول میں بے خودی کے عالم میں بولتا چلا گیا میں اُس لڑکی کا بہت احترام کرتا ہوں کیوں کہ وہ میری محبت تھی''OK

اب مجھے Reply کر دو کے......میری محبت کہانی آپ کو کیسی لگی؟ وہ پوچھتا رہا مگر میں نے اسے دانستہ جواب نہ دیا اس لیے کہ میں فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ وہ لڑکی میں تھی یا کوئی اور......وہ منت سماجت پہ اتر آیا میں پریشان ہوں پلیز ایک دفعہ اپنی خیریت کی اطلاع دو مگر میں نے سیل آف کر دیا ایک گھنٹے تک کروٹیں بدلتی رہی نہ آنکھوں میں نیند نہ چین تھا میسج پھر سے پڑھے اور نہ جانے کب آنکھ لگ گئی

صبح اذان فجر کے کچھ دیر بعد امی نے مجھے حسب معمول جگا دیا کہ اٹھو نماز پڑھو مگر میں سوئی رہی آنکھ ہی نہیں کھل رہی تھی۔کہ میرا سیل تھرتھرایا ذہن بیدار ہو گیا میں جاگ گئی اسی شخص کا میسج تھا ان بکس کھولا۔

لکھا تھا، ثناء کہوں فوزیہ یا کنول۔کیوں کہ تینوں نام آپ نے مجھے وقفے وقفے سے بتائے تھے اور میں جانتا ہوں یہ تینوں نام تیرے نہیں ہیں تم کوئی اور ہو اور جو بھی ہو سب سے پہلے اپنی صحت وسلامتی کی اطلاع دو۔

مین نے REPLY کر دیا میں خیریت سے ہوں۔

جواب آیا پیاری بیٹی ثناء، فوزیہ، کنول اللہ آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے بیٹا دنیا مین سب سے قیمتی چیز انسان کی عزت ہے۔اس کی حفاظت کرنا انسان کا اپنا کام ہے۔بیٹا جی میں آپ کی چاہت کا جواب مثبت لیے نہیں دے رہا تھا مجھے پتا تھا کے آپ ایک نوجوان بچی ہیں آپ کی عقل ابھی کچی اور ناپختہ ہے میں بھی بیٹیوں والا ہوں آپکو اپنی بیٹی سمجھتا ہوں۔میرا بیٹا سچ بولنے سے اللہ راضی ہوتا ہے جو ہوا سو ہوا اُسے بھول جاؤ اور آئندہ اپنی زندگی اپنے پیارے نبی ﷺ کی سنت کے عین مطابق گزارو۔بیٹا موبائل جوان بچے بچیوں کے لیے بری چیز ہے موبائل دوستیاں اچھے بھلے انسان کو گندگی کے گڑھے میں دھکیل دیتی ہیں انسان کو ایک دن یہ دنیا چھوڑنی ہے اور اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے یہ یاد رکھنا امید ہے میری بیٹی ان باتون پر عمل کرے گی ہمیشہ کے لیے خدا حافظ اب رابطہ نہ کرنا۔

صاحبو! اپنے دل کا بوجھ آپ کے سامنے ہلکا کیا ہے۔میری شادی کو چار سال ہو گئے ہیں، میری گود سونی ہے، روتی ہوں اللہ سے معافیاں مانگتی ہوں کیونکہ میری ساس اب بیٹے (میرے میاں) کی دوسری شادی کرانا چاہتی ہیں کہ اسے تو پوتے پوتیاں چاہیے، اولاد چاہیے۔جو مجھ سے پیدا نہیں ہوئی میں نے پڑھا ہے کہ اگر بندہ معاف کر دے تو اللہ معاف کر دیتا ہے۔خدارا میری کہانی شائع ضرور کرنا تاکہ وہ شخص پڑھ کر مجھے معاف کر دے۔

☆☆......☆☆

آٹھویں سچ بیانی





رانا محمد شاہد

بورے والا سے، ایک ایماندار شخص کی خاص کہانی

"شیخ انور صاحب سب لوگوں نے اس فائل میں موجود کاغذات پر دستخط کر دیے ہیں، پلیز آپ بھی کر دیجیے۔" ڈائیریکٹر صاحب نے شیخ صاحب پر قدرے زور دیتے ہوئے کہا،

ایک لمحے کے لیے شیخ صاحب نے کچھ سوچا اور پھر کہنے لگے "...... سر میں کل بتادوں گا کہ دستخط کروں یا نہیں۔"

ڈائیریکٹر صاحب کو شیخ صاحب کی صاف گوئی اتنی اچھی نہ لگی تو وہ سخت لہجے میں بولے۔

"اگر تم نے دستخط نہیں کیے تو نقصان تمہارا ہوگا ،نوکری تو جائے گی لیکن ساتھ ہی ساتھ تمہارے لیے کہیں اور نوکری تلاش کرنا بھی مشکل ہو جائے گا کیوں کہ اس شہر کے سب بڑے لوگ اور ادارے میرے جاننے والے ہیں۔"

شام کو جب شیخ انور دفتر سے چھٹی کر کے گھر پہنچے تو ان کے چہرے پر فکر کے آثار نمایاں تھے۔

شیخ صاحب شہر کی ایک معروف پرائیویٹ کنسٹرکشن کمپنی کے ہیڈ کلرک تھے اس کمپنی کو سرکاری اور غیر سرکاری ہر قسم کے کام کے ٹھیکے ملتے تھے، شیخ صاحب کی تنخواہ اتنی زیادہ نہ تھی کہ گھر کا گزارا آسانی سے ہو جاتا ، پھر بھی کسی نہ کسی طرح گزر اوقات ہو رہی تھی۔ ان کی بیوی صابرہ اپنے نام کی طرح صابر و شاکر عورت تھی وہ خود بھی ایک نیک اور ایمان دار انسان تھے شیخ انور کے دو بچے تھے۔ عامر میٹرک کا طالب علم تھا اور ریحانہ ساتویں کلاس میں پڑھتی تھی ،رات کا کھانا کھاتے ہوئے شیخ صاحب نے اپنی بیوی صابرہ کو بتایا کہ "...... ہمارے ڈائیریکٹر صاحب حکومت سے سڑک بنانے کی منظوری لے رہے ہیں، ایسی سڑک جو کاغذوں کی حد تک تو بنے گی لیکن حقیقت میں اس کا کوئی نام و نشان نہیں ہوگا اور حکومت سے ملنے والی رقم میں سے دفتر کے تمام ملازمین کو بھی حصہ ملے گا اور خود ڈائریکٹر صاحب نے تو نہ جانے اُوپر سے نیچے تک کن کن لوگوں کو حصہ دینا ہے، سب لوگوں نے ضروری کاغذوں پر دستخط کر دیے ہیں، میں چونکہ ہیڈ کلرک ہوں اس لیے میرے دستخط بہت ضروری ہیں۔ میں نے ایک دن کی مہلت مانگی ہے کہ تم سے مشورہ کر لوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کیوں کہ کام تو بہر حال وہ نکال ہی لیں گے مگر میری نوکری چلی جائے گی ......"

"لیکن بہر حال پھر بھی جب زندگی بھر حرام کا لقمہ نہیں کھایا تو اب کیوں؟" کچھ توقف کے بعد شیخ

صاحب نے دل کی بات کہہ دی تو ان کی بیوی بولی۔
"مجھ سے مشورہ لینے کی کیا ضرورت تھی؟" "آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمیں اپنے بچوں کی پرورش حلال کمائی سے کرنی چاہیے اور انہیں ہمیشہ حلال رزق ہی کھلانا ہے۔"

بیگم کی بات سن کر شیخ صاحب کا ارادہ مزید پختہ ہوگیا۔ اگلے روز شیخ صاحب نے فائل میں موجود کاغذات پر دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا، انھیں استعفی پر مجبور کیا گیا تو انھوں نے پہلے سے جیب میں موجود استعفی نکالا اور ڈائریکٹر صاحب کی میز پر رکھ دیا۔ اس کام کے بعد ان کے چہرے پر فخر کے ساتھ ساتھ اطمنان تھا۔ شیخ صاحب نے ایک نظر دفتر کے اسٹاف پر ڈالی اور باہر چلے گئے۔ دوسرے دن عصر کی نماز کے بعد شیخ صاحب گھر واپس آئے تو کچھ ہی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی، انھوں نے دروازہ کھولا تو باہر ان کے ڈائریکٹر صاحب کا پی اے اجمل کھڑا تھا شیخ صاحب حیران ہوئے اور اسے ڈرائنگ روم میں لے آئے، اجمل نے بتایا کہ "مجید صاحب نے کل شام پانچ بجے سٹار ہوٹل میں انہیں مدعو کیا ہے، آپ کو لینے گاڑی آئے گی، بس تیار رہیے گا اور آپ اپنے ساتھ اپنی فیملی کو بھی لے کر آئیے گا" یہ کہہ کر اجمل تو چلا گیا۔
شیخ انور حیرت میں ڈوبے چلے گئے کہ آخر معاملہ کیا ہے؟

اگلے دن شام پانچ بجے ان کے دروازے پر ایک گاڑی آ کر رکی، جس میں ڈائریکٹر مجید صاحب کا ڈرائیور شبیر موجود تھا، شیخ صاحب اپنے بیوی اور بچوں کے ساتھ تیار ہو کر گاڑی میں بیٹھ گئے اور گاڑی چل پڑی، تقریباً پندرہ منٹ بعد گاڑی سٹار ہوٹل کے گیٹ کے پاس جا کر رکی۔ شیخ انور کو اپنی فیملی کے ساتھ سیٹوں پر بٹھا دیا گیا پھر پروگرام شروع ہوا اور چند منٹ بعد سٹیج سیکرٹری نے ڈائریکٹر مجید صاحب کو بلایا جس کے بعد مجید صاحب نے اپنے ابتدائی کلمات میں بتایا کہ یہ پارٹی دراصل اپنے بیٹے کے اعزاز میں منعقد کی ہے، جو باہر سے تعلیم مکمل کر کے لوٹا ہے میں آج سے اپنا سارا کاروبار اس کے حوالے کرتا ہوں اور خود کم



ہی دفتر آیا کروں گا۔" اس کے بعد ڈائریکٹر صاحب نے ذرا تفصیل سے بتانا شروع کیا۔

میں اس تقریب کے حوالے سے ایک اہم بات آپ سے شیئر کرنا چاہوں گا، آج سے تقریباً 10 روز قبل میرا بیٹا دیارِ غیر سے وطن آیا۔ جب میں نے اپنا کاروبار اس کے حوالے کرنے کو کہا تو اس نے مجھے اپنے دفتر کا سب سے ایمان دار شخص بطور منیجر دینے کے کہا، اس سلسلے میں ایک فرضی سڑک بنانے کا منصوبہ بنایا گیا اور ہم نے تمام اسٹاف کو لالچ دے کر ایک فائل پر دستخط کروا لیے میری کمپنی کے ہیڈ کلرک شیخ انور کے سوا سب نے خاموشی سے دستخط کر دیے شیخ انور کو بھی قائل کرنے کی بہت کوششیں کی گئیں۔ مختلف حیلے بہانوں سے ڈرایا بھی گیا مگر آفرین ہے اس شخص پر...... اس نے دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا...... اور یوں شیخ انور اس امتحان میں کامیاب ہو گئے۔"

شیخ انور کے چہرے پر خوشی کا ایک رنگ آ رہا تھا ایک جا رہا تھا، کچھ ایسی ہی صورتحال ان کی فیملی کی تھی، ڈائریکٹر صاحب نے اپنے اختتامی کلمات میں کہا "میں اس کامیابی پر شیخ انور کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں وہ اپنی خدمات سے کمپنی کی نیک نامی میں اضافہ کریں گے۔ آئندہ سے وہ نہ صرف کمپنی کے منیجر ہیں ان کی تنخواہ میں بھی اضافہ کر دیا گیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ انہیں انعام کی رقم پچاس ہزار روپے بھی دی جا رہی ہے جو میرے بیٹے نے اس امتحان میں کامیاب ہونے والے کے لیے رکھی تھی۔ اب اسٹیج پر اپنے بیٹے اور شیخ انور صاحب کو آنے کی دعوت دیتا ہوں۔"

جیسے ہی مجید صاحب نے اپنی بات ختم کی ہال تالیوں سے گونج اٹھا شیخ انور حیرت اور خوشی کے ملے جُلے تاثرات لیے ہال میں موجود تھے، خواب کی سی کیفیت میں وہ کرسی سے اٹھے اور اسٹیج کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ اسٹیج پر موجود ڈائریکٹر مجید نے انہیں گلے لگایا ان کے بیٹے نے شیخ انور کے گلے میں پھولوں کا ہار پہنایا، انعام کی رقم دی بطور منیجر ان کی تقرری کا لیٹر ان کے حوالے کیا، ہال پھر ایک دفعہ تالیوں سے گونج اٹھا اور دوسری طرف شیخ انور کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے انہیں ان کی ایمانداری کا صلہ مل گیا تھا۔

☆☆......☆☆

زندگی ٹھہر ذرا!

محمد شعیب مجبور

خیبر پختونخواہ سے، ایک حوصلہ مند لڑکی کی کہانی، جسے درد نے مضبوط چٹان بنادیا

صدیق تاثیر کا خیال۔
جس سے بنتی نہیں کسی کی بھی
اس زمانے کا کیا کیا جائے؟

وہ کمرے کے درودیوار کو ٹکٹکی باندھے گھورے جا رہی تھی۔ جب سے اسے حقیقت کا علم ہوا تھا اس کی حالت عجیب ہوگئی تھی اداسی اور مایوسی میں گھری ہوئی تھی ایک معمولی سے پیٹ کے درد نے اتنا بڑا انکشاف کر دیا تھا۔ اس نے تو کبھی ایسا سوچا بھی نہ تھا پھر وہ بے بسی سے گھڑی کو دیکھنے لگی ابھی تو صرف سات بجے ہیں امی کے آنے میں پورا ایک گھنٹہ باقی ہے، ہسپتال میں وقت ہی نہیں گزرتا آنے والوں کا انتظار کتنا کٹھن ہوتا ہے۔

لیٹے لیٹے سوچنے کے سوا اس کے پاس کوئی کام نہ تھا کتاب ہاتھ میں پکڑنے کو جی نہ چاہتا تھا سامنے ٹی وی رکھا تھا پر اس کا دل دیکھنے کو نہ چاہتا تھا کہ کتنے سلسلے وار ڈرامے وہ شوق سے دیکھا کرتی تھی لیکن اب اسے کسی کے انجام سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ کیوں کہ اپنے انجام سے جو وہ باخبر ہوگئی تھی۔

رضوان کیوں نہیں آیا مجھے دیکھنے، مجھ سے ملنے، نہ کوئی اس کا فون آیا اس نے اپنا فون بھی بند کیا ہوا ہے۔ مجھ سے تمہارا وہ گھنٹوں فون پر باتیں کرتے رہنا، میرے سنہری ماضی کے روشن باب میں آج ایسے دمک اٹھا جیسے دشت میں اچانک ساون برسے، جیسے اندھیری راتوں کی تیز ہواؤں میں کوئی ہزاروں دیئے روشن کر دے۔

کافی رات ہو چکی تھی لیکن نہ جانے کیوں تمہاری مسکراتی تصویر آج مجھے سونے کی اجازت نہ دے پائی۔

کیوں...... کہیں...........اس نے اپنے ذہن سے جھٹک دیئے......وہ کیوں چھوڑ نہیں سکتا......وہ میرے بنا نہیں رہ سکتا اس نے مجھے ٹوٹ کر چاہا ہے..........وہ عام لوگوں کی طرح خود غرض نہیں...... آخر ہم بچپن کے ساتھی ہیں ہم آہنگی ہے اور پھر دو سال ہو گئے ہماری منگنی کو......اور اب تو جلد ہی ہماری شادی ہونے والی ہے وہ سوچوں کی دنیا میں قلابازیاں کھا رہی تھی کہ کمرے کے دروازے پر مانوس سی دستک ہوئی اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو ممی ناشتہ لے کر آئی تھیں۔

ان کا رنگ پیلا پڑا ہوا ان کیساتھ ثناء بھی تھی بجھی بجھی سی......خاموش افراء نے ممی کو دیکھ کر تڑپ کر پوچھا کیا ہوا مما کیا آپ ساری رات روتی رہی ہیں نہیں افراء کوئی بات نہیں......مما کوئی بات تو ضرور ہے ورنہ آپ تو

بہت صبر والی اور بہادر ہیں آپ کا رونا بے مقصد نہیں ہوسکتا آج آپ اندر سے ٹوٹی ہوئی اور بے حوصلہ نظر آرہی ہیں
ثنا تم ہی بتاؤ کیا بات ہے؟
کچھ نہیں اقراء باجی ...... سب ٹھیک ہے ...... آپ کو خواہ مخواہ وہم ہو رہا ہے۔تم دونوں کی بات بے بات مصنوعی مسکراہٹ مجھے کسی طوفان کا پتا دے رہی ہے۔مما جو بات ہے بتا دیں ہسپتال میں رہ کر میں بہت بہادر ہوگئی ہوں جو بات کل پتا چلنی ہے وہ آج ہی بتا دیں ...... ویسے آپ لوگوں کے اُڑے ہوئے رنگ دیکھ کر مجھے کچھ کچھ کہانی سمجھ تو آرہی ہے ۔ایکسیوزمی نرس کمرے میں آکر بولی ڈاکٹر صاحبہ راؤنڈ پر آرہی ہیں آپ دونوں کمرے سے باہر جائیے ،ڈاکٹر کے جانے کے بعد اقراء نے ماں سے کہا دیکھو مما میں کتنی دبلی ہوگئی ہوں۔آج دوبارہ یہ انگوٹھی میری انگلی سے گرگئی تھی۔آپ یہ رضوان کو واپس کر دیجئے گا ...... یہی بات تھی نہ مما جو آپ بتا نہیں پا رہی تھیں اور پھر آنسو ضبط کا بند حن توڑ گئے ...... مما ایک زندگی ہارتی ہوئی لڑکی سے منگنی رکھنے کا جواز بھی نہیں ہے ...... چلیں اچھا ہے جیتے جیتے میرے دل پر کوئی بوجھ نہ ہوگا ...... ہلکی ہوکر جاؤں گی۔
مما کے جانے کے بعد خود کلامی کرتے ہوئے بولی رضوان کی ڈور تو ٹوٹنے کو ہے کینسر کا مریض کتنے دن زندہ رہتا ہے یہی مہینے ڈیڑھ مہینے کی بات تھی میں نے کون سا تمہیں مجبور کیا تھا کہ میرے سوگ میں تم زندگی گزار دیتا کچھ اپنے وعدوں کی لاج تو رکھ لیتے ...... چلو خیر میں نے تمہیں معاف کیا۔
ارے اقراء تم رو رہی ہو کس کی یاد میں یہ اپنے قیمتی آنسو بہا رہی ہو ...... ڈاکٹر اقصیٰ مسکراتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئیں ،تم اتنی کم ہمت ہوگی میں تو سوچ بھی نہیں سکتی ...... بس اب رونا دھونا، بین کرنا اور ماتم چھوڑو ...... کیا اسی طرح بستر پر ایڑھیاں رگڑتے دنیا سے گزرنے کا ارادہ ہے ......
تو سن لو میری بات تمہیں ایسا کرنے نہیں دوں



گی......اس بستر سے اٹھو......موت تو اپنے وقت پر آتی ہے ......موت سے پہلے مرنا کہاں عقلمندی ہے...... میں نے تمہاری ساری رپورٹ دیکھ لیں ہیں تمہاری بیماری ابتدائی مراحل میں ہے جو علاج سے قابو آجائے گی ابھی تمہارا اوپر جانے کا پروگرام لگ نہیں رہا ہاں ایک اور خبر میں نے تمہاری یہاں سے چھٹی کردی ہے ڈاکٹر نے دوائیاں لکھ دی ہیں وہ تم گھر میں رہ کر کھا لینا ماہانہ چیک اپ میں بلا معاوضہ کر دیا کروں گی اور ہاں نماز پابندی سے پڑھنا دعا اور صدقہ بیماری کو ٹال دیتے ہیں فارغ مت بیٹھنا کچھ کرتی رہنا اس طرح وقت بھی اچھا گزرے گا اور بے کار سوچوں سے بھی تمہیں فرصت ملے گی۔

گھر والوں نے یہ خبر اس سے بہت چھپائی لیکن کسی نہ کسی طرح اسے پتا چل ہی گیا کہ خالہ نے رضوان کی شادی ماہم سے طے کردی ہے۔ یہ خبر کسی بم دھماکے سے کم نہیں تھی۔ ماضی کی حسین یادیں ایک بار پھر ستانے لگیں۔ اس کا رضوان کسی اور کا ہونے والا تھا یہ تصور ہی اس کے لیے بہت بھیانک تھا آنسو بہاتی وہ قلم اور ڈائری لے کر میز پر بیٹھ گئی اور دلی جذبات صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے لگی۔

زندگی ٹھہر ذرا میں بھی تیرا دم بھرلوں
ایک دو پل ہی سہی تجھ سے محبت کرلوں
کیا پتا کون سے موسم میں بچھڑ جاؤں
اب چاہنے کی تجھے جاگی ہے تمنا دل میں
بے وفا تجھ سے نباہ کرنے کی ہمت کرلوں
ایک دو پل ہی سہی تجھ سے محبت کرلوں
زندگی ٹھہر ذرا میں بھی تیرا دم بھرلوں

ٹرن ٹرن فون کی گھنٹی نے خیالوں کا تسلسل توڑ دیا ہیلو!! ارے اقراء میں ڈاکٹر اقصیٰ بول رہی ہوں۔ اقراء کل تمہیں ہسپتال آنا ہے چیک اپ کے لیے کراچی سے تمہاری ساری رپورٹس آ گئی ہیں۔

ساری رات رو رو کر خدا سے دعائیں مانگتی رہی کہ اے خدا مجھے دوبارہ زندگی دے۔

''مما میں بہت نروس فیل کر رہی ہوں۔ جانے کیا

شرارت

جھاگ اُڑاتا چشمہ
میرے بال بھگو کر
دُور کہیں جا نکلا ہے
لیکن اُس کی شوخی اب تک
میری مانگ سے موتی بن کر
قطرہ قطرہ ٹپک رہی ہے

شاعرہ: پروین شاکر

رپورٹس میں کتنی مہلت۔'' آگے کچھ مت کہنا اقراء اللہ پر بھروسا رکھو۔ ہیلو آنٹی ڈاکٹر اقصیٰ کا مسکراتا وجود سامنے تھا اور ساتھ ہی اچھی سی خبر بھی اقصیٰ! حیرت انگیز طور پر تمہاری تمام رپورٹس نارمل آئی ہیں۔ کیونکہ علاج کے ساتھ میں نے دعائیں بھی بہت کی تھیں اسکے لیے خاندان کے سب لوگ اقراء کو صحت یابی کی مبارکی دینے آرہے تھے۔

کزن کی شادی کا بلاوا آیا تھا ثناء بولی باجی تیار ہو جائیں۔

''نہیں ثناء میں نہیں جاؤں گی وہاں رضوان بھی ہوگا''

''تو باجی ہونے دیں آپ کا اس سے کیا واسطہ۔'' ڈاکٹر اقصیٰ نے اپنے بھائی کے لیے آپ کو مانگا ہے مجھے تو لگتا ہے یہ بیماری آپ پر آئی ہی اس لیے تھی کہ رضوان سے آپ کا پیچھا چھوٹ جائے۔

ثناء تم زیادہ بولنے نہیں لگی؟ شادی میں اقراء بڑے اہتمام سے تیار ہو گئی۔

رضوان کو اقراء کی صحت یابی کی خبر مل چکی تھی اچانک دونوں کا سامنا ہوا تو رضوان پلکیں جھپکانا بھول گیا وہ تو پہلے سے بھی زیادہ نکھری اور تروتازہ لگ رہی تھی۔

رضوان اقراء کے قریب آیا کچھ کہنے کو ابھی لب ملے ہی تھے کہ اقصیٰ نے نفرت سے دیکھتے ہی قدم آگے بڑھا لیے، رضوان اسے روکتا ہی رہ گیا...... پر وہ نہ رکی......اور وہ حسرت سے جاتا دیکھتا رہا۔

☆☆......☆☆

دسویں سچ بیانی

ہمت کرے انساں تو۔۔

ام منائل

حالات کے تھپیڑوں سے حوصلہ مندی سے نپٹتے نوجوان کی کہانی، ایبٹ آباد سے

ہم اپنے ماں باپ کی صرف دو ہی اولادیں تھیں یعنی میں اور مجھ سے دو سال بڑے منور تنولی۔ ہمارا جنم مانسہرہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں کھیواڑی میں ہوا ہم دونوں بھائی اپنے ماں باپ کی کل کائنات تھے

ہمارے ماں باپ نے ہماری تربیت انتہائی عاجزی اور انکساری کے اصولوں پر کی تھی اتنے پیسے کے باوجود نا ہمارے ماں باپ کے دل میں غرور تھا اور نہ ہی انھوں نے ہمیں احساس برتری کا درس دیا زندگی یوں ہی خوشیوں کے ہنڈولے میں جھول رہی تھی کہ ہماری زندگی میں ایسا بھونچال آیا جس نے ہمارے سروں سے ماں باپ کے سائے کی مہربان چادر چھین لی اور ہم زمانے کی دھوپ میں دنیا کے مظالم سہنے کے لیے اکیلے رہ گئے ہوا یہ کہ۔

☆......☆......☆

آج سے تقریباً ساٹھ پینسٹھ (65 60) سال پہلے جب پاکستان بنے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا قیام پاکستان کے وقت ہمارے کچھ ننھیالی ددھیالی رشتے دار گاؤں سے ہجرت کر کے کراچی جا بسے کیوں کہ کراچی اس زمانے میں دارالحکومت بھی تھا اور وہاں اس وقت بھی روزگار کے مواقع بہت میسر تھے ان ہی



رشتے داروں سے ملنے ہمارے والدین کراچی گئے تھے ہمارے پیپر چل رہے تھے۔ جس کی وجہ سے ہم دادا دادی کے پاس ہی رک گئے تھے۔ رشتے داروں سے مل کر ہمارے والدین بذریعہ جیپ واپس آ رہے

تھے کہ راستے میں خوشاب کے قریب ٹرک سے انکی جیپ کی ٹکر ہوگئی حادثہ اتنا شدید تھا کہ دونوں موقعہ پر ہی دم توڑ گئے اور اپنی منزل مقصود پر پہنچنے سے پہلے ہی سفر آخرت پر روانہ ہوگئے یہ سفران کی زندگی کا آخری سفر ثابت ہوا اس حادثہ نے ہماری زندگی کی کایا ہی پلٹ دی۔

☆......☆......☆

جس وقت ہمارے ماں باپ کی خون میں لت پت لاشیں گھر آئیں دادی تو بے ہوش ہو کر ایسی گریں۔ کہ چار بندوں کے کاندھے پر ہی انھیں ظہر میں ماں باپ اور عشاء میں دادی کی تدفین یہ ہماری زندگی کا ایسا سانحہ تھا جس نے گھر کے در و دیوار تک کو ہلا ڈالا ماں باپ کے انتقال کے بعد دادا نے ہم دونوں کی کفالت کی ذمہ داری سنبھال لی اور اپنا غم بھلا کر ہماری پرورش میں لگ گئے مگر شاید قدرت کو دادا کا سایہ بھی ہمارے سروں پر رکھنا بھی منظور نہ تھا دادا بھی اس حادثہ کے بعد سال بھر کے اندر داغ مفارقت دے گئے اور ہمیں جو تھوڑا بہت دادا کا سہارا تھا وہ بھی ختم ہوگیا

دادا کے قبر میں اترتے ہی تمام رشتے داروں نے ہم سے آنکھیں پھیر لیں تایا نے دادا کی جائیداد کے ساتھ ساتھ ہمارے باپ کی بھی ساری جائیداد اپنے نام کرا کر اس پر قبضہ کر لیا اور ہم دونوں بھائیوں کو گھر سے نکال کر حالات کے تھپیڑے کھانے فٹ پاتھ کا مسافر بنا دیا اس وقت میں دس سال چوتھی کلاس اور بھائی بارہ سال پانچویں کلاس کے طالب علم تھے زمانے کی اونچ نیچ سمجھنے کے لیے

خوشیاں تو ہمارے ماں باپ کے مرتے ہی ختم ہو گئیں تھیں فٹ پاتھ پر آ کر ہمارا گھر ہماری تعلیم ہمارا بچپن سب کچھ ختم ہوگیا اور ہم پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے تقدیر کے دھکے کھانے لگے سب سے پہلے ہم نے ایک ہوٹل میں بیرا گیری کی نوکری کی بھائی وہاں پر برتن دھوتے اور میں جھاڑو کے ساتھ ساتھ گاہکوں کے جانے کے بعد میزیں صاف کرتا اس کے عوض میں ہمیں ماہانہ پانچ روپے ملتے تھے کھانا ہمیں وہ مل جاتا جو پتیلیوں کے پیندے میں بچا کھچا کھرچن کی صورت میں ہوتا۔

☆......☆......☆

کبھی کبھی مالک ہمارے کام سے خوش ہو کر بریانی اور قورمے کی بھری پلیٹیں کھانے کو دیتا تو ہمیں اپنے ماں باپ کے ساتھ گزرے ہوئے وہ دن بہت یاد آتے جب ہم چین کی روٹی کھاتے تھے اور سکون کی نیند سوتے تھے اس کے علاوہ جب ہم گاہکوں سے آرڈر لینے کے لیے دوڑے ہوئے ان کے پاس جاتے تو ہمیں اپنے ماں باپ کے وہ لاڈ یاد آتے جو وہ ہمارے آگے پیچھے بھاگ کر اٹھاتے تھے سونے کے لیے اسی ہوٹل کا تھلا ہمارے لیے کافی ہوتا مگر گرمیاں تو سکون سے گزر گئیں لیکن کڑکتی سردی نے ہمارا کڑا امتحان لیا تب بھائی نے تھوڑے تھوڑے پیسے جمع کر کے اوڑھنے کے لیے ایک کمبل اور بچھانے کے لیے ایک گدا خرید لیا۔ پہننے کے لیے سویٹر ہوٹل کے مالک نے اپنے دے دیے تھے۔ سردیوں کا انتظام تو ہوگیا مگر یہ ہوٹل ہمارا مستقبل نہیں تھا ہمیں ابھی بہت آگے جانا تھا اور کچھ بنکر اپنے ماں باپ کی جائیداد واپس لینی تھی ہم اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے کہ اس نے ہمیں بہن نہیں دی ورنہ وہ بھی آج ہمارے ساتھ تقدیر کی ٹھوکریں کھا رہی ہوتی یا نہ جانے اس کا کیا حال ہوتا۔

☆......☆......☆

ہوٹل کی نوکری کے درمیان ہی ہم سارے دن کے تھکے سو رہے تھے کہ نہ جانے کون تکیے کے نیچے سے ہماری ساری جمع پونجی لے اڑا شاید وہ ہم سے بھی زیادہ ضرورتمند تھا۔ اس کے بعد ہمیں اپنا آپ بھی غیر محفوظ لگنے لگا۔ ہم نے ہوٹل کے مالک سے بات کر کے ایک کمرہ کرائے پر لے لیا شکر ہے مالک مکان ہوٹل کے مالک کے جاننے والے تھے انھوں نے رعایت کر کے کرایہ پانچ کے بجائے تین روپے کر دیا اس طرح رہائش کا مسئلہ بھی حل ہوگیا۔

ہوٹل کی نوکری کے ساتھ ساتھ ہم نے لوگوں کے جوتے پالش کرنا اور گاڑیوں کے شیشے صاف کرنا

شروع کر دیے اس کے علاوہ جہاں کہیں بلڈنگ کی تعمیر کا کام ہو رہا ہوتا تو وہاں مزدوری کر لیتے کبھی روڈ پر کھڑے ہو کر پھول بیچ لیتے اس کے عوض ہمیں اچھی خاصی رقم مل جاتی جو بہت احتیاط سے جمع کرتے اور گھر کی ضرورت کے استعمال کی چیزیں خریدتے وہ بہت سادہ دور تھا بجلی گیس کا مسئلہ نہیں تھا اس زمانے میں گاؤں میں یہ سہولت بہت کم تھی لوگ رات میں انگیٹھی جلاتے اور روشنی کے لیے دیا استعمال کرتے ہمارے پاس بھی یہی سہولت موجود تھیں اور کھانے کا بندوبست ہوٹل سے پورا ہوتا رہا۔

☆......☆......☆

گرمیوں میں تو ہوٹل کی چاندی ہو جاتی جب سیاح لوگ یہاں سیر و تفریح کے لیے آتے تب تو ہمیں سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ملتی لیکن ہماری محنت اس وقت وصول ہو جاتی جب مالک ہفتہ میں اضافی پیسے دے دیتا۔

مگر ہمارا امتحان ابھی پورا نہیں ہوا تھا مختلف جگہوں پر کام کرتے ہوئے ہمیں ابھی پانچ سال ہی ہوئے جس ہوٹل میں ہم کام کرتے وہ کچی مٹی کا بنا ہوا تھا ایک دن اتنے شدید زلزلے کے جھٹکے آئے کہ ہوٹل کی چھت گر گئی جس کی وجہ سے مالک کا کاروبار ٹھپ ہو گیا مالک نے کہا ''میں اس دفعہ لینٹر کی چھت ڈلواؤں گا جس میں کم از کم چھ سے آٹھ ماہ لگ سکتے ہیں پھر کاروبار جمنے میں ٹائم لگے گا تم لوگ جو بہتر سمجھو وہ کر لو۔ مالک کی بات ہمیں معقول لگی کیوں کہ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے تو روزانہ دو وقت کی روٹی درکار تھی یہاں تو سال بھر کی بات ہے۔

☆......☆......☆

ہمارے پاس تقریباً 2 ہزار روپے تھے ہم نے چھ ماہ کا کرایہ نکال کر باقی پیسوں سے پھیری لگانا شروع کی (زمین پر رکھ کر جو سامان بیچا جائے ہندکو زبان میں اسے پھیری لگانا کہتے ہیں) یہ کپڑا ہم لاہور کی ملوں سے لاتے اس کے لیے بہت محنت کی ضرورت تھی پھیری لگاتے ہوئے ابھی صرف ہمیں ایک ماہ ہی ہوا تھا کہ ایک دن دو نوجوان لڑکوں نے آ کر ہمارے کپڑے کو الٹ دیا اور بولے ''بابا ہم ماں باپ کے ماتم (انتقال) کی وجہ سے غم میں تھے (ہزارہ ڈویژن میں انتقال کو ماتم کہا جاتا ہے) تم نے تو ایک ماہ میں ہم سے ہماری زمین چھین لی یہ ہماری جگہ ہے چلو بھاگو یہاں سے۔'' اس لڑکے کی بات سن کر ہم ششدر رہ گئے یا اللہ تیری اتنی بڑی زمین پر ہمارے لیے کہیں جگہ نہیں لیکن پھر فوراً ہی توبہ استغفار کرنے لگے کہ ہمارے ماں باپ نے ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا سکھایا تھا۔

☆......☆......☆

پھیری سے مایوس ہو کر ہم واپس ہوٹل پہنچے وہاں جا کر پتا لگا کہ مالک روزگار کے لیے کراچی چلا گیا پہلے تو ہم نے بھی کراچی جا کر قسمت آزمانے کا سوچا مگر ماں باپ کی خون میں لت پت لاشیں ہمارے ذہنوں پر ایسی سوار ہوئیں کہ کراچی کا نام ہمارے لیے خوف کا باعث بن گیا حالانکہ ہم نے اپنے والدین کی زندگی میں گاؤں کے اندر لوگوں کا حال دیکھا تھا جو کراچی میں نوکری کرتے تھے وہ جب گاؤں آتے تو ان کے ٹھاٹ باٹھ ایسے ہوتے جیسے دبئی یا امریکہ سے آئے ہیں۔

لہٰذا ہم نے کراچی جانے کے ارادے کو مسترد کر کے اسی کپڑے کو کندھے پر لاد کر گلی گلی چکر لگا کر بیچنا شروع کر دیا اور اپنی زندگی کی گاڑی کو چلانے کی جدوجہد میں لگ گئے اس کے لیے ہم اپنے گاؤں سے نکل کر مختلف گاؤں گوٹھ بھی جانے لگے۔ ہم مختلف شہروں کی طرف بھی پھیری لگانے لگے اس میں ایبٹ آباد، ہری پور، حویلیاں حسن ابدال، مری، ایوبیہ، نتھیا گلی وغیرہ شامل تھے گرمیوں میں تو ہمارا کاروبار خوب چمکتا کیوں کہ ان علاقوں میں آنے والے سیاح کھڑے کھڑے خرید لیتے۔

☆......☆......☆

سردیوں میں ہم نے لنڈا لگانا شروع کیا کپڑے کے کاروبار میں ہمیں بہت فائدہ ہوا کیوں کہ یہ تجارت ہمارے رسول ﷺ کی سنت ہے ابھی پھیروں کے درمیان ہمیں ایبٹ آباد کا ماحول صحیح لگا

لہذا ہم گاؤں سے نکل کر ایبٹ آباد میں ایک کمرے میں کرائے پر رہنے لگے۔

حالات کے تھپیڑوں نے ہمیں وقت سے پہلے بڑا اور سمجھ دار بنا دیا تھا ہم نے پھیری کے ساتھ ساتھ بسوں میں کنڈیکٹری بھی شروع کر دی بھائی بازار میں پھیری لگاتے تو میں کنڈیکٹری کی ڈیوٹی انجام دیتا اور میں پھیری لگاتا تو بھائی کنڈیکٹری کرتے کیوں کہ ہمارے پاس ابھی اتنا پیسہ نہیں ہوا تھا کہ دکان خریدنا تو دور کی بات پگڑی (کرائے) پر بھی نہیں لے سکتے تھے کنڈیکٹری کے ساتھ فارغ اوقات میں ہم نے ڈرائیوری سیکھنا شروع کی ڈرائیوری سیکھنے کے بعد ہمارے حالات نے پلٹا کھایا اور ہماری زندگی سنورنا شروع ہو گئی ڈرائیوری سیکھنے کے بعد ہم نے پھیری کو خیر باد کہہ دیا مگر یہاں تک کے سفر میں ہماری عمریں پچیس، چھبیس سال کے لگ بھگ ہو گئی تھیں اور ہم تعلیم حاصل کرنے کے مراحل سے نکل چکے تھے تعلیم نہ حاصل کرنے کا افسوس رہا ہمیں ساری زندگی۔

☆......☆......☆

دو تین سال ڈرائیوری کرنے کے بعد ہمارے پاس اتنی رقم تو جمع ہو گئی تھی کہ ہم کوئی بڑا کاروبار کر سکیں تعلیم تو ہمارے پاس تھی نہیں جو کہیں نوکری ملتی اس لیے کوئی نہ کوئی کاروبار ہی کرنا تھا شاید تقدیر بھی ہم پر مہربان ہونا چاہتی تھی جس ٹرانسپورٹر کی ہم گاڑیاں چلاتے تھے اس کا کاروبار سعودی عرب میں بھی تھا اس ٹرانسپورٹر کی معرفت ہم سعودی عرب چلے گئے۔

☆......☆......☆

یہ 1996ء کا زمانہ تھا پاکستان ہندوستان کے خلاف جنگ جیت کر دنیا میں اپنا مقام بنا چکا تھا دنیا بھر میں پاکستان کو سراہا جا رہا تھا دوسری طرف ہماری قسمت ہمارا ساتھ دے رہی تھی۔ سعودی عرب کی زمین ہمارے نصیب کے لیے سونا ثابت ہوئی وہاں بھی ہم نے ڈرائیوری کی اور وہاں کے بینک میں اپنا اکاؤنٹ بنانا شروع کیا۔ حالات کے دھکے کھائے ہوئے تھے اس لیے گھر کی چھت اور پیسے کی قدر ہم سے زیادہ کون جان سکتا تھا کہ صحرا کی دھوپ کی چلچلاہٹ اور جاڑے کی کڑکڑاہٹ کیا ہوتی ہے۔ ماں باپ کی موت کے بعد رشتے داروں نے ہمیں ایسا سبق دیا کہ ہم دونوں بھائیوں کو ایک دوسرے کے علاوہ کسی تیسرے پر اعتبار کرتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔

☆......☆......☆

مگر کہتے ہیں ہاتھ کی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں پہلے ہوٹل کے مالک پھر بس کے مالک کو پرکھ کر ہمیں اس مثال کی حقیقت معلوم ہوئی کہ اس دنیا میں ہر قسم کے لوگ موجود ہیں۔ سعودی عرب میں ہم نے دو سال کی نوکری میں اتنا پیسا جمع کر لیا کہ ہم اپنا گھر بنا سکتے تھے۔ جس وقت ہم اسلام آباد ایئر پورٹ پر اترے تو بھیانک ماضی ایک دفعہ پھر ہماری آنکھوں کے سامنے لہرا گیا مگر اللہ کی رضا میں راضی ہو کر اپنا مستقبل بنانے کی جدوجہد میں لگ گئے ایئر پورٹ سے ہم سیدھا ایبٹ آباد بس کے مالک کے پاس پہنچے اور ان کی معرفت ہوٹل میں ایک کمرہ کرائے پر لے لیا پاکستان میں ہم چھ ماہ رہے اسی دوران ہم نے ایک گھر خریدا۔

☆......☆......☆

جب ہم واپس سعودی عرب گئے تو اس گھر کو ہم نے کرائے پر اٹھا دیا کرایہ ہمارے اکاؤنٹ میں جمع ہوتا رہا دو سال بعد جب ہمارا دوسرا چکر پاکستان لگا تو ہم نے اپنے گھر بسانے کے بارے میں سوچا ہمارے سر پر کسی کا مہربان سایہ تو تھا نہیں جو کوئی ہمارے بارے میں سوچتا لہذا ہم نے اپنے مالک سے بات کرنا ضروری سمجھی۔ مالک نے ہماری بات سن کر اپنے جاننے والوں میں لڑکی کا بتایا ہم نے اپنے مالک کو ہی بڑا بنا کر لڑکی والوں سے بات کرنے کا کہا اس معاملے میں بھی مالک نے ہمارا بھرپور ساتھ دیا اور تمام معاملات نپٹا کر اپنے قبیلے میں اچھے گھرانے کی لڑکی سے میری شادی کرا دی اور بھائی نے بھی سعودیہ میں ساتھ کام کرنے والے دوست کی بہن سے شادی کر کے اپنا گھر بسا لیا۔

شادی کے بعد بھائی نے سعودی عرب جانے کو ترجیح نہیں دی اور پاکستان میں ہی انہی مالک کے

ٹرک چلا کر ڈرائیوری شروع کردی یہاں سے ہم دونوں بھائیوں کے راستے جدا ہو گئے مگر ہم الگ ہوتے ہوئے بھی ساتھ جڑے رہے میری بیوی اور بھائی کی بیوی دونوں مل کر سکون سے ایک ہی گھر میں رہنے لگیں بیوی کی طرف سے اطمنان ہو جانے کے بعد میں واپس سعودیہ آ گیا بیوی کے قدم میرے لیے اتنے بھاگوان ثابت ہوئے کہ میں ترقی کی منازل طے کرتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

میرا دو تین سال میں ایک بار پاکستان کا چکر لگتا اس دوران میں نے حج بھی کیے اور بے شمار عمرے بھی بیوی بچوں کو بھی حج اور عمرے کرائے اس وقت مجھے میرے ماں باپ بے تحاشا یاد آتے یہ خیال آتے ہی میں نے ماں باپ دادا دادی ان چاروں کی طرف حج اور عمرے کے لیے ہر سال قربانی کرنا شروع کی۔

تمام بچوں کو تعلیم ان کی خواہش کے مطابق دلوائی ماں باپ کی موت سے ہماری تعلیم تو ادھوری رہ گئی مگر میں نے اپنی تعلیم کا شوق اپنے بچوں کی نذر کر دیا اولاد کی تربیت میں بیوی سے زیادہ میرا ہاتھ تھا میں نے اپنی اولاد کی تربیت بالکل اسی انداز میں کی جس طرح آٹھ دس سال کے قلیل عرصے میں ہمارے ماں باپ نے کی تھی۔

☆......☆......☆

جب بڑے بیٹے نے تعلیم مکمل کر لی تو میں نے اسے ادھر ادھر دفتروں کے دھکے کھانے کے بجائے سعودی عرب میں ہی کپڑے کی دکان کرا دی اس کے بعد جو بیٹا تعلیم مکمل کرتا گیا اس کی منشاء کے مطابق سعودی عرب میں ہی کاروبار کراتا گیا اس طرح آمدنی بڑھی تو میں نے سعودیہ میں ہی ٹرک خرید کر خود بھی ڈرائیوری کی اور بچوں کو بھی کاروبار کے ساتھ ڈرائیوری سکھائی تاکہ میرے بعد وہ اپنا یہ کاروبار سنبھالنے کے بھی لائق ہو جائیں اسطرح میرے یہ دونوں کاروبار پھیلتے چلے گئے۔

جب میرے پانچویں بیٹے نے اپنا کاروبار سنبھال لیا تو یکے بعد دیگرے میں نے پانچوں بیٹوں کی شادیاں کیں سب بیٹوں کے لیے گھر خریدا اور ان کے نام گھر اور زمین کی ہر بچے کے نام کا الگ اکاؤنٹ کھلوایا۔ ایبٹ آباد، نتھیا گلی، مانسہرہ، اسلام آباد (موجودہ) کھیواڑی ان سب علاقوں میں میں نے اچھی خاصی جائیداد بنائی۔

دولت میرے گھر کی باندی بن گئی۔ مگر اللہ کا لاکھ لاکھ بار شکر ہے میرے والدین کی مختصر سی تربیت کی بدولت میرے دل میں کبھی غرور اور گھمنڈ نہ آیا میں نے کبھی کسی کو حقیر سمجھا اور نہ ہی کبھی اپنے اچھے دنوں میں کھو کر ماضی کو بھلایا۔

☆......☆......☆

آج میرا اپنا ایک باڑہ ہے جہاں گائے، بھینس، بکری بھیڑ اور ہر نسل کے جانور ہیں ان کا خالص دودھ ہمارے گھروں میں استعمال ہوتا ہے اپنا ایک ذاتی چھوٹا سا پولٹری فارم ہے جہاں اعلیٰ نسل کی دیسی مرغیاں بطخیں اور ہر قسم کے پرندے ہیں۔

آج میں اپنی زندگی سے بہت خوش اور مطمئن ہوں اس کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ میں نے ہمیشہ نماز کی پابندی اپنائی خود تو تعلیم حاصل نہ کر سکا مگر اپنی اولاد کو دونوں جہاں کی تعلیم سے آراستہ کیا ماں باپ کی توجہ خود تو حاصل نہ کر سکا مگر اپنی اولاد پر بھرپور توجہ دی۔

☆......☆......☆

ایک بات تو آپ کو بتانا بھول ہی گیا جن لوگوں نے ہم یتیم بھائیوں کا حق کھایا تھا انہوں نے اس پیسے سے بالاکوٹ میں اچھی خاصی جائیداد بنائی مگر وہ دولت ان کے لیے چند روزہ سرمایہ ثابت ہوئی کیونکہ 2005ء کے زلزلے میں بالاکوٹ بالکل تباہ ہو گیا اور وہ سب سے عالیشان گھر سمیت زمیں بوس ہو گئے میں نے ہر ممکن ذرائع سے ان کی معلومات حاصل کی مگر کیمپ سے تایا کی ایک پوتی ملی تھی جس کی آٹھ سال میں نے اپنے زیرسایہ پرورش کی اور جنوری 2014ء میں ایک بیٹی کی طرح اس کا حق دے کر اچھے گھر میں شادی کر کے رخصت کر دیا آج وہ اپنے شوہر کے ساتھ خوش خرم زندگی گزار رہی ہے۔

☆☆......☆☆

گیارہویں سچ بیانی

بے وفا کون؟

شازیہ جاوید شازی

اسلام آباد سے، ایک باوفا مرد کی کہانی، جو آج بھی وفا ڈھونڈ رہا ہے

میں ناشتہ کر رہا تھا کہ میرے ایک دوست کا میسج آیا میں نے جلدی میں ذیشان کا نمبر ڈائل کر دیا مگر یہ کیا یہ تو کسی لڑکی کی آواز تھی میں اس کی سریلی آواز میں کھو سا گیا ادھ ہیلو مسٹر کون ہو، جی یہ ذیشان کا نمبر ہے میں کچھ بوکھلا سا گیا نہیں یہ کسی ذیشان کا نمبر نہیں ہے اور کال بند ہو گئی سارا دن اس ٹینشن میں گزر گیا کہ وہ حسینہ کون ہے دوبارہ کیسے بات کروں کیوں کہ رانگ کال ایک بار ملتی ہے بار بار نہیں رات سونے کے لیے لیٹا تو نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی کروٹیں بدلتے بدلتے رات کے بارہ بج گئے میں نے نمبر ملایا اور سوچا جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

پھر اس نے کال پک کی ہیلو جی کون جی میں عاطف بات کر رہا ہوں جی آپ کا نام کیا ہے مہوش بتایا پہلے پہلے وہ مجھ سے بڑا کتراتی رہی مگر ایک ماہ بعد ہماری ہلکی پھلکی دوستی ہو گئی یہ سلسلہ چلتا رہا وہ مظفر آباد کے رہائشی تھے اور مہوش ایک کمپنی میں جاب کرتی تھی کبھی وہ کال کر لیتی کبھی میں اس طرح وقت گزرتا گیا ایک سال بعد ہماری دوستی پیار میں بدل گئی ہم ایک منٹ بھی ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے ہمارا پیار شدت اختیار کر گیا۔

پھر مہوش لوگوں نے اسلام آباد آنا تھا تو اس نے ملنے کی ضد کی میں بھی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا میں صبح صبح اٹھا شیوہ وغیرہ بنوائی تیار ہوا میں نے مہوش کو دیکھا وہ اپنے امی ابو اور ایک شاید اس کا کزن تھا ان کے ساتھ آئی وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی کم تو میں بھی نہیں تھا کچھ دیر بعد وہ اپنے گھر آ گیا رات کو مہوش کی کال آئی وہ بھی مجھ سے مل کر بہت خوش تھی اور بار بار اصرار کر رہی تھی کہ اپنے گھر والوں کو اس کے گھر رشتے کے لیے بھیجوں مگر میری کوئی گھریلوں مجبوریاں تھیں میں نے کچھ وقت مانگا تو وہ ناراض ہو کے کہنے لگی عاطف میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی پلیز عاطف سمجھنے کی کوشش کرو میں نے اس کو کافی تسلی دی مگر خود پریشان ہو گیا کہ ان حالات میں امی ابو سے کیسے بات کروں اس کشمکش میں چھ ماہ گزر گئے مہوش مجھ سے ناراض رہنے لگی پھر ہماری بات بھی کم ہونے لگی آہستہ آہستہ رابطہ بھی ختم ہو گیا۔

کچھ عرصے بعد میری محبت بھی رنگ لے آئی کچھ ماہ میں میرا اشمار بھی اچھے بزنس مین میں ہونے لگا ایک سال میں اس قابل ہو گیا کہ میں مہوش کا ہاتھ بڑے فخر سے مانگ سکتا تھا میں نے مہوش کا نمبر ٹرائی کیا تو وہ مسلسل بند جا رہا تھا مجھے ان کے گھر کا پتا معلوم نہیں تھا مرتا کیا کرتا

صرف انتظار کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا مگر نمبر میں دن میں ہزار بار ٹرائی کرتا اس پریشانی میں مجھے تین سال اور لگ گئے ذہن میں کافی سوال تھے اس کی شادی نہ ہو گئی ہو مگر پھر دل کو تسلی دیتا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔

2010 میں مجھے ایک رانگ نمبر سے کال آئی مگر آگے سے کوئی بات نہیں کرتا تھا میں پریشان تھا کہ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے پھر مسیج آنے لگے کہ کیسے ہیں آپ؟ کیا کر رہے ہیں؟ ان باتوں سے میں یہ سوچنے پہ مجبور ہو گیا کہ جو کوئی بھی ہے اپنا ہے میں نے دوسرے نمبر سے کال کی تو مہوش کی آواز سن کر میری خوشی کی کوئی انتہاء نہ رہی پھر جب تک ہماری بات ہوئی ایک ہی گلہ عاطف آپ مجھے چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے ان تین سالوں میں ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا جس دن میں نے آپ کو یاد نہ کیا ہو مہوش اب میں آ گیا ہوں اب میرے پاس اتنی دولت ہے کہ میں بڑے فخر سے تمہارا ہاتھ تھام سکتا ہوں بولو کب بھیجوں اپنے والدین کو تو اس نے کہا رات کو امی سے بات کر کے بتاؤں گی میں نے کہا ٹھیک ہے پھر خوشی خوشی کال بند ہو گئی میں رات کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا رات کو مہوش نے اپنی امی سے بات کی تو انھوں نے کہا ٹھیک ہے مگر تم اپنے ابو کو کہنا کہ یہ میرے یوں کے جاننے والے ہیں مہوش مان گئی پھر کال پہ ہماری تفصیل سے بات ہوئی۔

صبح میں نے امی ابو سے بات کی تو وہ بہت خوش ہوئے اور کہا شکر ہے خدا کا تم شادی کے لیے راضی تو ہوئے مہوش کا گھر مظفر آباد میں تھا امی ابو ان کے گھر گئے چائے پانی کے بعد امی نے اصل بات کی تو وہ لوگ مان گئے مگر ان کی ڈیمانڈ تھی کے لڑکی کے نام ایک فلیٹ کروانا ہے ہم نے یہ بات مان لی، یہ تو میری محبت کے مقابلے کچھ نہ تھا وہ دن بھی آ گیا جب میری منگنی تھی جی کھول لہ میں نے مہوش کے شاپنگ کی اس کے گھر والوں کے لیے پندرہ پندرہ ہزار کے سوٹ لیے میں بہت خوش تھا مہوش اب صرف میری ہے وقت گزرتا گیا میں مہوش کی ہر فرمائش پوری کرتا اپنا فرض سمجھتا تھا دن مہینوں میں گزرتے رہے اس عرصے میں میرے سسرال والوں میں کوئی ملنے آ جاتا کبھی کوئی میں ان کو اپنی جان سے بڑھ کر عزت دیتا اور وہ خوش ہو کے واپس جاتے ایک دن مہوش کے بھائی کا مسیج آیا کہ بھائی مجھے دو ہزار روپے ایزی پیسہ کر دو میں نے فوراً کروا دیا میرے سسرال والے مجھ سے بہت خوش تھے۔

تین سال بعد میری شادی طے پائی تھی میں نے اپنا



بزنس اک دوست جس کا نام محسن تھا اس کے حوالے کیا اور خود شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا جہاں سے میری بربادی کے دن شروع ہو گئے دو ماہ بعد میرا دوست جسے میں دوست نہیں بھائی سمجھتا تھا میرا سارا پیسہ لے کر بھاگ گیا اور میں ہیرو سے زیرو ہو گیا بہت پریشان تھا شادی کے دن بھی قریب تھے اور فلیٹ بھی خریدنا تھا بیگم کے لیے زیور بھی مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی خیر میں نے کچھ دوست سے ادھار لیا کچھ اپنے پاس بچا تھا میں نے سوچا تھا ویسے میں مہوش کے لیے شاپنگ نہیں کر سکا شاید یہ ہی میری بدقسمتی تھی میں نے آٹھ لاکھ کا فلیٹ لیا چار لاکھ کا زیور بنوایا اپنے لیے شادی پہ صرف دو سوٹ لیے۔

پھر وہ دن بھی آ گیا اور دل میں دعا کر رہا تھا اللہ ہمیں نظر بد سے بچائیں مجھے دو جہاں کی خوشیاں مل گئی تھی ویسے والے دن میری ساس نے تھی جا کے میری بیوی کو ورغلانا شروع کر دیا مہوش تمہاری شادی طے جو شاپنگ ہوئی ہے جو مجھے پسند نہیں آئی عاطف آئے گا تو میں تو اس سے پوچھوں گی کہ اس نے ایسا کیوں کیا اب میری بیوی مجھ سے بدظن رہنے لگی اس رات میری بیوی نے مجھ سے کافی بحث کی کہ عاطف تم بدل گئے ہو تم مجھ سے اب پیار نہیں کرتے میں اپنی جگہ سے اٹھا پلیز مہوش جو تم سوچ رہی ہو ایسا کچھ نہیں میرے کاروبار میں تھوڑا خسارہ ہوا ہے خدا نے چاہا تو حالات پھر ٹھیک ہو جائیں گے چلو اپنا موڈ ٹھیک کرو آئس کریم کھانے چلتے ہیں اور پھر مہوش کا رویہ مجھ سے کچھ ٹھیک ہوا۔

کچھ دن بعد ہم نے پنڈی آنا تھا میں نے تیاری کی تو مہوش کہنے لگی کہ عاطف ہم لوگ کار پہ جائیں گے تو میں نے کہا مہوش بس میں چلے جاتے ہیں گھر کے حالات کچھ ٹھیک نہیں ہیں مجھے اس وقت بہت تکلیف ہو جب اس نے کہا مجھ سے کیڑے مکوڑوں کی طرح نہیں جایا جاتا یہ وہی مہوش ہے جو کہتی تھی کہ عاطف میں تین چار سال رتمہارے لیے روتی رہی ہوں عاطف آپ جب ناراض ہوتے ہیں تو میری سانسیں رکنے لگتی ہیں انہیں سوچوں میں وقت گا پتا ہی نہ چلا ہم پنڈی آ گئے گھر کو سیٹ کرنے لگے تھوڑی سی محنت کرنی پڑی وقت کا پہیہ گھومتا رہا۔

ایک دن میں آفس سے واپس آیا تو مہوش بولی عاطف مجھے کچھ پیسے چاہیے مجھے شاپنگ کرنی ہے میرے انکار پہ بیگم اس نے کافی واویلہ مچایا کافی سمجھانے پہ بھی وہ نہ مانی مگر اس کو جیسے کوئی بہانا چاہیے تھا ناراض ہونے کا کافی جھگڑا ہوا پلیز آہستہ بولو کوئی سن لے گا پلیز میں نے تقریباً روتے ہوئے کہا مگر وہ اور لڑائی کرنے لگی مجھے بھی غصہ آ گیا تو میں نے ایک تھپڑ مار دیا اور پھر خود بھی اداس رہا کہ یہ مجھ سے کیا ہو گیا مہوش نے اٹھنی امی کو فون کر کے بلایا اور ان کے ساتھ چلی گئیں میں نے اپنی امی لوگوں کو ساری بات بتائی پھر ابو اور میں لینے گئے باتیں ہو رہی تھیں مصالحت سے کام لیا گیا پھر ہم خوشی پنڈی آ گئے ایک ہفتہ ہمارا بڑا اچھا گزرا پھر اس نے ایک فرمائش کی کہ عاطف زیور بیچ کے ایک گاڑی لیں لیں مہوش کچھ دنوں کی بات ہے پھر میں اپنی جان کی ہر فرمائش پوری کروں گا کچھ بھی ہو جائے میں اپنی جان کا زیور بھی نہیں بیچوں گا اس بات پہ پھر ہماری لڑائی ہو گئی بڑی مشکلوں سے اسے منایا کچھ دن تو سکون سے گزر گئے میں اب اسے خوش رکھنے کی کافی کوشش کرتا تھا وہ پہلے سے کافی بدل گئی تھی مگر یہ میرا صرف وہم تھا وہ تو جیسے بڑے موقع کی تلاش میں تھی ہوا کچھ یوں کہ ہمارا پروگرام بنا شکر گڑھ جانے کا صبح کا وقت تھا مہوش میرے پاس آ کے کہنے لگی عاطف مجھے پانچ ہزار روپے چاہئے، سو ضرورت پڑ سکتی ہے میں اس وقت سو کے اٹھا تھا پرس دوسرے کپڑوں میں تھا میں نے کہا یار ادھر جا کے میں خود دے دوں گا بس پھر کیا تھا پتا نہیں کتنے دنوں سے وہ کوئی موقع ڈھونڈ رہی تھی لڑائی کا تو اسے آج مل گیا اس دن اتنی لڑائی ہوئی کے بس میری تو سوچ ہی مفلوج ہو گئی دماغ کی رگیں پھٹ رہی تھی میں سامنے صوفے پہ ڈھلے سا گیا اور رونے لگا۔

مہوش اپنے کمرے میں چلی گئی۔ امی کو کال کی مجھے آ کے لے جائیں میں نے ادھر نہیں رہنا مجھے سو روپے کے لیے بھی ترسنا پڑتا ہے میں نے سات ہزار دیا کہ مگر اس نے لینے سے انکار کر دیا وہ چلانے لگی کہ میں اپنے امی ابو سے پوچھوں گی کے مجھے یہاں کیوں پھینک دیا اک اک روپے

کے لیے بھی ترسنا پڑتا ہے میری قسمت خراب تھی وہ اپنے آپ کو اپنے گھر والوں کو کوسنے لگی اور مجھے برا بھلا کہنے لگی مجھ سے رہا نہ گیا میں نے کہا مہوش تم مجھے اتنی سزا کیوں دے رہی ہو لڑتے لڑتے مہوش اپنے کمرے میں چلی گئی۔

امی ابو کو فون کر دیا کے عاطف مجھے مار دے گا مجھے آپ آ کے لے جاؤ اب بندہ یہ سوچے کہ میری بیوی تھی میں نے کیوں مارنا تھا اس کو جس سے میں اتنی محبت کرتا ہوں وہ میری چھ سال کی محبت تھیں تو اسے جنوں کی حد تک چاہتا ہوں میں مر تو سکتا ہوں مگر اس کی جدائی قبول نہیں تھی۔ صبح میرے سسرال والے آ گئے مجھ سے پوچھنے کی زحمت بھی نہیں کی اور مہوش کو لے کر چلے گئے اس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا کچھ نہ کر سکا۔

میں نے ابو کو کال کر کے سب کچھ بتایا وہ بھی پریشان ہو گئے میں نے ابو کو ساتھ لیا اور مظفر آباد سے اپنے سسرال آ گیا مگر یہاں تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا میں نے کبھی سیدھے منہ بات نہ کی جب میں نے کہا مہوش کو بھیجیں تو میرا سسر اور میرا سالا مجھ سے لڑنے لگے اور کہنے لگے تمہارا تو خاندان ہی نہیں تم ہماری بیٹی کو دو وقت کا کھانا نہیں دے سکتے وہ محلے میں اپنی دوست کے گھر سے کھاتی ہے یہ باتیں ایسی تھی کے میرا دماغ پھٹنے لگا دل کر رہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں یہ مسلسل میرے پیار کی توھین کر رہے تھے اگر میں مہوش کی اتنی بدتمیزی برداشت کر رہا تھا تو صرف اس لیے کے میں اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا میں اس کے بنا نہیں رہ سکتا تھا پھر اک اور الزام لگایا کہ ہماری بیٹی کو عاطف نے مارا ہے اور اس کا بچہ پیٹ میں ہی فوت ہو گیا اس وقت میں اور میرے ابو بہت پریشان ہو گئے اور کون کون سے ظلم کرو گے میرے بیٹے پہ میرے ابو نے کہا باہر کافی بارش ہو رہی تھی انھوں نے ہمیں گھر سے نکال دیا۔

پھر مجھے کچھ دن بعد پتا چلا کے میرے بچے کو مارا گیا ہے اور میرے بچے کی قاتل ہے میری ساس آج میں مہوش سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم وہ دن بھول گئی تھیں جب ہم اپنے بچے کے بارے میں بات کر رہے تھے تم نے کہا کہ عاطف اگر بیٹا ہوا تو ہم اس کا نام محمد عون رکھے گے اور بیٹی کا نام دعا کیا کیا تم نے میرے عون کے ساتھ لڑائی جھگڑے تو ہوتے رہتے ہیں ہر گھر میں اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ بندہ اپنی اولاد کا گلہ گھونٹ دے کیا میرے بچے کے یہ ہی انجام تھا یار تم تو ماں تھی اس کی پھر کیوں کیا تم نے ایسا؟

میں نے پھر کوشش کی کہ شاید مہوش واپس آ جائے یہ سوچ کہ میں اپنے سسرال گیا جا کے بیٹھا تو میرا سسر آ گیا تو آتے ہی برس پڑا کیوں آئے ہو شور سن کے میرا بڑا سالا آ گیا اور کہا جاؤ ہمارے گھر سے میرے سسر نے میرا گریبان پکڑ لیا اس دن کافی لڑائی ہوئی میرا دل کر رہا تھا کہ چیخ چیخ کر کہوں کہ میں وہی عاطف ہوں جس نے پنڈی سے آپ کے لیے کھانے پیک کر کے بھجوائے مہنگے سے مہنگے گفٹ بھیجیا پنے سالے کی جاب کے لیے پچاس ہزار روپے دیے اپنے سسر کی میڈیسن کا سارا خرچہ خود اٹھایا اس بات کا گواہ میرے سالے کا دوست عثمان تھا جس کی گاڑی میں سب بھیجتا تھا۔ اف خدایا یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے مگر میں مہوش کو دیکھ رہا تھا وہ یہ سب دیکھ رہی تھی۔ آج مجھ پہ کافی سارے الزام لگ گئے کہ میرے پاس اپنے سسرال والوں اور بیوی کے نخرے اٹھانے کے لیے پیسے نہیں تھے۔

صبر کا دامن تھامے ایک بار پھر اپنے کام پہ جت گیا اور اسی محنت کا صلہ قدرت نے دیا، آ کے دیکھو نا مہوش آج میرے پاس بہت پیسہ ہے ہاں وہی پیسہ جس کی وجہ کی وجہ سے تم نے مجھے چھوڑا آ وٴں گا کبھی تمہارے سامنے اور وہ پیسے تمہارے قدموں میں پھینک دوں گا جتنے چاہوں لے لے مگر مجھے میرا عون یا دعا واپس کر دو پلیز مہوش یہ تم نے کیا کر دیا میرا یہ ہی قصور ہے کہ میں نے اپنے سے بڑھ کہ تمہیں پیار کیا تمھاری ہر بات کو مانا کہاں کی رہ گئی میرے پیار میں میری ریکویسٹ ہے ایسے والدین سے ہمیشہ اپنی اولاد کو اچھی تربیت دیں ورنہ پتا نہیں کتنے عاطف روز مریں روز جئیں گے کتنے عون یا دعا دنیا میں آنے سے پہلے ہی اندھیری کوٹھری میں چلے جائیں اور کتنی مہوش برباد ہوتی رہیں گی اپنی ماں کی وجہ سے اپنی آخرت سنواریں کیا پتا ہماری کون سی نیکی ہماری بخشش کا سبب بن جائے۔

☆☆......☆☆

ہم شکل

ایم اے راحت

سچی کہانیاں میں پہلی بار، برصغیر کے نامور
قلم کار، ایم اے راحت کے قلم کا جادو

سطر سطر تجسس سموئے، نئے سنسنی خیز سلسلے کی دوسری کڑی

شاہ زیب نیند سے اُٹھ کر آیا تھا۔ ذہن ابھی تک سویا سویا ہی تھا۔ ابتداء میں تو اسے اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ یہ ہو کیا رہا ہے اور پھر جب اسے اندازہ ہوا تو وہ حیران رہ گیا۔ لیکن اس وقت اس کی حیرانی کسی کام کی نہیں تھی۔ پاس پڑوس کے لوگ



اس ہڑ بونگ سے جاگ گئے تھے اور صورت حال معلوم کرنے نکل آئے تھے۔ پولیس والوں کا رویہ انتہائی خراب تھا۔ انہوں نے بڑی بے دردی سے شاہ زیب کو اٹھا کر پولیس کی گاڑی میں پھینک دیا اور اس کے اردگرد اس طرح بیٹھ گئے جیسے انہیں شاہ زیب کے فرار ہونے کا خدشہ ہو، بلکہ ان میں سے اسی سب انسپکٹر نے جس پر شاہ زیب کو شبہ ہوا تھا کہ بڑے غور سے شاہ زیب کا جائزہ لے رہا ہے۔ پستول نکال کر شاہ زیب کی پسلیوں میں لگاتے ہوئے کہا۔

''اس بار اگر تم نے کوئی حرکت کی تو میں یہ سارے کا سارا پستول تیری پسلیوں پر خالی کردوں گا۔'' اس کے لہجے میں انتہائی سفاکی تھی۔ شاہ زیب کو یوں لگا جیسے واقعی اگر اس نے ذرا بھی جنبش کی تو وہ پولیس والا اس کے بدن میں گولیاں اُتار دے گا۔ لیکن کیوں اور اس کیوں کا اسے پتا ہی نہیں چل سکا اور وہ ایک لمبا سفر طے کر کے اسے تھانے میں لے گئے۔ غالباً کوئی پولیس چوکی تھی، یہاں لاک اپ بھی بنا ہوا تھا اس سے کوئی سوال نہیں کیا گیا اور اسے لاک اپ میں ڈال دیا گیا۔

باقی رات دو پولیس والوں نے بیٹھ کر اس کی نگرانی کی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ شاہ زیب کو کوئی بہت ہی خاص آدمی سمجھتے ہیں۔ البتہ شاہ زیب لاک اپ میں بیٹھا یہ سوچتا رہا کہ آخر اس نے کیا کیا ہے اور اس کے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا گیا ہے۔ دوسرے دن پھر اسے ہتھکڑی اور بیڑیوں کے ساتھ گاڑی میں بٹھایا گیا اور اس بار گاڑی نے کافی لمبا سفر کیا تھا۔ کوئی پانچ گھنٹے کے سفر کے بعد وہ شاہ زیب کو کسی اور شہر میں لے گئے اور وہاں اسے جیل میں پہنچا دیا گیا۔

صورت حال اب بھی شاہ زیب کے علم میں نہیں آئی تھی۔ لیکن جیل میں اس کے ساتھ انتہائی سخت سلوک کیا گیا اور شاہ زیب بری طرح پریشان ہو گیا۔ ایک ایک شخص اس سے نفرت کا اظہار کر رہا تھا۔ لیکن یہ صرف جیل کے حکام تھے، ایک مقدم نے اسے خونی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بیٹا بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی آخر ایک دن چھری کے نیچے آنا پڑے گا، کیا سمجھا اب کے دیکھتا ہوں تو کیسے نکلتا ہے یہاں سے؟''

''ایک بات بتاؤ بھائی، میں کیا جیل سے نکل کر بھاگا ہوں؟''

''ہاں ہاں...... ہاں ہاں...... معصوم بن لے دلاور، تو سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو، بہت چالاک ہے تو۔''

''دد...... دلاور، ارے میں کتنے لوگوں کو اپنا نام بتا چکا ہوں، ابھی تک تم لوگوں نے یقین نہیں کیا، میں دلاور نہیں ہوں، بلکہ میرا نام شاہ زیب ہے۔''

''شاہ زیب کیا تیرا نام تو اورنگ زیب بھی ہو سکتا ہے اور پتا نہیں کیا ہو سکتا ہے، چل بیٹھ جا خاموشی کے ساتھ، شاہ زیب کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آ رہی تھی ایک ایک سے پوچھتا تھا کہ بھائی ہوا کیا ہے، لیکن عام طور پر سے لوگ اس کا مذاق ہی اڑاتے تھے۔ بہر حال دو یا تین دن گزر گئے تھے جیل آئے ہوئے اور شاہ زیب اب کافی پریشان ہو گیا تھا وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اگر اور کوئی صورت حال نہ بن سکی تو پھر گھر ہی سے رابطہ کرنا پڑے گا، شہباز اور شہریار بھائی کو بتانا پڑے گا کہ ایک مشکل پیش آ گئی ہے، کوئی کہانی گھڑ دی جائے گی اصل بات بتائے بغیر۔

پھر غالباً چوتھا دن تھا، وہ کوٹھری سے باہر لایا گیا تھا اور جیل کے احاطے میں اسے چہل قدمی کی اجازت دی گئی تھی۔ ابھی زیادہ دیر چہل قدمی نہیں کی تھی کہ ایک کافی اچھی شخصیت کا مالک جوان اس کے قریب پہنچ گیا، وہ اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور اس کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار تھے، شاہ زیب نے بھی اس کا جائزہ لیا، موٹی پھولی ہوئی ناک، موٹے موٹے ہونٹ اور چہرے پر اگی ہوئی ڈاڑھی اسے تھوڑا سا بدصورت ظاہر کر رہی تھی۔ جب اس نے کچھ بھی نہ کہا تو شاہ زیب خود ہی بولا۔

''کیا دیکھ رہے ہو بھائی؟''

''باپ رے باپ۔'' اس کے منہ سے آواز نکلی، پھر اس نے کہا۔ ''ادھر آؤ گے بھائی جی، ادھر آؤ، تم سے کچھ باتیں کروں۔''

''ٹھیک ہے چلو۔'' شاہ زیب بولا، ڈرنے کی تو خیر کوئی بات ہی نہیں تھی۔ یہاں اور زیادہ سے زیادہ کیا ہو سکتا تھا۔ وہ شخص اسے لیے ہوئے ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔

''بیٹھ جاؤ۔''

''وہ مقدم آ گیا تو مار لگائے گا۔'' شاہ زیب بولا۔

''نہیں لگائے گا۔ میرا نام بندو ہے بندو، یہ سارے مقدم مجھ سے ڈرتے ہیں کیونکہ دو چار کی اچھی خاصی چھینٹی لگا چکا ہوں۔''

''کہو بندو بھائی، ایسے مجھے کیوں دیکھ رہے تھے، جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہو؟''

''میں بتاؤں میری جان، ذرا اپنی اور میری آواز پر غور کرو۔''

''ارے ہاں، ایک لمحے میں میں نے یہی سوچا تھا کہ شاید تم میری آواز کی نقل کر رہے ہو۔''

''نقل نہیں کر رہا میری جان، اگر اپنے چہرے سے یہ میک اپ اتار دوں تو تم بھی دنگ رہ جاؤ گے۔''

''میک اپ۔''

''ہاں تمہیں حیرت ہوگی کہ میں تمہارا ہمشکل ہوں۔''

ہمشکل کے لفظ ہی سے دل پر دھکا لگا تھا۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا، دادی اماں کی بات مجھے یاد آ گئی تھی، اس دنیا میں ہر شخص کے سات ہمشکل ہوتے ہیں، یہ شخص کیا کہہ رہا ہے، کیا واقعی وہ میرا ہمشکل ہے، بظاہر تو نہیں لگتا تھا۔ اس نے کہا۔

''میرا نام دلاور ہے۔''

یہ دوسرا جھٹکا تھا جو مجھے لگا، میں آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھتا رہا، پھر میں نے کہا۔ ''دوست اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو تم نے میرا بیڑہ غرق کر دیا۔''

''میں یہی معلوم کرنا چاہتا ہوں تم سے کہ کس جرم میں یہاں آئے ہو؟''

''صرف اس جرم میں کہ وہ لوگ مجھے تمہارے دھوکے میں پکڑ لائے ہیں، وہ لوگ مجھے دلاور دلاور کہہ رہے ہیں۔''

''کیا؟'' وہ شخص حیران رہ گیا۔

''ہاں دلاور بھائی، میں تمہاری وجہ سے اس عذاب میں گرفتار ہوا ہوں ورنہ اچھی خاصی زندگی گزار رہا تھا۔''

دلاور سوچ میں ڈوب گیا پھر اس نے کہا۔ ''یار پہلی بار مجھے افسوس ہوا ہے، واقعی تم میرے اتنے ہمشکل ہو کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا، تمہاری آواز تمہارا بدن تمہارا چہرہ سو فیصدی میرا ہے، ذرا خود پر غور کرنا، اصل چہرہ تمہیں بے شک ابھی نظر نہیں آئے گا لیکن باقی تم خود دیکھ لو۔''

''مگر تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''اچھا پہلے تم اپنے بارے میں بتاؤ؟''

''اپنے بارے میں کیا بتاؤں، ایسے ہی آوارہ گرد ہوں، گھومتا پھرتا ہوں، کوئی سرپرست نہیں ہے، ایک چھوٹی سی آبادی میں وقت گزار رہا تھا کہ پولیس نے وہاں مجھے پکڑ لیا اور دلاور کے نام سے یہاں لے آئی، بڑا برا رویہ رہا ہے پولیس کا میرے ساتھ۔''

''مجھے اندازہ ہے، لیکن یہ بات بڑی حیرت کی بات ہے کہ تم میرے اس قدر ہمشکل ہو۔ دوست نجانے کیوں تم سے ایک لگاؤ کا سا احساس ہوتا ہے اور یہ فطری بات ہے کہ تم میرے لیے ایک انوکھی شخصیت کے مالک ہو، میرا مسئلہ ذرا مختلف ہے، بس یوں سمجھ لو کہ میں ایسے ہی ذرا غلط راستوں پر نکل گیا تھا۔ تم چاہو گے تو میں تمہیں اپنی کہانی سنا دوں گا، پولیس نے مجھے گرفتار کر لیا اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ بالکل الگ بات ہے، یوں سمجھ لو کہ میں جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا، لیکن پولیس جس طرح میرے پیچھے لگی ہوئی تھی مجھے اس بات کا خدشہ ہوا کہ مجھے دوبارہ گرفتار کر لیا جائے گا

اس کے بعد مجھے پھانسی کے پھندے سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ چنانچہ میں نے ایک چال چلی، میں نے ایک شخص سے جو میک اپ کا ماہر تھا اور بہت بڑا فنکار تھا اپنے چہرے میں تبدیلی کرائی یہ تبدیلی بالکل مستقل نہیں ہے کیونکہ کوئی بھی اپنا چہرہ چھوڑنا پسند نہیں کرتا۔ سارے رشتے ناتے ختم ہو جاتے ہیں جبکہ میرے رشتے ہیں باقی، لیکن یہ الگ بات ہے کہ میں بالکل مایوس ہو گیا ہوں کہ دیکھو کیا ہوتا ہے کیا نہیں ہوتا، لیکن جینا چاہتا ہوں۔ خیر تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ پولیس مجھے چپے چپے پر تلاش کر رہی تھی، میرے لیے بہتر یہی ہوا کہ میں پولیس ہی کے قبضے میں آ جاؤں، چنانچہ اس بدلے ہوئے چہرے کے ساتھ میں نے ایک چھوٹا سا جرم کیا اور اس جرم کی پاداش میں مجھے بھیج دیا گیا۔ ساڑھے تین مہینے کی سزا تھی میری، تین مہینے گزر چکے ہیں اور میں یہاں بڑے آرام سے ہوں، پندرہ دن کے بعد مجھے رہا کر دیا جائے گا، لیکن اس کے بعد میں اور کچھ سوچوں گا اب تک تو محفوظ رہنے کے لیے یہ جیل بہترین جگہ تھی۔ ان لوگوں کے فرشتوں کو بھی علم نہیں کہ جس دلاور کو یہ چپے چپے پر تلاش کر رہے ہیں وہ جیل ہی میں موجود ہے، کیا مزے کی بات ہے، ہے کہ نہیں۔“

شاہ زیب حیرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ بہت چالاک آدمی ہے یہ، لیکن میں اس کا چہرہ کیسے دیکھوں، میں کیسے دادی اماں کو بتاؤں کہ دادی اماں مجھے میرا ایک ہمشکل مل گیا، بس اب پانچ باقی ہیں، ایک میں خود ہوں کیونکہ دادی اماں نے بتایا تھا کہ سات ہمشکل ہوتے ہیں۔ پھر اس کے بعد شاہ زیب اور اصلی دلاور کے درمیان بڑی گہری دوستی ہو گئی اور رفتہ رفتہ شاہ زیب کو یہ پتا چل گیا کہ اس کے ساتھ دلاور کی حیثیت سے یہاں کیا سلوک ہونے والا ہے۔ دلاور نے اپنے بارے میں بتایا۔

”اصل میں یہ دنیا خود مجرم گر ہے، کوئی مجرم نہیں ہوتا، لیکن دنیا اسے مجرم بنا دیتی ہے، بس یوں سمجھ لو کہ میں اچھے خاصی حیثیت کا مالک تھا، ہمارا گھر انتہائی پُرسکون تھا، کھاتے پیتے لوگ تھے۔ ایک بہن اور ایک بھائی اور ماں باپ، لیکن بدنصیبی یہ تھی کہ باپ کا اچانک انتقال ہو گیا اور اس کے بعد یوں لگا جیسے گھر کی رونق ہی اڑ گئی، ہم لوگ زندگی گزارنے کے لیے پتا نہیں کیا کیا جتن کرنے لگے، اس دوران ایک اور صورت حال تھی وہ یہ کہ میری بہن دردانہ کا رشتہ ایک جگہ طے ہو چکا تھا۔ بڑے اچھے لوگ تھے لیکن جب ہمارے حالات خراب ہوئے تو وہ لوگ بھی خراب ہو گئے۔ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر بھاری جہیز نہ ملا تو وہ شادی نہیں کریں گے، ہمارے گھر میں تو ابا کے مرنے سے ہی نحوستوں کا آغاز ہو گیا تھا۔ ادھر توثیق صاحب نے جب سے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ میری بہن کی شادی اس وقت تک نہیں کریں گے جب تک کہ میرے پاس بھرپور جہیز دینے کے لیے نہ ہو۔ دردانہ بہت حساس تھی جب اسے یہ معلوم ہوا تو اس پر شدید دورہ پڑا اور اس نے کہہ دیا کہ وہ شادی نہیں کرے گی۔ ان لوگوں کے اس رویے پر میں سخت خونخوار ہو گیا اور مجھے یوں لگا جیسے میں ایک بے غیرت بھائی ہوں۔ میں نے سوچا کہ ہر قیمت پر پیسہ آنا چاہیے تاکہ ان لوگوں کی فرمائش پوری کر کے میں بہن کو رخصت کر دوں۔ پھر ایک دن ماں نے مجھے طعنہ دیا اور کہنے لگی کہ بھائی تو بہنوں کے لیے اپنے آپ کو بیچ دیتے ہیں۔ اگر تمہارا باپ ہوتا تو یہ ذمے داری تم پر نہ پڑتی لیکن اب ان تمام ذمے داریوں کا تعلق تم سے ہی ہے اور اگر تم ایسا نہ کر سکے تو پھر یہی کرنا ہوگا کہ تمہاری بہن کو بھی زہر دے دوں اور خود بھی زہر کھا کر مر جاؤں، میرے لیے اس سے زیادہ غمناک بات اور کوئی نہیں تھی۔ بہرحال کچھ کرنا بھی میرے بس سے باہر تھا لیکن بس میرا دل چاہ رہا تھا کہ کہیں سے مجھے دولت مل جائے اور میں اپنی بہن کو اس کے سسرال والوں کے مذموم مطالبے کو پورا کرتے ہوئے رخصت کر دوں۔

بہرحال میں سڑک گردی کرتا رہا، کیا کروں اور کیا نہ کروں، میرے ذہن میں بگولے اڑ رہے تھے، میرے ذہن میں کوئی انجانا منہ زور جذبہ سر اٹھا رہا تھا، ایسا جذبہ جس کے تحت میں ایک آتش فشاں بنا ہوا تھا، کیا کروں کدھر جاؤں مجھے یہ سب کچھ پورا کرنا تھا۔ بہرحال میں انہی ساری باتوں کو سوچتے ہوئے سڑک گردی کرتا رہا اور میرا ذہن چٹختا رہا، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا، کہاں جاؤں رہ رہ کر اپنی معصوم سی بھولی بھالی بہن کا چہرہ آنکھوں کے سامنے ابھرتا، میں اسے دلہن بنے بیٹھے دیکھتا، میرا خواب تھا کہ میں اس کی ڈولی اپنے ہاتھوں سے اٹھاؤں مگر اب میرے درمیان ایک تپتی ہوئی لوہے کی چادر آ گئی تھی جو لحظہ بہ لحظہ سرخ ہوتی جا رہی تھی اور پھر ایسے لمحات میں بدی کا فرشتہ فوراً ہی لپکتا ہے تاکہ انسان کو نیکیوں کے راستے

سے ہٹادے۔ میں نے صرف یہی سوچا کہ مجھے کہیں ڈاکہ ڈالنا چاہیے کہیں چوری کرنی چاہیے اور آخر کار میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں یہی کروں گا اور اس کے بعد میں نجانے کتنے راستے طے کرتا رہا۔ مجھے کسی ایسے گھر کی تلاش تھی جہاں میں ڈاکہ ڈال سکوں، وقت گزرتا رہا، میں پارک میں بیٹھا ہوا تھا اس سروے کے دوران ایک کوٹھی کا نقشہ میرے ذہن میں ابھر آیا تھا، مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہاں کون رہتا ہے، کیا نمبر ہے اس کا، بس مجھے یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ اس میں رہنے والے یقینی طور پر دولت مند ہوں گے اور اگر ان کی دولت کا کچھ حصہ میرے ہاتھ لگ جائے تو میری بہن رخصت ہو جائے، پھر رات کو تقریباً ایک بجے کے قریب میں تھوڑا سا فاصلہ طے کر کے اس کوٹھی تک پہنچ گیا۔ کوٹھی میں دور دور تک پھلدار اور خوشبودار درخت اور پودے اُگے ہوئے تھے، میری زندگی کا یہ پہلا موقع تھا کہ میں کسی عمارت کی چار دیواری پھلانگ کر اندر جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا، الغرض میں نے وہ دیوار عبور کی اور اندر داخل ہوگیا، مجھے ایک دم سے حیرت ہوئی کہ زندگی کے چھبیس سال میں نے کیسے گزار لیے اور اس سے پہلے اپنے آپ کو ایک بہتر انسان بنانے کے لیے یہ سب کچھ کیوں نہیں کیا۔ غرضیکہ میں اونچے اونچے پھیلے ہوئے پودوں اور درختوں کی اوٹ سے ہوکر عمارت کے جنوبی حصے میں جا پہنچا، کوٹھی بہت بڑی تھی اور اس میں بے شمار کمرے تھے، میں نجانے کس کس طرح ان کمروں کو عبور کرتا رہا اور پھر ایک راہداری میں داخل ہوا تھا کہ دائیں طرف کے برآمدے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی میں نے ایک لمبی تڑنگی عورت کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا اس کے ایک ہاتھ میں پستول تھا اور دوسرے ہاتھ میں ٹارچ پھر اس نے کسی کو آواز دی۔

''امام بخش، امام بخش، کہاں ہے تو سو رہا ہے گہری نیند...... ہوں۔''

چند ہی لمحات کے بعد کسی شخص کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ ''کیا بات ہے مالکن؟''

''یہ آہٹیں کیسی ہو رہی ہیں ارے دیکھو ادھر کون ہے، کون ہے ادھر۔'' عورت کی نگاہ شاید مجھ پر پڑ گئی تھی، دوسرے لمحے ایک فائر کی آواز سنائی دی اور میں پھرتی سے نیچے بیٹھ گیا، میری یہی کوشش مجھے بچا گئی تھی، کسی فاصلے پر شیشہ ایک زوردار آواز سے ٹوٹا لیکن پھر مسلسل فائرنگ ہونے لگی، یکے بعد دیگرے کئی گولیاں میری سمت چلائی گئیں مگر میں بچ گیا، مجھے اب صورت حال کا اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا، میں سمجھ گیا تھا کہ میں مشکل میں پڑ گیا ہوں، اب یہاں سے نکلنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا، بہر حال میں بچتا بچاتا اِدھر سے اُدھر چلتا رہا اور تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں وہ شخص یا کوئی اور موجود نہیں تھا اور صورت حال کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہا تھا، میری سمجھ میں اور کوئی بات نہیں آئی، میں نے دیکھا کہ وہ شخص میری طرف متوجہ ہوگیا ہے لیکن اس سے پہلے کہ وہ چیختا میں نے اپنے لباس سے نکالا ہوا چاقو اس کی گردن پر رکھ دیا۔

''ایک آواز اگر منہ سے نکلی تو تیری گردن الگ جا پڑے گی، چاقو بارہ انچ کا ہے اور بالکل تیز دھار والا ہے''، اس شخص کے حلق سے بے معنی آوازیں نکلیں لیکن پھر اس نے اور کوئی آواز نہ نکالی اور کھڑا کھڑا کانپنے لگا، پھر میں نے اس سے کہا۔

''میں تجھے نہیں ماروں گا لیکن جو سوالات میں تجھ سے کر رہا ہوں اس کے جواب دے۔''

اس کے منہ سے پھر کوئی آواز نہ نکلی تو میں نے اس سے کہا۔ ''یہاں کون رہتا ہے اور وہ عورت جو تجھے پکار رہی تھی کون ہے؟''

''مم...... مم میری مالکن، اس کا نام رخسانہ خان ہے۔''

''اس کے بارے میں مجھے کچھ اور بتا؟''

''بیوہ ہے صاب جی، بڑے صاحب کا انتقال کینیڈا میں ہوا تھا، دولت مند لوگ ہیں، صاحب جی ایک بات بتا دو، کیا آپ یہاں چوری کرنے آئے ہو؟''

''ہاں اور تجھے میری مدد کرنا پڑے گی اسی میں تیری زندگی بچ سکتی ہے۔''

''ٹھیک ہے صاب جی، مالکن کے پاس بڑا پیسہ ہے، اچھا ہے آپ اس کنجوس عورت سے کچھ رقم نکلوا لیں، میں آپ کی مدد کروں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' پھر واقعی اس شخص نے اپنا کہا ہوا نبھایا وہ ایک خفیہ راستے سے اس جگہ پہنچا جہاں وہ عورت اپنے ہاتھ میں پستول لیے کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے پیچھے سے اس پر جھپٹا مارا اور اس کے ہاتھ سے پستول چھین لیا اور اس کے بعد میں نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''اگر تم نے کوئی حرکت کی یا دوبارہ تمہارے منہ سے آواز نکلی تو میں گولی مار دوں گا۔''

''کک.....کون ہو کون ہو تم، کیا چاہتے ہو؟''

''مال کہاں ہے تمہارے پاس، مجھے بتاؤ مال کہاں ہے؟'' میں نے کہا اور اس کی طرف پستول اٹھا دیا، راہداری کے بلب کی روشنی میں میں نے اسے دیکھا وہ عورت کافی خطرناک نظر آتی تھی مجھے، پھر میں نے ایک سپاٹ آواز میں کہا۔

''میری بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی، تم دونوں کو قتل کر کے میں تمہاری دولت تلاش کر سکتا ہوں، اگر تم زندہ رہنا چاہتی ہو......''

''بکواس مت کرو تم۔ اس نے کہنا چاہا لیکن دوسرے لمحے میرا ایک بھرپور تھپڑ اس کے رُخسار پر پڑا اور وہ تیورا کر ایک دیوار سے جا لگی، اس کے منہ سے خون رسنے لگا تھا۔ اس کے ہونٹ تر ہونے لگے تھے اس نے خون کو اپنی انگلیوں سے پونچھنے کی کوشش کی، لیکن چوٹ زوردار لگی تھی خون بہتا رہا۔

''بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔'' میں نے ایک اور قدم آگے بڑھایا اور ایک اور تھپڑ اس کے بائیں طرف رسید کر دیا۔ میرا ہاتھ کافی طاقتور ہے تم اسے چھو کر دیکھو، بہرحال اب اس کے اعتماد کی دیوار لرزنے لگی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

''چلو میں تمہیں بتاتی ہوں۔'' اس نے کہا اور وہ مجھے ایک کمرے میں لے گئی، اس نے روشنی جلائی اور ایک طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی۔

''وہ ہے تجوری اس میں کافی رقم ہے، لیکن وعدہ کرو کہ مجھے ہلاک نہیں کرو گے۔''

''مجھے تمہاری زندگی نہیں بلکہ رقم چاہیے سمجھیں۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے جاؤ تجوری کے تالے کا نمبر میں تمہیں بتاتی ہوں، دو آٹھ دو آٹھ نو دو گیارہ۔''

''اس طرف کھڑے ہو جاؤ، تم لوگوں نے کوئی حرکت کی تو میں بے دریغ گولی چلا دوں گا۔'' میں نے کہا اور تجوری کی طرف چل پڑا میں نے تجوری کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور اس کے بعد سامنے رکھے ہوئے ڈائل کو دو آٹھ دو آٹھ نو دو گیارہ پر سیٹ کرنے لگا۔ لیکن جب میں نو اور دو کے بعد ایک اور ایک پر پہنچا تو اچانک اوپر سے ایک عجیب سی چیز گری اور میرا ہاتھ ہتھکڑی میں پھنس گیا۔ غالباً اس تجوری کو خاص طریقے سے بنایا گیا تھا، جب مجھے احساس ہوا کہ میرے ساتھ دھوکہ دہی کی گئی ہے تو میرا خون کھول گیا میں تو ویسے ہی دیوانہ ہو رہا تھا، چنانچہ میں نے فوراً ہی ان کی طرف رُخ کر کے گولی چلا دی ایک تیز چیخ سنائی دی اور عورت ڈھیر ہو گئی۔ لیکن مرد کو بھاگنے کا موقع مل گیا، بس اس کے بعد جو ہونا تھا وہ تم سمجھتے ہو کہ کیا ہوا، مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ میں وہاں سے بھاگ نہیں سکا تھا کیونکہ میرا دوسرا ہاتھ ہتھکڑی میں پھنسا ہوا تھا۔ مجھ پر قتل کا مقدمہ قائم ہوا، وہ عورت بہت بڑی حیثیت کی مالک تھی چنانچہ مقدمے کا فیصلہ ہونے میں بھی کوئی دقت نہ ہوئی اور مجھے سزائے موت سنا دی گئی۔ میں جیل آ گیا، ماں اور بہن بہت یاد آتی تھیں لیکن کر بھی کیا سکتا تھا، بے بسی سے جیل میں زندگی گزارتا رہا اور جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا کہ آخرکار مجھے بھاگنے کا موقع مل گیا، تقدیر نے میرا ساتھ دیا، باہر کی دنیا میرے لیے جس قدر ہولناک تھی میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ بہترین طریقہ یہی نظر آیا کہ میک اپ کر کے میں دوبارہ پولیس کے قبضے میں آیا اور اس چھوٹے سے جرم کی سزا میں جیل پہنچ گیا۔ ساڑھے تین مہینے کی سزا ہے جو پوری ہونے کو ہے، میں یہاں سے نکل جاؤں گا لیکن میرے دوست تم یقین نہیں کرو گے کہ میں دن رات پریشانیوں کا شکار ہوں کیونکہ تم میرے ہمشکل ہونے کی بنا پر اس عذاب میں گرفتار ہوئے ہو، تمہاری نجانے کیا کہانی ہے تم نے نہ آج تک مجھے بتایا اور نہ میں نے تم سے پوچھا لیکن کہانیاں

سب کی یکساں ہی ہوتی ہیں۔ تم کس طرح ان لوگوں کے چنگل میں پھنس گئے، بس بدنصیبی ہی کہا جاسکتا ہے اسے۔ تم یقین نہیں کرو گے میرا دل تمہارے لیے روتا ہے کیونکہ تمہیں میرے جرم کی سزا بھگتنی پڑ رہی ہے۔ کیا کہوں اور کیا نہ کہوں، ہاں ایک بات تو میں تمہیں بتانا بھول گیا کہ جیل سے فرار حاصل کرنے کے بعد میں اپنی ماں اور بہن کی تلاش میں اپنے گھر پہنچا تو مجھے پتا چلا کہ لوگوں نے ان کا جینا حرام کردیا تھا۔ بحالت مجبوری انہوں نے وہ گھر چھوڑ دیا، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ انہیں دوبئی جانے کا موقع مل گیا اور وہ دوبئی چلی گئیں، کچھ اور کچھ کہتے ہیں، اب میں کس کس کی زبان بند کرتا پھرتا۔ اگر میرے ذہن میں اب کوئی مقصد ہے تو صرف یہ کہ ماں اور بہن کو تلاش کروں، لیکن اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں اس ناکردہ گناہ سے کیسے بچاؤں۔'' شاہ زیب خاموشی سے اس کی صورت دیکھتا رہا تھا۔

اتنا اندازہ ہوگیا تھا کہ دلاور شریف آدمی ہے جو واقعات اس کی زندگی سے منسلک تھے۔ ان پر اگر غور کیا جاتا تو اندازہ ہوجاتا تھا کہ اس کا رُخ خود بخود جرم کی دنیا کی جانب ہوگیا تھا جبکہ وہ مجرم نہیں تھا۔ اور پھر وہی بات رہی کہ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم...... وہ جن مشکلات میں گرفتار ہوگیا تھا وہ ایک الگ چیز تھی لیکن ماں اور بہن کا اس طرح گم ہوجانا زیادہ دُکھ کی بات تھی۔ البتہ چالاک آدمی تھا۔ جس کا اندازہ اس کی اس حرکت سے ہوجاتا تھا کہ اس نے اپنا چہرہ بدل کر جیل ہی میں وقت گزارنے کی ٹھانی تھی۔ باہر کی دنیا میں اس کی تلاش کی شدت بے شک کم نہیں ہوئی تھی۔ اس کا اندازہ شاہ زیب سے زیادہ اور کسے ہوسکتا تھا۔ جسے دلاور کے دھوکے میں پکڑ کر لے آیا گیا تھا اور اب خود شاہ زیب کی زندگی پر بن گئی تھی۔

دلاور نے البتہ اس سے کہا۔

''تو فکر مت کرنا میری جان، بھائی ہے تو میرا۔ ہمارے درمیان ایک انوکھا رشتہ ہے۔ میں تجھے اکیلے نہیں چھوڑوں گا۔ اور تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر میں نے یہ دیکھا کہ تیری زندگی بچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو میں اپنے آپ کو اصل حیثیت سے پیش کروں گا۔ اور تجھ پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔''

یہ بہت بڑی بات تھی۔ زندگی اور موت کا معاملہ تھا۔ بھلا کون ایسے موقع کو ہاتھ سے گنوا کر موت کو گلے لگانے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ دلاور نے کم از کم یہی کہہ دیا تھا۔ یہ کافی تھا۔ لیکن شاہ زیب کو یہ بھی اندازہ ہوا تھا کہ قدرت کے کھیل ایسے ہوتے ہیں کہ انسان انہیں سمجھ بھی نہ پائے۔

اس رات کو بھی وہ اپنی کوٹھڑی میں کمبل پر لیٹا ہوا گزرے وقت کو یاد کررہا تھا۔ دادی، اماں، بھابیاں، بہنیں سارے کے سارے اور پھر ڈاکٹر سلیمان۔

''یار ڈاکٹر سلیمان زندگی سے تو اور کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے مجھے۔ لیکن یہ آرزو ضرور تھی میرے دل میں کہ تجھے شکست دی جائے اور پھر کبھی...... اصل میں جب انسان کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ سانسوں کی آخری منزل سے گزر رہا ہے تو پتا نہیں دل میں کیا کیا خیالات گردش کرتے رہتے ہیں۔''

خیر وقت گزرتا رہا اور شاہ زیب انہی سوچوں میں گم رہا کہ اچانک اسے اپنی کوٹھڑی کے قریب ہی آوازوں کا زبردست شور سنائی دیا۔ اسے یہ اندازہ ہوا کہ بہت سے لوگ ان کوٹھڑیوں کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ خصوصاً جن میں سزائے موت کے قیدی بند تھے۔ اس کے علاوہ وہ شور بھی کررہے تھے۔ پہرے دار ایک دم چوکنے ہوگئے۔ خود شاہ زیب کے دروازے پر جو سپاہی تھا اس نے رائفل سنبھالی اور دروازے سے پیٹھ ٹکا کر سامنے کے ہجوم پر گولیاں چلانے لگا۔ اس کی پیٹھ سلاخوں کے دروازے کے بالکل قریب تھی اور باہر آوازوں کا شور بڑھ رہا تھا۔ شاہ زیب کو ایک دم احساس ہوا کہ پتا نہیں اس کی گولیوں سے کون کون ہلاک نہ ہوجائے۔

چنانچہ وہ پھرتی سے اپنی جگہ سے اُٹھ گیا اور دبے پاؤں سلاخوں والے دروازے تک پہنچا۔ پھر اس نے بڑی احتیاط سے اپنا ہاتھ جنگلے سے باہر نکالا اور سنتری کی گردن میں ڈال دیا۔ سنتری کے دونوں ہاتھ فضا میں بلند ہوئے اور رائفل اس کے ہاتھ سے نیچے گرگئی۔ شاہ زیب نے اس وقت کسی قسم کا تکلف نہیں کیا تھا۔ اس نے پوری قوت سے سنتری کی گردن دبائی اور اس کے سر کو پکڑ کر جنگلے سے مارنے لگا۔ چند ہی لمحوں کے بعد اسے احساس ہوگیا کہ سنتری بے ہوش ہوگیا ہے۔

چنانچہ شاہ زیب نے جلدی سے جھک کر سب سے پہلے اس کی رائفل پر قبضہ کیا اور پھر اس کے گلے سے کارتوسوں کی پٹی بھی اُتار لی۔

شور بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ قیدیوں نے جیل کے عملے پر حملہ کر دیا ہے۔ گولیاں چل رہی تھیں اور زبردست چیخ و پکار مچ رہی تھی۔ پھر نجانے کتنے لوگوں کا ایک گروہ ان کوٹھڑیوں کے قریب پہنچ گیا۔ کسی نے چیخ کر کہا۔

''نکالو ان بدنصیبوں کو...... نکال لو یہاں سے۔''

''تالے توڑ دو'' کسی نے کہا۔ اور پھر کئی لوگ پاگلوں کی طرح ان کوٹھڑیوں کے تالوں پر پل پڑے۔ ان کے ہاتھوں میں اینٹیں تھیں، لوہے کی سلاخیں تھیں، ڈنڈے تھے۔ اور وہ بہت خونخوار نظر آ رہے تھے۔ انہی میں سے دو آدمیوں نے شاہ زیب کی کوٹھڑی کا تالا لوہے کی سلاخ ڈال کر توڑ دیا اور پھر اس کی آواز اُبھری۔

''نکل آ میری جان...... بچا اپنی جان ان قصائیوں سے...... بھاگ جا'' اس کے ساتھ ہی کوٹھڑی کا وہ جنگلہ کھل گیا اور شاہ زیب نے بندوق ہاتھ میں لے لی۔ کارتوسوں کی پٹی اس نے اپنے گلے میں ڈالی اور باہر نکل آیا۔

جیل کے کئی حصوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ قیدیوں نے اپنی بیرکیں توڑ ڈالی تھیں۔ یہ ایک عجیب و غریب موقع ملا تھا اور اس وقت بھی شاہ زیب کو دلاور پر پیار آیا۔ بجائے اس کے کہ وہ بھاگ جاتا وہ شاہ زیب کو تلاش کرتا پھر رہا تھا اور اس کی آواز اُبھر رہی تھی۔

''کہاں ہے میری جان...... شاہ زیب کدھر ہے تو۔'' شاہ زیب نے اس کی آواز کی سمت کا اندازہ لگایا اور برق رفتاری سے دوڑتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ جیل توڑنے والے قیدی بھرپور کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے جیل کی ایک دیوار میں سوراخ کر دیا تھا اور لوگ دھڑا دھڑ اس میں سے گزر کر باہر جا رہے تھے۔

''چل آ جا...... آ جا'' دلاور نے اس کا ہاتھ پکڑا اور چند لمحوں کے بعد یہ دونوں جیل سے باہر نکل آئے۔ ان کے اردگرد بے شمار قیدی وحشیوں کی طرح بھاگتے جا رہے تھے۔ اچانک جیل کے سپاہیوں کی گاڑیاں تیار ہو کر ان کی طرف لپکیں۔ اور وہ چیخے۔

''رک جاؤ ورنہ گولی مار دی جائے گی۔'' لیکن کوئی نہیں رک رہا تھا۔ کوئی دس ہی سیکنڈ کے بعد گولیوں کی بوچھاڑ ان کے اردگرد سے گزرنے لگی۔ ایک دو نہیں درجنوں گولیاں تھیں۔ کئی آدمی چیختے چلاتے اِدھر سے اُدھر لڑھک گئے تھے۔ مگر یہ دونوں بھاگتے رہے اور سڑک سے اُتر کر مغربی سمت میں اُگی سبزی کے کھیت میں جا گھسے۔ اس سے ذرا آگے ایک باغ تھا۔ تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دونوں بہت دور نکل آئے۔ ان کے تمام ساتھی پیچھے رہ گئے تھے۔ زندگی بچا کر یہاں تک نکال لانا بھی کارنامہ تھا۔ اور اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ ان کی قسمتیں ساتھ دے رہی ہیں۔

طویل عرصہ ہو گیا تھا شہروں سے، بستیوں سے، اپنوں سے، بیگانوں سے، زندگی کی دلآویز صبح سے اور اس کی روح پرور شاموں کی لذتوں سے دور ہوئے اور اب جس حیثیت میں زندگی گزر رہی تھی۔ اس میں شاہ زیب ایک مفرور قیدی تھا۔ ایسا قیدی جس کو پھانسی کی سزا سنائی جا چکی تھی۔ یہ تو الگ بات تھی کہ اس کی شکل دلاور سے ملتی تھی اور فیصلہ کرنا مشکل ہو سکتا تھا کہ ان میں سے کون دلاور ہے اور کون شاہ زیب۔ پھانسی کا پھندا بس دو چار ہاتھ ہی دور رہ گیا تھا۔ یہ دونوں چلتے رہے۔ دلاور نے اس دوران کوئی بات نہیں کی تھی۔ کھیت کھالیاں عبور کی جا رہی تھیں اور آہستہ آہستہ وقت گزرتا جا رہا تھا۔

اتنی مشقت کی تھی دونوں نے کہ ان کے سینے دھونکنی بنے ہوئے تھے۔ لیکن یہ سب کچھ کچھ بھی نہیں تھا۔ زندگی بچ جانے کی خوشی ان چیزوں سے کہیں زیادہ قیمتی تھی۔ یہ مشقت جو انہوں نے کی تھی بہت ضروری تھی۔

پھر ایک مناسب سی جگہ دلاور نے رُکتے ہوئے کہا۔

''بس رُک جا میری جان! لگتا ہے ہم موت کو پیچھے چھوڑ آئے۔ مجھے تو خیر نکل ہی آنا تھا۔ لیکن لعنت تھی ایسی زندگی پر جو مجھ بے گناہ کو پھنسا کر حاصل کی جاتی اور خدا کا بہت بہت شکر ہے کہ میں اس طرح تجھے جیل میں مل گیا، ورنہ بے موت

مارا جاتا تو..... یہ کمبخت کبھی یقین نہ کرتے کہ تو دلاور نہیں ہے۔'' شاہ زیب بھی مسکرا دیا۔ پھر دلاور نے کہا۔
'' کتنے دن سے ہمارا تیرا ساتھ ہے، لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ تو کون ہے، کہاں رہتا ہے، کیا کرتا تھا۔ ویسے ایک اندازہ میں نے لگایا ہے تیرے بارے میں، ہے کسی اچھے گھرانے کا فرد۔''
''ہاں دلاور! اچھے گھرانے کا فرد ہی ہوں۔ لیکن بس عجیب وغریب حالات کا شکار ہوں۔''
'' چل خیر اتنی کون سی جلدی ہے۔ تا تو کہیں جا رہا ہے نا میں۔ ایک بات سمجھ لے بیٹا سب کچھ اتنا آسان نہیں ہے ہم بھاگ تو لیے ہیں۔ جتنی لاشیں انہیں وہاں مل جائیں گی ان کی تو وہ تدفین کر دیں گے۔ لیکن جو قیدی نہیں ملیں گے ان کی تلاش میں زمین آسمان ایک کر دیں گے، ہمیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے اس دنیا میں۔''
''ہاں کیوں نہیں۔''
''ایک بات پوچھوں؟'' دلاور بولا۔
''ہاں پوچھو۔''
''کیا تو میرا چہرہ دیکھنا چاہتا ہے۔''
''سو فیصدی..... لیکن اتنی جلدی نہیں ہے، جیسا کہ ابھی تم نے کہا دلاور کہ زندگی باقی ہے تو بہت کچھ ہو جائے گا۔''
''ہاں یقین کر..... مجھے تو یہ سب کچھ بڑا خوشگوار لگ رہا ہے۔''
رات آہستہ آہستہ بیتی جا رہی تھی۔ پچھلا پہر تھا۔ ستارے دھندلاتے جا رہے تھے۔ وہ جس جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں سامنے ہی ایک سڑک نظر آ رہی تھی۔ جس کے دونوں جانب درخت تھے۔ پت جھڑ کے دن تھے۔ ہوا میں تیزی کے ساتھ ہلکی ہلکی خنکی بھی رچی ہوئی تھی۔ سڑک پر بکھرے ہوئے خشک پتے ہوا کے جھونکوں کے ساتھ کھڑکھڑاتے ہوئے سفر کر رہے تھے۔ یہ دونوں ننگے پاؤں تھے اور چونکہ کافی دیر تک دوڑتے رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی طبیعت میں ایک خوشگوار سی کیفیت طاری تھی، جس علاقے میں وہ لوگ موجود تھے۔ اس کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔
تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد دلاور نے کہا۔
''بات سنو! میرا خیال ہے ہمیں صبح کا اُجالا پھیلنے تک سفر کرتے رہنا چاہیے۔ جتنی دور نکل جائیں زیادہ اچھا ہے۔ ورنہ وہ لوگ اپنے وسائل سے کام لے کر برق رفتاری سے ہمیں تلاش کریں گے۔''
''یہ جانتے ہو دلاور کہ یہ راستہ کون سا ہے؟''
''نہیں بالکل نہیں..... سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہمیں بالکل نہیں معلوم کہ ہم کہاں ہیں مگر میرا خیال ہے اُٹھو آگے بڑھتے ہیں۔''
شاہ زیب اٹھ گیا۔ وہ بھی جوان اور تندرست آدمی تھا جو روگ اس سے منسوب کر دیا گیا تھا اسے اس نے قبول ہی نہیں کیا تھا اور یہ بھی ایک بہت بڑی سچائی ہے کہ اگر انسان ناآگہی کا شکار ہو تو بہت سے ایسے مرحلے طے کر لیتا ہے جو آگہی سے نہیں طے ہو سکتے۔
چنانچہ انہوں نے تھوڑی دیر کے بعد آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ کافی دور تک وہ چلتے رہے اور اس کے بعد انہوں نے کچھ اور بھی نہیں کہا تھا کہ پیچھے سے ہارن کی تیز آواز ابھری۔ دونوں نے پلٹ کر دیکھا سڑک کے موڑ سے روشنی ابھری اور خزاں رسیدہ درختوں کی برہنہ شاخوں سے چھن چھن کر ہر طرف بکھرنے لگی۔
وہ جھٹ سے سڑک سے نیچے اترے اور ایک گھنی جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔ دونوں کی گہری گہری سانسیں ابھرنے لگیں۔ لیکن دونوں ہی چوکس تھے۔ روشنی قریب آتی گئی اور پھر سڑک پر پہیوں کی تیزی سے دوڑنے کی آواز بڑھتی گئی۔ ذرا سی دیر میں ایک جیپ ان کے عین سامنے آ کر رُکی اور ان کے دم خشک ہو گئے۔ انہوں نے جیپ میں جیل کے سپاہیوں کو دیکھ لیا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں دبی ہوئی تھیں۔ جیپ کے رُکتے ہی اگلی نشست سے ایک شخص نیچے اترا اس کے ساتھ ہی جیل کی وردی میں ملبوس ایک سپاہی بھی نیچے اتر آیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے نشیب کی طرف

بڑھے اور ان دونوں کی سانسیں رُک گئیں۔ کیا انہیں دیکھ لیا گیا ہے؟ یا ان لوگوں کو شبہ ہوا ہے کہ یہاں کوئی چھپا ہوا ہے۔ وہ مسلح تھے، رائفل شاہ زیب کے پاس بھی تھی اور پولیس کی ہی رائفل تھی اور گولیاں بھی تھیں۔ لیکن جیپ میں کتنے لوگ تھے اس کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اور پھر یہ باقاعدہ مقابلہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ خاص طور سے شاہ زیب وہ بندوق چلانا نہیں جانتا تھا۔ ہاں دلاور کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا تھا۔

وہ لوگ دم سادھے انہیں دیکھتے رہے اور پھر انہیں اندازہ ہو گیا کہ اصل مسئلہ کیا ہے۔ وہ شخص جیپ سے نیچے اترا تھا وہ شاید رفع حاجت کرنا چاہتا تھا۔ خاصی دیر گزر گئی۔ یہ سہمی نگاہوں سے انہیں دیکھتے رہے۔ اور دوسرا آدمی جو ساتھ آیا تھا وہ ادھر اُدھر نگاہیں دوڑاتا ہوا گردش کرتا رہا۔ اچانک ہی ان میں سے ایک کی آواز ابھری۔

''شاید جیپ میں پنکچر ہو گیا ہے۔''

''تو، تو یہاں بیٹھ کر پنکچر لگائے گا کیا؟'' دوسرے آدمی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''نہیں، نہیں تھوڑے فاصلے پر پیٹرول پمپ سے ہوا بھروا لینا۔'' یہ کہنے کے بعد وہ واپس مڑا اور جیپ کی طرف بڑھنے لگا۔ ان لوگوں نے سکون کی گہری سانس لی تھی۔ آخر کار رات کے سناٹے میں جیپ کا انجن زور سے گڑگڑایا اور وہ آگے بڑھ کر تیزی سے دوڑنے لگی۔ چند ہی لمحوں کے بعد نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ شاہ زیب گردن اٹھائے اسے دور تک دیکھتا رہا اور پھر گہری سانس لے کر بولا۔

''باپ رے باپ کیا زندگی ہو گئی یار...... کیا ہماری باقی زندگی ایسے ہی گزرے گی۔''

''اس زندگی میں بھی ایک مزہ ہے میری جان۔ دیکھ تو سہی آگے کیا لکھا ہے تقدیر میں۔ بس یوں سمجھ لے کہ ہمیں بھاگتے رہنا ہے۔''

''میں تمہیں ایک کہانی سناؤں گا مگر ابھی نہیں۔''

''ہاں یہ وقت کہانیوں کا ہے بھی نہیں۔'' دلاور بولا اور اس نے آگے قدم بڑھا دیے۔

''چلو...... تم نے دیکھ لیا کہ موت زندگی سے زیادہ دور نہیں ہے۔ یہ لوگ۔ پتا نہیں اس طرف کیسے نکل آئے۔ ممکن ہے ہماری ہی تلاش میں ہوں۔ لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں جانا کہاں ہے۔''

جواب میں دلاور ایک بھونڈا سا گانا گانے لگا۔ جس میں منزل بے نشاں ہونے کے بول تھے۔ دونوں جھاڑیوں سے نکل کر سڑک پر آ گئے اور خشک پتوں کو روندتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ نجانے کتنا فاصلہ طے ہو گیا تھا اور روشنی پھیلتی جا رہی تھی۔ ان کی نگاہوں کے سامنے کھیتوں کا طویل سلسلہ پھیلا ہوا تھا لیکن سڑک بھی کھیتوں کے ساتھ ساتھ ہی چل رہی تھی۔ چنانچہ ضروری تھا کہ اب کھیتوں کا راستہ اپنایا جائے اور سڑک کو چھوڑ دیا جائے۔ وہ...... کھیتوں کے درمیان سے گزرنے والے کچے راستے پر چل پڑے۔

راستہ بہت کشادہ تھا۔ اور کھیت کے دونوں طرف فصلیں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ ہوا فراٹے بھرتی ہوئی چل رہی تھی اور گندم کی ڈالیاں جھومنے لگتی تھیں۔ کھیتوں میں دور تک لہریں سی ابھرتی اور ڈوبتی نظر آتیں۔ ہوا کی سرسراہٹ سے فصلوں میں سیٹیاں سی بج رہی تھیں۔ لیکن یہ ہر آواز پر چونک پڑتے تھے۔ ان کے قدم ڈگمگا جاتے اور انہیں یوں لگتا جیسے بس کوئی ان تک پہنچ رہا ہے۔

وہ کھیتوں کے درمیان سے گزر رہے تھے کہ اچانک ہی انہیں اپنے پیچھے کسی کے دوڑنے کی آوازیں سنائی دیں اور دونوں کے دل اُچھل کر حلق میں آ گئے۔ دلاور نے جلدی سے شاہ زیب کے ہاتھ سے رائفل لے لی۔ اور اسی طرح پوزیشن لے کر بیٹھ گیا جیسے تعاقب کرنے والوں سے جنگ کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ لیکن اچانک ہی اس کے حلق سے ایک قہقہہ نکل گیا کیونکہ چند ہی لمحوں کے بعد گیدڑوں کا ایک غول ان کے سامنے سے گزرتا چلا گیا۔

''دھت تیرے کی سالے۔'' دلاور نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔

اس کے بعد وہ دونوں آگے بڑھتے رہے۔ راستے کا کوئی اندازہ نہیں تھا لیکن وہ چوکنا تھے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد

کھیتوں کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ تھوڑے فاصلے پر درختوں کا ایک جھنڈ نظر آ رہا تھا۔ جھنڈ کے پیچھے مٹی کے بنے ہوئے کچے مکانات تھے۔ مکانات کے درمیان سے راستے گزرتے تھے۔ کوئی گاؤں تھا۔ تھوڑے فاصلے پر ٹیوب ویل چل رہا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک بڑے سے ڈھارے میں مویشی بندھے نظر آ رہے تھے۔ جن کی گردن میں پڑی ہوئی گھنٹیاں سناٹے میں بج رہی تھیں۔ وہ تھوڑا سا فاصلہ عبور کر کے درختوں کے نیچے پہنچ کر کھڑے ہو گئے۔ ایک گھر سے روشنی ابھر رہی تھی۔ پتا نہیں کاہے کی روشنی تھی۔ لیکن ابھی وہ یونہی کھڑے تھے کہ دفعتاً ہی قدموں کی آہٹ ابھری اور ایک آدمی مشتبہ حالت میں ان کے سامنے سے گزرا۔ اس کے چہرے پر ڈھاٹا بندھا ہوا تھا۔ صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ وہ چوکنی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ یہ دونوں آنکھیں پھاڑے اسے دیکھنے لگے۔ چند ہی لمحوں کے بعد وہ آگے بڑھا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ پھر دلاور نے کہا۔

''کچھ اندازہ ہوا۔''

''کیا؟''

''کوئی چور ہے۔ چوری کرنے آیا ہے یا چوری کر کے آ رہا ہے۔''

''مگر یہ وقت چوری کا نہیں ہے۔''

''کیا کہا جا سکتا ہے۔''

ابھی وہ یہ الفاظ ہی ادا کر رہے تھے کہ وہی شخص مویشیوں کے ڈھارے سے واپس آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک رسی بندھی ہوئی تھی اور رسی ایک بھینس کی گردن میں بندھی ہوئی تھی۔ وہ کسی اور سمت جانے کی بجائے سیدھا درختوں کے جھنڈ کی جانب بڑھا۔ اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر دونوں ایک درخت کے تنے کی آڑ میں دبک گئے۔ اور دلاور نے رائفل سیدھی کر لی۔ وہ آدمی آہستہ آہستہ ان کے قریب آتا چلا گیا۔ بھینس اس نے سنبھالی ہوئی تھی۔ لیکن جیسے ہی وہ قریب پہنچا دلاور نے جھپٹ کر بائیں ہاتھ سے اس کا منہ دبوچ لیا۔ اس شخص نے انتہائی پھرتی سے اپنے لباس کے کسی حصے سے چاقو نکال لیا۔ لیکن دلاور نے چاقو کھولنے کی مہلت نہیں دی۔ اس نے اس کی کلائی پکڑی اور پوری قوت سے موڑ دی۔ چاقو زمین پر گر پڑا۔ شاہ زیب حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ دلاور نے کہا۔

''اٹھا لے حرامی کا چاقو...... جلدی کر کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے یار...... اٹھا جلدی سے۔'' شاہ زیب نے فوراً اس کی ہدایت پر عمل کیا اور چاقو اٹھا کر اس شخص کے قریب پہنچ گیا۔ اب اس نے چاقو کی نوک اس شخص کی کمر سے لگا دی تھی۔ دلاور نے تیزی سے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔ وہ سراسیمہ ہو کر دونوں کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ دونوں جیل کے قیدیوں کی وردی میں اس کے سامنے اس طرح کھڑے تھے کہ اندھیرے میں بھوت نظر آ رہے تھے۔ پھر اس شخص کی ہلکی سی آواز ابھری۔

''کون ہو رے تم لوگ......'' لیکن جواب میں دلاور کا بھرپور ہاتھ اس کے منہ پر پڑا۔

''ہم جو ہیں وہ تو تجھے پتا چل ہی جائے گا...... تو کون ہے؟ کیا نام ہے تیرا؟''

''مم...... مم...... مم...... میرا نام...... میرا نام مسیتا۔'' اس نے کہا۔

''اور یہ تیری ماں...... یہ کون ہے؟''

''مجھ ہے جی مجھ۔''

''وہ تو ہمیں بھی پتا ہے۔ مگر لا کہاں سے رہا ہے۔''

''وہ جی...... وہ جی بس...... بس...... مجبوری ہے جی...... مجبوری ہے۔''

''ہوں تو مسیتے اب تو کدھر جا رہا ہے؟''

''میری بات سنو جی! یہ بتاؤ تم لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہو۔ اگر تم بھی دھندے کے لیے نکلے ہو تو میرا ساتھ دو۔ تمہارا بھی کام کرا دوں گا۔''

''ہم لوگ تیرے خلاف پرچہ کرانے جا رہے ہیں۔'' مسیتے نے دونوں کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لیا۔

''ہوں مگر باؤ جی تمہارے بدن پر جو کپڑے ہیں ہم انہیں اچھی طرح پہچانتے ہیں...... کیا سمجھے؟''

''یہ تو تیری زندگی موت کی کہانی ہوگئی۔ تو نے ہمارے کپڑے پہچان لیے ہیں۔ اب اگر تو زندہ بچ گیا تو ہمیں نقصان پہنچ جائے گا۔ کیا کہتا ہے۔''

''دیکھو جی! بس کرو ہم نے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ ہمیں کیوں نقصان پہنچا رہے ہو۔ اب جانے دو ہم سے تمہارا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ ہمیں ابھی بہت دور جانا ہے۔''

''یہی تو تجھ سے پوچھ رہا ہوں تجھے کہاں جانا ہے؟''

''بس جی!...... اس طرف۔'' مسیتے نے ایک جانب ہاتھ اٹھا دیا۔

''اُدھر ہمارا گاؤں ہے۔ چوری کے ڈنگر اٹھانے کے بعد ہم سیدھے اپنے گاؤں لے جاتے ہیں اور اُدھر ہمیں ان ڈنگروں کو خریدنے والے مل جاتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے...... چل ایک کام کر تو۔'' دلاور مستی میں بولا۔

''ہاں جی بولو!''

''ایک بھینس اور نکال لا ہمارے لیے۔''

''اوہ نہیں جی مسخری کر رہے ہو۔''

''سن ابھی مسخری کر نہیں رہے بلکہ اگر تو کہے تو کر دیتے ہیں۔'' دلاور نے شاہ زیب کے ہاتھ سے چاقو لے کر اس کی کمر سے لگاتے ہوئے کہا۔ اور وہ طرح خوفزدہ ہو گیا۔

''تو پھر مجھے کرنا کیا ہے۔''

''کھانا ایک مجھ اور لے آ ہمارے لیے۔'' مسیتا کچھ نہ بولا۔ خاموشی سے ڈھارے کی سمت بڑھا اور ایک بار پھر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ شاہ زیب خاموش کھڑا تھا۔

اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دلاور اس وقت کیا کر رہا ہے لیکن دلاور اس کے لیے جتنی قیمتی چیز تھا اسے اس کا اندازہ تھا۔ وہ خاموشی سے کھڑا انتظار کرتا رہا۔ تو دلاور کو احساس ہوا اور وہ بولا۔

''کیا بات ہے کیا سوچ رہا ہے۔''

''یار کوئی خطرناک کام نہ ہو جائے۔ ہمیں اس جگہ کے بارے میں کچھ نہیں معلوم، کہیں ایسا نہ ہو کہ کہیں کوئی گڑبڑ ہو جائے۔''

''کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی اب اتنی بھی احتیاط اچھی چیز نہیں ہوتی۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ زیادہ احتیاط کرنے والا مارا جاتا ہے۔''

''مگر اب کرو گے کیا؟''

''یار چلتے ہیں دیکھیں گے کہ مسیتے کا گاؤں کیسا ہے کہاں ہے۔ ہو سکا تو ہم بھی وہیں کچھ وقت کے لیے پناہ لے لیں گے۔ کوئی چھپنے کا ٹھکانہ تو ملنا چاہیے نا۔ مستیا اس کا بندوبست کر دے گا آگے بھی وہ کام آئے گا۔ وہ بھی مجرم ہم بھی مجرم اور مجرم کی مدد مجرم ہی کر سکتا ہے۔''

شاہ زیب نے گہری سانس لی۔ اسے ہنسی آ گئی تھی۔ اپنے مجرم ہونے کے لفظ پر پتا نہیں وہ کس کا مجرم تھا۔ خیر وہ تھوڑی دیر تک انتظار کرتے رہے لیکن پھر ایک دم چونک پڑے مستیا واپس نہیں آیا تھا۔ رات ڈھلتی جا رہی تھی۔ دن نکلتا آ رہا تھا۔ ہوا کے جھونکوں سے درختوں کے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ اور تیز ہو گئی تھی۔ اچانک ہی ڈھارے کی طرف سے زور سے آواز ابھری۔

''کون ہے اوئے...... کون ہے اُدھر۔'' اسی وقت مسیتا نظر آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے شاید مویشیوں کا رکھوالا بھی

ڈھارے سے نکلا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لمبی سی لاٹھی تھی۔

وہ مسیحا کے پیچھے دوڑا اور اونچی آواز سے چور چور کی صدا لگانے لگا۔ دلاور نے جلدی سے شاہ زیب کا ہاتھ پکڑا اور جدھر منہ اٹھا، سرپٹ دوڑ لگادی۔ وہ بھینس جو پہلے چوری کی گئی تھی ان کے قریب ہی کھڑی ہوئی تھی۔ لیکن اس کی طرف نہ مسیحے نے کوئی دھیان دیا اور نہ ان دونوں نے۔ پیچھے سے چور چور کی آوازیں آرہی تھیں اور وہ برق رفتاری سے دوڑ لگا رہے تھے۔

اُجالا اب اچھا خاصا پھیل گیا تھا اور رات رخصت ہوگئی تھی۔ لیکن خطرہ بھی قریب آتا جارہا تھا۔ دن کی روشنی ان کے لیے زیادہ ہولناک تھی۔ وہاں سے تو بچ بچا کر نکل آئے تھے۔ لیکن آگے کا مسئلہ بڑا خطرناک تھا کیونکہ ان کے جسم پر جیل کے کپڑے تھے۔ وقت کم تھا اور انہیں جلد سے جلد چھپنے کے لیے کسی ٹھکانے کی تلاش تھی۔ پھر انہیں نشیب میں ایک نالہ سا نظر آیا۔ یہ برساتی نالہ خشک اور اجاڑ پڑا ہوا تھا۔ اس کے ایک کنارے پر گھنے درخت اُگے ہوئے تھے اور دوسری طرف اونچی اونچی جھاڑیاں تھیں۔ درخت خاصی بلندی تک اُٹھ گئے تھے۔ دلاور ان درختوں کو دیکھتا رہا اسے یہ جگہ چھپنے کے لیے اچھی معلوم ہوئی اس نے مڑ کر شاہ زیب کو دیکھا جو اب واقعی بری طرح تھک گیا تھا اور گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔

''او یار ہمت سے کام لے اب تو آرام کا وقت آیا ہے۔''

''میری جان نکل چکی ہے دلاور، اب ہمت نہیں ہے۔''

''تھوڑا سا اور چل...... آگے چل۔''

''ٹھیک ہے...... چلو!'' شاہ زیب بولا۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ نشیب میں اُتر گئے۔ دلاور نے کہا۔

''دیکھ ہمت سے کام لے ہمت کے بغیر انسان دنیا میں کچھ نہیں کرسکتا۔ نالے کے اس طرف جو جگہ نظر آرہی ہے وہیں وقت گزاریں گے۔ اُدھر دیکھ درختوں کا یہ دور تک پھیلا ہوا سلسلہ ہماری عزت رکھ سکتا ہے۔ ویسے خاصا گھنا جنگل محسوس ہورہا ہے اور اب اللہ کی ذات سے اتنی امید ضرور ہوگئی ہے کہ پولیس ہمیں تلاش کرتی ہوئی یہاں تک نہیں پہنچ پائے گی۔ یا اگر پہنچ بھی گئی تو ہمیں تلاش کرنا مشکل کام ہوگا۔''

شاہ زیب دلاور کے ساتھ نشیب میں اترنے لگا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں نالے پر پہنچ گئے۔ کچھ دور جانے کے بعد ایک چھوٹا سا تالاب نظر آیا۔ اس میں ابھی تک پچھلی برسات کا پانی موجود تھا اور دلچسپ بات یہ تھی کہ پانی زیادہ گندا نہیں تھا۔ وہ دونوں اس چھوٹے سے تالاب کے کنارے بیٹھ گئے۔ مٹی نیچے بیٹھی ہوئی تھی اوپر کا پانی بالکل شفاف تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس جگہ کو گندا کرنے والا کوئی آس پاس موجود نہیں تھا۔ دونوں نے چلو بھر بھر کر پانی پیا، منہ دھویا، ہاتھ پاؤں دھوئے اور تر و تازہ ہوکر درختوں کی جانب بڑھ گئے۔ مشرق میں روشنی کا سرخ الاؤ دہکنے لگا تھا۔ سورج طلوع ہورہا تھا لیکن ان درختوں کے نیچے ابھی تک اندھیرا تھا۔ وہ آگے اور آگے بڑھتے رہے۔ اُجالا تیز ہوتا چلا گیا۔

پھر انہیں ایک پرانا سا درخت نظر آیا اس کا تنا خوب چوڑا تھا اور اندر سے کھوکھلا بھی تھا۔ لیکن اس میں صرف ایک آدمی کے چھپنے کی گنجائش تھی۔ دونوں دیر تک اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ اب درختوں کے پتوں سے دھوپ چھن چھن کر نیچے بکھرنے لگی تھی۔ ہر طرف پرندے چہچہا رہے تھے۔ تھکن سے دونوں کا برا حال تھا۔ انگ انگ ٹوٹ رہا تھا۔ آنکھیں بند ہوئی جارہی تھیں اور شدید بھوک لگ رہی تھی۔ تھوڑے سے فاصلے پر انہیں پگڈنڈی نظر آئی اور وہ اس کی جانب بڑھ گئے۔ آہستہ آہستہ پگڈنڈی پر تھوڑا سفر کیا گیا۔ ابھی زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے کہ ان کی نظر لکڑی کے تختوں کی بنی ہوئی ایک بوسیدہ سی جھونپڑی نما شے پر پڑی۔ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس ویران علاقے میں جھونپڑی کیوں بنائی گئی ہے۔ لیکن دلاور کافی باہمت تھا۔ ہمت تو شاہ زیب میں بھی بہت تھی لیکن حالات نے کچھ اس طرح پست کردیا تھا کہ اس کی ہمت زیادہ ساتھ نہیں دے پارہی تھی۔

آخر کار وہ اس جھونپڑی کے نزدیک پہنچ گئے۔ پہلے آس پاس کان لگا کر سُن گن لی اور جب یہ اندازہ ہوا کہ اندر کوئی آہٹ نہیں ہے تو انہوں نے آہستہ سے جھونپڑی کے دروازے کو دھکا دیا۔ دروازہ کھلا اور دونوں نے اندر جھانکا۔ جھونپڑی بالکل خالی تھی۔ فرش پر خشک گھاس بچھی ہوئی تھی اور جگہ جگہ گھوڑے کی لید بکھری ہوئی تھی۔ لیکن خوش قسمتی کی بات یہ تھی کہ یہ لید سوکھ کر سخت ہو چکی تھی اور اس میں زیادہ بدبو نہیں تھی۔ اس وقت اگر اس کی بدبو بھی ہوتی تو بھی ان کی حالت اس طرح کی ہو رہی تھی کہ وہ یہیں پر آرام کرنے کے لیے لیٹ جاتے اور ایسا ہی ہوا اور دونوں فرش پر لیٹ گئے۔

شاہ زیب تھوڑی دیر تک خاموش لیٹا رہا۔ اسے وقت کی ستم ظریفی پر عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ بدن بے شک تھکن سے چور تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے خاموش پڑا رہا۔ جبکہ دلاور نے کئی بار اپنی جگہ سے اُٹھ کر باہر کی آہٹیں لی تھیں، لیکن ہر طرف گہرا سناٹا طاری تھا۔ جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ آخر کار ان کی پلکیں جڑنے لگیں اور پھر دونوں ہی ایک ساتھ گہری نیند سو گئے۔

وقت گزرتا رہا۔ نیند اتنی شدید آئی تھی کہ بھوک پیاس کا احساس بھی مر چکا تھا۔ یہاں تک کہ سورج نے اپنا بلندی کا سفر طے کیا اور ڈھلان کی جانب بڑھنے لگا۔ سائے لمبے ہو گئے۔ پھر ان لوگوں کی آنکھ کھلی تو انہیں شدید بھوک اور پیاس کا احساس ہوا۔ دلاور نے شاہ زیب کو آواز دی اور شاہ زیب ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

”کک..... کک..... کیا ہے..... کیا ہے؟“ وہ بولا۔

”اوہ ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے..... کک..... کک کچھ..... کچھ۔“ دلاور نے ابھی اتنے ہی الفاظ کہے تھے کہ یکا یک سناٹے میں قدموں کی سی آہٹ اُبھری۔ اور دونوں ایک دم ساکت ہو گئے۔ وہ کسی انجانے خوف سے سہمے سمٹے ہوئے تھے۔ دلاور کے پاس رائفل موجود تھی اور شاہ زیب کے پاس چاقو تھا۔ اس نے زبردست رام پوری چاقو کھولا اور دروازے کی اوٹ میں چوکس ہو کر کھڑا ہو گیا۔ دوسری طرف دلاور نے بھی پوزیشن سنبھال لی تھی۔ آہٹ قریب ہوتی گئی۔ وہ بڑی مہارت سے آہٹ سے اندازہ لگا رہے تھے کہ کتنے افراد ہیں..... آہٹیں انسانی قدموں ہی کی تھیں۔ انہیں اندازہ ہو گیا کہ آہٹیں صرف ایک ہی آدمی کے قدموں کی ہیں یعنی آنے والا اکیلا ہی تھا۔ مگر اس کے پیروں میں وزنی جوتے ہیں اس کا احساس کر کے مزید خوف طاری ہو گیا۔ وہ سانس روکے قریب آنے والے کا انتظار کرتے رہے۔ لیکن چند ہی لمحوں میں وہ جھونپڑی کے سامنے سے آگے بڑھ گیا۔ اس کے قدموں کی چاپ خشک پتوں پر دیر تک اُبھرتی رہی اور پھر جب یہ چاپ سناٹے میں ڈوب کر ختم ہو گئی تو دونوں کے چہروں پر چھایا خوف مٹتا چلا گیا۔ وہ تھکے تھکے سے انداز میں فرش پر بیٹھ گئے۔ لیکن فرش پر بیٹھنے کے بعد بھوک نے اتنا پریشان کیا کہ ان کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ اچانک ہی ان کی نگاہ نیچے فرش پر پڑی۔ گھاس پر اِدھر اُدھر چنے کے دانے بکھرے ہوئے تھے۔ دلاور نے ان کی طرف دیکھا اور مسکرا کر شاہ زیب سے بولا۔

”واہ..... خوراک موجود ہے۔ اور اس سے اچھی خوراک بھلا کہاں مل سکتی ہے۔ آؤ.....“ دلاور چنوں کے یہ دانے چن چن کر کھانے لگا۔ کافی دانے تھے۔ انہوں نے چن چن کر ایک ایک دانہ کھا لیا۔ چنے خشک اور کسیلے تھے۔ بھوک تو خیر ان سے کیا مٹتی، البتہ پیاس کی شدت ان سے اور بڑھ گئی۔ لیکن اس وقت دروازے سے باہر نکلنا انتہائی خطرناک تھا۔ چونکہ دن کی روشنی ابھی تک پھیلی ہوئی تھی اور روشنی میں نکلنا خطرے کو دعوت دینا تھا۔

سورج ڈوب گیا اور شام کو دھندلکا ہر طرف پھیل گیا۔ پیاس سے دونوں کے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ آواز تک نہیں نکل پا رہی تھی۔ حلق سوکھ رہا تھا۔ شاہ زیب نے کہا۔

”دلاور اس طرح تو لیٹے لیٹے مر جائیں گے ہم لوگ۔“

”اُٹھو..... بھوک پیاس بے شک ہے لیکن تھکن دور ہو گئی ہے۔“ دلاور نے کہا۔ اور دونوں اپنی جگہ سے اُٹھ گئے۔ انہیں اس تالاب کی طرف سفر کرنا تھا۔ چنانچہ دونوں باہر آ گئے۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی اور درختوں سے سنسناتی ہوئی گزر رہی تھی۔ خشک پتے اُڑ اُڑ کر شور مچا رہے تھے۔ دونوں خاموشی سے پگڈنڈی پر چلتے رہے۔ وہ تالاب کی جانب جا رہے

تھے لیکن اس بار دلاور نے ذرا مختلف راستہ اختیار کیا تھا۔ کافی لمبا فاصلہ طے کرنے کے بعد دونوں ڈھلان سے نیچے اُترنے لگے۔ تالاب زیادہ دور نہیں تھا لیکن راستہ بہت خراب تھا۔ نشیب میں اترتے ہوئے شاہ زیب کا پاؤں پھسلا اور وہ دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ چوٹ زیادہ نہیں آئی تھی لیکن لگتا تھا کہ پیر مڑ گیا ہے۔ غرض یہ کہ تالاب پر پہنچ کر انہوں نے اس بے قراری سے پانی پیا کہ ان کے پیٹ پھول گئے۔ عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ سر چکرا رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے شدید چکر آ رہے تھے۔ دونوں وہیں تالاب کے کنارے لیٹ گئے۔ تالاب کا زیادہ پانی پی لیا گیا تھا۔ شاہ زیب کا تو دل متلانے لگا تھا۔ یہاں لیٹے رہنا بھی خطرناک تھا۔ اس جگہ کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ ہوسکتا ہے اطراف میں خونخوار درندے بھی موجود ہوں۔ بیڑہ ہی غرق ہو جائے گا۔

دونوں ہی وہاں سے آگے بڑھے لیکن اب چلا نہیں جا رہا تھا۔ بحالتِ مجبوری شاہ زیب زمین پر بیٹھ گیا اور اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

"دلاور بھائی معافی چاہتا ہوں میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔ آپ چاہیں تو......"

"یہ بتا چھوٹا بھائی ہے کہ بڑا بھائی۔" دلاور نے پوچھا۔

"سمجھا نہیں۔"

"چھوٹا بھائی ہے تو تیرے منہ پر ایک زوردار تھپڑ لگاؤں کہ تجھے مزا آ جائے۔ میں نے اپنے لیے یہ سب کچھ کیا ہے۔ تجھے پتا ہے کہ مجھے تو دس بارہ دن کے اندر جیل سے آزادی مل جانے والی تھی۔ میں تیرے لیے ہی تڑپ رہا تھا اور اب تو یہ بات کہہ رہا ہے کہ میں اگر اپنی جان بچا کر جانا چاہوں تو چلا جاؤں۔"

"معافی چاہتا ہوں۔ اس کے علاوہ اور کیا کہوں۔" شاہ زیب کے منہ سے نکلا۔

"آئندہ ایسی بات مت کہنا الگ تو ہم دونوں کو ہونا ہے تو نے تو میری صورت بھی نہیں دیکھی۔ ابھی ذرا تھوڑا سا وقت گزر جانے دے۔ دونوں ایک دوسرے سے روشناس تو ہوئے جاتے ہیں۔"

خیر باتیں ختم ہو گئیں۔ کچھ ہی وقت گزر رہا تھا کہ اُجالا پھیلنے لگا۔ چاند درختوں کے پیچھے سے دھیرے دھیرے اوپر آ رہا تھا۔ شاید چودھویں کی قریب کی راتوں کا چاند تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف چاندنی پھیل گئی۔ تالاب کا پانی جھلملا رہا تھا۔ لیکن یہ چاندنی بھی خوف دلانے والی تھی۔ جگہ بالکل ریتیلی سی محسوس ہو رہی تھی اور جھاڑیاں بھی یہاں زیادہ گھنی نہیں تھیں۔ وہ خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ کچھ وقت اور گزر گیا۔ چاند درختوں کے اوپر آ گیا۔ ریت کے ذرے جھلملانے لگے۔ سائے سٹ گئے۔ سناٹا بہت گہرا تھا۔ پھر اچانک ہی رات کے گہرے سناٹے میں کسی کے کھانسنے کی آواز سنائی دی اور خشک پتوں پر آہٹ محسوس ہونے لگی، کوئی ڈھلان سے نیچے اتر رہا تھا۔ لیکن اس بار ایک آدمی نہیں تھا۔ انہوں نے کان لگا کر آواز کو سنا وہ ایک سے زیادہ تھے شاید دو۔ پھر دونوں کے سائے نظر آ گئے۔ اُن کا رُخ اسی جانب تھا۔ شاہ زیب نے دلاور سے کہا۔

"دلاور بھائی غور کر رہے ہو؟" دلاور خود بھی خاموشی سے بیٹھ کر انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہے تھے اور ایک لمحے کے اندر اندازہ ہو گیا کہ ان میں سے ایک مرد اور دوسری عورت ہے۔ مرد آگے آگے چل رہا تھا اس کے سر پر بڑی سی گٹھڑی تھی۔ عورت کی گود میں بچہ تھا۔ پھر دونوں نے ان لوگوں کو دیکھ لیا۔ مگر وہ خاموشی سے چلتے رہے۔ جب وہ بالکل نزدیک پہنچ گئے تو عورت لمحے بھر کو ٹھٹکی۔ اس نے مدھم سی آواز میں اپنے ساتھی سے کہا۔

"پتا نہیں کون لوگ ہیں یہ دو ہیں۔"

"کوئی بھی ہوں تمہیں کیا۔ سیدھی سیدھی چلتی رہو۔" مرد نے اسے ڈانٹا اس بات سے کم از کم یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ گزرگاہ ہے۔ اور یہ علاقہ خطرناک اور جنگلی جانوروں سے بھرا ہوا نہیں ہے۔ ورنہ رات کے اس حصے میں ایک مرد اور ایک عورت یہاں پر سفر نہ کرتے۔

وہ ان دونوں کے قریب سے گزر کر آگے بڑھ گئے۔ لیکن عورت نے کئی بار مڑ مڑ کر اِدھر دیکھا تھا۔ کچھ دیر کے بعد

دونوں دور ہوتے ہوئے اندھیرے میں گم ہو گئے۔ البتہ دور تک بھی ان کی چاپ خشک پتوں پر ابھر رہی تھی۔ کیونکہ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔

پھر اس کے بعد بہت دیر گزر گئی۔ کوئی نہ آیا۔ اب ان کے بدن بے جان سے ہو گئے تھے۔ اگر اٹھنے کی کوشش کرتے تو اٹھا بھی نہ جاتا۔ چاند چڑھتے چڑھتے آسمان کے بیچوں بیچ آ گیا۔ رات پوری طرح جاگ رہی تھی اور اب وہ ان کی آنکھوں میں نیند بھی نہیں لا پا رہی تھی، کیونکہ اب پیٹ کا مسئلہ تھا۔

''ہاں شاہ زیب بھائی اب کیا کہتے ہو؟''

''بس یار کیا کہیں... اب ذرا طبیعت کچھ بہتر ہو گئی ہے۔ چلو یار اپنے پاس اس کے علاوہ اور کام ہی کیا ہے۔''

''ہمت ہے؟'' دلاور نے پوچھا۔

''ہمت ہی ہمت ہے۔ میرا خیال ہے ہم لوگ سفر کرتے ہیں۔ تم نے یہ تو اندازہ لگا ہی لیا کہ ادھر سے بھی لوگ گزرتے رہتے ہیں جبکہ رات ہے، دن کی روشنی میں تو یہاں اچھا خاصا چلنا پھرنا ہوتا ہوگا۔ کوئی ایسی جگہ تلاش کرتے ہیں جہاں دن میں چھپ کر آرام کیا جا سکے۔''

دونوں گہری سانسیں لے کر آگے بڑھتے رہے۔ وہ جو کہتے ہیں ناکہ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا، بھوک کی شدت آسمان کو پہنچی ہوئی تھی۔ پانی پیا تھا، اس لیے اس وقت پیاس کی ضرورت نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ وہ چلتے رہے یہاں تک کہ چاند ڈوب گیا۔ اندھیرا چھا گیا۔ راستہ دشوار ہو گیا۔ لیکن وہ ریتیلی اور ناہموار زمین پر چلتے رہے۔ دونوں طرف اونچے نیچے ٹیلے نظر آ رہے تھے۔ کہیں کہیں ببول اور بیری کے درخت بھی نظر آ جاتے تھے۔ اور اس کے علاوہ جنگلی جھاڑیوں کے جھنڈ تھے جو کہیں کہیں انسانی قد سے بھی اوپر تھے۔ سفر جاری رہا اور پھر جب صبح کا ہلکا ہلکا اُجالا پھیلا تو وہ ایسی جگہ پہنچ چکے تھے۔ جہاں گھاس اور سرکنڈوں کے اونچے اونچے پودے تھے، زمین دلدلی تھی اس قدر نرم کہ پیر اندر دھنس رہے تھے، ان میں دلدل عبور کرنے کی ہمت نہیں تھی، دونوں تھکن سے نڈھال ہو رہے تھے، سورج بھی طلوع ہونے والا تھا۔ انہوں نے آگے جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ گئے۔

ٹیلے کی بلندی سے انہوں نے چاروں طرف دیکھا ہر طرف ویرانی پھیلی ہوئی تھی، لیکن یہاں سے تھوڑے فاصلے پر صبح کی روشنی میں ایک چھوٹی سی شفاف جھیل نظر آ رہی تھی اور جھیل سے تھوڑا سا آگے چل کر ایک سرمئی سڑک جو خاصی چوڑی اور سیدھی چلی جاتی تھی۔ وہ لوگ ٹیلے پر خاموش بیٹھے رہے، شاہ زیب کے چہرے پر تھکن طاری تھی، یہ علاقہ خاصا بہتر محسوس ہو رہا تھا، دور تک کسی آبادی کا نام و نشان نہیں تھا، نہ ہی کوئی پگڈنڈی تھی، ہر طرف ٹیلے ہی ٹیلے بکھرے ہوئے تھے اور جنگلی پودوں کی جھاڑیاں نظر آ رہی تھیں، کہیں کہیں درخت بھی اُگے ہوئے تھے لیکن یہ خودرو درخت تھے۔

''کیا خیال ہے یہاں چھپنے کی کوشش کی جائے، دن کی روشنی میں بہر حال ہمارے لیے خطرناک ہے۔''

''ہاں۔ تھکن اس قدر ہو گئی ہے کہ اب مر جانے کو جی چاہتا ہے۔''

''لے یہ کیا بات ہوئی دوست، اگر مر جانے کو دل ہی چاہتا تو پھانسی کی سزا کیا بری تھی؟'' دلاور نے کہا اور ہنس پڑا، لیکن شاہ زیب کے ہونٹوں پر ہنسی نہیں آئی۔

اچانک ہی اس کے دل میں ایک خیال ابھرا تھا، اگر وہ ڈاکٹر سلیمان کے کہنے کے مطابق کینسر کا مریض ہے تو اتنی بھاگ دوڑ کے بعد تو اس کی سانسیں آخری سانسیں ہونی چاہیے تھیں۔ لیکن وہ اپنا تجزیہ کر رہا تھا، شاید تھکن کا احساس بے شک تھا، لیکن ایسی کوئی جسمانی کمزوری نہیں پتا چل رہی تھی جس سے یہ احساس ہو کہ یہ لمحے اس کی زندگی کے آخری لمحے بن سکتے ہیں، اس دوران دلاور کی نگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں، اس نے ایک ٹیلے کے دامن میں کسی غار کا دہانہ دیکھا اور شاہ زیب کے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا۔

''میرا خیال ہے قدرت نے ہمیں گھر مہیا کر دیا ہے۔''

''گھر۔'' شاہ زیب چونک پڑا۔

''وہ ادھر، ادھر دیکھو میری انگلی کے اشارے کی سیدھ میں۔'' دلاور نے کہا اور شاہ زیب اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے گردن ہلا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''اوہو وہ شاید کسی غار کا دہانہ ہے۔''

''انسان پہلے غاروں میں ہی رہتا تھا۔'' دلاور بولا اور وہ دونوں غار کی جانب بڑھ گئے، دلاور کا کہنا غلط نہیں تھا۔ غار واقعی قدرت کی طرف سے مہیا کیا ہوا گھر ہی لگ رہا تھا۔ صاف ستھرا کشادہ چٹیل زمین پر کوئی چیز نہیں پڑی ہوئی تھی، غار کی یہ صاف شفاف زمین انہیں بہت ہی اچھی لگی تھی چنانچہ وہ لیٹ گئے اور اس کے بعد دونوں کی سوچوں کا سفر جاری ہو گیا، اچانک ہی دلاور نے کہا۔

''میری بات سن شاہ زیب، شاہ زیب بڑا لمبا چوڑا نام ہے، لیتے ہوئے اس کی عزت کرنی پڑتی ہے، اگر میں تجھے خالی شاہو کہوں تو کیسا رہے گا؟''

شاہ زیب پھیکے سے انداز میں مسکرا دیا اور بولا۔ ''جو دل چاہے کہو۔''

''ایک بات تو میں بھی جانتا ہوں شاہو وہ یہ کہ جیسا کہ میں نے کہا کہ تو شکل وصورت سے کسی اچھے گھرانے کا فرد لگتا ہے، چل تیرا گھرانہ کیسا ہی ہو، ظاہر ہے بندہ جب گھر سے باہر بھٹکتا پھرتا ہے تو اس کے پیچھے کوئی ایسی ہی کہانی ہوتی ہے جو ہر ایک کو نہیں سنائی جا سکتی، لیکن کچھ بنیادی باتیں تو لازمی ہوتی ہیں، مثلاً یہ کہ وقت پر کھانا ملتا ہوگا، آرام دہ بستر ملتا ہوگا، گھر والے بھی ہوں گے پھر وہ کون سا ایسا عمل تھا جس کی بنا پر تو نے گھر چھوڑ دیا اور یوں دربدر بھٹکتا پھر رہا ہے، اب یہ تو بالکل اتفاق کی بات ہے کہ قدرت نے تیری شکل میری جیسی بنا دی۔''

''اور تم نے ابھی تک مجھے اپنا چہرہ بھی نہیں دکھایا۔''

''دیکھ لے یار اب تو تُو اکیلا نہیں بلکہ ہم دونوں ہی مصیبت کا شکار ہیں، تو اگر مجھے چھوڑ کر بھاگ جائے اور میری نشاندہی کر دے تو میں پکڑا جاؤں گا اور مجھے سزائے موت مل جائے گی، میں اگر اپنی جان بچانا چاہوں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ اصل دلاور تو ہے اور تُو پکڑا جائے۔''

شاہ زیب ہنسنے لگا اور پھر بولا۔ ''کتنی تعلیم حاصل کی ہے دلاور؟''

''کیوں...... اچانک ہی یہ سوال تُو نے کیوں کر دیا؟''

''ایسے ہی پوچھ رہا ہوں۔''

''بس یار بتا چکا ہوں تجھے کہاں سے پڑھتے لکھتے، بس زندگی تھی گزر گئی، ویسے بھی ابا کی زندگی میں پڑھنے پڑھانے سے زیادہ شوق نہیں رہا، تھوڑے بہت پڑھے لکھے ہیں۔''

''یہ میں سوچ رہا تھا، میں اگر تیری نشاندہی کر دوں اور تو گرفتار ہو جائے تو سزائے موت تجھے ہی ملے گی، تو اگر میری نشاندہی کرے اور یہ بتا دے کہ میں اصل دلاور ہوں تو مجھے سزائے موت نہیں ملے گی۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ جب تو قتل کے الزام میں گرفتار ہوا ہوگا تو تیرے ہاتھوں کے نشانات بھی کاغذ پر لیے گئے ہوں گے۔''

''ایں۔'' دلاور نے چونک کر آنکھیں پھاڑ دیں۔

''بول ایسا ہوا تھا یا نہیں؟''

''ہوا تو تھا...... انہوں نے میرے ہاتھوں کے پرنٹ لیے تھے۔''

''چل چھوڑ، ہم دونوں نے ایک دوسرے کو تسلیم کر لیا تو باہر کی باتوں سے کیا فائدہ۔''

بہر حال وہ اسی طرح کی باتیں کرتے رہے اور اس کے بعد نجانے کب دونوں کو ایک ساتھ نیند آ گئی، آنکھ کھلی تو شام آہستہ آہستہ ٹیلوں پر اتر رہی تھی، دلدل پر اُگی ہوئی اونچی اونچی گھاس اور سرکنڈوں کے پودے دھند میں لپٹے ہوئے تھے،

کافی دیر تک وہ دونوں لیٹے رہے اور اس کے بعد دلاور نے کہا۔

"اُٹھ یار شاہ ہو باہر چلتے ہیں طبیعت اوبھ گئی ہے اس کے علاوہ بھوک بھی بڑی لگ رہی ہے۔ یار کہا تو یہی جاتا ہے کہ قدرت بھوکا اٹھاتی ہے بھوکا سلاتی نہیں، آ دیکھیں قدرت ہماری بھوک کا کیا انتظام کرتی ہے، اب تو سچی بات یہ ہے کہ جان ہی نکل رہی ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے کھانے کے لیے۔"

شاہ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا، البتہ دلاور کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ تھوڑی سی غلطی ہو گئی اپنے گھر میں ہوتا تو بیماری تو ایک الگ چیز تھی قدرت کو جو منظور ہوتا ہے وہ تو ہونا ہی تھا، لیکن کم از کم یہ تکلیفیں نہ اٹھانی پڑتیں۔ اب تو بس زندگی کا خوف تھا صحرا گردی تھی، بھوک تھی پیاس تھی، ان کے قدم غیر اختیاری طور پر اسی تالاب کی جانب اُٹھ رہے تھے جو خاصا وسیع تھا اور جسے تالاب کے بجائے جھیل کا نام دیا جا سکتا تھا۔ چاند آہستہ آہستہ سر اُبھار رہا تھا اور ماحول روشن ہوتا جا رہا تھا، دلاور نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"تیرے لیے میں نے اپنا چہرہ بھی نمایاں کر دیا اس سے تو میرے خلوص کا اندازہ لگا لے۔"

"ہاں دلاور یار مجھے اپنی زندگی کی کوئی فکر نہیں ہے تو اگر اس طرح سے بچ سکتا ہے تو بچ جا۔"

"اب کیا فائدہ اور یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟"

"ہو سکتا ہے۔" شاہ زیب نے کہا۔

"کیسے؟" دلاور بولا۔

"بس ٹھیک ہے، تو آرام سے جہاں جا ہے گم ہو جا، میں پولیس اسٹیشن پہنچ جاؤں گا اور اپنے آپ کو قاتل دلاور کی حیثیت سے پیش کر دوں گا، سزائے موت تو مجھے مل ہی رہی تھی، دوبارہ مل جائے گی ہاں بس اتنا ہو گا کہ اس بار میں تردید نہیں کروں گا اور اپنے آپ کو دلاور تسلیم کر لوں گا، بات ختم ہو جائے گی اس کے بعد تو آزادی سے اپنی زندگی گزارنا بلکہ میری طرف سے ماں اور بہن کو تلاش کرنا میں دعائیں کروں گا کہ خدا کرے تمہیں وہ دونوں مل جائیں اور تم کسی خاموش گوشے میں زندگی کی خوشگوار گھڑیاں گنو۔"

دلاور پھیکے سے انداز میں ہنس دیا اور پھر بولا۔ "اور سب سے بری بات یہ ہے کہ شاہو کہ لوگ اپنے آپ کو فرشتہ سمجھتے ہیں اور دوسرے کو شیطان، میں ایسا کیسے کروں گا، اگر ایسا کرنا ہوتا میرے دوست تو تجھ پر اپنے آپ کو ظاہر ہی نہ کرتا، یہ تو میری خوش بختی ہے کہ تیری شکل میں مجھے اپنا بھائی مل گیا۔ ایک کام کریں گے، اگر ذرا سا بھی وقت نے موقع دیا اور تقدیر نے ساتھ دیا تو دونوں کہیں چل کر اپنے چہرے پر پلاسٹک سرجری کرا لیں گے۔ چہرہ بدل جائے گا دنیا بہت وسیع ہے، کہیں نہ کہیں زندگی گزارنے کا موقع مل ہی جائے گا۔ میں ماں اور بہن کو تلاش کروں گا اور تیرے بارے میں میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ تیری زندگی کا مقصد کیا ہے؟"

شاہ زیب ہنسنے لگا پھر اس نے کہا۔ "بڑے مزے کی بات کہہ رہا ہے تو دلاور تیرا چہرہ بدل جائے گا تو ماں اور بہن تجھے کیسے پہچانیں گی، کیسے وہ تسلیم کریں گی کہ تو دلاور ہے، اور میں اگر اپنی دنیا میں واپس جاؤں گا تو کیسے اپنوں کو یقین دلاؤں گا کہ میں ہی شاہ زیب ہوں۔"

دلاور قہقہہ لگا کر ہنس پڑا اور پھر بولا۔ "ارے باپ رے، یہ تو واقعی ہم دونوں میں سے کسی نے نہیں سوچا تھا۔"

باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں جھیل کے کنارے پہنچ گئے اور پھر اچانک ہی دلاور نے شاہ زیب کا شانہ دبایا اور شاہ زیب رُک گیا۔

"کیا ہے؟" اس نے کہا۔

"وہ...... وہ۔" دلاور نے اشارہ کیا اور شاہ زیب اس طرف دیکھنے لگا اس کے چہرے پر بھی حیرت کے نقوش پھیل گئے تھے۔

(اس سنسنی خیز سلسلے کی تیسری کڑی ماہ دسمبر میں ملاحظہ کیجیے)

زندہ کہانی

محمد خان



محمد علی اسد بھٹی

محمد خان ڈاکو کی رونگٹے کھڑے کردینے والی داستان، ہڈالی، خوشاب سے ایک تحفۂ خاص

محمد خان بھی ایک کردار گزرا ہے ''محمد خان ڈاکو'' کے نام سے مشہور تھا۔ وادی سون تحصیل چکوال' تحصیل پنڈی گھیب اور تلہ گنگ میں محمد خان کا حکم چلتا تھا۔ ان علاقوں پر مشتمل اس نے اپنی ریاست بنا رکھی تھی جس کا یہ بے تاج بادشاہ تھا۔ اخبارات میں اس کو ''وادی سون کا بے تاج بادشاہ'' لکھا جاتا تھا۔ اس کی دہشت اتنی زیادہ تھی کہ طویل عرصہ تک سرگودھا سے راولپنڈی تک رات کے وقت بسیں نہیں چلتی تھیں۔ حکومت نے اس کو گرفتار کرنے کے لیے پولیس کے سرکردہ افسروں کی نگرانی میں ہزاروں سپاہیوں پر مشتمل خصوصی گاردیں ترتیب دیں جو جدید اسلحہ اور سامان سے لیس تھیں لیکن یہ شخص اپنی آخری روپوشی کے دور میں گیارہ ماہ کی طویل جدوجہد کے بعد بھی پولیس کے ہاتھ نہیں لگ سکا تھا۔ یہ اپنی عدالتیں لگاتا تھا۔ اس بارے میں محمد خان کا کہنا تھا کہ میں نے جس طرح قانون وانصاف کا خون ہوتے دیکھا، انسانیت کی توہین اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ میرے ساتھ جو ظلم وستم روا رکھا گیا۔ اس نے نفسیاتی ردعمل کے طور پر مجھے ایک ایسا نظام قائم کرنے کی تحریک کی جس میں کمزور اور طاقتور برابر ہوسکیں۔ جہاں رشوت، سفارش اور ٹیلی فون پر انسانی قسمت کے فیصلے نہ ہوں۔ ظالم کو کڑی سزا ملے اور مظلوم کو اس کا حق دلوایا جائے۔ محمد خان کو پھانسی کی سزا معاف ہوگئی تھی۔ اس کی تمام رقابتیں، رنجشیں اور دشمنیاں ختم ہوچکی ہیں۔ وہ رہا ہوکر ملک وقوم کی خدمت بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہ انسانیت دکھانا چاہتا تھا۔ محمد خان 29 ستمبر 1995ء کو طبعی موت مرا۔ اسے آبائی گاؤں ڈھوک مصائب تحصیل تلہ گنگ ضلع چکوال میں دفن کیا گیا۔

اس کے نام کی پورے پاکستان میں زبردست دھوم ہی نہیں تھی بلکہ غیر ملکی ذرائع ابلاغ بھی ایک عرصہ تک اس شخص سے متعلق سنسنی خیز معاملات نشر کرتے رہے۔ اس شخص نے حکومت کے ہوتے ہوئے اپنی الگ حکومت قائم کررکھی تھی۔



دادی
سون تحصیل چکوال
تحصیل پنڈی گھیپ اور تلہ گنگ
میں صرف اس کا حکم چلتا تھا۔ ان علاقوں پر مشتمل اس نے اپنی ریاست بنا رکھی تھی۔ جس کا یہ بے تاج بادشاہ تھا عدالتیں قائم تھیں۔ سیکڑوں سپاہی اور ہزاروں کارندے تھے۔ جن میں بیشتر مسلح ہوتے۔ علمائے کرام کی موجودگی میں باقاعدہ ملزمان کے مقدمات کی سماعت ہوتی۔ فیصلے سنائے جاتے اور موقع پر اپنے سامنے عمل درآمد کرایا جاتا۔

اخبارات میں اس شخص کو دادی سون کا بے تاج بادشاہ لکھا جاتا تھا اس کی دہشت اتنی زیادہ تھی کہ ایک طویل عرصہ تک سرگودھا سے راولپنڈی کو رات کے وقت بسیں نہیں چلتی تھیں یہ اپنے دور کا نامی گرامی اور خطرناک ترین شخص ملک محمد خان ڈاکو کے نام سے مشہور ہوا۔ اسے مختلف مقدمات میں پانچ سال سزائے موت اور ایک سو پچاس سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔

ابتدائی حالات اور خاندان

ضلع اٹک تحصیل تلہ گنگ میں ڈھرنالہ نام کا موضع ہے یہاں زیادہ تر اعوان اور سید آباد ہیں۔ محمد خان کے دادا فوج میں دفعہ دار تھے پہلی جنگ عظیم کے وقت اس کے والد ملک لال خان فوج کے شعبہ رسالہ میں ملازم تھے۔ جو ملازمت کے بعد زمینوں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ زرعی رقبہ کافی تھا اور بڑی خوشحالی سے زندگی بسر ہو رہی تھی۔ اس کا گھرانہ کٹر دینی گھرانہ تھا۔ ماں باپ بہن بھائی سب نمازی پرہیزگار تھے۔ وہ بھی بچپن سے نماز پڑھنے کا عادی تھا۔ ایک بہن اور پانچ بھائی تھے۔ ایک بہن اور تین بھائی محمد خان سے بڑے تھے جبکہ ایک چھوٹا تھا۔ بڑا بھائی رن باز خان فوج میں بٹالین حوالدار اور میجر تھا اور حافظ قرآن تھا۔ اس سے چھوٹا علی خان، پھر ہاشم خان چوتھے درجے پر محمد خان اور اس سے چھوٹے بھائی کا نام محمد بشیر تھا، رن باز خان اور علی خان کو مخالف فریقین نے قتل کر دیا جبکہ محمد خان سے بڑا ہاشم خان 1963ء میں دوران مفروری طبعی موت مرا۔ اس کے تینوں بھائی فوج میں ملازم تھے۔ بڑے اطمینان سے وقت گزر رہا تھا۔

جب 1940ء میں دوسری جنگ عظیم لگی تو اس وقت محمد خان کی عمر 14 سال تھی۔ اس کے ایک چچا ملک اللہ یار خان ان دنوں یوپی میں تھے۔ یہ سیون راجپوت یونٹ کے حولدار تھے۔ دہاں کھلی بھرتی ہو رہی تھی۔ محمد خان کو بھی فوج میں بھرتی ہو کر خدمات

سرانجام دینے کا بہت شوق تھا۔ اسی شوق کے حصول کی خاطر وہ اپنے چچا جان کے پاس یوپی چلا گیا اور فوج میں سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد اس کے عہدے میں ایک درجہ ترقی ہوئی اور 1947 تک وہ وہیں رہا۔

پاکستان بننے کے بعد وہ اٹھارن پنجاب رجمنٹ میں چلا گیا اس کا زیادہ وقت کشمیر کے محاذ پر گزرا۔ 1950ء تک اسی محاذ پر رہا، محمد خان ایک ذمہ دار محب وطن سپاہی کی حیثیت سے نمایاں پوزیشن کا حامل تھا۔ اس نے کبھی اپنے افسروں کو کسی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ زندگی کی شاہراہ پر سانسوں کا کارواں چل رہا تھا۔ محمد خان کے خاندان کی کسی کے ساتھ کوئی جدی پشتی دشمنی نہیں تھی اور نہ ہی اس کے خاندان میں کبھی لڑائی جھگڑا ہوا تھا۔ اس کے والد بھی بڑے مرنجاں مرنج طبیعت کے مالک تھے کسی قسم کا فکر اور غم نہیں تھا۔ 1950ء میں وہ دو ماہ کی چھٹی لے کر گھر آیا تو حالات کے بے رحم سائے اس کے سر پر بھوکی چیلوں کی طرح منڈلانے لگے۔

موضع ڈھرنال کے نمبردار ملک لال خان اور محمد خان کے بڑے بھائی ہاشم خان کی سیاسی دھڑے بندیوں کی وجہ سے آپس میں ان بن ہو گئی۔ نمبردار جس دھڑے کو سپورٹ کرتا تھا ہاشم خان اس کے مخالف دھڑے کا حمایتی تھا۔ اس وقت الیکشن کا معاملہ چل رہا تھا ووٹوں کو پکا کرنے کی مہم جاری تھی۔ ایک بہت بڑی سیاسی شخصیت نمبردار کی پشت پناہی کر رہی تھی۔

سردیوں کا موسم تھا رات کے 12 بج رہے تھے۔ محمد خان اپنے گھر والوں کے ہمراہ کسی بھی سازش سے بے نیاز اپنے گھر میں سو رہا تھا اس کی چھٹی ختم ہونے میں تین دن باقی تھے کہ نمبردار لال خان نے پولیس سے ساز باز کر کے ایک ڈرامہ کھیلا اس نے اپنے تین آدمیوں کو لوڈ کی ہوئی بندوقیں دیں اور ہدایت کی کہ وہ آدھی رات کے وقت اس کے گھر پر فائرنگ شروع کر دیں۔ وہ ایک بہت کھلی حویلی میں رہتا تھا۔ جو گاؤں کے وسط میں واقع تھی ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔ آدھی رات ہوئی تو گولیاں چلنے کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ گولیاں کیوں چل رہی ہیں۔ صبح ہوئی تو ڈھرنال کے ملحقہ تھانے لاوہ میں محمد خان اور اس کے بھائی ہاشم خان پر 307 ارادہ قتل 392 ڈکیتی کا نامزد پرچہ درج کر دیا گیا۔

کہانی یہ بنائی گئی کہ یہ دونوں بھائی مسلح ہو کر لال خان کے گھر اسے قتل کرنے اور ڈاکہ ڈالنے گئے۔ لال خان ہاتھ نہ لگ سکا تو مال لوٹ کر فائرنگ کرتے ہوئے فرار ہو گئے۔ اس من گھڑت کہانی نے محمد خان کے ہوش اُڑا کر رکھ دیے۔ یہ سراسر زیادتی اور ظلم تھا لیکن کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پولیس نے موقع ملاحظہ کر کے ملزموں کی تلاش شروع کر دی۔ محمد خان کی چھٹی ختم ہو گئی تھی اور اسے ایبٹ آباد نوکری پر حاضر ہونا تھا اس نے بھائی ہاشم خان اور ایک دوست فتح شیر خان سے کہا کہ وہ چکوال ریلوے اسٹیشن پر اسے ریل میں سوار کروا آئیں، نمبردار لال خان نے چکوال کے تھانے دار کو جو اس کا کلاس فیلو تھا، ان کی گرفتاری کا پیغام بھجوا دیا وہ پولیس کی بھاری نفری لے کر ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا، وہ جونہی ریل میں سوار ہونے لگے پولیس نے انہیں گرفتار کر لیا بعد ازاں چکوال کی حوالات میں بند کر دیا اور تینوں کا چالان کر کے متعلقہ جیل بھیج دیا گیا۔

تھانے دار نے محمد خان پر رائفل اس کے بھائی پر پستول اور فتح خان پر برچھی کی جعلی برآمدگی ڈال دی حالانکہ وہ تینوں خالی ہاتھ تھے۔ محمد خان کرائے اور خرچے کے لیے گھر سے پانچ سو روپے لایا تھا۔

پولیس نے اس رقم کو ڈاکے میں لوٹی ہوئی رقم قرار دے کر برآمدگی ڈال دی اور انہیں کیمبل پور منتقل کر دیا گیا۔ فرضی ڈاکے کی کہانی تو گھڑ لی گئی اور حویلی کی دیواروں پر گولیوں کے نشانات بھی اس ڈرامے کی کڑی ثابت کیے گئے لیکن اس میں نہ حویلی کا کوئی تالہ ٹوٹا نہ کسی دروازے کو نقصان پہنچا حویلی کے اندر بندھے ہوئے ڈھور ڈنگر بھی محفوظ رہے۔ کسی شخص کو معمولی خراشیں بھی نہ آئیں لیکن اس کے باوجود علاقے کی ایک معروف سیاسی شخصیت کے اثر ورسوخ کو استعمال کرتے ہوئے ان پر ڈاکہ ثابت کر دیا گیا۔

مجسٹریٹ نصر اللہ وڑائچ کی عدالت میں چھ ماہ مقدمہ چلا اور آخر اس کیس میں دونوں بھائیوں کو تین تین سال قید بامشقت کی سزا ہوگئی۔ اس موقع پر مدعی نمبردار ملک لال خان تھا جو بطور گواہ بھی عدالت میں پیش ہوا، دوسرا گواہ اس کی بیوی تھی اور اس کا ذاتی چوکیدار، اور اس کے علاوہ کوئی اور گواہ عدالت میں پیش نہ کیا جاسکا تھا۔ بہر حال تین سال کی سزا میں سے ڈیڑھ سال کی معافی مل گئی بقیہ ڈیڑھ سال کی سزا بھگت کر 1952ء میں وہ رہا ہو کر جیل سے باہر آگئے۔

اس دوران وہ کیمبل پور اور پنڈی جیل میں رہے، ابھی انہیں جیل سے رہا ہوئے چھ ماہ ہوئے تھے کہ نمبردار نے ایک خطرناک منصوبہ بنایا، محمد خان کا خیال تھا کہ انہیں جھوٹے مقدمے میں سزا دلانے کے بعد ملک لال خان کے ضمیر میں خلش پیدا ہوگئی ہو اور اسے اس ظلم کا احساس لازماً ہوگا جو اس نے بے گناہ بھائیوں پر کیا تھا کیونکہ جن لوگوں کے ضمیر مردہ نہ ہو چکے ہوں، سینوں میں ایمان کی چنگاری سلگ رہی ہو ان کو اپنی کی ہوئی زیادتیوں پر شرمندگی ضرور ہوتی ہے۔ وہ واقعتاً یہی سوچ رہا تھا کہ پیر مکھڈ شریف کے کہنے پر ملک امیر محمد خان کے حمایتی ہونے کی سزا جو انہیں دی جا رہی تھی۔ یہ غلط سیاسی دشمنی ترک کر دی جائے گی۔ کیونکہ ملک لال خان تو محض ایک پتلی تھا اس کی ڈوری ہا اثر سیاسی افراد کے ہاتھ میں تھی۔

ملک امیر محمد خان سابقہ گورنر مغربی پاکستان اور پیر مکھڈ شریف کی دیرینہ دشمنی چلی آرہی تھی پاکستان بننے سے قبل انگریز کے زمانے میں ملک امیر محمد خان نے اس کے والد لال بادشاہ کو قید کی سزا دلوائی تھی۔ اس کے دل میں یہ چبھن زخم بن کر محسوس ہوتی تھی ملک لال خاں اس کا سیاسی حلیف تھا دونوں ایک سیاسی پارٹی سے تعلق رکھتے تھے جبکہ محمد خان کا خاندان، رشتہ دار اور دوست عزیز ملک امیر محمد خاں کے زبردست حامی تھے۔ محمد خان، ملک امیر محمد خاں کو اپنے والد کا درجہ دیتا تھا ان کی بے انتہا عزت کرتا تھا پیر مکھڈ شریف کے سیاسی اثر ورسوخ کو ختم کرنے کے لیے وہ سرگرم کارکنوں کی طرح کام کرتے تھے یوں کہنا چاہیے۔

ملک امیر محمد خاں جس شخص کے بارے میں یہ خواہش رکھتے تھے کہ اس کی سیاسی حمایت کی جائے محمد خان اور اس کی برادری کی بنیاد پر بھی اور فرداً فرداً بھی اس کے لیے کمربستہ ہو جاتے تھے یہ بات پیر مکھڈ شریف کے سینے پر مونگ دلنے کے مترادف تھی۔ وہ بنفس نفیس تو ان کی مخالفت میں سامنے نہیں آتا تھا اپنے مہروں سے کام لیتا تھا۔

محمد خان نواب آف کالا باغ ملک امیر محمد خان کو نیک سیرت بااصول اور نہایت روشن فکر انسان سمجھتا تھا، مقامی سیاست میں بہت کچھ ہوتا ہے بڑے پُرخطر راستوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات یہی مقامی سیاست ملکی سیاست پر اثر انداز ہونے والی ہوتی ہے۔ پھر معاملہ جذباتی اور نظریاتی وابستگی کا ہوتا ہے کوئی نہیں چاہتا اس کا اثر ختم ہو روہ اس سکے کھوٹے بن جائیں، کچھ لوگ تو یہاں تک گوارا نہیں کرتے کہ ان کے سامنے کوئی سر بھی اٹھا کر چلے، پیر مکھڈ شریف اور اس کے سیاسی حلیف محمد

خان کو اپنا دشمن سمجھتے تھے، یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اسے راستے سے ہٹانے کی ہر ممکن کوشش کی، محمد خان اور اس کا خاندان لڑائی جھگڑے سے دامن بچاتے رہے مگر ملک لال خان ان پر جھپٹتا رہا۔

محمد خان کو ابھی رہا ہوئے چھ ماہ ہوئے تھے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ اس کا بڑا بھائی ہاشم خان اکثر گردے کے درد کی وجہ سے بیمار رہا کرتا تھا محمد خان اسے گاؤں کے قریب واقع اسپتال میں دکھانے لے جایا کرتا اس کا حال یہ ہو گیا تھا کہ دوا کھاتا رہتا تو درد رکا رہتا ورنہ شدید تکلیف ہوا کرتی، اس لیے اسپتال کے ڈاکٹر سے مسلسل رابطہ رکھنا پڑتا تھا ایک دن سخت گرمی تھی۔ دوپہر کے دو بج چکے تھے ہاشم خان کے گردے میں سخت تکلیف تھی محمد خان اس کو ساتھ لے کر اور ڈاکٹر سے دوا لینے کے لیے گھر سے پیدل گاؤں کے اسپتال کی جانب جا رہے تھے ابھی تھوڑی دور گئے تھے کہ نمبردار کے تین آدمیوں نے ان کا راستہ روک لیا۔

انہیں کسی نے اطلاع کر دی تھی اور وہ ان کا راستہ روک کر بیٹھ گئے تھے جونہی وہ ان کے قریب سے آگے بڑھنے لگے تو ان تین آدمیوں نے انہیں للکارا، وہ اس وقت بالکل خالی ہاتھ تھے اور ان کے ذہن میں قطعی ایسی کوئی بات نہیں دشمنی تو ضرور تھی البتہ یہ علم بھی نہیں تھا کہ ملک لال ایسی گھٹیا حرکتوں پر اُتر آئے گا اور بیماری کی حالت میں بھی ان پر حملہ کروا دے گا ان تینوں میں سے ایک چاقو پکڑے ہاشم خان پر جھپٹ پڑا تو محمد خان نے اسے منع کیا اس وقت وہ لڑنا نہیں چاہتا تھا اور نہ وہ اس ارادے کے ساتھ گھر سے نکلے تھے۔ جب وہ باز نہ آیا تو محمد خان نے تیزی کے ساتھ اس کو پکڑ کر چاقو چھین لیا۔ دوسرے دو افراد نے جب یہ دیکھا تو ان دونوں نے ان پر ڈنڈوں کی بارش کر دی۔ ہاشم خان گردے میں درد کی وجہ سے پہلے ہی نڈھال تھا وہ لڑکھڑا کر ایک جانب گرنے لگا تو محمد خان نے اسے سنبھالا دیتے ہوئے ایک جانب کھڑا کر دیا خود جہان خان نامی شخص پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے اس کی ٹانگوں اور رانوں پر تین چار چاقو پوری قوت سے مارے وہ زخمی ہو کر اس جگہ گر گیا جب گاؤں کے دوسرے افراد نے یہ لڑائی دیکھی تو انہوں نے بیچ بچاؤ کرایا، وہ وہاں سے گھر چلے گئے اسی روز ان پر 307 ارادہ قتل کا نامزد پرچہ درج کروا دیا گیا۔

یہ محمد خان کے ساتھ زندگی میں ہونے والا دوسرا شدید ظلم تھا۔ ان کا راستہ مخالف پارٹی کے آدمیوں نے روکا اس نے لڑائی کو ٹالنے کے لیے ہزار جتن کیے حملہ انہوں نے ان پر کیا، وہ تو اپنے بھائی ہاشم خان کو اسپتال لے کر جا رہا تھا لیکن ارادہ قتل کا پرچہ دونوں بھائیوں پر ہو گیا، محمد خان کو جب پتا چلا تو اس نے ضمانت قبل از گرفتاری کرالی اس وقت ہاشم خان گردے میں تکلیف کی وجہ سے فوج چھوڑ چکے تھے اور انہیں پنشن مل رہی تھی۔ اس کیس میں پولیس نے چالان کر کے انہیں جیل بھیج دیا۔

کیمبل پور کے مجسٹریٹ کی عدالت میں مقدمہ چلا، دونوں بھائیوں کو تین تین سال قید بامشقت کی سزا ہو گئی جبکہ مخالف فریق کا ایک شخص بھی قید نہیں ہوا اس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کی گئی اور ہائی کورٹ نے انہیں باعزت طور پر بری کر دیا۔ تین ماہ جیل میں رہنے کے بعد جب دونوں بھائی رہا ہوئے تو محمد خان کے ذہن میں ملک لال خان کے بارے میں ایک طوفان بپا تھا اس کے سینے میں نفرت کے الاؤ دہک رہے تھے، اس کا ارادہ تھا کہ وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔

ابھی انہیں گھر آئے چند دن ہی ہوئے تھے کہ محمد خان کے بڑے بھائی رن باز خان بھی چھٹی پر آ گئے گاؤں کے عام لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ اب محمد خان اور ملک لال خان کی کوئی بہت بڑی لڑائی ہو گی

کہ اچانک حالات نے ایسا رُخ بدلا کہ انہیں روایت اور صبر کے امتحان میں پورا اترنا پڑا، ہوا یوں کہ ملک لال خان گاؤں کے تین چار معززین کے ہمراہ محمد خان کے گھر آ گیا اور اس نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ وہ آئندہ ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کرے گا ان کے ساتھ کیے ہوئے ظلم پر وہ سخت نادم ہوا، سب بھائیوں نے فراخدلی کا ثبوت دیتے ہوئے اسے معاف کر دیا اس کے بعد ان کی اور نمبردار کی مخالفت کا باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

گاؤں میں کسی اور کے ساتھ ان کی دشمنی نہیں تھی لال خاں سے راضی نامہ ہو چکا تھا اب ان کا خیال تھا کہ اب وہ امن سکون سے رہ سکیں گے اور جو کچھ ہو چکا تھا اسے بھولنے کی کوشش کرنے لگے، پیر مکھڈ شریف کو یہ صلح ایک آنکھ نہ بھائی اس نے ان کے نانا کی پارٹی مولا بخش وغیرہ کو اُکسایا، مولا بخش ننھیال کی طرف سے محمد خان کا رشتہ دار تھا مگر اس سے دیرینہ چپقلش چلی آ رہی تھی۔ پیر صاحب نے وقت کی راکھ میں دبی ہوئی دشمنی کی چنگاری کو ہوا دی کہ موضع ڈھرنال کی زمین انسانی خون سے رنگین ہونے لگ گئی اور ایک ایسی خوفناک خونیں داستان لکھی جانے لگی جسے وقت کبھی فراموش نہیں کر سکے گا اور جسے پڑھتے بھی حساس دل بیٹھنے لگتے ہیں۔

محمد خان کی 1954ء میں مولا بخش کے خاندان کی ایک لڑکی سے شادی ہوئی اس نے یہ شادی اپنی پسند سے کی تھی۔ یہ لوگ نہ صرف اس شادی کے مخالف تھے بلکہ مولا بخش کے خاندان کا ایک فرد بھی اس شادی میں شریک نہیں ہوا تھا انہیں یہ دکھ تھا کہ ان کی مرضی کے بغیر یہ شادی کیوں ہوئی نانا سے اس خاندان کی پہلے ہی دشمنی تھی اس کی پسند کی شادی نے جلتی پر تیل کا کام کیا وہ محمد خان اور اس کے بھائیوں کے مخالف ہو گئے۔ پیر صاحب کو اس سے بہتر موقع ہاتھ نہیں آ سکتا تھا۔ اس نے مولا بخش اور اس کے خاندان کو اتنا بھڑکا دیا کہ وہ ان کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ پیر مکھڈ شریف اور دوسرے مخالف سیاسی عناصر نے انہیں کہا وہ دونوں بھائیوں ہاشم خاں اور محمد خان کو قتل کر دیں اور یہ یقین دلایا کہ انہیں نہ صرف کیس سے بری کروا دیا جائے گا بلکہ ہر طرح کی امداد بھی دی جائے گی پیر صاحب کا تیر ٹھیک نشانے پر لگا۔

ابھی محمد خان کی شادی کو چار ماہ ہوئے تھے کہ 90 افراد کو ایک جگہ جمع کیا اس اکٹھ کے لیے اس نے یہ ڈرامہ کھیلا کہ اپنے خاندان میں فوری ایک شادی طے کروا دی جس میں اپنے خاص آدمیوں کو بھی مدعو کیا ان میں خاص سے خاص افراد کی ایک خفیہ میٹنگ بلا کر دونوں بھائیوں کے قتل کی اسکیمیں تیار ہونے لگیں۔ اس نے یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ انہیں اس منصوبے کا علم نہ ہو سکے کیونکہ گاؤں میں اگر عام حالات میں 80، 90 افراد کو جمع کیا جائے تو لازمی محمد خان کو شبہ ہو جاتا یا ان کے بندوں کو اس کی اسکیم کا پتا چل جاتا شادی والے گھروں میں اجتماع ہوا ہی کرتے ہیں پھر اس نے یہ سب کچھ اتنی راز داری سے کیا کہ انہیں اس منصوبے کا قطعی قبل از وقت علم نہ ہو سکا۔ اور ان کے عزیز واقارب میں سے کوئی اس شادی میں شریک نہیں تھا ورنہ تھوڑی بہت بھنک کانوں میں ضرور پڑ جاتی کہ مولا بخش خطرناک کھیل کھیلنے والا ہے۔

روز صبح اپنے کھیتوں پر جانا محمد خان کا معمول تھا۔ اس دوران وہ اسپتال کا بھی چکر کاٹا کرتا تھا اس کے ہاتھ میں صرف بید کی ایک چھڑی ہوا کرتی تھی۔ کوئی ساتھی یا محافظ بھی ساتھ نہیں ہوتا تھا اگرچہ لائسنس کا اسلحہ تو اس کے پاس موجود تھا مگر ذہن میں یہ بات ہی نہیں تھی کہ مولا بخش اسے قتل کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ ظاہر ہے اس کا علم ہوتا تو وہ کبھی اکیلا اور نہتا صبح سیر کو نہ نکلا کرتا، اس نے فوج میں

نوکری کی تھی اور وہ جانتا تھا کہ دشمن کو کمزور نہیں سمجھنا چاہیے لیکن یہاں تو مسئلہ ہی اور تھا اسے اپنے دشمن کی سن گن ہی نہیں تھی، وہ پسند کی شادی کرنے پر ان کی ناراضی کو اچھی طرح جانتا تھا اور محتاط بھی رہا کرتا تھا البتہ یہ ہرگز نہیں جانتا تھا کہ پیر صاحب کے کہنے پر وہ اس کی جان لینے پر تل گئے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس روز بھی وہ حسب معمول صبح اٹھا ہاتھ میں بید کی چھڑی پکڑی اور تمام خطرات سے بے نیاز کھیتوں کی جانب نکل کھڑا ہوا، اس کا پھوپی زاد بھائی فتح شیر اپنی زمینوں پر کام کر رہا تھا محمد خان اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا حقہ پیا دونوں بھائی گپیں ہانک رہے تھے کہ سامنے سے ایک شخص سخت بدحواسی کے عالم میں ان کی جانب دوڑتا ہوا دکھائی دیا وہ اس کے قریب آیا اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ سینے میں سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی اس شخص کو محمد خان کی ساس نے اس اطلاع کے لیے بھیجا کہ کھیتوں سے واپسی پر وہ دوسرے راستے سے گھر آئے کیوں کہ کم و بیش 90 مسلح افراد نے اسے قتل کرنے کے لیے بڑے راستے کی مکمل ناکہ بندی کر رکھی ہے۔

محمد خان نے 1954ء کے آخری مہینے میں شادی کی تھی اور یہ 1955ء کا تیسرا مہینہ مارچ تھا علاقہ میں گندم کی فصل پک کر تیار کھڑی تھی زمینداروں کے لیے انتہائی مصروفیت کے دن ہوتے ہیں لیکن مولا بخش کے سر پر ایک ہی دھن سوار تھی ابھی اس کی شادی کو چار ماہ ہی ہوئے تھے کہ ان 90 مسلح افراد نے گاؤں کے عین وسط میں اسے گھیر لیا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ اتنے زیادہ لوگوں کو اس کے قتل پر کیوں مامور کیا گیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ بچپن ہی سے نڈر بے خوف اور خطرات سے کھیلنے والا انسان تھا۔ لیکن آج تک اس نے کوئی ایسا کارنامہ سرانجام نہیں دیا تھا کہ لوگوں کے دلوں پر اس کی دھاک بیٹھ جاتی پھر مسلح آدمی بھی اس کے ساتھ نہیں ہوتے تھے حتیٰ کہ اپنی بندوق بھی پاس نہیں رکھتا تھا۔ ممکن ہے انہوں نے اسے مار کر علاقے یا ڈاکے کا پروگرام بنا کر اس کے قتل سے بری الذمہ ہونے کا سوچا ہو بہرحال یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اس نے اپنے پھوپی زاد بھائی فتح محمد سے بھی اس کا ذکر کیا تھا کہ اگر یہ اطلاع سچی ہے تو پھر وہ اس کی بوٹیاں نوچ کر کھا جائیں گے اور قتل کا سراغ تک نہیں ملے گا۔

فتح محمد اسی خدشے کے پیش نظر ایک برچھی لے کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ محمد خان کا ذہن ابھی تک اس اطلاع پر یقین نہیں کر رہا تھا کیوں کہ اتنی بڑی دشمنی تو کسی کے ساتھ نہیں تھی یہی وجہ تھی کہ اس نے گھر کو آتے وقت دوسرا راستہ اختیار نہیں کیا بلکہ اسی راستے سے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔ تاہم اس کے دل کے کسی گوشے میں خوف کی ایک لہر ضرور موجود تھی وہ اور فتح محمد بڑے محتاط انداز میں دائیں بائیں دیکھتے گھر کی جانب جا رہے تھے جونہی گاؤں کے درمیان پہنچے تو چھڑیوں، کلہاڑیوں اور بندوقوں سے مسلح دس دس پندرہ پندرہ آدمی مختلف پوزیشنیں سنبھال کر چھپے بیٹھے تھے، انہوں نے اس کے گھر کے راستے کی مکمل ناکہ بندی کر رکھی تھی اب اسے خطرے کا احساس ہوا مسلح افراد میں سے ایک شخص نے اسے للکارا وہ اسی جگہ رُک گیا۔ وہ ہاتھ میں برچھی پکڑے سیدھا محمد خان کی جانب دوڑتا ہوا آیا اب محمد خان نہ پیچھے مڑ سکتا تھا نہ واپس گھر جا سکتا تھا یہاں چھپنے کے لیے کوئی جگہ بھی نہیں تھی۔ مخالف پارٹی کے آدمیوں نے تمام اطراف سے اسے گھیر رکھا تھا جب اس نے دیکھا کہ موت اس کے سر پر منڈلا رہی ہے تو اس کے ذہن نے برق رفتاری سے ایک فیصلہ کیا جب مرنا ہی تو بزدلوں کی طرح جان کیوں دی جائے۔ زندگی کوئی تحفہ نہیں جو دوسروں کی جھولی میں ڈال دی

نوکری کی تھی اور وہ جانتا تھا کہ دشمن کو کمزور نہیں سمجھنا چاہیے لیکن یہاں تو مسئلہ ہی اور تھا اسے اپنے دشمن کی سن گن ہی نہیں تھی، وہ پسند کی شادی کرنے پر ان کی ناراضی کو اچھی طرح جانتا تھا اور محتاط بھی رہا کرتا تھا البتہ یہ ہرگز نہیں جانتا تھا کہ پیر صاحب کے کہنے پر وہ اس کی جان لینے پر تل گئے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس روز بھی وہ حسب معمول صبح اٹھا ہاتھ میں بید کی چھڑی پکڑی اور تمام خطرات سے بے نیاز کھیتوں کی جانب نکل کھڑا ہوا، اس کا پھوپی زاد بھائی فتح شیر اپنی زمینوں پر کام کر رہا تھا محمد خان اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا حقہ پیا دونوں بھائی گپیں ہانک رہے تھے کہ سامنے سے ایک شخص سخت بدحواسی کے عالم میں ان کی جانب دوڑتا ہوا دکھائی دیا وہ اس کے قریب آیا اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ سینے میں سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی اس شخص کو محمد خان کی ساس نے اس اطلاع کے لیے بھیجا کہ کھیتوں سے واپسی پر وہ دوسرے راستے سے گھر آئے کیوں کہ کم و بیش 90 مسلح افراد نے اسے قتل کرنے کے لیے بڑے راستے کی مکمل ناکہ بندی کر رکھی ہے۔

محمد خان نے 1954ء کے آخری مہینے میں شادی کی تھی اور یہ 1955ء کا تیسرا مہینہ مارچ تھا علاقہ میں گندم کی فصل پک کر تیار کھڑی تھی زمینداروں کے لیے انتہائی مصروفیت کے دن ہوتے ہیں لیکن مولا بخش کے سر پر ایک ہی دھن سوار تھی ابھی اس کی شادی کو چار ماہ ہی ہوئے تھے کہ ان 90 مسلح افراد نے گاؤں کے عین وسط میں اسے گھیر لیا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ اتنے زیادہ لوگوں کو اس کے قتل پر کیوں مامور کیا گیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ بچپن ہی سے نڈر، بے خوف اور خطرات سے کھیلنے والا انسان تھا۔ لیکن آج تک اس نے کوئی ایسا کارنامہ سرانجام نہیں دیا تھا کہ لوگوں کے دلوں پر اس کی دھاک بیٹھ جاتی پھر مسلح آدمی بھی اس کے ساتھ نہیں ہوتے تھے حتیٰ کہ اپنی بندوق بھی پاس نہیں رکھتا تھا۔ ممکن ہے انہوں نے اسے مار کر بلوے یا ڈاکے کا پروگرام بنا کر اس کے قتل سے بری الذمہ ہونے کا سوچا ہو بہرحال یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اس نے اپنے پھوپی زاد بھائی فتح محمد سے بھی اس کا ذکر کیا تھا کہ اگر یہ اطلاع سچ ہے تو پھر وہ اس کی بوٹیاں نوچ کر کھا جائیں گے اور قتل کا سراغ تک نہیں ملے گا۔

فتح محمد اسی خدشے کے پیش نظر ایک برچھی لے کر اس کے ساتھ ہو لیا، محمد خان کا ذہن ابھی تک اس اطلاع پر یقین نہیں کر رہا تھا کیونکہ اتنی بڑی دشمنی تو کسی کے ساتھ نہیں تھی یہی وجہ تھی کہ اس نے گھر کو آتے وقت دوسرا راستہ اختیار نہیں کیا بلکہ اسی راستے سے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔ تاہم اس کے دل کے کسی گوشے میں خوف کی ایک لہر ضرور موجود تھی وہ اور فتح محمد بڑے محتاط انداز میں دائیں بائیں دیکھتے گھر کی جانب جا رہے تھے جونہی گاؤں کے درمیان پہنچے تو چھڑیوں، کلہاڑیوں اور بندوقوں سے مسلح دس دس پندرہ پندرہ آدمی مختلف پوزیشنیں سنبھال کر چھپے بیٹھے تھے، انہوں نے اس کے گھر کے راستے کی مکمل ناکہ بندی کر رکھی تھی اب اسے خطرے کا احساس ہوا مسلح افراد میں سے ایک شخص نے اسے للکارا وہ اسی جگہ رُک گیا۔ وہ ہاتھ میں برچھی پکڑے سیدھا محمد خان کی جانب دوڑتا ہوا آیا اب محمد خان نہ پیچھے مڑ سکتا تھا نہ واپس گھر جا سکتا تھا یہاں چھپنے کے لیے کوئی جگہ بھی نہیں تھی۔ مخالف پارٹی کے آدمیوں نے تمام اطراف سے اسے گھیر رکھا تھا جب اس نے دیکھا کہ موت اس کے سر پر منڈلا رہی ہے تو اس کے ذہن نے برق رفتاری سے ایک فیصلہ کیا جب مرنا ہی تو بزدلوں کی طرح جان کیوں دی جائے۔ زندگی کوئی تحفہ نہیں جو دوسروں کی جھولی میں ڈال دی

جائے۔ چنانچہ اس نے فتح محمد سے برچھی لے لی اور جونہی وہ شخص تیزی سے بھاگتا ہوا برچھی لہراتا آگے بڑھا اس نے برچھی مارنے کے لیے فضا میں ہاتھ بلند کیا ہی تھا کہ آناً فاناً محمد خان نے اپنے ہاتھ میں پکڑی برچھی اس کے سینے میں اتار دی برچھی اس کے دل کو چیرتی ہوئی دوسری جانب نکل گئی اس شخص کا نام مہر خان تھا اور وہ مسلح افراد کا لیڈر تھا خون کی ایک تیز دھار زمین کو سرخ کر گئی وہ زوردار چیخ کے ساتھ اسی جگہ ڈھیر ہو گیا۔

یہ محمد خان کی زندگی کا پہلا قتل تھا جو حفاظت خود اختیاری کے تحت مجبوراً کیا گیا، مہر خان کے مرتے ہی ایک شور برپا ہوا آس پاس چھپے افراد شور وغل کرتے اور للکارتے ہوئے پاگلوں کی طرح محمد خان پر ٹوٹ پڑے اتنے سارے لوگوں سے جان بچانا بہت مشکل تھا اس جگہ فوج کی ٹریننگ اس کے کام آئی جن لوگوں کے پاس بندوقیں تھیں جب انہوں نے اس پر گولیوں کی بارش کر دی اور وہ زمین پر لیٹ گیا اور رینگتے ہوئے ایک جانب پناہ لینے کے لیے کہنیوں کے بل بھاگا لیکن وہ خود کو گولیوں کی زد سے محفوظ نہ کر سکا اس اثناء میں تین گولیاں سنسناتی ہوئی اس کی شلوار میں سوراخ کرتے ہوئے گزر گئیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ کوئی گولی اسے نہیں لگی حالات نے اس کی بہت مدد کی وہ اس طرح کہ کلہاڑیوں اور برچھیوں والے ایسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے کہ محمد خان ان کی اوٹ میں تھا اگر بندوق بردار اسے گولیوں کا نشانہ بنانا چاہتے تو ان کے اپنے آدمی ان کی فائرنگ کی زد میں آ جاتے جب وہ ایک جانب کو ہونے لگتے تو وہ پیچھے مڑ کر ان کو برستی گولیوں کے آگے کر دیتا اسی حالت میں گولیوں سے بچتے بچتے وہ ایک رشتہ دار کے ڈیرے پر پہنچ گیا اور دروازہ بند کر کے ایک دیوار کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ گیا وہ مسلح افراد کلہاڑیاں فضا میں اچھالتے اور لگاتار فائرنگ کرتے ہوئے ڈیرے پر آ گئے اور انہوں نے مکان کو گھیرے میں لے لیا۔

پورے گاؤں میں قیامت کا سماں تھا۔ بچے بوڑھے سب ڈر کے مارے گھروں میں چھپ گئے لوگوں کے دل حلق میں اٹک کر رہ گئے تھے۔ دن کے دس بج چکے تھے۔ انہوں نے مکان کا دروازہ توڑنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے پھر چند افراد چھت پر چڑھ گئے تاکہ چھت پھاڑ کر اندر داخل ہو سکیں جب وہ ایسا نہ کر سکے تو سب نے مل کر دروازہ کو توڑ دیا۔ وہ دیوار سے لگ کر کھڑا تھا لگاتار فائرنگ ہو رہی تھی گولیاں اس کے سر کے اوپر سے ہوتی ہوئی سامنے بڑی دیوار میں لگ رہی تھیں۔ وہ اس وقت جرأت کرتے تو اندر داخل ہو کر اسے موت کے گھاٹ اتار سکتے تھے لیکن کسی کو بھی اندر آنے کا حوصلہ نہ ہوا غالباً ان کا خیال تھا کہ اس کے پاس مہلک ہتھیار ہیں ان میں سے چند لوگوں نے کہیں سے سوکھی ہوئی جھاڑیاں منگوائیں انہیں دروازے کے ساتھ رکھ کر آگ لگانے کی کوشش کی وہ مکان کو آگ لگا کر اسے اندر ہی بھسم کر دینا چاہتے تھے۔ یہ تو خدا کا کرنا ہوا کہ اس روز تیسرا روزہ تھا انہیں کہیں سے نہ تیل مل سکا نہ ماچس ہی میسر آ سکی۔

اس منصوبہ میں ناکام ہونے کے بعد انہوں نے ایک اور چال چلی وہ یہ کہ ایک ادھیڑ عمر عورت مہر بھری کو مکان کے اندر جانے پر آمادہ کر لیا مہر بھری سے کہا گیا کہ وہ اندر جاتے ہی محمد خان کو پکڑے اور شور مچا دے پھر مشتعل ہجوم مکان میں داخل ہو کر محمد خان کو پکڑ لے گا اور کسی دوسری جگہ لے جا کر قتل کر دیا جائے گا مہر بھری، مہر خان کی چچازاد بہن اور سخت بدچلن عورت تھی۔ ان کا خیال تھا کہ علاقے کے رواج کے مطابق محمد خان عورت پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا اور پکڑا جائے گا لیکن وہ ان کی چال کو تاڑ گیا جونہی مہر بھری نے مکان کی دہلیز عبور کی محمد خان نے اسے

برچھی مار کر موت کی گہری نیند سلا دیا جب ان کا یہ حربہ بھی ناکام رہا تو ہجوم مزید بپھر گیا۔ اس اثناء میں محمد خان نے اپنے بھائی ہاشم خان کو حالات سے آگاہ کر دیا وہ اسی وقت بہت سے مسلح ساتھیوں کے ہمراہ ڈیرہ پر پہنچ گئے دونوں طرف سے زبردست فائرنگ کا تبادلہ ہوا آخر کار مخالف پارٹی مقابلہ کی تاب نہ لا کر بھاگ کھڑی ہوئی جاتے ہوئے انہوں نے محمد خان کے پھوپی زاد بھائی فتح محمد اور چچا زاد بھائی عزیز خان کو گولی مار کر ہلاک کر دیا اور دو رشتہ داروں محمد خان اور زور خان کو شدید زخمی کر دیا البتہ محمد خان اور ہاشم خان کی جان بچ گئی گاؤں کے چوراہے میں مہر خان کی اور ڈیرے پر مہر بھری کی لاش خون میں لت پت پڑی تھی جبکہ محمد خان کے دو بھائیوں کی لاشیں بھی کچھ فاصلے پر پڑی تھیں۔ اس کے دو گھنٹے بعد تھانہ لادے کا ایس ایچ او پولیس کی گاڑی لے کر گاؤں آ گیا۔

ہاشم خان تو گھر چلا گیا لیکن محمد خان بھاگ کر تلہ گنگ آ گیا۔ یہاں سے اس نے آئی جی پنجاب، علاقہ مجسٹریٹ اور کمشنر کو اس حادثہ سے متعلق تاریں ارسال کیں۔ جن میں لکھا کہ پولیس مخالف فریق سے ملی ہوئی ہے اس لیے اسپیشل کرائم برانچ سے اس واقعہ کی تحقیقات کرائی جائیں اس نے تاروں اور درخواستوں میں مخالف پارٹی کے 22 افراد کے نام بھی لکھے تھے اور حکام سے استدعا کی تھی کہ ان کا بھی چالان کیا جائے کیونکہ اسے علاقے کی پولیس سے انصاف کی توقع نہیں تھی۔ پولیس نے لاشیں اپنے قبضہ میں لے لیں۔ تیسرے دن کرائم برانچ کا انسپکٹر گاؤں میں پہنچ گیا تحقیقات شروع ہوئیں۔ محمد خان اور اس کے بھائی ہاشم پر قتل کا پرچہ درج ہو گیا اور چوتھے روز انہیں گرفتار کر لیا گیا جبکہ مخالف پارٹی کے 22 افراد کو بھی حراست میں لے لیا گیا سب کا چالان کر کے متعلقہ جیل میں بند کر دیا گیا۔

کیمبل پور کے سیشن کورٹ کی عدالت میں ایک سال مقدمہ چلا آخر میں محمد خان کو 14 سال قید بامشقت کی سزا ہوگئی۔ البتہ ہاشم خان بری ہو گیا، مخالف پارٹی کے 22 افراد کو 48'48 سال کی سخت سزائے قید ہوئی۔ یہ 1956ء کا دور تھا اس وقت ہائی کورٹ پشاور میں تھی۔ ہاشم خان نے محمد خان کی سزا کیخلاف عدالت میں اپیل دائر کر دی اس مقدمے کی پیروی نامور وکیل پیر ابخش نے کی جبکہ پیر صاحب کے کہنے پر مخالف پارٹی کا کیس خان عبدالقیوم خان مرحوم نے لڑا، کیس جسٹس حبیب اللہ خان کی عدالت میں لگا، یہ وہی حبیب اللہ خان تھے جو ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں سینٹ کے چیئرمین بھی رہے۔ پہلی پیشی پر ہی یہ بیمار ہو گئے اور کیس کی سماعت ملتوی کر دی گئی، ان حالات کے بعد لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس عزیز احمد اور ایک انگریز جج پشاور میں اس مشہور قتل کیس کی سماعت کے لیے حکومت نے تعینات کیے اس اسپیشل جج کے روبرو آٹھ ماہ تک مقدمہ کی سماعت جاری رہی۔ اسپیشل جج نے دونوں فریقین کو بری کر دیا، محمد خان رہا ہو کر گھر پہنچا تو خدا کا شکر ادا کیا کہ پھانسی کے پھندے سے بچ گیا۔ اب وہ دشمن کی جانب سے محتاط رہنے لگا تھا۔ سب مخالفین کے چہرے محمد خان کی نظروں کے سامنے تھے۔ 6 ماہ نہایت امن وسکون کے ساتھ گزرے نہ اس نے کوئی چھیڑ کی نہ مخالف فریق نے کوئی سازش کی۔

لاشوں کے ڈھیر لگ گئے بیک وقت 9 افراد قتل ہو گئے

کچھ عرصہ امن سے گزر گیا محمد خان دنگے فساد سے دور پُرسکون زندگی گزارنے کی جدوجہد میں مگن تھا کہ حالات نے کروٹ لی سکندر مرزا کو ہٹا کر محمد ایوب خان برسر اقتدار آ چکے تھے اکتوبر 1958ء کو جب فیلڈ مارشل ایوب خان کرسی اقتدار پر بیٹھے تو

ملک امیر محمد خان گورنر مغربی پاکستان بن گئے وقت کا گھوڑا مخصوص رفتار سے دوڑتا رہا کہ مئی 1959ء کی ایک رات ڈھرنال کی زمین انسانی خون سے سرخ ہوگئی اس خوفناک اور لرزا دینے والے واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ مولا بخش پارٹی نے حالات سے سبق سیکھنے کے بجائے انتقام لینے کا منصوبہ بنایا۔ محمد خان اپنے بھائی ہاشم خان کے ہمراہ گھر بیٹھا تھا۔ 15 مئی کی رات کافی گرم تھی۔ 9 بج چکے تھے اور دونوں بھائی کسی خاندانی مسئلے پر بات کر رہے تھے کہ اچانک مکان کے باہر سے کچھ لوگ پکارنے لگے۔ ''باہر نکلو بڑے سور سے بنے بیٹھے ہو باہر نکلو۔'' اس نے یہ آوازیں سنیں باہر جھانک کر دیکھا تو 40'30 افراد گھر کا محاصرہ کیے کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔

محمد خان حالات کی نزاکت کو بھانپ گیا اس نے اس لڑائی کو ٹالنے کی بہت کوشش کی۔ ہمسایوں کے ذریعے انہیں کہلوایا کہ وہ واپس چلے جائیں اور خود ایک دیوار کی اوٹ سے بلند آواز سے انہیں کہا کہ وہ یہ خونیں کھیل نہ کھیلیں وہ ابھی رہا ہو کر آیا ہے وہ خود بھی زندہ رہیں اور انہیں بھی زندہ رہنے دیں وہ رات کے 3 بجے تک یہی جدوجہد کرتا رہا کہ کسی طرح خطرہ ٹل جائے۔ لیکن دشمن نے ان کوششوں کو کمزوری سمجھا اور بندوقوں کے منہ گولیاں اُگلنے لگے انہوں نے دو اطراف سے فائرنگ شروع کر دی وہ اس میں بری طرح پھنس گئے تھے کہ نہ گھر میں جان محفوظ تھی اور نہ باہر نکل کر کہیں چھپ سکتے تھے تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق جب کوئی چارہ کار نہ رہا تو رات کے پچھلے پہر محمد خان نے بھی دشمن کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا بندوقیں لیں اور دونوں بھائیوں نے گھر کے اندر مورچے سنبھال لیے مخالف فریق دائیں اور بائیں جانب سے فائرنگ کر رہے تھے دائیں جانب محمد خان رائفل اور ڈھیر ساری گولیاں لے کر بیٹھ گیا بائیں جانب اس کا بھائی ہاشم خان وہ مکان کے اندر سے باہر کھڑے مسلح افراد کی حرکت کو دیکھ سکتے تھے لیکن خود ان کی نگاہوں سے اوجھل تھے۔ جب ان دونوں نے تاک تاک کر انہیں گولیوں سے بھوننا شروع کر دیا آن کی آن میں 9 افراد اسی جگہ موت کے گھاٹ اُتر گئے۔ 9 افراد نے ان کی آنکھوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیا اور بہت سے زخمی ہوئے یہ دیکھ کر باقی لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی اور وہ بدحواسی میں جان بچا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ گھر کے باہر گلی میں نو افراد کی لاشیں بے گور و کفن پڑی تھیں اور زمین گرم خون سے سرخ ہوگئی تھی۔

سارے گاؤں میں بھونچال آ گیا اس گاؤں میں کیا کسی بھی جگہ ایک وقت میں اتنے قتل ہوئے ہوں۔ ڈھرنال گاؤں کے بچے سہم کر اپنی ماؤں کی چھاتیوں سے چمٹ گئے تھے۔ نو لاشیں خون اور مٹی میں لت پت ساری رات گلی میں پڑی رہیں، محمد خان اور ہاشم خان گھر کے مورچوں میں بیٹھے رہے اتفاق کی بات ہے کہ انہیں گولی کا ایک چھرا تک نہیں لگا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ گھر کے اندر مورچہ بند تھے اور دشمن گھر کے باہر وہ دونوں دشمن کی ہر حرکت کو نوٹ کر رہے تھے۔ جبکہ دشمن انہیں اندھیرے کے باعث دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ انہیں یہ تو پتا چل گیا کہ گولیاں کس سمت سے آ رہی ہیں لیکن وہ ان گولیوں کی زد سے باہر تھے صبح ہوئی تو وہاں ایک کہرام برپا تھا آج تک اس گاؤں میں اتنا بڑا تصادم نہیں ہوا تھا۔

ڈھرنال ایک طرح کا میدان جنگ بن گیا تھا دہشت اور خوف نے پورے گاؤں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ محمد خان نے اپنے بندوں کو کہا کہ وہ خاک و خون میں لوٹتے زخمیوں کو تلہ گنگ کے اسپتال میں پہنچا دیں اب وہ ہر قسم کی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھے۔ محمد خان نے سب سے پہلا کام یہ

کیا کہ ملتان میں بڑے بھائی رن باز خان کو اس حادثہ کی اطلاع کردی۔ وہ 14 مئی کی شام کو ڈھرنال پہنچ گیا اسی روز تلہ گنگ کا انسپکٹر پولیس سید مرتضیٰ شاہ پولیس کی بھاری نفری لے کر گاؤں جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔ یہ انسپکٹر مقتولین کا رشتہ دار اور پیر صاحب کا خاص آدمی تھا۔ اس نے سرسری تفتیش کے بعد جو کیس تیار کیا اس میں مخالف فریق کو بے قصور قرار دیتے ہوئے حادثہ کی تمام تر ذمہ داری نہ صرف دونوں بھائیوں پر ڈال دی بلکہ ان افراد کو بھی قتل کیس میں ملوث کرلیا، جو موقع پر موجود نہیں تھے۔ انصاف کی آنکھوں میں ریت بھری دی جائے۔ مفادات کی افیون دے کر ضمیروں کو موت کی نیند سلا دیا جائے تو انسانی جسموں میں روحیں مرجاتی ہیں اخلاق کا جنازہ نکل جاتا ہے۔ اسے ابتداء ہی سے معاشرتی ناانصافیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جھوٹے مقدمات میں اُلجھایا گیا ہر قسم کا ظلم روا رکھا گیا اور اس مرتبہ تو ظلم و زیادتی کی حد کردی گئی۔ قانون کی دھجیاں اڑائی گئیں۔

انصاف کے منہ پر تھپڑ رسید کیے گئے۔ آپ حیران ہوں گے اس کوڑھی نظام پر، زخم کس طرح ناسور بن جاتے ہیں ایک شریف انسان کس طرح ڈاکو بنادیا جاتا ہے؟

پولیس نے محمد خان کے بہنوئی ملک علی خان جو حضرو میں اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور ڈیوٹی پر حاضر تھے انہیں بھی اس مقدمہ میں دھرلیا یاد رہے کہ حضرو گاؤں سے 133 میل دور ہے یہ بات ریکارڈ سے ثابت ہے کہ ملک علی خان لڑائی کے دن ڈیوٹی پر حاضر تھے بڑے بھائی رن باز خان کو اس نے خود تصادم کی اطلاع دے کر بلوایا اور وہ اسی شام گھر آئے تھے۔ پولیس نے انہیں بھی 302 میں چالان کردیا اس کے علاوہ ان کا ایک نوکر محمد عارف کو بھی قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا حتیٰ کہ بہنوئی کے بھائی محمد صادق بھی پولیس کے ظلم کا نشانہ بن گئے۔ اس مجرمانہ حمایت پر ان کی پولیس انسپکٹر کے ساتھ جھڑپ ہوگئی اور انہوں نے اپنی گرفتاری نہیں دی ان کا موقف تھا کہ قتل میں ملوث افراد کو ہی پکڑا جائے جو بے گناہ ہیں انہیں مقدمے میں نہ اُلجھایا جائے اس نے کھلے بندوں قتل کا اعتراف کرلیا لیکن پولیس انسپکٹر اپنی ضد پر ڈٹا رہا اس نے محمد خان اس کے بھائی ہاشم خان کے علاوہ بڑے بھائی رن باز خان، محمد عارف، ماسٹر علی خان اور محمد صادق پر قتل کا نامزد پرچہ درج کرلیا۔ اور انہیں گرفتار کرکے حوالات میں بند کردیا جبکہ مخالف پارٹی کے ایک شخص کو بھی ہتھکڑی نہیں پہنائی گئی حالانکہ انہوں نے گھر کا محاصرہ کیا تھا اور گھیرے میں لے کر انہیں مارنے کی کوشش کی تھی ان کی زبردست فائرنگ سے گھر کے در و دیوار پر گولیوں کے بے انتہا نشانات موجود تھے دشمن فریق کی لاشیں ان کے گھر کے آگے پڑی تھیں اور جائے واردات کے سرسری معائنے میں ہی یہ بات ثابت ہوجاتی کہ قصور مولا بخش کے آدمیوں کا ہے اور اس قتل کے ذمہ دار وہ خود ہیں لیکن ظلم کی حد ہے کہ ان میں سے ایک آدمی کو بھی گرفتار نہیں کیا گیا۔ یہ جانبداری کی انتہا تھی۔

قانون شکنی اور بے ضمیری تھی۔ پولیس محمد خان کے خلاف پارٹی بن گئی تھی اثر و رسوخ حرکت میں آچکا تھا۔ ٹیلی فون کی کالیں گونج رہی تھیں۔ ذولت اپنا جادو جگا رہی تھی۔ ظالم مظلوم بن گئے تھے۔ یہ حالت دیکھ کر محمد خان اور ہاشم خان مفرور ہوگئے اور بھاگ کر وادی سون کے پہاڑوں میں روپوش ہوگئے کچھ عرصہ بعد اس کے بڑے بھائی رن باز خان کی فوج سے چٹھی آگئی کہ وہ نوکری پر حاضر ہوجائے اب پولیس کی آنکھ کھلی اور انہیں مقدمہ سے

ڈسچارج کر دیا گیا۔ وہ ملتان ڈیوٹی پر حاضر ہو گئے دیگر افراد کا چالان کر کے پولیس نے انہیں متعلقہ جیل بھیج دیا۔ کیمبل پور سیشن کورٹ میں کیس کی سماعت ہو رہی تھی دو سال تک مقدمہ چلتا رہا۔

1961ء کے سال نے زندگی کے صحن میں قدم رکھا اس کے بڑے بھائی ہر پیشی پر عدالت میں حاضر ہوتے تھے کہ بے رحم وقت نے ظلم کا ایک اور باب کھول دیا، ہوا یوں کہ سال 1961ء کا تھا۔ رن باز خان مقدمہ میں پیشی کے لیے کیمبل پور کے ایک ہوٹل میں قیام پذیر تھا۔ جمعہ کا دن تھا۔ وہ کیمبل پور کی مسجد میں نماز جمعہ پڑھنے کے بعد مسجد سے نکل رہا تھا کہ پیر صاحب کے بندوں نے رن باز خان پر اچانک فائرنگ کر دی رن باز اسی جگہ جان کی بازی ہار گیا۔ انسپکٹر پولیس مرتضیٰ شاہ ان دنوں ڈی ایس پی کیمبل پور تھا اس قتل کے تیسرے روز عدالت سے گرفتار شدگان تمام افراد بری ہو گئے ان پر قتل ثابت نہ کیا جا سکا۔

البتہ محمد خان اور ہاشم خان کو قتل کے کیس میں مفرور قرار دے دیا گیا۔ دوسرے ہی روز اس کے بندوں نے پہاڑوں میں اُس کے بھائی کے قتل کی اطلاع دی تو محمد خان کے دل پر بجلی سی گر گئی۔ اسے شک تھا کہ مولا بخش کے آدمیوں نے اس کے بھائی رن باز خان کے خون سے ہاتھ رنگے ہوں گے۔ لیکن جب یہ پتا چلا کہ مرتضیٰ شاہ نے یہ سازش تیار کی تو اس کے سینے میں شعلے بھڑک اٹھے اور دماغ انتقام کی آگ میں جلنے لگا وہ اور ہاشم خان مرتضیٰ شاہ سے اس قتل کا بدلہ لینے کے لیے ترکیب سوچنے لگے کہ کسی طرح اسے ان کے اس ارادے کا پتا چل گیا اس نے ایک دوست کے ذریعے پیغام بھیجا کہ رن باز کے قتل میں اس کا ہاتھ نہیں ہے۔ ساتھ ہی اس نے قسم بھی دی کہ آئندہ وہ ان کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہیں کرے گا۔ اس کے بعد انہوں نے اس کا پیچھا چھوڑ دیا اگر یہ نہ ہوتا تو وہ لازماً اسے کسی نہ کسی طرح موت کے گھاٹ اتار کر اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کرتے اور یہ بات مرتضیٰ شاہ بھی جانتا تھا کیونکہ ان دنوں ارد گرد تمام علاقوں میں محمد خان کی زبردست دہشت پھیلی ہوئی تھی اور لوگ اس کا نام سنتے ہی کانپ اٹھتے تھے۔

وادی سون میں تین سال روپوشی کے واقعات

محمد خان اور اس کا بھائی ہاشم خان وادی سون کے اونچے پہاڑوں اور کھنڈوں میں زندگی کے دن گزار رہے تھے۔ پولیس کی بھاری جماعت ان کی گرفتاری پر مامور تھی لیکن وہ ان کے ہاتھ نہیں لگ سکے کئی مرتبہ پولیس کے دستوں کے ساتھ ان کا آمنا سامنا ہوا لیکن وہ انہیں دھوکہ دے کر کسی پہاڑ کی اوٹ میں چھپ جاتے تھے اور یہ ان کے لیے ممکن نہیں تھا کہ کھائیوں میں انہیں تلاش کر کے مار دیتے یا زندہ گرفتار کرتے، اس دوران آس پاس کے علاقوں میں جرائم پیشہ افراد نے لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا جس سے پولیس نے یہ تاثر دیا کہ یہ وارداتیں محمد خان خود کرتا ہے یا اپنے بندوں سے کرواتا ہے حالانکہ ایسا نہیں تھا وہ روپوش ضرور تھا جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ پیر مکھڈ شریف اور دوسرے با اثر اشخاص پولیس کے ہاتھوں اسے مروا دینا چاہتے تھے اگر اسے پولیس کے اس ارادے کا علم نہ ہوتا تو یقیناً عدالت میں حاضر ہو جاتا ہر شخص اپنی جان کی حفاظت کرتا ہے وہ فوج سے گھر چھٹی پر آیا تھا تو ملک لال خان نے ڈاکے اور قتل کے جھوٹے مقدمے میں پھنسا دیا پھر گھیر کر اسے ٹھکانے لگانے کی کوشش کی گئی با اثر افراد کی وجہ سے مولا بخش اور اس کے آدمی مقدمات میں ایک بار بھی کڑی سزا نہیں پا سکے۔ پھر محمد خان کے گھر کا محاصرہ کر کے اسے موت کے گھاٹ اتارنے کے

لیے مسلح افراد نے دھاوا بول دیا مگر مقدمات بھی محمد خان اور اس کے خاندان پر قائم ہوئے مخالف فریق صاف بری ہوگیا۔ یہ واقعات اس کے ذہن میں پتھر پر لکیر کی طرح نقش تھے۔ ان بے انصافیوں نے اسے ایک نیا ذہن نئی سوچ اور ایک الگ تھلگ کردار کا مالک بنا دیا تھا۔

وہ ظالم سفاک قاتل اور لٹیرا نہیں تھا وہ تو اپنی جان بچانے کے لیے پہاڑوں کی وادی میں تنہائی کے مظالم سہ رہا تھا اگرچہ اس کے والد کا سایہ بچپن ہی سے سر سے اٹھ گیا تاہم گھر میں بھائی فتح شیر ایک بوڑھی ماں اور بہن موجود تھی۔ اس کا دھیان ہر وقت ان کی جانب رہتا تھا۔ وہ کئی مرتبہ پولیس کا گھیرا توڑ کر گھر آیا اور بہت دیر تک گھر رہ کر پھر روپوش ہو جاتا پولیس یہ خیال کر رہی تھی کہ اس نے ڈاکوؤں، چوروں اور قاتلوں کا ایک گروہ تیار کر رکھا ہے۔ جو ہینڈ گرنیڈوں، آتشیں اسلحہ اور جدید ہتھیاروں سے مسلح ہے یہی وجہ ہے کہ کئی مرتبہ اس کے قریب ہوتے ہوئے بھی پولیس نے گولی نہیں چلائی۔

ایک مرتبہ مغرب کے وقت وہ وادی سون میں وضو کر کے پہاڑوں کے درمیان نماز پڑھنے لگا تو سامنے نگاہ پڑی تو پولیس کی بھاری نفری اس کا محاصرہ کیے ہوئے تھی۔ اس کے پاس اس وقت ایک رائفل تھی اور ایک لڑکا اس کے ساتھ تھا۔ اس نے پولیس کے خطرے سے محمد خان کو آگاہ کرتے ہوئے کسی محفوظ جگہ نماز ادا کرنے کو کہا اس نے اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈالی اور زوردار قہقہہ فضا میں بلند کیا اور اسی جگہ مصلیٰ بچھا کر نماز پڑھنے میں مصروف ہوگیا وہ جانتا تھا کہ جس جگہ پولیس موجود ہے وہاں سے وہ اسے نہیں دیکھ سکتی جبکہ نیچے سے وہ پولیس کی حرکات و سکنات کو نوٹ کر رہا تھا۔ وہ اندازے کے مطابق اسی جگہ آ گئے تھے اگر انہیں اس کی جگہ کا علم ہوتا تو یقیناً وہ گھیرا تنگ کرتے ہوئے اسے گرفتار کرنے کی کوشش کرتے۔

وادی سون میں محمد خان کے ساتھیوں، عزیز رشتہ داروں اور بعض پولیس والوں کا تعاون بھی اسے حاصل رہا وہ اسے خطرات سے آگاہ کر دیتے اور حالات سے پوری طرح باخبر رکھا کرتے یہی وجہ تھی کہ وہ پولیس کارروائی سے قبل ہی حفاظتی انتظامات کر لیا کرتا تھا۔ محمد خان کے بارے میں مشہور کر دیا گیا کہ روپوشی کے دوران ایک ''خونی لٹیرا'' بن گیا تھا اس نے پہاڑوں میں ایک بینک قائم کر رکھا تھا اس کے ہزاروں ساتھی وادی سون میں گھومتے رہتے تھے اور وہ لوگوں کو پکڑ کر قتل کر دیا کرتا تھا اس کے خفیہ اڈے قائم تھے یہ تاثر غلط ہے۔ وہ فلمی ڈاکوؤں کی طرح پہاڑوں میں سردار نہیں بنا بیٹھا تھا۔ اس کے پاس اسلحہ تھا، حفاظت خود اختیاری کا پورا سامان تھا اسے لحہ لحہ کی خبر رہتی تھی لیکن اس نے ڈاکوؤں کا کوئی گینگ تیار نہیں کیا ہوا تھا بلکہ اس نے اس علاقہ میں امن وامان بحال کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔

اسے ہر وقت اپنے بھائی ہاشم خان کی فکر لگتی رہتی وہ درد گردہ کا دیرینہ مریض تھا محمد خان پیشاب جاری کرنے والے ٹیکے ہر وقت اپنے پاس رکھتا تھا بھائی رن باز خان کے بچھڑنے کا غم تازہ ہی تھا کہ اس کے چار پانچ ماہ بعد ہی ہاشم کے گردے میں ایک رات شدید تکلیف ہوئی درد اتنا شدید تھا کہ اس کا پیشاب بند ہوگیا محمد خان نے ٹیکہ لگایا لیکن فرق نہ پڑا آخر رات کے گیارہ بجے اس نے اس کے سامنے دم توڑ دیا صبح ہوتے ہی اپنے ساتھیوں سے کہا وہ بھائی ہاشم خان کی لاش ملک خضر حیات کے ڈیرے پر پہنچا دیں۔ یہ لاش وہ اس لیے وہاں پہنچانا چاہتا تھا کہ معززین کی نگرانی میں اس کے بھائی کو باعزت طور پر سپرد خاک کیا جا سکے۔ پولیس کو اس کی اطلاع ہوگئی

پولیس نے راستے میں ہی ساتھیوں سے اس کے بھائی کی لاش چھین لی اور لاش پر گولیاں برسا کر پولیس مقابلہ کی کہانی گھڑلی، اخبارات میں یہ خبر چھپی کہ ڈاکو محمد خان کا بھائی ہاشم خان پولیس مقابلہ میں مارا گیا۔ محمد خان کو اس کا بے حد دکھ ہوا وہ تو روپوش تھا اس وقت کیا کرسکتا تھا پولیس خود اس کی تاک میں تھی۔ اس کے ٹھیک پانچ ماہ بعد اس نے روپوشی کی زندگی ترک کرتے ہوئے پولیس تھانہ ٹمن میں واقعہ ڈھوک مصائب میں مستقل رہائش اختیار کرلی یہ تھی ہے کہ اس پر قتل کا مقدمہ درج تھا اور پولیس اسے پکڑنے کے لیے چھاپے ماررہی تھی لیکن اب اس کے حالات بدل چکے تھے۔ پولیس اس سے خوف کھانے لگ گئی تھی۔ پولیس کو اسے پکڑنے کی جرأت نہیں ہورہی تھی۔

جب محمد خان نے ڈھوک مصائب پر ڈیرہ لگایا تو اس کی دہشت کے سائے وادی سون سے نکل کر تحصیل چکوال، تحصیل پنڈی گھیب اور نواحی علاقوں تک پھیل گئے تھے۔ اس نے اس جگہ آتے ہی تمام گھر والوں کو بھی بلالیا، اس کا مخالف فریق چل کر اس کے پاس آگیا، اس نے اس سے صلح کرلی اب محمد خان کا وہ دور شروع ہوتا ہے جس کو اس کی الگ ریاست قائم کرنے سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ محمد خان نے جس طرح قانون و انصاف کا خون ہوتے ہوئے دیکھا انسانیت کی توہین اپنی آنکھوں سے دیکھی اس کے ساتھ جو ظلم وستم روا رکھا گیا اس نے نفسیاتی ردعمل کے طور پر اسے ایک ایسا نظام قائم کرنے کی تحریک دی جس میں کمزور اور طاقتور برابر ہوسکیں جہاں رشوت سفارش، اور ٹیلی فونوں پر انسانی قسمت کے فیصلے نہ ہوں۔ ظالم کو کڑی سزا ملے اور مظلوم کو اس کا حق دلوایا جائے۔

محمد خان کی ریاست عدالتیں اور تاریخی فیصلے

یہ درست ہے کہ وہ 1963ء سے 1966ء وہ زیادہ پڑھا ہوا نہیں تھا لیکن تجربے نے بہت کچھ سکھایا تھا اس نے اپنی الگ عدالتیں لگانا شروع کردیں وہ لوگ جو جان کے دشمن تھے اس کے خوف سے لرزنے لگے۔ پولیس آفیسر تحصیل دار، دوسرے محکموں کے سربراہ اس کے پاس آیا کرتے اور پاس بیٹھ کر فیصلے کیا کرتے ہیں۔

محمد خان ان عدالتوں کا سربراہ اعلیٰ ہوا کرتا تھا اس کے پاس سیکڑوں سپاہی ہوا کرتے تھے جنہیں وہ خود بھرتی کیا کرتا انہیں باقاعدہ تنخواہیں دی جاتی تھیں ہزاروں رضا کار تھے۔ باقاعدہ مقدمات کا ریکارڈ رکھا جاتا تھا۔ سب کارروائی عام عدالتوں کی طرح لکھی جاتی تھی۔ شہادتیں لی جاتیں مقدمات کی انکوائری کی جاتی وارنٹ جاری کیے جاتے اور مسلح سپاہی ملزموں کو پکڑ کر لایا کرتے تھے۔ محرر تمام کارروائی نوٹ کرتا اس کے ساتھ علمائے کرام بیٹھا کرتے تھے تمام مقدمہ کی کارروائی سننے کے بعد وہ قرآن وسنت کی روشنی میں جو فیصلہ دیا کرتے ہیں وہ ان پر دستخط کرکے اور اپنے سامنے عمل درآمد کرایا کرتا تھا۔ سپاہیوں کے پاس اسلحہ ہوا کرتا تھا اگر کوئی شخص عدالت کا حکم ماننے سے انکار کردیتا تو طاقت کے ذریعے اس پر عمل کرایا جاتا۔ جب اس کی عدالتیں لگا کرتی تھیں تو اردگرد کے تھانے اجڑ گئے، تحصیلیں سونی ہوگئی تھیں اور دوسرے انصاف مہیا کرنے والے ادارے بالکل ویران ہوگئے۔ چار سال تک متذکرہ علاقوں پر اس کا مکمل کنٹرول رہا وادی سون تحصیل چکوال، تحصیل پنڈی گھیب اور تلہ گنگ کے علاقوں میں اس کا سکہ جاری تھا۔ اس کی اجازت کے بغیر ان علاقوں پر مشتمل ریاست میں چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی۔ ان علاقوں کی انتظامیہ بالکل بے کار ہوکر رہ گئی تھی۔

تک اپنی ریاست کا بے تاج بادشاہ تھا اس کی عدالتوں میں 302 کے علاوہ ہر قسم کے مقدمات پیش ہوا کرتے تھے 1964ء کے صدارتی انتخابات میں ملک امیر محمد خاں کے کہنے پر اس نے علاقہ کے تمام بی ڈی ممبروں اور چیئرمینوں کے ووٹ صدر ایوب خان کو دلوائے تھے 1965ء میں جب بھارت نے پاکستان سے جنگ شروع کی تو اس نے جنرل محمد موسیٰ اور صدر ایوب خان کو تار دیا کہ اسے پانچ ہزار مجاہدین کو لے کر محاذ جنگ پر جانے کی اجازت دی جائے اسے اس تار کا جواب آیا ابھی انتظار کرو بعد میں جنگ بندی کے باعث اس کی یہ حسرت پوری نہ ہو سکی۔ اس کا اثر و رسوخ بہت زیادہ تھا اس کا نام ریاست کے راجے کے مترادف معنی اختیار کر گیا تھا۔ اس کے پاس مظلوم لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ صبح عدالت لگا کر بیٹھ جاتا کرتا اور رات کے گیارہ بجے تک مقدمات کی سماعت کرتا رہتا۔ اس حالت میں رضا کاروں کا اس کے گرد جمع ہو جانا قدرتی بات تھی۔

اس سے انکار نہیں کہ ان کے پاس اسلحہ نہیں ہوتا تھا۔ ہوتا تھا مگر لوٹا ہوا نہیں لائسنس کا، کہیں کوئی ناجائز بھی ہوگا جس کے لیے قسم نہیں کھائی جا سکتی۔ لوگ اس کے ایک اشارے پر کٹ مرنے کو تیار تھے۔ وہ یہ عدالتیں سرکاری ریسٹ ہاؤس میں لگایا کرتا تھا جس پر اس نے قبضہ کر رکھا تھا اس کے نیچے ایک تہہ خانہ بھی تھا جو خاص مقاصد کے لیے تھا۔ اس وقت کی پولیس اس سے بخوبی آگاہ تھی۔ آخر عدالتوں کا ریکارڈ بھی تو محفوظ کرنا ہوتا تھا اور فیصلوں کی دستاویزات کی حفاظت کا مسئلہ بھی تھا۔ تہہ خانہ اسی کام کی حفاظت کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کے کارندوں کے پاس اسلحہ تو ہوا کرتا تھا اور حکومت کے افسران بھی اس بات سے آگاہ تھے۔ اس کی عدالتوں اور الگ ریاست کے قیام سے حکومت بھی لاعلم نہیں تھی۔

اس کی عدالتوں کا نظام ٹھیک ٹھاک انداز سے چل رہا تھا چار سال کے طویل عرصہ میں اس کی ریاست سے رشوت کا مکمل خاتمہ ہو گیا تھا اکثر و بیشتر مقدمات میں جرمانے کیے جاتے تھے۔ جرمانے کی رقم مدعی کو دے دی جاتی تھی۔ ہزار میں سے صرف تیس روپے رکھے جاتے تھے اس کٹوتی سے جو رقم اکٹھی ہوتی اس میں سے عدالت کے کارندوں کو تنخواہ دی جاتی تھی اور عدالتوں کا خرچہ پورا کیا جاتا تھا اس کے علاوہ علاقہ کے امیر کبیر افراد بھی اس کی خدمت کر جاتے اس لیے اس کی ریاست اور عدالتیں کبھی مالی بحران سے دوچار نہیں ہوئیں اس وقت اس کے پاس نئی شیورلیٹ کار تھی اور ذاتی استعمال کے لیے دو گھوڑے بھی تھے۔ اس کی عدالت کے قاضی عبدالرحمٰن نہایت عرق ریزی سے اسلام کی روشنی میں جرم کی نوعیت کے پیش نظر اپنے ساتھی قاضیوں سے مشورہ کر کے فیصلہ دیا کرتے تھے۔ اس نے اس عرصے میں دلیرانہ اور سنسنی خیز فیصلے کیے۔

1963ء سے 1966ء تک اس کی ریاست میں عدالتیں قائم رہیں دور دراز علاقوں کے کیس بھی اس کے سامنے پیش کیے جاتے رہے کہ وقت نے انگڑائی لی ملک امیر محمد خان اور صدر ایوب خان کے درمیان اختلاف پیدا ہو گئے ملک امیر محمد خان نے گورنری سے استعفیٰ دے دیا۔ محمد خان کے مخالف عناصر نے صدر ایوب کو اس کے خلاف بھڑکا دیا اور حکومت کی پوری مشینری اس کے خلاف حرکت میں آ گئی۔ یہاں سے وہ کہانی شروع ہوتی ہے جس کو اس کے مخالف گروپ نے ترتیب دیا تھا محمد خان کے عروج کو زوال آنے لگا اور تباہی اور بربادی کے اندھیرے اس کا تعاقب کرنے لگے۔

زوال کی ابتدا ایوب خان محمد خان اس کے مخالف ہو گئے

یہ اگست 1966ء کی بات ہے کہ انٹیلی جنس نے صدر ایوب خان کے کان بھرے کہ ملک امیر محمد خان، محمد خان کے ہاتھوں تمہیں قتل کرنے کی سازش کر رہا ہے۔ صدر ایوب خان نے اس اطلاع پر یقین کرتے ہوئے آئی جی پولیس کو محمد خان کی فوری گرفتاری کا حکم دے دیا اس وقت ایس پی دل باز خان نے محمد خان کو عدالتیں لگانا چھوڑ دینے کا ہمدردانہ مشورہ دیا تا کہ حکومت مطمئن ہو سکے۔ اس نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ حالات رُخ بدل رہے ہیں عدالت کے تمام کارندوں کے حساب بے باق کرتے ہوئے وہ اپنا ڈیرہ چھوڑ کر ملتان چلا آیا۔ ابھی اُسے ملتان آئے ہوئے چند دن ہی ہوئے تھے کہ ملک امیر محمد خان اور محمد خان کے مخالف پولیس افسران کو حکم دیا گیا جس طرح بھی ہو محمد خان کو تلاش کر کے گولی سے اڑا دیا جائے۔ اسے بھی اس حکم کا علم ہو گیا وہ اپنی جان بچانے کے لیے بہاولپور چلا گیا اور بال بچوں کو سرگودھا میں ایک رشتہ دار کے ہاں بھیج دیا۔ پولیس کی بھاری نفری اس کی گرفتاری کے لیے تعینات کر دی گئی حتیٰ کہ اسپیشل دستے تعینات کر دیے گئے۔ اب وہ باقاعدہ روپوش ہو گیا اسے خطرہ تھا کہ اگر وہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو کبھی زندہ نہیں بچے گا۔ پولیس نے اس کے رشتہ داروں اور جان پہچان رکھنے والوں کی وسیع پیمانے پر گرفتاریاں شروع کر دیں۔

جب وہ پولیس کے ہاتھ نہ لگ سکا تو ایک نہایت اعلیٰ خفیہ اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ روپوشی کی حالت میں کسی بھی طرح اسے پکڑ کر مار دیا جائے اور ملک امیر محمد خان کو اس کے قتل کے الزام میں گرفتار کر کے پابہ زنجیر کر دیا جائے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے یہ حربہ استعمال کیا گیا کہ اس کی ضعیف ماں سے ایک سادہ کاغذ پر انگوٹھا لگوا لیا گیا۔ اس کاغذ پر بعد میں یہ لکھا گیا کہ ملک محمد خان کو ملک امیر خان نے قتل کر دیا ہے اس حلفیہ بیان کی روشنی میں استغاثہ تیار کر کے عدالت کو دے دیا گیا۔

جب محمد خان کو اس کا علم ہوا کہ ملک امیر محمد خان کی زندگی خطرے میں ہے اور حکومت انہیں اس کے قتل کے کیس میں اُلجھا کر سزا دینا چاہتی ہے تو اس سے برداشت نہ ہو سکا اس نے 27 جولائی 1967ء کو رات کے 9 بجے ایک خفیہ مقام سے فون کیا اس نے انہیں بتایا کہ کسی نے اُسے قتل نہیں کیا وہ اپنی جان کی حفاظت کے لیے روپوش ہے۔ کیونکہ جن پولیس افسران کی نگرانی میں اسپیشل پولیس کی گاردیں تیار کی گئیں وہ سب اس کے جانی دشمن ہیں وہ پولیس مقابلہ کی کہانی گھڑ کے اسے ٹھکانے لگا دیں گے اس لیے وہ گرفتاری پیش نہیں کر رہا اگر غیر جانبدار پولیس مقرر کر دی جائے تو وہ خود بخود گرفتاری پیش کرے گا اس کے بعد سید اکبر شاہ انسپکٹر پولیس کو اسپیشل گارد دے کر محمد خان کی گرفتاری پر مامور کر دیا گیا۔ یہ ایک مخلص نیک کردار اور اچھا انسان تھا اس نے اس کی جانب اپنا ایک آدمی بھیجا اور گرفتاری پیش کرنے کے لیے جگہ اور تاریخ کا تعین کر دیا اور کہلوا بھیجا کہ وہ تھانہ لاوا میں واقع ڈھوک بشیر یکم اگست 1967ء کو دن دس بجے آ کر اسے گرفتار کر لے اس کی گرفتاری کے لیے پورے ملک میں پولیس حرکت میں آ چکی تھی۔

صرف وادی سون میں ایس ایس پی عبداللہ خان اور ڈی آئی جی پولیس کی نگرانی میں تین ہزار سپاہیوں پر مشتمل پولیس گارڈ تعینات تھی خود آئی جی پولیس قریشی صاحب ہیلی کاپٹر پر وادی سون کے اوپر چکر لگاتے رہے تھے پورے ملک کے عوام کی

دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوگئی تھیں۔ جو دن طلوع ہوتا لوگ بڑی بے تابی سے اخبار کھولتے اور سب سے پہلے محمد خان کی گرفتاری کی خبر تلاش کرتے، گیارہ ماہ کی روپوشی کے دوران پولیس سے اس کی جو آنکھ مچولی ہوتی رہی ہے ان میں سے چند واقعات کا بیان کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

ستمبر 1966ء سے یکم اگست 1967ء تک گیارہ ماہ تک اس کی آنکھ مچولی جاری رہی۔ شیورلیٹ کار اس کے پاس تھی وہ اس کی نمبر پلیٹ تبدیل کر لیتا اور خود بھیس بدل کر پولیس کی نگاہوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا جب وہ اپنے علاقے میں ہوتا تو مونچھیں رکھ لیتا جب لیہ یا کسی اور علاقہ میں جاتا تو مونچھیں صاف کر دیتا عام طور پر وہ شلوار قمیض پہنتا تھا لیکن روپوشی کے دوران میں پینٹ کوٹ، نکٹائی، ٹائی اور ہیٹ بھی استعمال کرتا تھا آنکھوں پر مختلف رنگوں کی عینک بھی لگا لیتا، یعنی کہیں بھی جاتے ہوئے وہ مکمل طور پر اپنا حلیہ بدل لیا کرتا روپوشی کے دوران 6 ماہ یزمان منڈی میں اس نے ایک اینٹوں کے بھٹے پر پناہ لیے رکھی تھی ایک ماہ ملتان میں ایک ہوٹل کا کمرہ کرایہ پر لے کر رہا۔ تین ماہ میانوالی میں گزارے۔ یہاں اس نے 30 روپے ماہانہ میں ایک مکان کرایہ پر لے رکھا تھا جس کا خاص افراد کو علم تھا۔ اس طرح لیہ میں بھی اپنے قیام کے لیے اس نے ایک جگہ کرایہ پر لے رکھی تھی اور گرفتاری پیش کرنے سے قبل ایک ماہ اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ میں گزارا۔

پولیس نے بہاولپور میں چھاپہ مار کر شاہ نواز آف حاصل پور کو گرفتار کر لیا حالانکہ اس سے اس کی کوئی شناسائی نہیں تھی۔ خانیوال سے اس کے چچا بشیر محمد اور ملک جان بیگ کو پکڑ لیا، اس کی تلاشی کے دوران ہزاروں افراد کو حراست میں لے لیا ان میں سے ایک شخص بھی نہیں جانتا تھا کہ محمد خان کہاں روپوش ہے۔ پھر ان میں سے بعض افراد پر بے پناہ تشدد کیا گیا اور پولیس نے ہر ہتھکنڈا استعمال کیا تاکہ اس کا پتا چل سکے، تھوہا محمد خان کے ڈیڑھ سو افراد کے مکانوں کو پولیس نے صرف اس لیے آگ لگا دی کہ ان سے محمد خان کے تعلقات تھے لیکن وہ اس کے کسی بھی کام میں شریک نہ تھے پولیس ان کو کہتی کہ محمد خان کو لا کر پیش کر دو بھلا وہ اسے کہاں سے لا کر پیش کرتے اسی طرح موضع ڈھرنال میں رہنے والے رشتہ داروں اور عزیزوں کو گرفتار کر کے سخت اذیتیں دی گئیں۔ پولیس نے شک وشبہ میں ہزاروں افراد کو گرفتار کر کے ظلم وتشدد کے پہاڑ توڑے لیکن محمد خان کا سراغ نہ پا سکے۔ وہ بعض اوقات ان کے بیچ سے گزر جاتا انہیں بعد میں پتا چلتا کہ محمد خان دھوکہ دے کر نکل گیا ہے۔

ایک بار پولیس کو علم ہوا کہ وہ میانوالی میں ہے اس نے نشاندہی کیے گئے راستوں کی ناکہ بندی کر لی محمد خان نے بھی بھیس بدلا پینٹ کوٹ پہنا سر پر ہیٹ رکھا مونچھیں پہلے ہی صاف تھیں۔ بڑی بے نیازی سے شیورلیٹ کار میں بیٹھا اور پولیس کے پیچھے سے گاڑی نکال کر لیہ کی جانب نکل کھڑا ہوا جب پولیس کو اس کے جانے کا علم ہوا تو وہ پیچھا کرتے ہوئے لیہ پہنچ گئی وہاں پہنچ کر محمد خان نے اپنے کپڑے تبدیل کیے کار کی نمبر پلیٹ تبدیل کی اور منڈا چوک پہنچ کر پولیس کے بالکل سامنے کار روک دی نکلنے سے وضو کیا نماز پڑھی ایک دوکان سے چائے پی اور سیدھا شہر اپنے کرائے کے مکان میں آ گیا یہ مکان اس نے جعلی نام سے لے رکھا تھا۔ پولیس کو شائد شک گزرا کہ محمد خان ان کے پاس سے ہو کر گزر گیا ہے بعد میں انہیں پتا چلا تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے لیکن وہ اب ان کی زد سے

بچ چکا تھا۔

ایک رات میں میانوالی ونڈے کے علاقے میں آیا رات گزارنے کے بعد صبح اسے میانوالی جانا تھا کسی طرح اس کے پروگرام کی اطلاع پولیس کو مل گئی پولیس افسران کیل کانٹے سے لیس ہو کر بھاری نفری کے ساتھ ونڈا شاہ بلاول تھانہ لاوا کے لاری اڈہ پر پہنچ گئے اور ہر طرف سے ناکہ بندی کردی جب اسے پتا چلا کہ پولیس نے جانے کے تمام راستے بند کر رکھے ہیں اس نے ایک گھر سے سفید ٹوپی والا برقعہ لیا عورتوں کی سینڈل لے کر پاؤں میں ڈالی شلوار اور کرتا پہلے ہی پہنا ہوا تھا ہاتھ اس کے برقع کے اندر تھے۔ پاؤں میں جرابیں تھیں۔ ایک مرد بوڑھی عورت اور پانچ سالہ بچی کو ساتھ لیا اور بس پر سوار ہونے کے لیے نکل کھڑا ہوا مرد کو اس کا خاوند ظاہر کیا گیا جب کہ بوڑھی عورت ساس بنی اور لڑکی بیٹی واقعہ یہ بنایا کہ مرد اپنی بیوی اور ماں کے ساتھ اپنے گھر جارہا ہے ساس اپنی بیٹی کو چھوڑنے کے لیے ساتھ جارہی ہے۔اس علاقے کی روایت ہے کہ جب کوئی عورت برقعہ پہن کر باہر نکلے تو مرد احتراماً دوسری طرف منہ پھیر لیتے ہیں چنانچہ محمد خان بیوی کے بھیس میں ٹھمک ٹھمک چلتا پولیس کے بیچ میں سے گزر کر میانوالی کی لاری پر سوار ہوگیا۔غضب یہ ہوا کہ اسے اور اس کے خاوند کو ڈرائیور کے بالکل پیچھے سیٹ ملی اب یہاں ایک اور دلچسپ المیہ ہوا کہ ڈرائیور کے آگے جو شیشہ لگا ہوا کرتا ہے اس میں سے اس کی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ڈرائیور نے سوچا بڑی اونچی لمبی اور خوبصورت عورت گاڑی میں آبیٹھی ہے۔گاڑی چلاتے ہوئے بھی وہ بار بار اس کی جانب دیکھ رہا تھا اور اسے دامن محبت میں گرفتار کرنے کی خاطر اُلٹی سیدھی حرکتیں کرنے لگا یہ نظارہ اس کے لیے عجیب وغریب تاثر رکھتا تھا ڈرائیور اس کے عشق میں اتنا کھو گیا ایک دو دفعہ بس دوسری بس سے ٹکر ہوتے ہوتے بچی، اس نے سوچا کہ اگر اسی طرح یہ کرتا رہا تو کہیں بس ذے مارے گا سواریوں کو جو نقصان ہوگا وہ اپنی جگہ وہ یقیناً گرفتار ہو جائے گا۔اس نے اپنے خاوند سے کہا کہ وہ ڈرائیور کو اسے گھور کر دیکھنے سے منع کرے چنانچہ اس کے ٹوکنے پر ڈرائیور کو چین آیا۔

جب ایس ایس پی عبداللہ اور ڈی آئی جی بنگش کو اس بات کا علم ہوا کہ صدر ایوب کے کہنے پر اکبر شاہ کو اس کی گرفتاری پر مامور کردیا گیا ہے تو انہیں بہت برا لگا انہوں نے اکبر شاہ پر پابندی لگادی اور اسے نظر بند کردیا اکبر شاہ کے معتمد ساتھیوں کو ڈھوک شیر کا علم تھا یہ پولیس افسران ہزاروں سپاہیوں کو لے کر یکم اگست 1967ء کو دن گیارہ بجے ڈھوک شیر پر پہنچ گئے اور اپنی پوزیشنیں سنبھال لیں ڈھوک شیر ایسا علاقہ ہے جہاں چھوٹے چھوٹے نالے، کھائیاں اور پہاڑیاں ہیں۔ ایس ایس پی عبداللہ نے آتے ہی اسے گرفتاری دینے کو کہا وہ اس وقت دھوتی اور بنیان پہنے ہوئے تھا۔ وہ جب سے روپوش تھا اس کے پاس ہینڈ گرینڈ، تہہ کی جانے والی رائفل، ریوالور اور ڈھیر ساری گولیاں تھیں جنہیں وہ ایک صندوق میں بند رکھتا تھا۔ایس ایس پی عبداللہ نے کہا محمد خان ہاتھ کھڑے کردو اور خود کو گرفتاری کے لیے پیش کردو پولیس نے چاروں جانب سے تمہیں گھیر لیا ہے۔اب تم کسی صورت نہیں بچ سکتے۔ اس نے جواب دیا میں اس وقت بالکل خالی ہاتھ ہوں اکبر شاہ کو بھیجو کہ مجھے گرفتار کرلے یہ سنتے ہی ایس پی عبداللہ نے فائر کھول دیا وہ اس وقت بالکل نہتا تھا پہلی گولی اس کی چھاتی میں لگی اس نے بھاگ کر بیٹھک سے تہہ بند لیا جہاں گولی لگی وہاں باندھا اور گھنی جھاڑیوں کے درمیان گہری کھائی میں جا چھپا

پولیس نے چاروں طرف سے گھیرا ڈال رکھا تھا اور وہ مسلسل فائرنگ کرتی رہی حتیٰ کہ شام کے ساڑھے پانچ بج گئے اگر پولیس کو علم ہوتا کہ وہ واقعی ہی خالی ہاتھ ہے تو وہ لازمی طور پر گھیرا تنگ کرتے ہوئے اسے گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاتے لیکن پولیس کو خدشہ تھا کہ اس کے پاس ہینڈ گرنیڈ، آتشیں اسلحہ اور دوسرا تباہ کن سامان موجود ہے وہ اس لیے آگے نہ بڑھ سکے جب انہوں نے دیکھا کہ وہ کسی طرح اسے گرفتار کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے تو مجبوراً انسپکٹر شاہ کو بلایا گیا اس نے موقع پر آگے بڑھ کر اسے آواز دی محمد خان نے اکبر شاہ کو پاس بلایا اور خود کو اس کے حوالے کر دیا اتنے عرصے میں اس کا بہت سا خون ضائع ہو چکا تھا اور وہ بہت کمزوری محسوس کر رہا تھا۔

پولیس اسے ڈیرے پر لے آئی وہاں چارپائی پر لٹا دیا خون آلود چادر اتار کر دوسری باندھی گئی بعد ازاں اسے تھانہ ڈھوک میں لایا گیا جو تین سو گز کے فاصلے پر واقعہ تھا اسی وقت وائرلیس پر صدر ایوب کو محمد خان کی گرفتاری کی اطلاع دی گئی اور انہیں اس کے زخمی ہونے کا بھی بتایا گیا صدر ایوب نے اسی وقت حکم دیا کہ اسے بلا تاخیر ملٹری اسپتال راولپنڈی منتقل کر دیا جائے چنانچہ رات کے دس کے قریب اسے پنڈی اسپتال میں داخل کرا دیا گیا جہاں اس کے سینے سے گولی نکال لی گئی اور وہ 18 دن تک اسی اسپتال میں پولیس کے کڑے پہرے میں زیر علاج رہا جس کمرے میں اسے علاج کی غرض سے رکھا گیا وہاں چار انسپکٹر، ایک ڈی ایس پی ایس ایچ او اور مسلح سپاہی دروازوں پر موجود ہوتے۔

محمد خان کی گرفتاری پر پورے ملک میں قیامت برپا ہو گئی اور اسے اخبارات میں ڈاکو قاتل اور وادی سون کا بے تاج بادشاہ لکھا جاتا رہا اور اس سے ایسی باتیں اور بے سر و پا وارداتیں منسوب کی گئیں جن کا اسے شاید علم تک نہیں تھا کیونکہ یہ یکطرفہ پراپیگنڈہ تھا اور وہ اس کی تردید کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا اس لیے لوگوں میں وہی تاثر عام ہو گیا جو اخبارات کے ذریعے پھیل گیا۔ اس کے بعد اسے شاہی قلعہ لاہور منتقل کر دیا گیا اٹھارویں روز جب وہ اسپتال سے شاہی قلعہ منتقل کرنے لگے تو اسپتال سے نکلنے سے پہلے اس کے پاؤں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں۔ اسے شاہی قلعہ میں جس کمرہ میں رکھا گیا وہاں سے کوئی 18 گز کے فاصلے پر تفتیشی کمرہ تھا۔ اسے وہاں تک بھی ہتھکڑیوں اور بیڑیوں سمیت پیش کیا جاتا اور اسے آئی جی کرائم برانچ عبدالوکیل خان کی نگرانی میں باقاعدہ تفتیش شروع ہوئی اسے وہاں چھ ماہ رکھا گیا حکومت یہی کوشش کرتی رہی کہ وہ امیر محمد خان کے خلاف وعدہ معاف گواہ بن جائے حکومت اس سے یہ بیان لینا چاہتی تھی کہ ملک امیر محمد خان اس کے ہاتھوں ایوب خان کو قتل کروانا چاہتے تھے۔ یہ بات غلط تھی۔ اس بیان کی روشنی میں حکومت اپنے سیاسی مخالفین کو الجھانا چاہتی تھی۔ انہوں نے اس سے یہ بیان حاصل کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا۔ دفتروں کے دفتر دیکھے گئے کہیں سے بھی محمد خان اور امیر محمد خان کی ملاقات کا ریکارڈ حاصل نہ کیا جا سکا اس نے بھی حالات کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے۔ ہر وار اپنی جان پر سہہ لیا لیکن وعدہ معاف گواہ بن کر اپنے ضمیر کا سودا نہیں کیا۔ پولیس نے اس کے ڈیرے کا مال و متاع لوٹ لیا گھروں کو آگ لگا دی۔ اس کی پانچ مربعہ اراضی بحق سرکار ضبط کر کے نیلام کر دی گئی شاہی قلعہ میں اسے کڑے پہرے میں رکھا گیا۔

6 ماہ بعد اسے گوجرانوالہ جیل منتقل کر دیا گیا۔

وہاں اسے پھانسی کی کوٹھڑی میں رکھا گیا حالانکہ ابھی اسے کسی مقدمہ میں سزا نہیں ہوئی تھی۔ یہاں بھی اتنے سخت حفاظتی انتظامات تھے کہ پھانسی کی کوٹھڑی کے اوپر دائیں بائیں اور آمنے سامنے مسلح سپاہی تعینات تھے حتیٰ کہ پھانسی کی کوٹھڑی کے اندر بھی اس کے ہاتھوں کو ہتھکڑیاں لگائی جاتیں پاؤں میں بیڑیاں اور ایک موٹا سنگل ہتھکڑی کے ساتھ باندھ کر پھانسی کی کوٹھڑی کے لوہے کے دروازے کے ساتھ باندھ دیا جاتا تھا کھانے اور وضو کرنے کے لیے بھی اس کی ہتھکڑیاں نہیں کھولی جاتی تھیں۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل خود آ کر صرف ایک ہاتھ کی ہتھکڑی کھولتا اسی حالت میں وضو کر کے نماز پڑھتا اور کھانا کھاتا تھا۔ جیل میں قتل کے 19 اور 5 زخمیوں کے کیس کی سماعت شروع ہوئی اس کے لیے حکومت نے جج مظہر الحق اور اسپیشل مجسٹریٹ اعجاز احمد چیمہ پر مشتمل خصوصی پینل تشکیل دیا 8 ماہ تک سماعت جاری رہی۔ بالآخر 12 ستمبر 1968ء کو محمد خان ڈھرنالیہ کو 5 بار سزائے موت اور 149 سال قید با مشقت کی سزا سنا دی گئی۔ اس نے کم و بیش 12 سال اسی حالت میں پھانسی کوٹھڑی میں گزارے اس مقدمہ میں نہ وکیل کی اجازت تھی اور نہ ہی وہ کسی سے مل سکتا تھا۔ مکمل طور پر اسے قید تنہائی میں رکھا گیا اسے اتنی ذہنی اذیتیں دی گئیں کہ کوئی اور ہوتا تو پاگل ہو گیا ہوتا۔ اس فیصلے کے خلاف اسے ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ میں اپیل کرنے کا موقع بھی نہیں دیا گیا۔

وہ تختہ دار چوم کر لوٹا

وہ کیمبل پور جیل میں تھا 8 جنوری 1976ء کو صبح چار بجے اسے تختہ دار پر لٹکانے کے تمام تر انتظامات مکمل تھے اور بلیک وارنٹ جاری ہو چکے تھے اسے علم تھا کہ صبح اس کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال دیا جائے گا۔ لیکن اس کا دل مطمئن تھا۔ سارا دن ارد گرد کے قیدی اس کے پاس آتے رہے اور الوداعی سلام لیتے رہے وہ بے خوف و خطر پھانسی سیل میں بیٹھا رہا معمول کے مطابق اس نے روٹی کھائی چائے پی اور ملنے والوں سے گپیں ہانکتا رہا حتیٰ کہ رات کو گہری نیند سویا جیل حکام کو مصیبت پڑی ہوئی تھی وہ پھانسی گھر میں خصوصی انتظامات کرنے میں لگے ہوئے تھے اور جیل کے باہر بھی غیر معمولی انتظامات تھے۔ پھانسی دینے والے جلاد کو بھی بلا لیا گیا تھا۔ لیکن یار لوگ گھوڑے بیچ کر سوتے رہے، رات کے گیارہ بجے کے بعد پھانسی پانے سے صرف 5 گھنٹے قبل ہائی کورٹ کی جانب سے سزائے موت پر عملدرآمد روکنے کا حکم مل گیا اسے جگا کر اس فیصلے سے آگاہ کیا گیا اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور نماز ادا کرنے کے بعد گہری نیند سویا۔

6 جنوری 1976ء کو اس کے چھوٹے بھائی فتح شیر نے ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر دی تھی کہ جو منظور ہوگئی اور 1978ء میں اس کی سزائے موت معاف ہوگئی تاہم 149 سال قید با مشقت کی سزا بحال رہی، جیل میں قابلِ رشک چال چلن کے باعث ملنے والی معافیاں شامل کر کے مجموعی طور پر 55 سال قید کاٹی اور بغیر معافیوں کے 14 سال سے اوپر بھگتی جس میں سے 12 سال پھانسی کوٹھڑی میں گزارے، پھانسی کی سزا معاف ہونے کے باوجود وہ پھانسی کوٹھڑی میں رہا اس کی وجہ یہاں کا سکون تھا کوئی شور و غل نہیں نہ آمد و رفت تھی وہ نہایت یکسوئی سے اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول رہتا لوگوں کی نظروں سے دور گوشہ تنہائی میں راحت محسوس کرتا۔ اپنے دور میں اپنے علاقہ کا یہ بے تاج بادشاہ محمد خان 29 ستمبر 1995ء کو طبعی موت مرا۔ اسے آبائی گاؤں ڈھوک مصائب تحصیل تلہ گنگ ضلع چکوال میں دفن کیا گیا۔

☆☆......☆☆

کارِ جہاں دراز ہے

سنگلاخ دیواروں کے پیچھے سے جرم کی کوکھ میں پل کر مجرم بننے والوں کی عبرت سامان
دل سوز تحریریں جن میں آنسوؤں کی نمی بھی ہے اور سسکتی ہوئی زندگی کے نوحے بھی

بے ثبات ہے زندگی



جاوید راہی

دولت کی پجاری، ایک عورت کے حرص کی تصویر جرم

سیکڑوں لوگ تھے جن میں خواتین سمیت ہر عمر کے مرد اور بچے پریس کلب لاہور کے باہر بڑے بڑے کتبے اور بینرز اٹھائے رخسانہ کے قتل کا انصاف مانگ رہے تھے، جسے رخسانہ کے والد عبدالغفور کی زبانی زیادتی کے بعد قتل کر دیا گیا تھا۔ جس کی لاش دو روز تک مکئی کے کھیت میں جنگلی جانوروں کے رحم و کرم پر پڑی رہی۔

اس روداد کے پیچھے جس حوالے کو راقم الحروف نے بڑی گہرائی سے دیکھا وہ خاصا پریشان کن ہے۔

اوکاڑہ کے نواحی قصبہ 37-36 ٹو آر کے رہائشی اس خاندان کے تعلق عرصہ دراز سے اسی گاؤں کے عیسائی خاندان سے بڑے قریبی چلے آ رہے تھے۔ یہاں تک کہ رخسانہ اور نامزد ملزمان ستار مسیح ولد لال مسیح کی زوجہ کیتھرین ایک جان دو قالب کی مثال تھیں۔ رخسانہ کے بہنوئی فاروق نے بارہا بار رخسانہ کے خاوند شوکت علی کو اس میل ملاپ سے روکا مگر کیتھرین کے خاوند ستار مسیح نے فاروق کو روک کر اس سے باز پرس کی کہ تم اپنے آپ کو اس معاملہ سے دور رکھو۔ نامزد ملزمان رشید مسیح، امین مسیح، ستار مسیح اور کیتھرین کے خلاف تھانہ صدر اوکاڑہ میں درج ایف آئی آر کے مطابق رخسانہ کو اغوا کیا گیا اور مکئی کے کھیت سے رخسانہ کی لاش ملی، جس کے چہرے پر انسانی دانتوں کے واضح نشانات تھے اور لاش کی حالت بتا رہی تھی کہ اسے بری طرح پامال کیا گیا تھا جس کی تصدیق بعد میں رپورٹ ملنے پر سامنے آئی کہ اسے قتل سے پہلے اجتماعی زیادتی کا نشانہ بھی بنایا گیا تھا۔

اس واقعے کی مکمل تفصیل جاننے کے لیے جب میں تھانہ صدر اوکاڑہ میں ستار مسیح سمیت دیگر نامزد ملزمان سے ملا تو سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ ملزمان کو سیاسی آشیر باد حاصل ہونے کی بنا پر خاصا مطمئن پایا۔ کئی ایک لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ ستار مسیح اور مقتولہ کے خاوند میں خاصا مضبوط دوستانہ چلا آ رہا تھا۔ ستار مسیح رخسانہ کے خاوند کو نوکری دلوانے میں پیش پیش رہتا، کبھی وہ دونوں میاں بیوی کو فیصل آباد لے جاتا نوکری دلوانے کی غرض سے اور وہ اکٹھے ہی رہائش پذیر ہوتے۔ کئی کئی ماہ یہ سلسلہ چلتا رہتا۔

اسی طرح فتح پور بنیادی مرکز صحت میں ان ٹرینڈ دائی کے کورس میں داخلہ لیے رُوکی (رخسانہ) کو ابھی بیس روز ہی ہوئے تھے کہ مرکز صحت کے تمام عملہ کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ مرکز انچارج ایچ ٹی صادق جو خود کو ڈاکٹر کہلوانا پسند کرتا ایل ایچ وی نجمہ اور میڈ وائف زبیدہ جو سالہا سال سے ایک فیملی کی طرح اس مرکز صحت میں تعینات اس علاقہ کے لوگوں کو طبی سہولت فراہم کرتے آ رہے تھے ڈاکٹر صادق رخسانہ کی بیس روزہ حاضری کے دوران پانچ بار رخسانہ کی

طرف سے ہونے والے معاملات میں الجھے اور علاقے کے بااثر افراد کی سخت تنقید کا سامنا کر چکے تھے۔ رخسانہ پارٹی بازی کی بڑی ماہرانہ فنکارہ تھی ایک دوسرے سے لڑانا اس کے ایک جھٹکے کا کمال تھا۔

بنیادی مرکز صحت خواتین اور بچوں سے بھرا ہوا تھا مہینہ وار راشن کی تقسیم تھی جو ایل ایچ وی کی ذمہ داری میں شامل ہونے کی بنا پر زچہ و بچہ کی ہسٹری درج کرنے کے بعد خشک دودھ، گندم، بٹر، آئل وغیرہ دیا جاتا۔ خدا جانے رخسانہ نے وہاں موجود خواتین میں کون سا شوشا چھوڑا کہ تمام خواتین نے وہاں احتجاج شروع کر دیا۔ جس کا نشانہ ایل ایچ وی اور ڈسپنسر خادم تھا، جن پر یہ الزام لگایا جا رہا تھا کہ وہ راشن خرد برد کرتے تھے۔ اس احتجاج کی بازگشت قریبی پولیس چوکی میں ہوئی تو ملازمین دندناتے ہوئے مرکز میں آ گئے۔

شکایات کا دفتر کھل گیا۔ رخسانہ پیش پیش تھی۔ نہ تو اس کا یہ پتا چل رہا تھا کہ وہ احتجاج کرنے والوں کے ساتھ تھی اور نہ یہ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ مرکز صحت کے عملہ کی وکالت کر رہی ہے۔ دیگر عملہ ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا،

ڈسپنسر اور ایل ایچ وی اس صورت حال کو ہینڈل کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ سالہا سال سے چلتا ہوا پروگرام پل بھر میں متنازعہ ہو گیا اور وہ سب خواتین مارنے مرنے پر تیار ہو گئی تھیں۔

آخر کار چوکی انچارج راشن کے سٹور کو تالا لگا کر چابی ساتھ لے گیا۔ جاتے جاتے مرکز صحت کے عملہ کو کہہ گیا کہ اس کا فیصلہ محکمہ صحت کا کوئی آفیسر ہی آ کر کرے گا کیونکہ یہ غیر ملکی امداد کا معاملہ ہے۔ یہ محکمہ ہی حساب لگائے گا کہ کیا صحیح اور کیا غلط ہوتا آ رہا تھا۔ سب راشن لینے والی خواتین بچوں سمیت واویلا مچاتی واپس چلی گئیں۔

رخسانہ ایل ایچ وی کے کمرے میں چہرے پر یاسیت کا نقاب سجائے اس سے مخاطب ہوئی۔

''میڈیم آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ سب کچھ کہیں ڈاکٹر اور میڈ وائف زبیدہ کا کیا دھرا تو نہیں۔ میرا مطلب کہیں یہ سازش دونوں نے مل کر کی ہو کہ آپ کی ٹرانسفر کروا کر سارا نظام دائی زبیدہ کے ہینڈ اوور ہو جائے اور یہاں راشن میں بھی ان کی اجارہ داری قائم ہو جائے۔ میڈیسن پر تو وہ پہلے ہی قابض چلے آ رہے



ہیں۔ میں نے اپنے والد کے لیے کھانسی کا شربت مانگا تو وہ کہنے لگی ابھی اسٹو نہیں کیا۔" منہ کا زاویہ بگاڑتے ہوئے اس نے ایل ایچ وی پر اپنی ہمدردی کا اظہار کیا۔

"مجھے نہیں پتا ڈی ایچ او صاحب خود آ کر سب کچھ دیکھ لیں گے۔ میں آفس جا کر ساری صورت حال ان سے بیان کر دوں گی یہ کہتے ہوئے وہ رجسٹر وغیرہ دراز میں رکھتے تالا لگا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆......☆......☆

دوسرے روز محکمہ صحت کے اہلکاروں نے آ کر سارا سٹور اور ریکارڈ چیک کیا تو انہیں کوئی بھی بے ضابطگی نظر نہ آئی مگر یہ سب کچھ کیسے ہوا کسی نے اس بارے کوئی نوٹس نہ لیا اور وہ سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا۔

رخسانہ کو دو ماہ ہو گئے مگر وہ کبھی کبھار کوئی اوچھا ہتھکنڈا ضرور کر گزرتی۔ چوکیدار نور محمد کا کوارٹر اس نے صاف کر کے اس میں اپنا تھوڑا بہت سامان رکھ لیا تھا کیونکہ نور محمد رات کی ڈیوٹی کر کے قریبی بستی میں اپنے گھر چلا جاتا۔ رخسانہ چونکہ اسی گاؤں کی رہائشی تھی سب کے ساتھ اس کے روابط اس لیے بھی کھلم کھلا تھے کہ سب لوگ اسے جانتے تھے خاص کر پولیس چوکی کا عملہ اس کے دائرہ کار میں تھا۔

نور محمد چوکیدار نے رخسانہ کو اس بات پر رضامند کر لیا تھا کہ کبھی کبھار اکبر خان کا تھوڑا بہت مال جس میں چرس، افیون شامل تھی اپنے کوارٹر میں رکھ لیا کرو اور چوکی والے تو تیری طرف آنکھ بھر کر بھی نہیں دیکھتے وہ تمہاری خدمت بھی کر دیا کرے گا۔ یوں 'رُوکی' اکبر خان کے ساتھ مل کر منشیات کا دھندا کرنے لگی۔

اس کی ہوس دن بدن بڑھتی جا رہی تھی اس کے مراسم ایسے لوگوں سے بھی ہو گئے تھے جن کو اکبر خان براہ راست اس کے پاس رکھا مال لینے بھجوا دیتا۔

گاؤں میں ایک دو گھر عیسائیوں کے بھی تھے اور ان کے پرمٹ تھے شراب کے۔ رخسانہ ان سے شراب خرید کر مہنگے داموں آگے فروخت کرنے لگی تھی۔ منہ متھے لگتی تھی اور اسے دوسروں سے کام نکلوانے کا فن بھی آتا تھا۔

مرکز صحت کی بدنامی ہو رہی تھی مگر عملے کے کسی ملازم کی جرأت نہ ہوتی اس کے راستے میں آنے کی۔ اس نے بطور اَن ٹرینڈ دائی یہاں داخلہ لیا اور اس ایریا کو اپنی مذموم سرگرمیوں کی آماجگاہ بنا لیا۔ اس کے گھر والے بھی کھلے دل کے لوگ تھے۔ وہ اس کی سرگرمیوں میں اس کی معاونت کرتے۔ اکبر خان نے اسے اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ اِدھر کا مال اُدھر ڈیلیور کرے۔

رات کی تاریکی میں گاڑیاں مرکز صحت پر آتیں اور رخسانہ کے کوارٹر پر دیر تک لین دین کا سلسلہ جاری رہتا۔ پولیس چوکی چند قدم پر تھی مگر وہ سب اس کے اشاروں پر ناچتے تھے۔ اس کے کوارٹر پر اِدھر اُدھر سے اسی قماش کی عورتیں بھی دھڑلے سے آتیں اگر محکمہ کا کوئی ملازم باز پرس کرتا تو وہ آپے سے باہر ہو کر ٹرانسفر کروانے کا رعب ڈالتی تو وہ چپ ہو جاتا۔

☆......☆......☆

ان ہی دنوں اکبر خان نے اسے ایک پیکٹ دیا اور سرگودھا روانہ کر دیا۔ یہ اس کی پہلی ڈیل تھی جو وہ اپنے علاقہ سے دور کرنے جا رہی تھی۔ خوبرو تو تھی ہی اس نے وہ پیکٹ زیر جامہ کیا اور دوپہر ڈھلنے سے قبل اپنے کوارٹر سے نکل کر سڑک پر آ گئی۔ اس نے اپنا جو پلان بنایا تھا وہ یہ تھا کہ کسی گزرتی کار کو جس میں فیملی ہو اس میں لفٹ کی کوشش کرے گی۔ دو چار گاڑیوں کو ہاتھ دیا مگر کامیابی حاصل نہ ہوئی آخر کار ایک ایمبولینس جو کہ کوئی مریض لے کر جا رہی تھی، ہاتھ دینے پر رک گئی۔ ایمبولینس میں موجود مریض کے ورثا نے ریکویسٹ پر اسے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔

فیصل آباد تک کا سفر بخیریت ہوا اور وہ اتر کر بس اسٹینڈ کی طرف چل دی۔

شام ہو رہی تھی اور اسے ایک اکیلی بیٹھی خاتون کے برابر سیٹ مل گئی۔ جو راستہ اس نے اختیار کر لیا تھا اس کا انجام تباہی تھا مگر وہ ان سب سے بے خبر صرف دولت کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ بس سرگودھا کے بس اسٹینڈ پر رکی تو وہ بھی سواریوں کے ساتھ بس سے باہر آ گئی۔ پی سی او پر آ کر اس نے رابطہ نمبر ڈائل کیا اور دوسری طرف رابطہ ہونے پر اس نے بولنے والے کو بتایا کہ وہ اسٹینڈ کے اندر ہی پی سی او میں ہے۔ یہ بتا کر اس نے فون کاٹ دیا اور پی سی او کے ایک طرف ہو کر انتظار کرنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد ایک موٹر سائیکل سوار نوعمر لڑکا اس کی طرف آتے رک گیا اور نام لے کر مخاطب کیا۔ رخسانہ نے



ڈی پی او بابر بخت قریشی

سر ہلا کر تائید کی اور اس کے ساتھ موٹر سائیکل پر سوار ہوئی۔ وہ لڑکا جس نے اپنا نام عبداللہ بتایا تھا اسے لے کر مختلف گلیوں سے ہوتا ہوا ایک مکان کے آگے آ کر رکا دروازہ کھلا تھا۔ وہ اسے لے کر اندر داخل ہو گیا۔

گھر کے اندر ہی خاتون خانہ جس کا نام رضیہ تھا نے اس کا خیر مقدم کیا اور بتایا کہ یہ میرا بیٹا ہے جو کام میں میرا ہاتھ بٹاتا ہے۔ اکبر خان نے رخسانہ کو بتایا تھا کہ جس کے پاس تم مال لے کر جا رہی ہو وہ خود بھی منشیات کا کام کرتی ہے۔ خاوند اس کا قتل کے سلسلہ میں جیل تھا پیچھے وہ گھر اور اس کا مقدمہ سنبھال رہی تھی۔ بیگ اس نے رضیہ کے سپرد کیا اور اس کے پیچھے چلتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔ اس کی دو بیٹیاں نصرت اور عشرت بھی کمرے میں آ گئیں۔ چائے وغیرہ کے بعد کھانا لگ گیا۔ رات گئے تک وہ ان سے باتیں کرتی رہی۔ پھر ان کے درمیان ہی سو گئی۔

صبح ناشتہ سے فارغ ہو کر عبداللہ کے ہمراہ بس اسٹینڈ پر آئی اور واپسی کے لیے بس میں سوار ہو گئی۔ اس کی پہلی ڈیل بغیر کسی مسئلہ کے کامیاب ہو گئی۔

☆......☆......☆

رخسانہ ہوس زر کے جال میں الجھتی چلی گئی ادھر ادھر منشیات سمگل کرتی کرتی وہ لاکھوں میں کھیلنے لگی۔ اپنی



مقتولہ رخسانہ

اغوا کار رابعہ نور فرتاشہ' جاوید نور پولیس حراست میں

گاڑی خرید لی۔ الگ سے گھر خرید لیا۔ اپنے دونوں بھائیوں اور باپ کو بھی اسی کاروبار میں شامل کر لیا۔ کئی بار یہ سب لوگ رنگے ہاتھوں پکڑے گئے، جیل بھی گئے پھر ضمانت پر باہر آ کر وہی دھندا شروع کر دیتے۔

اسی قماش کے ایک بڑے منشیات فروش توکل سے رخسانہ نے شادی کر لی۔ توکل کے آنے سے باپ بھائیوں کے ساتھ اَن بن ہو گئی وہ دونوں کے کاروبار سے الگ ہو گئے۔ دونوں طرف سے سرد جنگ شروع ہو گئی۔ ایک دوسرے کی مخبری میں پولیس کی چاندی ہونے لگی اور یہ سلسلہ طویل ہوتا گیا۔

رخسانہ کا بڑا بھائی عبدل ذرا غصے والا تھا۔ ایک دو بار اُس نے توکل اور رخسانہ کے ساتھ مار پیٹ بھی کی۔

بات پولیس تک جا پہنچی۔ گرفتاریاں، مقدمات دونوں طرف سے چلنے لگے مگر دونوں نے ہار نہ مانی۔ توکل اور رخسانہ اپنی گاڑی پر چالیس کلو چرس لے کر آ رہے تھے کہ عبدل کو اس کے بارے میں خبر ہو گئی۔ ابھی وہ راستے میں ہی تھے کہ اس نے پھول نگر پولیس کو ان کا گاڑی نمبر دیتے، بھاری منشیات سمگل کرنے کا بتایا۔ پولیس نے ناکہ لگاتے گاڑی روکی اور تلاشی پر چرس برآمد ہو گئی۔ وہ دونوں میاں بیوی گرفتار ہو گئے اور جیل چلے گئے۔

☆......☆......☆

جب ضمانت پر باہر آئے تو سیدھے عبدل کے گھر مصلحت کے لیے گئے مگر رخسانہ کے والد نے دونوں کو بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا۔ دونوں کو اپنی بے عزتی کا بڑا دکھ ہوا۔ اُن کو پتا چل گیا تھا کہ پھول نگر پولیس کو مخبری عبدل نے کی تھی۔

”رُوکی ہمیں تمہارے بھائی کی وجہ سے بہت نقصان اٹھانے پڑ رہے ہیں۔“ توکل نے رخسانہ کو مخاطب کرتے گلہ کیا۔

”میں خود بھی بہت پریشان ہوں، ان کے رویے سے۔“ رخسانہ نے توکل کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”تو پھر کیا کرنا چاہیے۔“ توکل نے بدستور پریشان کن انداز میں اس سے پوچھا۔

”توکل میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ اگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو مجبوراً کوئی قدم اٹھانا ہوگا۔“ توکل نے چہرے پر سختی لاتے اس کی جانب دیکھا۔

”میں تمہیں نہیں روکتی۔“ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔ توکل کے اندر رخسانہ کے گھر والوں کیلئے غصہ اور نفرت کا الاؤ روشن تھا، جو لمحہ بہ لمحہ بلند ہوتا جا رہا تھا۔

توکل نے اپنے ایک ملنے والے مفرور اشتہاری فضلو بلوچ سے رابطہ کر کے یہ پلان تیار کر لیا کہ کوئی موقع دیکھ کر عبدل پر دھاوا بول دینا ہے۔

اُدھر عبدل اپنے باپ بھائی کے ہمراہ دونوں کو ٹھکانے لگانے کا پکا پروگرام بنائے بیٹھا تھا۔ رخسانہ اور توکل شہر سے واپس آ رہے تھے۔ وہ تینوں باپ بیٹے ان کے انتظار میں ٹوٹے روڈ کے ایک جانب کماد کی فصل میں چھپے ہوئے تھے۔ اس سڑک پر گاڑی کی رفتار رینگنے کی حد تک سست ہو جاتی تھی۔

جب اُن کی گاڑی ان سے کچھ فاصلے پر آہستہ ہوئی تو وہ تینوں اسلحہ سے لیس فصل سے نکل کر سڑک پر آ گئے۔ گاڑی کے سامنے آ کر عبدل نے فائر کھول دیا۔

پہلے برسٹ نے رخسانہ کے پرخچے اڑا دیے دوسری طرف عبدل کے بھائی اور باپ نے فائر کھول دیا۔ توکل اس حملہ کے لیے بالکل تیار نہیں تھا ورنہ وہ اپنا پستول نکال لیتا مگر پے در پے گولیوں نے اسے سٹیئرنگ پر ہی ڈھیر کر دیا۔ دونوں جانب سے ٹریفک رُک گئی تھی۔ باپ بھائی اپنے خون کو پانی کی طرح بہا کر موٹر سائیکل پر موقع واردات سے فرار ہو گئے۔

☆......☆......☆

پولیس آئی دونوں کی لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے ہسپتال بھجوا کر ان کے پیچھے گرفتاری کے لیے چڑھ دوڑی مگر پولیس کو بھاگ دوڑ نہ کرنی پڑی۔ وہ تینوں اسلحہ سمیت تھانے میں حاضر ہو گئے۔

گرفتاری عمل میں لائی گئی اور ان کے اقرار جرم اور اسلحہ کی برآمدگی کے بعد ان کو جیل بھیج دیا گیا۔ مقدمہ کی پیروی توکل کا چھوٹا بھائی کر رہا ہے مگر عدم دلچسپی کی بنا کر پر شاید وہ تینوں کمزور استغاثہ کی بنا پر جلد باہر آ جائیں۔ مگر رخسانہ سے سبق لے کر کتنی بیٹیاں اس دلدل میں جانے سے باز رہیں گی اور کتنی ہیں جو دوسری رخسانہ بننے کی تیاری کر رہی ہوں گی۔

کسی کو پتا ہے یہ؟

☆☆......☆☆

شعلہ ساماں تحریریں

بت اور نفرت کی دہکتی آنچ
میں لودیتی ہوئی شعلہ ساماں تحریریں

اِک گناہ اور.....

عابد علی سحر

چشتیاں سے ایک شخص کی داستانِ عبرت

''آؤ آؤ نواب زادے۔ تشریف رکھو۔'' وہ خشمگیں نگاہوں سے اُسے گھورتا ہوا کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''کیوں بلوایا ہے مجھے؟'' وہ درشتی سے بولا۔

''بتاتا ہوں جناب۔'' یہ کہہ کر وہ مڑا اور پکارا۔

''ہوشیار خان! ذرا اندر آؤ۔'' ایک خرانٹ قسم کا شخص اندر آ گیا جس کے ہاتھ میں ایک رسی تھی۔ اُس نے آنکھ دبا کر اُسے اشارہ کیا تو وہ آگے بڑھا اور اُسے کرسی کے ساتھ باندھنا شروع کر دیا۔

''ارے یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' وہ چلایا، مگر مزاحمت نہیں کی، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ ایسی کوئی بھی حرکت فضول ہوگی۔ چند ہی لمحوں میں ہوشیار خاں نے اُسے کرسی کے ساتھ جکڑ کر باندھ دیا۔ وہ پھر اُس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔

''کیوں بھئی...... آخر چڑھ ہی گئے نا تم میرے ہتھے؟ اوئے...... میں نے تجھ سے کہا تھا کہ ایک دن میں تجھے ثبوت اور گواہ سمیت ضرور پکڑ دوں گا، جب کہ تو نے کہا تھا کہ وہ دِن کبھی نہیں آئے گا، لیکن دیکھ لے آج وہ دن بھی آ ہی گیا۔ میرے پاس گواہ بھی ہے اور ثبوت بھی۔ سن رہا ہے نا بچو...... آ گئی نا جان شکنجے میں، آخر تو قابو آ ہی گیا اور یہ سب کچھ میری وجہ سے ممکن ہوا ہے، کیوں کہ میرا نام ہے عقلمند خان۔''

''انسپکٹر عقلمند خاں! لعنت ہے اُس پر بھی جس نے تیرا نام عقلمند خان رکھا اور اُس پر بھی جس نے تجھے انسپکٹر بنایا۔ آخ تھوہ......'' یہ کہتے ہوئے اُس نے تھوکا اور انسپکٹر کو گھورنے لگا۔ اُس کے چہرے سے عیاں تھا کہ اگر اُس کا بس چلتا تو وہ ضرور انسپکٹر سے ہاتھا پائی کرتا۔

''اوئے اوئے...... تُو نے میرے باپ اور ماموں کو گالی دی، یعنی مجھے گالی دی۔ تجھے اس کی سزا ابھی ملے گی، اپنا کاکا ہوشیار خان! ذرا دس نمبر والا جوتا تو لے کر آ۔'' انسپکٹر نے چیختے ہوئے کہا۔

ہوشیار خان جلدی سے چلایا۔

''معاف کرنا انسپکٹر! میرے جوتے کا نمبر 8 ہے...... پھر بھی اگر دس نمبر کا ہی لانا ہے تو باٹا کمپنی کا لانا چلے گا۔'' وہ دانت نکالتے ہوئے بولا۔

''چٹاخ......!'' انسپکٹر نے اُس کی بات کا جواب تھپڑ سے دیا۔

''ارے اتنی زور سے کیوں مارا اور اب بندھا ہونے کی وجہ سے میں اپنا گال بھی نہیں سہلا سکتا۔'' وہ تقریباً روہانسا ہو گیا۔

''بیٹا! ابھی تو میں نے شروعات کی ہے، آگے آگے



دیکھو کیا ہوتا ہے تمہارے ساتھ۔ تم نے دو جرم کیے ہیں۔ ایک تو تم نے چوری کی ہے اور دوسرا تم نے مجھے گالی دی ہے۔ ایک آن ڈیوٹی آفیسر کو گالی دی ہے تم نے بے وقوف۔" انسپکٹر کا لہجہ پُر جلال تھا۔

"گالی؟ کیسی گالی؟ اور چوری.....؟ ارے مہینوں ہو گئے ہیں، اب تو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے جیب میں، پھر بھی میں نے یہ حرکت نہیں کی ہے۔" اُس نے سوالیہ انداز میں اپنی صفائی پیش کی اور کرسی پر بیٹھا

کسمسایا، لیکن تکلیف ہی ہوئی، کیوں کہ بندھا ہوا جو تھا۔
"بھئی کہاں مر گئے ہوشیار خان!" انسپکٹر نے ہانک لگائی۔
"آیا سر جی۔ یہ لیس جی میں آ گیا۔" حوالدار ہانپتا ہوا اندر داخل ہوا تو اُس کے ہاتھ میں پولیس والوں کا ایک روایتی جوتا موجود تھا۔
"اُس کو بتاؤ ہوشیار خان کہ میرا نام میرے والد نے رکھا تھا اور میرے ماموں نے مجھے انسپکٹر بنایا۔ ذرا دو چار لگا تو اسے۔ ہاں بھئی ساحر، دماغ ٹھیک رہے گا ناں؟" انسپکٹر نے اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔
"مگر میں نے کیا کیا ہے؟" ساحر استفہامیہ لہجے میں چیخا۔
"بیٹا تم نے مجھے گالی دی ہے، اس کی سزا تو الگ ملے گی تجھے، خیر اسے تم ابھی بھول جاؤ۔ سنو تم نے شہر کے ایک مشہور آدمی کے گھر اُس کا خاندانی ہار چرایا ہے، جس کی قیمت کوئی 50 لاکھ کے قریب ہے۔" انسپکٹر نے نہایت رسان سے اُسے آگاہ کیا۔
"کیا 50 لاکھ روپے......؟ ارے انسپکٹر! اگر مجھے وہ ہار ملا ہوتا تو میں اس وقت یہاں ہوتا؟" اُس نے بہانہ تراشا۔
"تو گویا تم نے وہ ہار چوری نہیں کیا یا پھر تمہارا کوئی دوسرا ساتھی لے اُڑا۔" انسپکٹر نے سوال داغا۔
"جی نہیں میں نے یہ چوری نہیں کی اور نہ ہی میرا کوئی ساتھی ہے۔" ساحر نے سخت انداز میں جواب دیا۔
"بہت سن لی تیری یہ بکواس اب ذرا تو یہ بتا کہ تُو کل رات ساڑھے گیارہ بجے کہاں تھا؟" انسپکٹر نے پھر سوال داغا۔
"میں کل رات چاچا کریم کے گھر پر تھا۔" ساحر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
"تو مسلسل جھوٹ بول رہا ہے، اگر تُو چاچا کریم کے گھر پر تھا تو رات کے ساڑھے گیارہ بجے تو گرین ٹاؤن کی گلی نمبر 3 میں کیوں بھاگا جا رہا تھا؟" پھر ایک سوال داغ گیا۔
"عقلمند خان صاحب آپ ہیں تو انسپکٹر، لیکن آپ کی معلومات بالکل ناقص ہیں۔ آپ کے خیال میں چاچا کریم کا گھر یہیں گندے نالے کے قریب ہے تو آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اب وہ یہاں سے گرین ٹاؤن میں شفٹ ہو گئے ہیں۔" اُس نے انسپکٹر پر چوٹ کی۔
"چلو مان لیا لیکن تم بھاگے کیوں جا رہے تھے؟"
"دراصل چاچا کریم دمے کے مریض ہیں، کل رات اُن کی طبیعت بگڑ گئی تھی اور میں ڈاکٹر ذاکر کے کلینک کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔" ساحر نے تفصیل بتائی۔
"بالکل غلط۔ تم نے ڈاکٹر کو بھی ساتھ ملایا ہوگا، تاکہ وہ تمہاری گواہی دے سکے۔ حقیقت میں تم نے کل رات سیٹھ رحمان کے گھر سے اُن کا قیمتی خاندانی ہار چوری کیا اور رفو چکر ہو گئے، لیکن بھاگتے ہوئے تمہیں ایک قریبی گھر کے گارڈ نے دیکھا تھا، لیکن اُس نے تم پر کوئی خاص توجہ نہ کی۔" انسپکٹر نے اسے گھورتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔
"تم اگر مجھے تفصیل سے سب کچھ بتاؤ تو شاید میں اپنی صفائی بہتر انداز میں دے سکوں۔"
"اچھا مشورہ ہے۔ میرے ذلیل اور کمینے دوست تُو نے چوری بھی کر لی اور تفصیل بھی تجھے معلوم نہیں...... بھئی بہت اچھے۔" انسپکٹر نے اُس کا مذاق اُڑایا۔
وہ بھی کچھ کم نہ تھا، کہنے لگا۔ "میرے سب گھٹیا اور احمق دشمن امیں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ جو الزام تم مجھ پر لگا رہے ہو، میں اُس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا اگر اس کی کچھ تفصیل بتا دو تو اچھا ہے۔"
انسپکٹر کو تاؤ تو بہت آیا، مگر اُس نے صبر کیا، کیوں کہ وہ آرام سے حساب بے باک کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس لیے بولا۔
"چلو میں ہی بتا دیتا ہوں۔ سنو...... سیٹھ رحمان شہر کے ایک مشہور بزنس مین ہیں ان کی اپنی زمینیں بھی کافی ہیں وہ خاندانی نواب ہیں، اُن کی ایک ہی بیٹی ہے عالیہ رحمان وہ امریکا میں پیدا ہوئی اور وہیں پلی بڑھی، وہ پہلی بار پاکستان آئی ہے اور آتے ہی اُن کا خاندانی ہار چوری ہو گیا، جو کئی نسلوں سے اُن کے درمیان چلا آ رہا تھا۔ انہوں نے تھانے میں رپورٹ درج کروائی ہے اور تفتیش کے دوران ہمیں تمہارے بارے میں معلوم ہوا کہ تم اس وقت وہاں موجود تھے۔ اس طرح تم مشکوک ہو گئے، اسی وجہ سے تم یہاں ہو۔"
"بہت خوب، کہانی تو بہت اچھی ہے، مگر تم یہ بھول

گئے کہ مس عالیہ جب پہلی بار پاکستان آئی ہیں تو میں انہیں کس طرح جان سکتا ہوں اور اُن کا وہ خاندانی ہار کیسے کر چرا سکتا ہوں، بھلا تم بے وقوف، بڑے آئے عقلمند خان کہیں کے۔" ساحر نے اسے چڑاتے ہوئے ایک اور وضاحت دی۔

"دیکھ بھئی ساحر! یار اگر تُو سیدھی طرح سے اقبالِ جرم کر لے اور ہار کے بارے میں معلومات فراہم کر دے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تجھے مس عالیہ سے معافی دلوادوں گا۔" انسپکٹر نے خوشامد کی۔

"کیوں؟ وہ تیری خالہ کی بیٹی ہے کہ تُو مجھے اس سے معافی دلوادے گا اور رہی بات اقبالِ جرم کی تو میں نے یہ چوری نہیں کی اور تم جو کرنا چاہو کرو۔ مجھے کوئی شوق نہیں ہے کہ جان بوجھ کر ناکردہ جرم قبول کرلوں۔" اُس نے خاصے غصے میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ تُو سیدھی طرح سے نہیں مانے گا تو ایسے ہی سہی، آخر کسی نہ کسی طرح تو گھی نکالنا ہی ہے۔" انسپکٹر نے انگلیاں ٹیڑھی کرتے ہوئے کہا۔

"ہوشیار خان اسے کھولو اور لگاؤ دو چار، تا کہ اس کا دماغ ٹھکانے آسکے۔ یہ ہر دفعہ نکلتا ہے، لیکن آج دیکھتا ہوں میں اسے کون بچاتا ہے، اگلا پچھلا سارا حساب سے پاک کردوں گا۔" انسپکٹر پُرجلال لہجے میں دھاڑا۔

حوالدار نے اُسے کھول دیا اور نہایت تیزی سے "خاطرداری" کی تیاری کرنے لگا۔

"ٹھہریے! اس کی ضرورت نہیں ہے۔" ایک دل کش اور مترنم نسوانی آواز نے حوالدار کے قدموں کو بریک لگادیے، جبکہ ساحر اور انسپکٹر حیرانگی سے پلٹ کر دیکھنے لگے۔

دروازے میں ایک قدرے سانولے سے رنگ کی مگر پُرکشش لڑکی کھڑی تھی، جبکہ اُس کے ساتھ دو اور آدمی بھی تھے، جو حلیے سے ملازم لگتے تھے۔ انہوں نے ایک اور آدمی کو پکڑ رکھا تھا۔ انسپکٹر جلدی سے آگے بڑھا۔

"آیئے مس آمنہ..... کیسے آنا ہوا اور یہ کسے پکڑ کر لایا گیا ہے؟"

لڑکی پھر گویا ہوئی۔ "دراصل یہی اصل چور ہے، یہ گھر کا ملازم ہے، صبح یہ ہار گھر سے لے کر جاتے ہوئے پکڑا گیا، میں اسے آپ کے حوالے کرنے آئی ہوں۔ مس عالیہ مصروف تھیں ورنہ وہ خود آتیں۔ خیر آپ انہیں چھوڑ دیں کیوں کہ یہ بے قصور ہیں۔" اُس نے ساحر کی طرف اشارہ کیا۔

"اور اس مردود کو پکڑ لیں" اگر مزید کوئی بات پوچھنا ہو تو ٹیلی فون پر مس عالیہ سے بات کریں۔

"نہیں نہیں..... اس کی ضرورت نہیں پڑے گی، آپ اسے یہاں چھوڑ جائیں باقی میں خود ہی دیکھ لوں گا۔" انسپکٹر جلدی سے بولا۔

"ٹھیک ہے، میں اب چلتی ہوں۔ لڑکی نے یہ کہا اور چلی گئی، جبکہ اُس کے ساتھ آئے ہوئے دو ملازم بھی اُس تیسرے شخص کو، جو اصل مجرم تھا وہاں چھوڑ کر چلے گئے۔"

انسپکٹر کے سر پر گویا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا، وہ ایک عرصے سے ساحر کو حوالات میں بند کرنے کا خواہش مند تھا، لیکن کئی بار اسی طرح ناکام ہو چکا تھا۔ اُس نے بے دلی سے ساحر کو جانے کی اجازت دی۔

"بھئی عقلمند خان! تم مزید کچھ دن تک عقل کے جوتے کھاؤ، میں مرہم لے کر پھر کسی دن آؤں گا۔" ساحر نے جاتے جاتے بھی اُسے نہیں بخشا۔

"نکل جا یہاں سے فوراً۔" انسپکٹر دھاڑا اور وہ مسکراتا ہوا باہر چلا گیا۔

تھانے کی عمارت سے باہر آ کر ساحر ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کدھر جائے؟ کہ اُسے وہی دل کش اور مترنم سی آواز سنائی دی۔

"ایکسکیوزمی! مجھے بہت افسوس ہے مسٹر ساحر! وہ کیا ہے کہ....."

"بس بس پہلے تو آپ یہ بتائیں کہ آپ ہیں کون؟ اور یہ کیا حرکت تھی؟" اُس نے لڑکی کی بات درمیان سے کاٹ ڈالی۔

"میں نے کہا نا کہ سوری۔ میں مس عالیہ کی سیکریٹری ہوں، بلکہ اُن کی سہیلی بھی ہوں، آمنہ نام ہے میرا۔"

"ٹھیک ہے جو ہونا تھا سو ہو چکا، آپ جا سکتی ہیں۔" اُس نے اُکتاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

"چلی جاؤں گی مگر مجھے آپ سے ایک بات کرنا تھی۔" آمنہ بدستور گفتگو پر آمادہ تھی۔

"برائے مہربانی جائیں آپ، مجھے آپ سے کوئی

بات نہیں کرنی، مجھے مزید پریشان نہ کریں تو بہتر ہوگا۔" اُس کی اکتاہٹ عروج پر تھی۔

"لگتا ہے کافی ناراض ہیں آپ؟" بڑی اپنائیت سے پوچھا گیا۔

"اور نہیں تو کیا پٹاخے پھوڑوں؟ جانتی ہیں مجھے کتنی بے عزتی محسوس ہوئی ہے۔ آپ نہیں جانتیں میں اس معاملے میں کتنا احساس واقع ہوا ہوں۔" وہ طنز کو نہ روک سکا۔

"اچھا! چلیں میں اس کی کچھ تلافی کر دیتی ہوں۔ کیا آپ میرے ساتھ ایک کپ کافی پینا پسند کریں گے؟" آمنہ کا انداز بڑا پُرخلوص تھا۔

"تاکہ آپ مجھے کہیں اور پھنسوا سکیں؟ معاف کیجیے گا میں کسی اجنبی اور وہ بھی خاص کر لڑکی سے، زیادہ فری نہیں ہوتا۔ پوری طرح ریزرو ہوں میں۔

"جو کچھ ہوا ہے کیا آپ اُسے بھول نہیں سکتے؟ اور پھر میں نے سوری بھی تو کیا ہے، اتنی بھی خود پرستی اچھی چیز نہیں۔" وہ ایک دم چلا اُٹھی۔

"ٹھیک ہے میں نے آپ کو معاف کیا۔" وہ جلدی سے بولا، کیوں کہ اُسے لگا کہ وہ روہانسی ہو چلی ہے اور اب تو لوگ بھی اُنہیں مُڑ مُڑ کر دیکھنے لگے تھے۔

"چلیں شکر ہے آپ نے ہمیں معاف تو کیا، لیکن کافی کی آفر کا آپ نے جواب نہیں دیا۔" آمنہ نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"آخر آپ مجھے کافی پلانے پر بضد کیوں ہیں اور وہ بھی کس تعلق سے؟" وہ بھی ہار ماننے والا نہ تھا۔

"تعلق تو تبھی بنے گا نا جب آپ میرے ساتھ چلیں گے، رہی بات یہ کہ میں آپ کو کافی کی آفر کیوں کر رہی ہوں، تو اس کی ایک وجہ ہے۔" آمنہ نے اس وقت کھلنا مناسب نہ سمجھا۔

"اگر آپ مجھے وجہ بتا دیں تو شاید میں آپ کے ساتھ چل سکوں۔"

"چلیں بتا دیتے ہیں۔ آپ فاخرہ کو بھولے تو نہیں ہیں؟" سوال ہوا لیکن یہ سوال نہ تھا۔ یہ تو پھٹتا ہوا آتش فشاں تھا جو ساحر کے حواس پر آ گرا تھا۔ وہ اسے کیسے بھول سکتا تھا۔ کوئی بھلا اپنی زندگی کو بھی بھول سکتا ہے، لیکن ایک اجنبی کے منہ سے اُس کے بارے میں سوال

سُن کر وہ دم بخود رہ گیا۔ وہ اس سوال کا فوری طور پر کوئی جواب نہ دے سکا۔ مارے حیرت کے اُس کا منہ کھلا ہوا تھا اور وہ آنکھیں پھاڑے آمنہ کو تکے جا رہا تھا۔

"میرا خیال ہے آپ یقیناً فاخرہ کو نہیں بھولے ہوں گے۔" آمنہ نے اپنا سوال دہرایا۔

"آ...... آپ...... اُسے کیسے...... جانتی ہیں؟ اور...... اور یہ سوال آپ نے کیوں کیا؟ آپ کو میرے بارے میں کس نے بتایا؟ کیا...... فاخرہ نے؟ کیا وہ زندہ ہے؟"

وہ ٹوٹے پھوٹے لہجے میں سوال پہ سوال کیے جا رہا تھا۔

اب حیران ہونے کی باری آمنہ کی تھی۔ اُسے ساحر کے اس انداز نے لمحوں میں ہی یہ احساس دلا دیا تھا کہ فاخرہ ساحر کی زندگی میں ایک نہایت بلند حیثیت رکھتی ہے۔

"آپ کچھ بول نہیں رہیں، آپ مجھے کچھ تو بتائیں۔ اس کی خاموشی پر ساحر بے چین تھا۔

"اگر آپ سب کچھ آرام سے جاننا چاہتے ہیں اور وہ بھی پوری تفصیل کے ساتھ تو آپ کو میرے ساتھ ایک کپ کافی پینا پڑے گی۔" وہ اب بھی اپنی ضد پر قائم تھی۔

"مجھے لگتا ہے آپ مجھے چیٹ کر رہی ہیں، اپنی ضد پوری کرنے کے لیے، یہی کافی وغیرہ کا چکر چلا کر۔" ساحر آمنہ کی باتوں سے مطمئن نہ تھا۔

"جی نہیں...... میرا ایسا کوئی پلان نہیں ہے اور مجھے کسی کے جذبات سے کھیلنے کا کوئی شوق بھی نہیں ہے، آپ فاخرہ کو جنون کی حد سے زیادہ چاہتے تھے، بلکہ چاہتے ہیں، اس لیے میں اُسی کا نام لے کر آپ کو فریب نہیں دے سکتی اور یہ کہ محض چند منٹ کے لیے میں کسی کے دل سے کھیلنے والا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتی۔ شاید آپ مجھے غلط سمجھے ہیں، اگر آپ میری بات کی تفصیل جاننا چاہتے ہیں تو آرام سے آپ کو میری بات سننا ہوگی اور ظاہر ہے یہ بات میں آپ کو یہاں کھڑے ہو کر تو نہیں بتا سکتی۔" آمنہ نے حقیقت سے پُر ایک لمبی وضاحت کر دی، پھر ساحر نے بھی گہرائی میں جا کر سوچا اور بولا۔

"ٹھیک ہے میں آپ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں۔"

"چلیں پھر آئیں، آپ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا یہاں قریب ہی میرا گھر ہے، ہم وہاں چلیں گے، باقی باتیں بھی وہیں ہوں گی۔"

وہ چپ چاپ اُس کے ساتھ چل دیا۔ پارکنگ ایریا میں آمنہ کی گاڑی کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ آتے ہوئے دو دو ملازم کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ اُس نے اُن کے بارے میں پوچھنا چاہا، لیکن پھر خاموش ہی رہا، کیوں کہ اُن سے زیادہ اُسے فاخرہ کے متعلق جاننے کی جلدی تھی۔ اسی لیے وہ خاموشی سے آمنہ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا اور گاڑی سڑک پر فراٹے بھرنے لگی، آمنہ نے مزید اُس سے کوئی بات نہ کی، جبکہ وہ اپنے ماضی میں ڈوب گیا۔

☆......☆

ساحر وجدان نے ایک متوسط گھرانے میں آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالنے پر خوشیوں کو اپنے اردگرد رقص کرتے پایا۔ اُس کے والد وجدان احمد ایک فرم میں اچھے عہدے پر فائض تھے۔ اُن کی تنخواہ معقول تھی، جس سے اُن کی گزر بسر آسانی سے ہوتی تھی، وہ تھے ہی کتنے نفوس۔ ساحر، نیلم (ساحر کی بڑی بہن)، اُس کے والدین اور فاخرہ، اُس کی چچازاد کزن۔ وہ اُن کے ساتھ ہی رہتی تھی، کیوں کہ اُس کے والدین کا ایک کار ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو چکا تھا۔ اُس وقت فاخرہ محض تین سال کی تھی۔ اس کے علاوہ اُن کا کوئی قریبی رشتے دار نہ تھا۔ ساحر کی والدہ فضیلہ بیگم اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھیں۔ شادی کے محض ایک سال بعد ہی اُن کے والد اور والدہ آگے پیچھے اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ اسی طرح ساحر کے والد بھی بس دو بھائی ہی تھے۔ ساحر کے دادا، دادی بھی وفات پا چکے تھے، جبکہ چچا فرقان احمد اور چچی بھی دنیا سے منہ موڑ چکے تھے۔ قریب کا کوئی رشتے دار نہ تھا، جو چند ایک تھے وہ دور پرے کے رشتے دار تھے۔ اُن کی دنیا رشتوں اور تعلقات کے حوالے سے چھوٹی سی تھی، مگر اس پر وہ سب خوش اور شاکر تھے کہ بعض اوقات لمبی رشتے داریاں اور تعلقات کئی مسائل کو بھی جنم دیتے ہیں اور نہیں تو آئے دن خرچے وغیرہ کا باعث بنتے ہیں۔ کبھی کسی کی شادی ہے، کبھی منگنی اور کبھی برتھ ڈے وغیرہ۔ بہر حال ہر کسی کو اپنا اپنا نظریہ ہوتا ہے، کچھ کے نزدیک ایسی محفلیں اور رشتے داریاں ہی سب کچھ ہوتی ہیں۔

ساحر شروع سے ہی فاخرہ کا دیوانہ تھا اور فاخرہ بھی اُسے بہت عزیز رکھتی تھی، اس کے علاوہ ہم عمر کزن ہونے کی وجہ سے بھی دونوں میں خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ ساحر کے والدین نے بچپن میں ہی دونوں کو ایک دوسرے سے منسوب کر دیا تھا، کیوں کہ انہوں نے اُن دونوں کی بچپن کی چاہت کو ہی جوانی کے دنوں کی اساس تصور کیا تھا اور اس میں وہ حق بجانب بھی تھے، کیوں کہ ساحر اور فاخرہ ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ اکٹھے اسکول جانا، اکٹھے کھیلنا، اکٹھے ہوم ورک وغیرہ کرنا، کہیں آنا جانا ہوتو بھی ایک ساتھ۔ غرض ہر جگہ دونوں ایک ساتھ نظر آتے تھے۔ ساحر ہر مقام پر فاخرہ کا اس طرح خیال رکھتا تھا جیسے وہ کوئی کانچ کی گڑیا ہے۔ خاص کر وہ فاخرہ کے ساتھ کسی بھی قسم کی بدتمیزی برداشت نہیں کرتا تھا اور وہ اس معاملے میں خاصا تشدد پسند واقع ہوا تھا۔

ایک بار اسکول میں یہ ہوا کہ کسی بچے نے فاخرہ کی یونیفارم پر روشنائی گرا دی۔ ساحر نے جی بھر کے اُس کی دھلائی کی، پریڈ خالی تھا، بات میڈم تک پہنچ گئی اور وہ کلاس روم میں آ کر ساحر سے باز پرس کرنے لگیں۔

''ساحر بیٹا! فاخرہ کیا دوسری دنیا کی مخلوق ہے؟ اگر اس پر کسی نے روشنائی گرا دی تو کیا قیامت آ گئی تھی؟ اُس کی یونیفارم پر لگے دھبے منٹوں میں صاف ہو سکتے تھے اور دیکھو تم نے واجد کو کتنی بے دردی سے مارا ہے۔ تمہیں اس طرح سے نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' اور جواب میں ساحر نے اپنے سامنے کھڑی میڈم پر آنکھیں جما کر کہا تھا۔

''ہاں قیامت ہی آئی ہے، وہ میری کزن ہے، میری فاخرہ ہے، میرا فخر ہے اس لیے میں اُس کے ساتھ بھی کسی قسم کی بدتمیزی برداشت نہیں کر سکتا اور جو بھی ایسا کرے گا، اُس کا یہی حال ہوگا۔''

''ہوں......'' میڈم صرف اتنا ہی کہہ سکی تھیں اور جلدی سے کلاس روم سے نکل گئی تھیں، کیوں کہ وہ ساحر کی آنکھوں کی تاب نہ لا سکی تھیں۔

ساحر واقعی ایک ساحر تھا، اُس کی گہری سبز آنکھوں میں جھانکنے کی کسی میں بھی ہمت نہ تھی۔ عجیب کشش اور چمک تھی اُس کی آنکھوں میں اور اس وقت میڈم کے ساتھ بھی شاید کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

دوسرے دن ساحر کو جی بھر کے پاپا کی ڈانٹ کھانا پڑی، کیوں کہ میڈم نے انہیں اسکول بلوا کر ساری

رپورٹ فراہم کی تھی اور کہا تھا کہ اس دفعہ تو ساحر کو چھوڑا دیا جاتا ہے، مگر آئندہ ایسی کوئی حرکت برداشت نہیں ہوگی۔ آپ اس کو سمجھائیں، وہ اب بچہ نہیں ہے، چھٹی کلاس کا طالب علم ہے۔ لیکن اس نے پاپا کو بھی وہی جواب دیا تھا جو اس سے پہلے وہ میڈم کو دے چکا تھا۔ جدان احمد حیران ہی تو رہ گئے تھے، اس کا جواب سن کر یہی سب کچھ دیکھ کر ہی تو ان دونوں کو ایک دوسرے سے منسوب کیا گیا تھا اور پھر جدان احمد کا ایک خیال یہ بھی تھا کہ گھر کی عزت گھر میں ہی رہے تو اچھا ہے۔ ساحر اُسے کبھی کوئی دُکھ نہیں دے گا، شاید اسی طرح وہ قیامت کے دن اپنے بھائی کے آگے سرخرو ہو جائیں۔

وقت پَر لگا کر اڑا اور وہ دونوں میٹرک میں پہنچ گئے تھے۔

اب فاخرہ اکیلے میں اور خاص کر اسکول میں ساحر سے دور دور رہتی تھی، کیوں کہ وہ شرم و حیا کے ہاتھوں مجبور تھی، مگر ساحر یہ جانتے ہوئے بھی کہ پورا اسکول اُن کی نسبت سے آگاہ ہے، بھری کلاس روم میں فاخرہ کو تنگ کرنے سے باز نہیں آتا تھا، وہ تھا ہی ایسا چلبلا، بے حد خوش اور شریر۔ شوخی تو گویا اس کی ذات میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، اس پر اس کی مردانہ وجاہت، سونے پر سہاگے کا کام کرتی تھی۔ وہ اسکول کا سب سے ذہین طالب علم تھا۔ تمام نصابی اور غیر نصابی سرگرمیاں اس کے دم قدم سے ہوتی تھیں، کتنے ہی دل تھے جو اس پر مرتے تھے، مگر اسے فاخرہ کے سوا کوئی دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ یہ سال بھی گزر گیا اور وہ دن بھی آ گیا، جب اُن کا رزلٹ آنا تھا۔

فاخرہ بے چینی سے ساحر کا انتظار کر رہی تھی، کیوں کہ وہ رزلٹ معلوم کرنے گیا ہوا تھا۔ وہ اس وقت ڈرائنگ روم میں تھی اور مسلسل اِدھر سے اُدھر ٹہل رہی تھی۔ نیلم بھی اس کے قریب ہی ایک صوفے پر نیم دراز کوئی میگزین دیکھ رہی تھی۔ اس نے بی ایڈ کر لیا تھا اور مزید تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ کہیں نوکری کا ارادہ بھی رکھتی تھی، لیکن فی الحال وہ فارغ تھی۔ اس نے فاخرہ کو بے چینی سے ٹہلتے ہوئے دیکھا تو اس سے رہا نہ گیا۔

''فاخرہ! تم آرام سے بیٹھ کر بھی انتظار کر سکتی ہو، کیا ٹہلنے سے بے چینی کم ہو جاتی ہے؟''

''ارے باجی! میں نے..... کب کہا؟ میں تو بس یونہی، ارے ہاں..... یاد آیا..... آپ خود بھی تو ایسے ہی انتظار کرتی تھیں، اب مجھے کیوں منع کر رہی ہیں؟''

''اسی لیے تو میں نے تم کو مشورہ دیا ہے، بھئی تجربہ بھی کوئی چیز ہوتی ہے، کیوں کہ مابدولت ایسے مرحلوں سے کئی بار گزر چکے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ تھوڑا مغرور ہو گئی تھی۔

''ذرّہ نوازی ہے حضور کی، ورنہ غلام اس قابل کہاں.....'' فاخرہ کا جواب سن کر وہ ہنس دی۔

''چلو ٹی وی لاؤنج میں چلتے ہیں، تمہارا دھیان بھی بٹ جائے گا۔'' اچھا مشورہ تھا، اس لیے وہ رد نہ کر سکی۔

''لیکن کیا کافی ملے گی؟''

اِس عنایت کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔'' نیلم مسکراتی ہوئی کچن کی جانب چل دی اور وہ ٹی وی لاؤنج میں آ کر ٹی وی کھول کر بیٹھ گئی۔

نیلم ابھی کافی لے کر آئی ہی تھی کہ ساحر آ گیا۔

''بھئی واہ مزا آ گیا۔ کیا رزلٹ آیا ہے۔''

''کیا ہوا؟'' دونوں بیک وقت بولیں۔

''جناب اچھے اچھے رہ گئے اور، نہلے دہلے آگے نکل گئے ہیں یعنی پاس ہو گئے ہیں۔ کیا میں پاس ہو گئی ہوں؟ گریڈ کیا ہے میرا؟'' اس کی پریشانی عروج پر تھی۔

''ارے تم کیوں ایسے سوالات کر رہی ہو، تمہارا شمار تو پوزیشن ہولڈرز میں ہوتا ہے۔'' نیلم نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''باجی! وہ خود ہی تو بول رہا ہے کہ اچھے اچھے اسٹوڈنٹ بھی فیل ہو گئے ہیں اور..... تم بولتے کیوں نہیں..... میں پاس ہو گئی ہوں نا؟'' فاخرہ نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

''ویسے میرے بارے میں کیا خیال ہے حضور کا۔ اپنی بڑی فکر ہے، ہم سفر کا کوئی خیال ہی نہیں، کوئی فکر ہی نہیں ہے اس کو۔'' وہ مزے لے رہا تھا۔ نیلم نے اُسے گھورا، لیکن اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ اُبھرا، البتہ اُس کی شوخ مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔

''تم جاؤ بھاڑ میں، میری جان پر بنی ہوئی ہے اور تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے، آخر۔ تم بتا کیوں نہیں دیتے؟'' وہ چیخ پڑی تھی۔

''جاؤ نہیں بتاتا۔ بھئی کیوں بتاؤں، مٹھائی یا پھر منہ میٹھا کرنے کے لیے کوئی چیز بھی نہیں ہے اور سونے پہ

سہاگہ یہ کہ باتیں بھی جلی کٹی آزاد ہو رہی ہیں محترمہ کے حلق سے۔" اس کی شوخی عروج پر تھی۔

"ساحر! یہ کیا ہو رہا ہے؟" نیلم نے دخل اندازی کی۔

"تھوڑی دیر برداشت کریں، ایسے مواقع بار بار نہیں آتے۔ اک عرصے بعد مجھے چانس ملا ہے اسے تنگ کرنے کا، اس سے اپنی بات منوانے کا۔" وہ شوخی سے فاخرہ کو گھور رہا تھا۔

"تم بہت ضدی ہو۔" "بولو کیا چاہیے تمہیں؟" فاخرہ نے گویا ہار مان لی تھی۔

"ارے کیسے بولوں۔ سامنے باجی بیٹھی ہوئی ہیں، کچھ لحاظ تو کرنا پڑے گا نا۔ کیوں کہ مجھے شرم۔" اس نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

"ساحر کے بچے! بہت ہوگیا۔" نیلم نے اُس پر کشن کھینچ مارا۔ "دیکھو بھی، پاپا گھر پر نہیں ہیں، تم اس چیز کا زیادہ فائدہ نہ ہی اُٹھاؤ تو بہتر ہے، ورنہ بعد میں جو جھاڑ تمہیں پلائیں گے اور پاپا کے اخلاقیات پر خوب صورت الفاظ سے مزین لیکچر جو تمہیں سننے کو ملیں گے تو کیا مزا آئے گا۔" ساحر نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"واہ! مزہ آ جائے گا بچو۔ تم ایک دفعہ آنے تو دو انہیں، طبیعت صاف نہ کروائی تو نیلم وجدان نام نہیں میرا۔" اُس کا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ ساری شوخی چھومنتر ہوگئی۔ یوں تو وہ ہر کسی سے فری تھا، لیکن والدین؟ خاص کر پاپا؟ اگر اُن تک رپورٹ پہنچی تو بہت بُرا ہوگا۔ ایسا ہوا تو پاپا کبھی بھی معاف نہیں کریں گے۔ لیکچر سننے کو ضرور ملے گا، یہ الگ بات ہے کہ دو چار منٹ کا ہو۔ لیکن...... لیکن سب کے سامنے عزت جو ہوگی، یہ بات کچھ ٹھیک نہیں ہے، نیلم باجی بھی اپنے نام کی ایک ہی ہیں، جو کہا ہے کہ دکھائیں گی۔ یہ ساری باتیں لمحوں میں اس کے ذہن سے ہو کر گزر گئیں، اُس نے مزید تاخیر نہ کی اور رزلٹ سنا دیا۔ ساحر ہمیشہ کی طرح ٹاپ کر گیا تھا، جبکہ فاخرہ نے بھی اپنی کلاس کی تیسری پوزیشن برقرار رکھی تھی۔

دن اسی طرح گزرتے رہے اور وہ دونوں ایف اے کلیئر کر گئے، دونوں نے ایف ایس سی کیا تھا نان میڈیکل میں، کیوں کہ قابل ہونے کے باوجود بھی دونوں سرجری کی فیلڈ میں نہیں جانا چاہتے تھے۔ اس لیے کہ دونوں کو چیر پھاڑ سے نفرت تھی اور دونوں کو ہی بزنس فیلڈ میں گھسنے کا شوق تھا، اسی لیے یہ دونوں ایم بی اے کا ارادہ رکھتے تھے، لہٰذا اب دونوں کا ارادہ بی ایس سی یا پھر بی کام کرنے کا تھا، لیکن ابھی ایڈیشن اوپن نہیں ہوئے تھے، لہٰذا فارغ گھر میں بیٹھے ہوئے تھے۔

وجدان احمد تو چاہتے تھے کہ دونوں میڈیکل کی فیلڈ میں جاتے، لیکن جب وہ دونوں تیار نہ ہوئے تو وجدان احمد نے بھی اصرار نہ کیا اور دونوں کو اپنی مرضی سے تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دے دی، اسی لیے وہ اتنے کامیاب رہے تھے، کیوں کہ بعض اوقات کسی پر اپنی مرضی آپ مسلط تو کر سکتے ہیں، لیکن پھر اس سے اچھے نتائج حاصل نہیں کر سکتے۔

فاخرہ چھت پر کھڑی غروبِ آفتاب کے منظر سے لطف اندوز ہو رہی تھی، جب اُسے اپنے عقب میں آہٹ محسوس ہوئی، اُس نے پلٹ کر دیکھا تو ساحر اپنی دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ اُس کی توجہ کا منتظر تھا۔

"میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں! بولو، کیا کہنا چاہتے ہو۔" اُس نے ساحر کی حوصلہ افزائی کی۔

"میں پوچھنا چاہتا تھا کہ اب آگے کیا ارادہ ہے؟"

"ارے بھئی ظاہر ہے یونیورسٹی میں داخلہ حاصل کرنا اور باقی پلاننگ بھی تم جانتے ہو۔" اُس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"ہوں۔ میں جانتا ہوں، لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم یونیورسٹی کی بجائے کسی گرلز کالج میں ایڈمیشن لے لو۔ ساحر نے اصل بات کہہ ڈالی۔"

"کیا؟ گرلز کالج میں ایڈمیشن، لیکن کیوں؟ تمہارا یونیورسٹی اکیلے جانے کا ارادہ ہے کیا؟ ایسا میں ہرگز نہیں ہونے دوں گی، تم وہاں اتنی لڑکیوں کے درمیان...... مجھ سے دور، ہرگز نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا، ہم جہاں جائیں گے ایک ساتھ جائیں گے۔ یہ بات بچپن سے ہمارے درمیان طے ہو چکی ہے، یاد ہے نا؟ کیا بات ہے؟ لگتا ہے تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔ اصل بات بتاؤ مجھے۔" فاخرہ نے اسے گھورتے ہوئے کئی سوال کر ڈالے۔

"فاخرہ! تم...... تم خود سوچو...... کالج کا وہ ماحول وہ

آزادی کتنے پُرلطف تھے وہ دن اور یونیورسٹی تو اُس سے بھی...... کئی گنا آگے ہے...... کہیں میں تمہیں...... کھو نہ دوں۔" اُس نے اٹک اٹک کر اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔

"کیا؟ تم یہ سب کچھ کہہ رہے ہو...... ساحر...... تم...... مجھے یقین نہیں آ رہا۔ آہ! گویا تمہیں میرے اوپر اعتماد نہیں ہے، میری برسوں کی وفاؤں کا یہ صلہ؟ تمہارا دل مطمئن نہیں ہے...... ارے پہلے بھی ماحول ایسا ہی تھا، میں پہلے کیوں نہ بہک گئی، کالج کے اندر کون سی پابندی تھی۔ میں نے قدم قدم پر تمہارا ساتھ دیا، لیکن آج تم نے میرا سارا مان سمان توڑ دیا۔ اپنا سب کچھ تو تمہیں سونپ دیا ہے میں نے، میرے ہونٹ گواہ ہیں...... اس بات کے، مگر تم۔" اُس کی آواز بھیگ گئی اور مزید بولنا اس کے لیے ممکن نہ رہا۔ آنسو اُس کی آنکھوں سے مون سون کی طرح برس رہے تھے۔ اُسے روتا دیکھ کر ساحر کو یوں لگا کہ جیسے اُس کے دل کو کسی نے اپنی مٹھی میں لے کر بھینچنا شروع کر دیا ہو۔ اسے اپنی دھڑکن رُکتی ہوئی لگی تھی۔

"دیکھو فاخرہ! میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا، میں نے تو اپنا اِک خدشہ ظاہر کیا تھا۔ میں خود بھی یونیورسٹی جوائن نہیں کروں گا، مجھے خود بھی تمہارے بغیر وہاں۔"

"چپ ہو جاؤ۔ چلے جاؤ یہاں سے، تم مجھے برسوں میں نہ سمجھ سکے تو اب کیا سمجھو گے اور کیا سمجھاؤ گے؟" اس کی بات کاٹتے ہوئے وہ چیخ ہی تو پڑی تھی۔

فاخرہ نے اُسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اُسے اپنا ارد گرد چکراتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ ابھی سے دلوں میں بے اعتمادی کا بیج نہیں بو سکتا تھا، اسی لیے وہ آگے بڑھا۔

"فاخرہ! محبت بازاروں میں نہیں بکتی کہ جب دل چاہا خرید لی۔ یا اگر ایک محبت گم ہو جائے یا چھن جائے تو دوسری حاصل کر لی۔ اس کا راج تو دلوں پر ہوتا ہے نا جانے کتنی ریاضتوں اور عبادتوں کے بعد ہم پر یہ بھید کھلتا ہے کہ کوئی تو ایسا ہے جو ہمیں ٹوٹ کر چاہتا ہے۔ اس کے دل کی دھڑکن ہمارے دل کی حرکت سے پیدا ہوتی ہے۔ جس کی سانسیں ہماری زندگی سے وابستہ ہیں۔ کوئی تو ہے جو ہماری خاطر سب کچھ کر سکتا ہے، اس پوری دنیا سے ٹکر لے سکتا ہے، اِک عرصے تک عہد و پیمان ہوتے ہیں، وعدے وعید کیے جاتے ہیں، قسمیں کھائی جاتی ہیں تب کہیں جا کر یقین آتا ہے کہ ہاں یہی وہ شخص ہے جسے چاہا جا سکتا ہے اور میرے لیے وہ شخص...... تم ہو فاخرہ! ہاں تم...... صرف تم...... لیکن تمہیں کھو دینے کا ڈر بھی ہمیشہ ساتھ رہتا ہے نا...... میں تمہیں کھو نہیں سکتا۔ کسی بھی قیمت پر یہ ممکن نہیں، جانتی ہو۔ تمہیں کھونے کا احساس ہی میری روح کو کھینچ لیتا ہے۔ مجھے اپنی دھڑکن رُکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے میں نے، بس اسی خدشے کو...... نہیں شاید مجھے یہ بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔ مجھے معاف کر دو فاخرہ۔ مجھے معاف کر دو۔ کہہ دو کہ تم نے مجھے معاف کیا، کہہ دو فاخرہ! ورنہ میں جی نہ سکوں گا...... جی نہ......" وہ اُس کے سامنے گھٹنوں کے بل نیچے بیٹھ گیا۔

وہ ایک دم پیچھے ہٹی۔

"ساحر! یہ تم۔ کیا کر رہے ہو؟" ساحر رو رہا تھا۔ وہ گنگ سی ہو گئی اور اپنا رونا دھونا بھول کر وہ آگے بڑھی، ساحر کو کندھوں سے پکڑ کر اوپر تو اٹھایا اور بولی۔

"ساحر مجھے معاف کر دو۔ میں نے صرف اپنی وفاؤں، اپنی چاہت اور اپنے بارے میں سوچا اور تمہاری محبت کا احساس نہ کیا، تمہاری بات پر غور نہیں کیا کہ تم یہ سب کیوں کہہ رہے ہو، تمہاری بات تحمل سے سُننا گوارا ہی نہ کی۔"

"تو...... گویا تم نے مجھے معاف کر دیا۔" وہ تیزی سے بولا۔

"کیسی باتیں کرتے ہو، میں ناراض ہی کب تھی تم سے؟ ہاں دُکھ ضرور ہوا ہے تمہاری بات سے، لیکن تم تو ہو ہی ایسے۔ ہمیشہ میری ذات کے معاملے میں کمزور پڑ جاتے ہو۔ گھبراؤ نہیں، کہیں نہیں جاؤں گی میں۔ تمہیں چھوڑ کر، بھول کر بھی نہیں، آئندہ ایسی کوئی بات مت کرنا اور...... پلیز بس کرو اب۔"

"کہا نا سوری، بابا غلطی ہو گئی اس بار معاف کر دو۔ بندہ اگلی دفعہ احتیاط برتے گا۔" ساحر نے اس کا لیکچر لمبا ہونے نہ دیا۔

"پھر سوری؟ ارے میں نے معاف کر دیا ہے نا، لیکن اگر دوبارہ ایسی بات کی تو میں، کہیں چلی جاؤں گی۔" اُسے دھمکایا گیا۔

"ارے اب میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گا۔" ساحر نے یہ کہتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر اُسے اپنے بازوؤں

کے حصار میں مقید کر لیا۔

"ارے، چھوڑو مجھے، یہ کیا کر رہے ہو ساحر...... نہیں پلیز...... دیکھو تم روز حد سے بڑھتے جا رہے ہو۔" وہ اس کے بازوؤں میں کسی پنچھی کی طرح مچل رہی تھی۔

"یہ تو سراسر جھوٹ ہے، الزام ہے مجھ پر، تقریباً سال ہو گیا ہے میں صرف ایک۔" اُس کی بات کسی وجہ سے ادھوری رہ گئی۔

"جی نہیں، میں سب کو، یہ بات بتا دوں گی۔" پھر دھمکی دی گئی۔

دیکھو تم ایک مشرقی لڑکی ہو، تم ہرگز ایسا نہیں کر سکتیں اور وہ بھی سب کے سامنے؟ لاج نہیں آئے گی تمہیں۔" ساحر کی شوخی واپس لوٹ آئی تھی، اس کے آنسو کہیں گم ہو گئے تھے اور پھر فاخرہ اپنے ہونٹوں کو اُس کی من مانی سے نہ بچا سکی۔ ایک ہفتے بعد وہ دونوں یونیورسٹی میں ایڈمیشن کے لیے داخل ہو رہے تھے۔

واپسی پر ساحر، فاخرہ کو ایک ریسٹورنٹ میں لے گیا، کافی وغیرہ کا آرڈر دے کر وہ فاخرہ کی جانب متوجہ ہوا۔

"ویسے کافی سندر لگ رہی ہو آج۔ ہائے! معلوم نہیں کب وہ دن آئے گا جب...... خیر رہنے دو۔" وہ جز بز سا ہو کر خاموش ہو گیا۔

"اے! سندر تو میں پہلے بھی تھی اور اب کیا سُرخاب کے پَر نکل آئے ہیں مجھ میں۔"

اس کا لہجہ خاصا کرارا تھا۔ "میں نے کب کہا ہے کہ سُرخاب کے پَر نکل آئے ہیں، بس دِل کی بات کہی تھی میں نے۔" اُس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"اور وہ "ہائے" کے بارے میں کیا خیال ہے؟ جناب اس کی وضاحت کرنا پسند فرمائیں گے۔" وہ دوبدو گفتگو پر آمادہ تھی۔ دراصل میں اُس دن کا سوچ رہا تھا، جس دِن ہماری شادی ہو گی۔ کتنا حسین دن ہو گا وہ، کتنا مزا آئے گا، پر معلوم نہیں کب وہ دن آئے گا۔ ساحر حسرت بھرے لہجے میں گویا ہوا۔

"فکر نہ کرو وہ دن بھی ضرور آئے گا، لیکن اس کے آنے میں ابھی کم از کم چھ سات سال باقی ہیں، لہٰذا تب تک، ایسے ہی دِل کو بہلایا کرو۔" فاخرہ نے اُسے ٹھینگا دکھا کر چڑاتے ہوئے کہا۔

بس اتنا یاد ہے

دُعا تو جانے کون سی تھی
ذہن میں نہیں
بس اِتنا یاد ہے
کہ دو ہتھیلیاں ملی ہوئی تھیں
جن میں ایک میری تھی
اور اِک تمہاری!

شاعر: پروین شاکر

"ہائیں! چھ سات سال۔ بھئی وہ کیسے؟" وہ حیرت زدہ تھا۔

"ارے میرے پیارے! بدھو منگیتر تعلیم مکمل کرنے، اور جاب وغیرہ سیٹ کرنے میں تمہیں اتنا عرصہ تو لگ ہی جائے گا۔" وہ اس کی حیرانگی انجوائے کر رہی تھی۔

"اور اگر میں چاہوں کہ وہ دن ذرا جلدی آ جائے تو؟" ساحر نے فاخرہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ پہلے تو حیا کی سُرخی فاخرہ کے چہرے پر کئی مناظر بکھیر گئی، پھر وہ ذرا سنبھلی اور جواب دینا چاہا، لیکن ویٹر کی آمد کی وجہ سے خاموش ہو گئی۔

"جواب نہیں ملا اس ناچیز کو۔" اس کی شوخی عود کر آ رہی تھی۔

"ایسا سوچو بھی مت، میرا ایسا مائنڈ بالکل نہیں ہے۔ بھئی تم تو ابھی مجھے چین سے رہنے نہیں دیتے، شادی کے بعد تو تم بالکل مجھے قید کر دو گے۔ مجھے اپنی آزادی کے یہ چند دن بہت عزیز ہیں مجھے۔" کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے فاخرہ نے سنجیدہ سا جواب دیا۔ اس کی بات سن کر ساحر کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ اس کی جادوگر آنکھوں کی چمک مزید بڑھ گئی، پھر وہ بھی سنجیدگی سے بولا۔

"لگتا ہے تم اُس دن کی بات ابھی بھولی نہیں ہو۔ شاید۔"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے، میں تو بس۔"

"چھوڑو، اب میری بات مت کاٹنا۔" ساحر نے

اس کی بات درمیان سے اُچک لی۔
تم کبھی بھی یہ نہ سوچنا کہ میں تم پر کوئی فضول قسم کی پابندی لگاؤں گا۔ پابندی ہوگی تو صرف اتنی کہ میری ذات کے حصار میں رہنا، مجھے ہر دم اپنا تصور کرنا، میری محبت کا حساس رکھنا، مجھ سے کیے ہوئے وعدوں کا پاس رکھنا اور ان سب سے بڑھ کر میری عزت کا خیال رکھنا ہمیشہ ہمیشہ۔ اس کے علاوہ مجھے کچھ نہیں چاہیے، بولو یہ سب کچھ کروگی، رہی بات انتظار کی تو رانجھے تو بارہ سال تک انتظار کر سکتے ہیں، سوال تو ہیر کی ثابت قدمی کا ہے۔''
''تم مجھے ہمیشہ ثابت قدم پاؤ گے۔'' یہ کہتے ہوئے فاخرہ نے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ دن اِسی طرح گزرتے رہے اور وہ دونوں فائنل ایئر میں پہنچ گئے۔ زندگی پُرسکون گزر رہی تھی، لیکن قسمت نے کروٹ بدلی اور اُن کی پُرسکون زندگی میں پہلا تلاطم پیدا ہوا۔
وجدان احمد پر یہ الزام لگا کہ انہوں نے فرم میں لاکھوں کا ہیر پھیر کیا ہے، یہ الزام اُن کے اپنے ہی ایک کولیگ نے لگایا تھا۔ وجدان احمد تھے تو بے گناہ، لیکن وہ اپنی بے گناہی ثابت نہ کر سکے اور تمام الزامات قبول کر لیے۔
جی ہاں! قبول کر لیے، کیوں کہ انہیں اپنی نیک نامی عزیز تھی، لہٰذا فرم کے کرتا دھرتا افراد سے اس معاملے کو منظرِ عام پر نہ لانے کی درخواست کی اور تمام جرمانہ ادا کرنے کی بھی حامی بھر لی۔ فرم والوں کو کیا چاہیے تھا، وہ فوراً اس پر راضی ہوگئے، مگر وجدان صاحب کو نوکری سے برخاست کر دیا گیا۔ ساحر سمیت سب گھر والوں نے اُن سے احتجاج کیا کہ جب بے گناہ ہو تو اپنا کیس لڑو، مگر وہ اس کے لیے راضی نہ ہوئے، کیوں کہ شبیر شاہ (کولیگ) نے اُن کے خلاف ایک نہایت مضبوط کیس بنایا تھا۔ اس نے نہ صرف گواہ پیش کیے تھے، بلکہ ثبوت بھی فراہم کر دیے تھے۔ یہ سب کیسے ہوا؟ وجدان احمد بیچارے اس سے بے خبر رہے۔ اصل میں ہیر پھیر شبیر شاہ نے کی تھی، مگر الزام اُن کے سر لگا دیا گیا تھا۔ وجدان صاحب کو احساس ہو گیا تھا، لیکن وہ یہ بات ثابت نہیں کر سکتے تھے، کیوں کہ شبیر شاہ نے آفس کے کچھ دیگر افراد کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ یوں وجدان صاحب نے چپ چاپ اپنے خون پسینے کی کمائی سے بنایا ہوا گھر بیچ کر فرم کو رقم ادا کر دی اور خود کرائے کے فلیٹ میں آ گئے۔
اُن کی جنت برباد ہو گئی تھی، کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ گھر بار سب بک گیا، جو جمع پونجی تھی، وہ بھی جھونک دی تھی، صرف اور صرف اپنی عزت کی خاطر، کیوں کہ ہمارا معاشرہ گدھوں کا معاشرہ ہے۔ جس طرح گدھ مُردار پر ٹوٹ پڑتے ہیں، اسی طرح ہمارے لوگ اس شخص کا گھیراؤ کرتے ہیں، جس کی عزت پر کوئی حرف آیا ہو، چاہے وہ بے گناہ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ معاشرہ اُسے مجرم بنا کر ہی دم لیتا ہے، وجدان احمد کو یہ سب کچھ گوارا نہیں تھا۔ وہ لوگوں کی باتوں اور طنز کا سامنا نہیں کر سکتے تھے، اسی لیے اپنا آپ بھی گروی رکھ کر اپنی عزت بچائی۔
کہتے ہیں کہ وقت سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے، شاید غلط کہا ہے کسی نے، کیوں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دُکھ مزید گہرا ہوتا جاتا ہے۔ شروع میں کئی لوگ آپ کا دُکھ بانٹتے ہیں، اگر آپ شیئر کریں تو، لیکن جوں جوں وقت گزرتا ہے دوسرے لوگ بھول جاتے ہیں، لیکن آپ نہیں بھولتے۔ آپ کو اکیلے ہی سب کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے، مگر آپ زندہ رہتے ہیں دوسروں کی خاطر، زندگی کی خاطر کیوں کہ زندگی کے دن تو پورے کرنا ہوتے ہیں نا اور زندہ رہنے کیلئے ضرور ہوتی ہے روٹی اور روٹی کا ٹھکانہ پیٹ ہوتا ہے جو کبھی بھی نہیں بھرتا، لہٰذا اسے بھرنے کے چکر میں آپ اپنا غم وقتی طور پر تو فراموش کر سکتے ہیں، لیکن بھول نہیں سکتے۔ جب بھی آپ کو تنہائی ملتی ہے، یہ آپ کو کسی آسیب کی طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ ایک ایسا آسیب جسے آپ چاہ کر بھی ظاہر نہیں کر سکتے اور نہ ہی اس سے پیچھا چھڑا سکتے ہیں۔ یہی سب کچھ ان کے ساتھ ہوا تھا۔ زندگی گزارنے کے لیے وہ لوگ پھر سے مصروفِ عمل ہوگئے تھے۔ وجدان احمد نے ایک اور جگہ پر جاب اختیار کر لی تھی اور نیلم نے بھی ایک کالج میں پروفیسر کے طور پر نوکری کر لی تھی، جبکہ ساحر اور فاخرہ کی روٹین لائف وہی تھی۔ دن گزرتے رہے اور وہ دونوں اپنے سالانہ امتحان سے فارغ ہوگئے۔ گھریلو حالات اب کافی خوش گوار تھے اور وہ سب پھر سے زندگی کی خوشیاں انجوائے کر رہے تھے اور آنے والے حالات سے بے خبر بھی تھے۔ قسمت نے

ایک بار پھر پلٹا کھایا اور ساحر کی زندگی ویران ہوگئی۔ شہر میں بم بلاسٹ ہوا تھا؟ جس میں اُس کے ممی، پاپا دونوں ملک عدم سدھار گئے تھے، جبکہ نیلم بُری طرح سے زخمی ہوئی تھی۔ وہ تینوں قریبی مارکیٹ میں گئے تھے۔ جمعے کا دن تھا اور جمعہ بازار میں اشیا، بار عایت مل جاتی ہیں۔ وہ بھی شاپنگ کرنے گئے تھے اور دھماکے کی نذر ہوگئے تھے۔ ساحر اور فاخرہ گھر پر ہی تھے، اُن کی تو دنیا ویران ہوگئی تھی۔ ممی، پاپا کی میتیں گھر پہنچ گئی تھیں، جبکہ نیلم اسپتال میں زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی تھی۔ ان دونوں کو اس کی کچھ خبر نہیں تھی، کیوں کہ وہ اپنے حواس میں ہی نہیں تھے۔ محلے داروں نے ہی تدفین وغیرہ کے انتظامات کیے تھے، لیکن پھر نیلم کی خاطر ان دونوں نے خود کو سنبھالا۔ اور اپنے اپنے آنسو پونچھ ڈالے، اس کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتے تھے، کیوں کہ انصاف تو اس ملک میں ملتا ہی نہیں ہے اور احتجاج کا کوئی فائدہ نہیں تھا، لہٰذا یہ سب کچھ کرنے کی بجائے جو بچ گئے ہیں، اُن کو سنبھالنا زیادہ بہتر ہے۔ وہ بھی نیلم کو سنبھالنے میں لگ گئے۔ نیلم بُری طرح سے جل چکی تھی اور اس کا بچنا ناممکن نظر آ رہا تھا، لیکن وہ دونوں پُر امید تھے اور ڈاکٹروں کو پوری کوشش کرنے پر مجبور کر رہے تھے اور خدا کے حضور بھی دعا گو تھے، لیکن اُن کی دعائیں اور کوششیں رائگاں گئیں، نیلم بھی ایک ماہ بعد انہیں روتا بلکتا چھوڑ کر چلی گئی۔ محلے کے ہر فرد کی آنکھ اشکبار تھی۔ کسی سے بھی اُن کا رونا دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ سب صبر کی تلقین کر رہے تھے، لیکن وہ خود بھی اس سانحے پر رو رہے تھے ایسا ہی ہوتا ہے، مگر اُن کے دلوں کی حالت کیا ہے؟ یہ کون جان سکتا تھا۔ جس پر پڑتی ہے وہی جانتا ہے، دوسرے تو صرف احساس کر سکتے ہیں، تصور کر سکتے ہیں اور بس......

وہ دونوں گم صم ہو کر رہ گئے تھے، مگر کب تک؟ پیٹ پھر بلکنے لگا تھا۔ وہ پھر روٹی مانگ رہا تھا، لیکن وہ دونوں خالی ہاتھ تھے اور گھر میں بھی کچھ نہیں تھا، لہٰذا نوکری کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، سو دونوں ہی شہر کی سڑکیں ناپنے نکل کھڑے ہوئے، آخر ڈیڑھ ماہ کی کوششوں کے بعد دونوں کو ایک فرم میں ملازمت مل گئی۔ دونوں نے سکون کا سانس لیا اور خود کو پھر سے زندگی کی رونقوں میں گم کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ ماضی کی یادیں انہیں تنگ کرنے ضرور آتی تھیں، لیکن وہ اسے نظر انداز کر جاتے اور کیا کر سکتے تھے۔

وہ اُن بھیڑیوں کو نہیں پکڑ سکتے تھے، جن کی وجہ سے اُن کے پیارے اُن سے جدا ہوگئے تھے، بس اپنے تصورات میں اُن کو عبرت ناک سزا پاتے ہوئے دیکھتے تھے، کیوں کہ حکومت بھی چند دن مختلف بیانات دے کر چپ ہوگئی تھی گویا ان کا فرض پورا ہوگیا تھا۔ اس طرح یہ کیس بھی سینکڑوں دیگر کیسز کی طرح فراموش کر دیا گیا۔

ساحر اور فاخرہ نے اب اس طرف سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا، کیوں کہ خوامخواہ کی ٹینشن لینے سے کوئی فائدہ نہ تھا، اسی دوران اُن کا رزلٹ آؤٹ ہوگیا اور وہ دونوں اے ون گریڈ میں پاس ہوگئے تھے۔ فرم میں اب وہ دونوں ایڈجسٹ ہو چکے تھے، لیکن ایک پریشانی پیدا ہوگئی تھی فاخرہ کے لیے بقول اُس کے، فرم کا مالک اُس میں خصوصی دلچسپی لے رہا تھا، ساحر نے اس کی یہ بات کسی حد تک رد کر دی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ بڑی عمر کا شخص ہے اور اُس کی کوئی اولاد بھی نہیں ہے، شاید اس وجہ سے تمہیں بیٹی کی طرح سمجھ کر زیادہ اہمیت دے رہا تھا، لہٰذا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن فاخرہ مطمئن نہ ہوئی۔ بولی۔

''کس دور کی بات کر رہے ہو، آج کل لوگ اپنی بیٹی کو بھی اپنی نہیں مانتے اور وہ غیر ہو کر مجھ سے ہمدردی کیوں جتانے لگا، مجھے تو کوئی اور ہی چکر لگتا ہے۔''

''بھئی تصور ہی کیا ہے نا تم نے۔ اس نے کچھ کہا تو نہیں ہے۔ جب وہ کوئی ایسی ویسی حرکت کرے گا تو دیکھا جائے گا، بلاوجہ اس کی جانب سے عدم تحفظ کا شکار ہونا جائز نہیں۔'' ساحر نے جواب دیا۔

فاخرہ اُس کی باتوں سے کسی حد تک مان تو گئی تھی، لیکن پھر بھی وہ ہر وقت اپنے باس کو شک کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ پھر ایک دن آخر وہی ہوا، جس کا فاخرہ کو ڈر تھا۔ اس کے باس سلیم صاحب نے اسے اپنے کمرے میں بلایا اور دفتری معاملات پر گفتگو کے بعد اس کو پرپوز کر ڈالا۔ فاخرہ نے انہیں اسی وقت دوٹوک جواب دیا اور اُٹھ کر جانے لگی۔ سلیم صاحب فوراً آگے بڑھے اور اس کا

ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا، لیکن ناکام رہی، سلیم صاحب کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ پچاس سالہ سلیم صاحب کی ہمت بڑھ گئی تو انہوں نے فاخرہ کو کندھوں سے پکڑ لیا۔ اب فاخرہ کو خطرہ محسوس ہونے لگا تھا۔ اس کے باس نے پھر اپنی بات دہرائی اور مزید پیش قدمی کی کوشش کی، لیکن فاخرہ اک جھٹکے کے ساتھ اُن کی گرفت سے نکل گئی۔ سلیم صاحب پھر آگے بڑھے، لیکن ٹھٹک کر رک گئے۔ دروازے میں ساحر کھڑا شعلہ بار نگاہوں سے انہیں گھور رہا تھا وہ نجانے کب اندر آ گیا تھا۔ فاخرہ نے اک نظر اسے دیکھا اور آنکھوں میں آنسو لیے اس کے برابر سے باہر نکل گئی۔ ساحر کے اندر لاوا سا اُبل پڑا۔ اس نے پلٹ کر اپنے باس کو دیکھا۔ سلیم صاحب اب سنبھل گئے تھے، وہ بارعب انداز میں دھاڑے۔

''مسٹر ساحر! کیا آپ کو اتنے دنوں میں یہ بات سمجھ نہیں آ سکی کہ جب کسی کے کمرے میں داخل ہوں تو اجازت طلب کرنا چاہیے۔ یہ یہاں کے آداب میں شامل ہے۔''

''آداب تو...... میں اب آپ کو سکھاؤں گا۔'' وہ دانت کچکچاتا ہوا سلیم صاحب کی جانب لپکا۔ اس نے انہیں دھکا دے کر میز پر گرا دیا۔ وہ اُٹھنے لگے تو ساحر نے شیشے کی ایش ٹرے اُٹھا کر ان کے ہاتھ پر دے ماری۔ ایک کے بعد دوسری ضرب پڑی۔ اُن کے منہ سے فلک شگاف چیخیں نکلیں۔ دفتر میں ہر طرف افراتفری پھیل گئی، پھر ساحر نے سلیم صاحب کو گھونسوں پر رکھ لیا۔

لوگ جب تک کچھ سمجھے اور اپنے باس کو جا کر ساحر سے بچایا، تب تک وہ جی بھر کے اُن کی دھنائی کر چکا تھا۔ سلیم صاحب کا ایک ہاتھ تقریباً ناکارہ ہو چکا تھا۔ اُن کا سارا لباس پھٹا ہوا تھا اور وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھے۔ اُن کے منہ اور ناک سے خون بہہ رہا تھا، کچھ پل اور گزر جاتے تو شاید ساحر انہیں جان سے مار دیتا۔ دفتر کے ملازمین نے ساحر کو حوالات میں اور سلیم صاحب کو اسپتال پہنچا دیا۔

دفتر کے ملازمین کو صورت حال کا کچھ پتا نہ تھا، کیوں کہ وہ اصل بات نہیں جانتے تھے، چوں کہ سلیم صاحب بے ہوش ہو چکے تھے، اس لیے انہوں نے اقدام قتل کی ایف آئی آر کٹوائی۔ اس کی وجہ ساحر کا رویہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے منہ سے جھاگ اُڑ رہا تھا اور وہ ایک ہی بات دہرائے جا رہا تھا۔

''چھوڑ دو مجھے۔ میں اس کمینے کو جان سے مار ڈالوں گا۔'' خیر ساحر حوالات میں پہنچ گیا۔ خلاف توقع اس پر کوئی تشدد نہ کیا گیا، بلکہ وہاں پر موجود انسپکٹر شہباز نے نہایت نرمی سے تفتیش شروع کی۔ ساحر بہت حیران ہوا، کیوں کہ انسپکٹر شہباز کسی بھی لحاظ سے ہماری پولیس کا افسر نظر نہیں آتا تھا۔ کلین شیو، ہینڈسم نوجوان اور خوش گفتار انسپکٹر اسے متاثر کر گیا۔ اس نے من وعن تمام کہانی اسے سنا ڈالی۔

اس کا بیان سننے کے بعد انسپکٹر نے اسے بتایا کہ ابھی سلیم صاحب کے بیان کا اُسے انتظار کرنا ہوگا، پھر ہی کیس کا صحیح چہرہ واضح ہوگا۔ انسپکٹر نے اس سے گھر کا ایڈریس پوچھا اور چاہا کہ فاخرہ کو بیان کے لیے راضی کر سکے، لیکن ساحر نہ مانا اور انسپکٹر سے گزارش کی کہ اُسے ابھی تنگ نہ کیا جائے، کیوں کہ یقیناً پہلے ہی شدید ڈپریشن کا شکار ہے۔ انسپکٹر نے اس کی بات مان لی ساحر سے مزید اُس نے یہ کہا کہ اس نے اچھا نہیں کیا، اگر وہ قانون کی مدد لے لیتا تو اچھا ہوتا یا پھر اس قصے کو بھول جاتا اور نوکری وغیرہ چھوڑ دیتا، کہیں اور ملازمت مل جاتی، کیوں کہ یہ اتنا بڑا معاملا بھی نہیں تھا۔ کوئی بھی کسی کو بھی پرپوز کر سکتا ہے، لیکن اب وہ لوگ کوئی بھی فرضی قصہ گھڑ کر اُسے بُری طرح عدالت سے سزا دلوا سکتے ہیں۔ اقدام قتل کا کیس کوئی معمولی کیس نہیں ہے۔ ساحر کو اب تھوڑا تھوڑا پچھتاوا ہو رہا تھا، لیکن پھر سلیم صاحب کی شکل اُس کی نظروں میں گھوم گئی اور اس کی حالت پھر خونی درندے جیسی ہو گئی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا، ورنہ وہ اُڑ کے اسپتال پہنچ جاتا اور انہیں ختم کر دیتا۔

تین گھنٹے بعد انسپکٹر شہباز نے سلیم صاحب کے بیان کا خلاصہ ساحر کو سنایا، جسے سن کر وہ حیران رہ گیا۔ وحشت سے اُس کا عجب حال ہو گیا۔ سلیم صاحب نے بیان دیا تھا کہ یہ دونوں اُن کی فرم میں گھپلے کرنے کے جرم کے مرتکب ہوئے ہیں۔ انہیں جب یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے ساحر اور فاخرہ کو بلا بھیجا کہ صحیح بات معلوم کر سکیں اور حقائق کو جان سکیں، لیکن ساحر اس وقت دفتر میں نہیں تھا، اس لیے اکیلی فاخرہ اُن کے کمرے میں

پہنچی۔ انہوں نے اس سے پوچھ گچھ کی تو فاخرہ نے انکار کیا۔ جب انہوں نے سختی سے پوچھا تو وہ اُٹھ کر جانے لگی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر اُس کا راستہ روکا اور اسے دھمکی دی کہ وہ سچ سچ سب کچھ بتا دے، ورنہ اُن دونوں کو حوالۂ پولیس کیا جائے گا۔ اسی دوران ساحر اندر داخل ہوا۔ اس نے جب اپنا بھانڈا پھوٹتا دیکھا تو طیش میں آ کر اُن کو مارنا پیٹنا شروع کر دیا اور کہا کہ انہوں نے فاخرہ کے ساتھ بدتمیزی کی ہے حالاں کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی، وہ تو صرف پوچھ گچھ کر رہے تھے کہ حساب کتاب میں غلطی تھی یا واقعی ان دونوں نے گھپلا کیا ہے، لیکن نہ تو فاخرہ نے کوئی جواب دیا اور نہ ہی ساحر نے۔ فاخرہ وہاں سے فوراً چلی گئی اور ساحر نے انہیں مارنا پیٹنا شروع کر دیا اور اگر دفتری ملازمین انہیں نہ بچاتے تو شاید ساحر انہیں جان سے مار ڈالتا۔ یہ بیان سن کر ساحر نے اسے رَد کر دیا اور کہا کہ یہ سب کچھ جھوٹ ہے۔ سارا حساب کتاب دُرست ہے، ہم نے کوئی ہیرا پھیری نہیں کی ہے۔ انسپکٹر نے کہا۔

''کیا وہ کوئی گواہ پیش کر سکتا ہے؟'' اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا، پھر انسپکٹر نے اُسے بتایا کہ سلیم صاحب نے گواہ بھی پیش کیے ہیں جنہوں نے گواہی دی ہے کہ تم دونوں نے ہیرا پھیری کی ہے اور ثبوت بھی فراہم کرنے کا وعدہ کیا ہے، جو وہ عدالت کے روبرو پیش کریں گے۔ ساحر نے پھر انکار کیا اور کہا کہ یہ سب کچھ سلیم صاحب کی مرضی پر ہوا ہے، یہ ایک سازش ہے۔ انسپکٹر نے جواب دیا کہ جو بھی ہو۔ وہ مجبور ہے، وہ اُس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا کیوں کہ تمہارے پاس گواہ نہیں ہے اور ثبوت بھی نہیں ہے، جبکہ اُن کے پاس دونوں ہیں، لہٰذا اب اُسے فاخرہ کو بھی گرفتار کرنا پڑے گا، کیوں کہ اب اُس کے خلاف بھی ایف آئی آر کٹ گئی ہے۔ ساحر یہ سن کر وحشت سے دیوانہ ہو گیا اور ''جھوٹ'' بکواس ہے کی گردان کرتا ہوا دیواروں سے سر ٹکرانے لگا کچھ لمحوں بعد جب وہ خاموش ہوا تو انسپکٹر نے اس کو حوصلہ دیا اور فاخرہ کی گرفتاری کے لیے روانہ ہو گیا۔ ساحر حوالات میں بیٹھ کر خالی خالی نظروں سے دیواریں تکنے لگا اور سوچنے لگا کہ تقدیر اس کے ساتھ نجانے کیا کھیل، کھیل

رہی ہے؟ مزید تین گھنٹے بیت گئے، اب شام ہو چکی تھی اندھیرے نے دنیا پر اپنی راجدھانی قائم کرنا شروع کر دی تھی۔ تھانے کے اندر روشنیاں جل اُٹھی تھیں۔ ساحر کی کوٹھری میں لگا ہوا بلب بھی اندھیرے کو اپنی برتری کا احساس دلا رہا تھا، مگر ساحر کے دل کے اندر جو اندھیرا پھیلا ہوا تھا، وہ مزید گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے گزرے ہوئے پچھلے دو سالوں کو یاد کر رہا تھا، ان دو سالوں میں اس کے ساتھ کیا کیا نہیں ہوا تھا۔ اس دوران اس کی تین عزیز ترین ہستیاں بھی اس سے چھن گئی تھیں اور وہ کوڑی کوڑی کو بھی محتاج ہو گیا تھا۔ اب اِک عزت رہ گئی تھی، اُس پر بھی ایک بھیڑیے نے حملہ کر دیا تھا اور وہ خود حوالات پہنچ چکا تھا۔ ''کیا اب اُس کی محبت بھی یہاں پر پامال ہو گی؟ کیا فاخرہ کو بھی سزا......؟'' اس سے آگے سوچنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ اُس کی نگاہوں میں شبیر شاہ کی شکل گھوم گئی۔ اُس گھٹیا انسان کی وجہ سے اس کی جنت نما زندگی تباہ ہو گئی تھی۔ اس کو وہ بم بلاسٹ یاد آ رہا تھا اور انتظامیہ کی لاپروائی بھی، کہ جب اُس کے ممی، پاپا اور معصوم بہن اس سے چھن گئے تھے، اور پھر آخر میں سلیم صاحب کی شکل اس کی نظروں میں جم کر رہ گئی تھی۔

وہ جتنا وہ سوچتا جا رہا تھا۔ اس کے اندر اِک لاوا سا بھرتا جا رہا تھا۔ اُس کی سوچیں اُسے اس سماج، اس کے رسم و رواج، یہاں کے قانون اور یہاں کی بداخلاقی بات سے باغی بن جانے کی ترغیب دے رہی تھیں۔ یونہی سوچتے سوچتے اُسے پھر فاخرہ کا خیال آیا اور اُس نے پُرنم آنکھوں سے اِک سرگوشیانہ دعا کی۔

''خدا کرے فاخرہ! کہ تم پولیس کے ہاتھ لگنے سے پہلے ہی مر جاؤ۔ یا پھر تمہیں حوالات میں دیکھنے سے پہلے میں مر جاؤں۔''

وہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا ہوا تھا، جب انسپکٹر نے آ کر دروازہ کھلوایا اور اُسے حکم دیا کہ وہ اس کے ساتھ چلے، وہ خاموش نظروں سے اسے دیکھتا ہوا اُٹھ کر چل دیا۔ وہ اسے لے کر اپنے کمرے میں پہنچا اور اسے ایک کرسی پر بیٹھنے کا کہا۔ وہ چپ چاپ بیٹھ گیا، چند لمحے خاموش رہنے کے بعد انسپکٹر بولا۔

''مسٹر ساحر! تمہارے لیے ایک بُری خبر ہے۔''

ساحر کا دل دھڑکنے لگا اُس نے سوالیہ نظروں سے انسپکٹر کی جانب دیکھا۔

''میں تم سے...... کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتا۔ فاخرہ ہمیں نہیں ملی، لیکن وہ گھر پر بھی نہیں پہنچی، البتہ ہمیں ایک مسخ شدہ لاش ضرور ملی ہے۔ وہ ایک لڑکی کی لاش ہے اور اس کے بدن پر وہی کپڑے ہیں جو بقول عینی شاہدین کے فاخرہ آج صبح پہن کر دفتر آئی تھی۔ میں تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا، تاکہ تم لاش کی شناخت کر سکو، کیوں کہ اس کے پاس سے کوئی بھی شناختی ثبوت نہیں ملا۔''

فاخرہ کے پاس تو پرس وغیرہ تھا اور اس کے اندر وزیٹنگ کارڈز اور شناختی کارڈز وغیرہ بھی تھے۔ ساحر بے تابی سے بولا۔

''ہوگا، لیکن ہمیں وہاں سے کچھ نہیں ملا، ہوسکتا ہے کوئی اُٹھا کر لے گیا ہو، کیوں کہ اس حادثے کا کوئی عینی شاہد بھی نہیں ہے کہ یہ کوئی ایکسیڈنٹ ہوا ہے، لڑکی کسی ہیوی گاڑی تلے آ کر کچلی گئی ہے۔ یہ حادثہ ایک ویران سے علاقے میں پیش آیا ہے، اسی بات کا فائدہ اُٹھا کر گاڑی کا ڈرائیور لاپتا ہے اور کوئی یہ حادثہ ہوتے دیکھ بھی نہیں سکا، اس لیے ہوسکتا ہے کوئی نشہ باز لاش کے پاس پڑی ہوئی چیزیں لے کر رفو چکر ہوگیا ہو، بہر حال تم میرے ساتھ چلو اور یہ تصدیق کرلو کہ لاش......'' انسپکٹر شہباز نے اس کو پوری تفصیل بتادی۔ یہ سب سن کر ساحر کی روح تک تڑپ گئی، لیکن وہ خاموش رہا۔ دوسری طرف اسے اک گونا سکون بھی محسوس ہو رہا تھا، کیوں کہ فاخرہ ذلت کی زندگی سے بچ گئی تھی اور اس لیے اُس کی دعا قبول ہوگئی تھی۔

☆......☆

وہ انسپکٹر کے ساتھ ایک سرد خانے میں پہنچا اور لاش کی شناخت کی۔ لاش کے دونوں ہاتھ اور چہرہ، بلکہ سارا اوپری دھڑ بری طرح سے مسخ ہو چکا تھا۔ اس کی جانب دیکھنے کے لیے بھی بڑا دل گردہ چاہیے تھا۔ اس لاش کی فاخرہ سے صرف اتنی ہی مشابہت تھی کہ اس کے لہولہان تن پر ویسے ہی کپڑے تھے جیسے فاخرہ نے پہن رکھے تھے۔ ساحر کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ اُس نے نیم بے ہوشی کی سی حالت میں ہی یہ اقرار کرلیا کہ ''ہاں یہ...... فاخرہ...... ہی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ مزید اپنے پاؤں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ اگر شہباز اسے نہ سنبھالتا تو وہ اوندھے منہ گر پڑتا۔ اس کا ری ایکشن دیکھ کر انسپکٹر حیران و پریشان ہوگیا، اب اسے یقین ہوگیا تھا کہ ساحر سچا ہے اور سلیم صاحب نے اس کے خلاف سازش کی ہے، تاکہ اُسے الزام دے کر خود بچ سکیں۔ اس طرح ان کے اپنے جرم پر پردہ پڑ جائے، لیکن وہ اس کے لیے کچھ نہیں کرسکتا تھا، کیوں کہ وہ قانون کے ہاتھوں مجبور تھا۔

دن یونہی گزر گئے۔ عدالت نے ساحر کو سزا سنادی اور فاخرہ کو مردہ قرار دے دیا گیا۔ انسپکٹر شہباز نے بہت چاہا کہ ساحر کے لیے کچھ کر سکے، لیکن ساحر کو اک مستقل خاموشی لگ گئی تھی، جسے نہ وہ توڑ سکا اور نہ سرکاری وکیل، نتیجتاً اُسے چار سال کی سزا ہوگئی، جسے اُس نے چپ چاپ قبول کرلیا۔ انسپکٹر شہباز کو بہت دُکھ ہوا اور اس بات کا شدت سے احساس بھی ہوا کہ جب ساحر جیل سے رہا ہوجائے گا تو یہ لازماً اک عادی مجرم بن جائے گا، جو اس معاشرے کے لیے یقیناً ایک بُری چیز ہوگی اور پھر وہ اس معاشرے سے اپنی بربادی کا انتقام لے گا، ہوا بھی ایسے ہی۔ ساحر نے چار سال جیل میں رہ کر ہر طرح کے جرائم کرنے کی گویا ٹریننگ حاصل کی تھی اور جب وہ چار سال بعد رہا ہوا تو ایک ماہر نقب زن بن چکا تھا، پھر وہ اسی راہ پر چل نکلا۔ چوری کرنا اور بدمعاشی کرنا اس کے دو محبوب مشاغل تھے۔ ہوسکتا تھا کہ وہ بہت دور نکل جاتا، لیکن اسی دوران اس کی ملاقات کریم بیگ سے ہوئی، جنہیں وہ چاچا کریم کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ وہ اس کے پاپا کے دوست تھے۔ وہ سالوں پہلے شہر سے چلے گئے تھے، لیکن اب پھر وہ واپس آگئے تھے۔ انہیں ساحر کی زبانی ساری داستان سن کر بہت دُکھ ہوا۔ ساحر نے انہیں یہ بھی بتادیا کہ وہ اب کیا کرتا ہے۔ کریم صاحب نے اسے سمجھایا اور یہ راستہ چھوڑنے کو کہا مگر وہ نہ مانا۔

شاید کریم صاحب ناکام ہوجاتے، مگر پے در پے ملاقاتیں ہونے اور بار بار سمجھانے پر ساحر کسی حد تک مان گیا اور آخری بار جب کریم صاحب نے اسے اس کی محبت اور والدین کی قسم دی تو اُس نے ان کے سامنے ہی توبہ کرلی کریم صاحب نے خدا کا شکر ادا کیا اور ساحر کو

سینے سے لگالیا۔

☆......☆

دن یونہی گزرتے گئے اور وہ سدھرتا چلا گیا۔ کریم صاحب نے کوشش کر کے اپنی رہائش تبدیل کرلی اور گرین ٹاؤن میں شفٹ ہو گئے۔ ساحر بھی اُن کے ساتھ ہی وہیں چل گیا، البتہ وہ اکیلا ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ اس نے دو چار مقامات پر ٹیوشنز وغیرہ پڑھانا شروع کردیں، جن سے اس کا گزر بسر آسانی سے ہوجاتا تھا۔ وہ اپنی جرائم پیشہ زندگی بھولتا جارہا تھا، مگر فاخرہ، والدین اور نیلم کو وہ نہیں بھول پارہا تھا، بھلا یہ کیسے ممکن تھا۔ جب اسے یہ سب لوگ یاد آتے تو وہ تھوڑا بہک جاتا اور اُس کا دل کرتا کہ وہ کسی طرح اپنی بربادی کی ذمے دار شخصیات سے انتقام لے، کیوں کہ وہ ابھی تک ایسا نہیں کرسکا تھا۔ شبیر شاہ ریٹائرڈ ہوگیا تھا اور معلوم نہیں کہاں تھا، جبکہ سلیم صاحب دوسرے شہر شفٹ ہوگئے تھے۔ شاید وہ اس تک پہنچ جاتا، مگر کریم صاحب راستے میں آگئے اور بروقت اسے روک لیا تھا۔ خیر وہ اب پُرسکون ہوتا جارہا تھا کہ انسپکٹر عقلمند کی جانب سے اسے بلاوا آ گیا۔ انسپکٹر عقلمند خاں سے اس کی کئی بار مڈبھیڑ ہوچکی تھی اور وہ ہر بار اس کے ہاتھ سے بچ نکلا تھا، لیکن اس بار تو اس کا ماضی گویا زندہ ہوگیا تھا۔

☆......☆

وہ صوفے میں دھنسا اپنے سامنے میز پر پڑے کافی کے کپ کو گھور رہا تھا۔ آمنہ اُسے اتنا کہہ کر انتظار پر مجبور کرگئی تھی کہ "وہ کافی پیے اتنی دیر میں وہ تھوڑا فریش ہو کر آتی ہے۔" مگر اس نے کافی نہیں پی، بلکہ بیٹھا اُسے گھورے جارہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ آمنہ کو اس کی رام کہانی کہاں سے معلوم ہوئی، لیکن اس کے ذہن کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ بے چینی سے آمنہ کی آمد کا منتظر تھا۔ تھوڑی دیر بعد آمنہ واپس آ گئی۔ اس نے لباس چینج کرلیا تھا، شاید وہ ہاتھ منہ دھو کر آئی تھی اور خاصی فریش بھی تھی۔

"ارے آپ نے کافی نہیں پی، وہ ساحر کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ آپ پہلے میرے سوالوں کا جواب دیں۔" اس نے جلدی سے اپنا مدعا بیان کیا۔

"آپ کو آپ کے ہر سوال کا جواب ملے گا۔ آپ پلیز ٹینشن نہ لیں، کافی لیں نا آپ۔ اتنی دیر میں، میں الفاظ کو ترتیب دے لوں۔" یہ کہتے ہوئے آمنہ کسی سوچ میں ڈوب گئی۔ ساحر نے بے بسی سے اُس کی جانب دیکھا اور کافی کا کپ اٹھالیا۔ چند لمحوں بعد آمنہ گویا ہوئی۔ میں آپ کو شروع سے لے کر بتاؤں گی یعنی اس وقت سے جب آپ دونوں جدا ہوئے تھے۔

"کیا فاخرہ......ز......زندہ ہے۔" اُس نے سوال کیا۔

"جی ہاں! زندہ ہیں اور بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔"

"کہاں ہے وہ؟" اُس نے دوسرا سوال داغا۔

"اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے ہر سوال کا جواب اکٹھے ہی مل جائے تو پھر مجھے شروع سے ساری بات بتانے دیں، اس طرح وقت بھی بچے گا اور سب کچھ آپ کی سمجھ میں بھی آ جائے گا اور اس کے بعد میں آپ کو فاخرہ کے پاس لے چلوں گی۔" اس نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے ساحر کو ایک لمبی وضاحت دی۔ شاید وہ ساحر کے مسلسل سوالات سے بچنا چاہتی تھی۔

"چلیں ٹھیک ہے۔ آپ شروع سے بیان کریں، اب میں آپ سے کوئی سوال نہیں کروں گا۔" ساحر نے آمنہ کی بات مان لی۔

"تو پھر سنیں۔"

یہ کہتے ہوئے آمنہ نے اسے گزرے ہوئے ماضی کی کرب ناک داستان، سنانا شروع کی۔

جب فاخرہ آفس کی بلڈنگ سے نکل کر پیدل ہی گھر کی جانب چل دی تھی، تو وہ بالکل بدحواس سی تھی اور جب وہ اقبال ٹاؤن کے زیرِ تعمیر علاقے سے گزر رہی تھی، تو ایک موڑ مڑتے ہوئے اس نے اپنے اِردگرد توجہ نہ دی اور وہ ایک کار سے ٹکرا گئی، اسے خاصی چوٹیں لگیں، خاص کر سر میں بہت شدید چوٹ آئی، یہ ایکسیڈنٹ ہوتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا۔ کیوں کہ اس وقت وہاں کوئی موجود نہیں تھا، ہوسکتا تھا کہ کار سوار افراد یا فرد بھاگ جاتے، لیکن ایسا نہیں ہوا، کیوں کہ یہ گاڑی شہر کے ایک اچھے انسان کی تھی۔ اس نے فاخرہ کو اس قدر زخمی حالت میں چھوڑ کر فرار ہونا گوارا نہ کیا، حالاں کہ اس کے ڈرائیور نے اسے کچھ ایسا ہی مشورہ دیا تھا، لیکن اس نے ایسا نہ کیا

اور اسے اٹھا کر اسپتال لے گیا۔ جب فاخرہ کو ہوش آیا تو وہ اپنی یادداشت کھو چکی تھی، اسے کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ اس کے علاوہ سر میں لگنے والی چوٹ کی وجہ سے اس کی بینائی بھی متاثر ہوئی تھی۔ فاخرہ کے محسن کو یہ بات اچھی نہ لگی۔ اس کے خیال میں اس نے ایک لڑکی کی زندگی برباد کر دی تھی، خیر انہیں فاخرہ کی شناخت کرنا پڑی۔ انہیں فاخرہ کے ہینڈ بیگ سے اس کا شناختی کارڈ اور کچھ ایڈریس وغیرہ مل گئے، جن کی مدد سے وہ لوگ فاخرہ یعنی تمہارے گھر پہنچے۔ وہاں انہیں ایک نئی داستان سننے کو ملی۔ محلے والوں نے بتایا کہ فاخرہ تو ایک حادثے میں ماری جا چکی ہے اور اسے دفنائے ہوئے بھی چار دن گزر گئے ہیں اور ساحر جیل میں ہے یعنی اور کوئی خاندان والا موجود نہیں ہے اور جو تھا، سو اب وہ بھی نہیں رہا تھا اور کسی نزدیکی رشتے دار کا انہیں پتا نہیں ہے..... آمنہ تھوڑی دیر کو رکی، پھر دوبارہ بولی۔ میں اس کار والے آدمی کو اب سیٹھ صاحب کہوں گی، تاکہ کچھ آسانی رہے، او کے..... ساحر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

یہ باتیں معلوم کر کے سیٹھ صاحب کے آدمی ان کے پاس پہنچے، وہ بہت پریشان ہوئے کہ اب کیا کریں؟ پہلے انہوں نے سوچا کہ تھانے چل کر ساری حقیقت پولیس کو بتا دیں، لیکن وہ ایسا نہ کر سکے۔ وہ سلیم طاہر کا نام سن کر پریشان ہو گئے تھے۔ اُن کے خیال میں وہ ایک عیار، چالاک انسان تھا جو کہ اوپر سے ایک فرشتہ نظر آتا ہے، لیکن اندر سے کسی شیطان سے کم نہیں ہے۔ اُس نے ضرور ساحر اور معصوم فاخرہ کو اپنی کسی سازش کی بھینٹ چڑھایا ہے۔ انہیں یہ سارا کیس ایک ڈراما لگا، جس کا ڈائریکٹر سلیم طاہر تھا۔ اوپر سے انہیں فاخرہ سے بھی ہمدردی تھی، لہٰذا انہوں نے پولیس کے پاس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ فاخرہ کی یادداشت باقی نہیں رہی تھی اور ایک وجہ یہ بھی کہ سیٹھ صاحب کو فاخرہ اپنی بیٹی جیسی لگی تھی۔ ان وجوہ کی وجہ سے سیٹھ صاحب نے فاخرہ کو اپنے پاس ہی رکھ لیا تھا اور اس کا علاج معالجہ شروع کر دیا تھا، چند ہی ہفتوں میں فاخرہ بالکل تندرست ہو گئی، البتہ اس کی نظر کمزور ہو چکی تھی۔ خیر دن اسی طرح گزرتے گئے۔ فاخرہ نے خود کو کسی حد تک

سیٹھ صاحب کے گھر میں ایڈجسٹ کر لیا تھا۔ اس کے لیے یہ کوئی خاص مشکل کام بھی نہ تھا، کیوں کہ گھر میں سوائے نوکروں کی فوج کے اور کوئی نہ تھا۔ سیٹھ صاحب نے تمہارے بارے میں بھی معلومات حاصل کیں، انہیں افسوس تھا کہ تم جیل پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے کافی کوشش کی کہ فاخرہ کی یادداشت جلد واپس آ جائے، لیکن ایسا نہ ہو سکا، کیوں کہ ڈاکٹرز کے بقول یہ خود بخود ہی واپس آئے گی اور اس میں زیادہ سے زیادہ عرصہ بھی لگ سکتا ہے اور کم سے کم بھی۔ دو سال بیت گئے، اسی دوران فاخرہ کی آنکھوں کا بھی علاج کروایا گیا اور اس کی بینائی پھر سے لوٹ آئی۔ سیٹھ جی کی تو اس میں ہی جان تھی اور وہ بھی انہیں ڈیڈی ہی کہتی تھی، اسی دوران سیٹھ صاحب کو خیال گزرا کہ کل وہ کس نام سے فاخرہ کو دنیا کے سامنے متعارف کروائیں گے؟ پھر انہیں ایک خیال سوجھا اور وہ فاخرہ کو لے کر امریکہ چلے گئے، سیٹھ جی نے وہاں پر ایک عورت سے شادی کر رکھی تھی، جو کہ مصر کی رہنے والی تھی۔ سیٹھ صاحب نے فاخرہ کو اس کی بیٹی بنا کر واپس لانے کا ارادہ کر رکھا تھا، گو کہ یہ ایک مشکل اور غیر قانونی کام تھا، لیکن اُن کے پاس دولت کی کوئی کمی نہ تھی، سو یہ کام نہایت آسانی سے ہو گیا۔ بُرا تو انہیں بھی لگا تھا لیکن یہ سب دیکھ وہ مجبور بھی تھے اور وہ فاخرہ کی شناخت بدلنا چاہتے تھے، کیوں کہ کل کو اگر فاخرہ کو دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا تو پولیس پیچھے پڑ جائے گی، کیوں کہ قانون اُسے مردہ قرار دے چکا ہے اور اگر زندہ مانا جائے تو وہ ایک کیس کی مفرورہ کہلائے گی۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے انہوں نے یہ قدم اٹھایا۔ وہاں پر وہ سب کچھ دولت کے بل بوتے پر نہایت ہی آسانی سے ہو گیا جو یہاں پر مشکل لگ رہا تھا۔ سیٹھ جی اور فاخرہ کو امریکہ میں رہتے ہوئے ایک سال کا عرصہ گزر گیا۔ فاخرہ اب وہاں پر سیٹھ جی کی بیٹی کی حیثیت سے ہی رہتی تھی اور اسے وہاں کی شہریت بھی مل چکی تھی۔ سیٹھ صاحب کی بیوی ثوبیہ بھی اسے اپنی بیٹی کی طرح چاہتی تھی، کیوں کہ اس کی گود بھی خالی تھی۔ فاخرہ کو سیٹھ صاحب نے یہ کہانی گھڑ کر سنائی تھی کہ ثوبیہ ہی اس کی ماں ہے اور وہ اس کا باپ۔ وہ ایک عرصے بعد پاکستان گئی تھی جہاں وہ ایک کار ایکسیڈنٹ میں اپنی یاد

داشت کھو چکی ہے، لہٰذا اسے اب کچھ بھی یاد نہیں ہے۔ فاخرہ نے یہ سب کچھ سچ مان لیا اور وہاں پر ہنسی خوشی رہنے لگی ایک سال مزید گزر گیا، اس دوران انہوں نے پاکستان کا بھی ایک چکر لگالیا، پھر ایک اور حادثہ ہوا۔ ٹریفک حادثے میں ثوبیہ جی کی جان چلی گئی اور فاخرہ زخمی ہوکر اسپتال پہنچ گئی۔ یہ حادثہ سیٹھ صاحب کے لیے نقصان دہ ثابت ہوا کہ اُن کی بیوی بھی ملک عدم سدھار گئی تھی اور فاخرہ کے لیے یہ حادثہ فائدہ مند ثابت ہوا کہ اس کی یادداشت واپس آ گئی تھی۔ سب کچھ یاد آنے پر بھی اس نے ایک ہی بات پوچھی تھی کہ ساحر! کہاں ہے؟" وہ تمہیں بھولی نہیں تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ اُڑ کر تمہارے پاس پہنچ جاتی، مگر اسے صبر کرنا پڑا، کیوں کہ وہ زخمی تھی۔ تندرست ہوکر وہ گھر واپس پہنچی تو وہ اپنے ڈیڈی یعنی سیٹھ صاحب کو پہلے سے بھی زیادہ چاہنے لگی تھی کہ اُن کی وجہ سے آج وہ زندہ سلامت تھی۔ اب وہ جلد از جلد تم تک پہنچ جانا چاہتی تھی، مگر اک گڑبڑ ہوگئی۔ سیٹھ صاحب کی طبیعت اچانک بگڑ گئی۔ وہ دل کے مریض تھے۔ صورت حال کافی بگڑ گئی تھی ان کے دل کا ایک والو تقریباً ناکارہ ہو چکا تھا، جس کا آپریشن کرنا پڑا۔ ہارٹ سرجری کا کیس تھا۔ فاخرہ اپنے محسن کو اس حال میں تنہا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ آپریشن کامیاب رہا۔ سیٹھ صاحب اسپتال سے ڈسچارج ہوکر گھر پہنچ گئے اور پھر مزید چھ ہفتے گزرے تو وہ مکمل طور پر صحت یاب ہوگئے۔ فاخرہ سے اب مزید صبر نہ ہوسکا، لہٰذا وہ دونوں پاکستان واپس آ گئے۔ چار سال سے زائد عرصہ گزر گیا تھا۔ اس دوران تم رہا ہوکر نا جانے کہاں گم ہوگئے تھے۔ سیٹھ صاحب کے آدمیوں نے بہت ڈھونڈا تمہیں، لیکن تم نہ مل سکے، بس اتنا ہی معلوم ہوسکا کہ تم ایک چور بن چکے ہو اور اسی سلسلے میں دوبارہ حوالات میں بھی پہنچ چکے ہو، لیکن پھر اچانک ہی تم کہیں گم ہوگئے، تقریباً ایک سال بیت گیا، لیکن تم نہ ملے۔ تم گھر بھی نہیں گئے تھے گھر تو کرائے کا تھا، مگر آفرین ہے فلیٹ مالک پر کہ اس نے تم لوگوں کا سامان باہر پھینک کر اُسے دوبارہ کرائے پر نہیں چڑھایا تھا۔ فاخرہ نے واپس آ کر اُن کا کرایہ ادا کیا اور پھر وہ وہیں رہنے لگی۔ اس نے بہت انتظار کیا تمہارا لیکن تم نہ آئے۔ اس نے اخبارات میں اشتہار دینے کا سوچا، مگر عمل نہ کر سکی، کیوں کہ تم شہر کے مختلف تھانوں میں مطلوب تھے۔ اشتہار دے کر وہ تم سے کوئی بھی تعلق ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔ اس طرح مزید چھ ماہ بیت گئے، اسی دوران تم پر موجودہ کیسز تقریباً ختم ہوگئے لیکن، تم پھر بھی کہیں نظر نہ آئے۔ سب نے سمجھا کہ تم شاید یہ شہر ہی چھوڑ گئے ہو۔ سیٹھ صاحب نے فاخرہ کو مجبور کیا کہ اب وہ اُن کے ساتھ ہی رہے۔ اُسے بھلا کیا انکار ہوسکتا تھا، وہ پہلے بھی اس شہر میں اُن کی بیٹی کی حیثیت سے رہ رہی تھی، اگر اُن کے گھر رہ لیتی تو کیا مضائقہ تھا۔ سیٹھ صاحب اور فاخرہ نئے گھر میں شفٹ ہوگئے۔ وہ گھر سیٹھ صاحب نے فاخرہ کی خاطر ہی تعمیر کروایا تھا، ورنہ وہ تو اپنی پرانی آبائی کوٹھی میں ہی رہتے تھے، جو کہ اندرون شہر واقع ہے۔ وہاں رہتے ہوئے (یعنی نئے گھر میں) مزید کئی ماہ بیت گئے۔ تمہیں پھر سے، بہت تلاش کیا گیا مگر تم نہ ملے۔ اب دوسرے شہروں میں تلاش کرنے کا ارادہ تھا کہ گھر میں چوری ہوگئی۔ اس میں آپ کا نام لیا گیا اور ایف آئی آر کٹی اور آپ پہنچ گئے حوالات میں۔ فاخرہ کو بے چینی نے آن گھیرا۔ اُسے لگا کہ یہ تم ہی ہو۔ انسپکٹر عقلمند سے معلومات لی گئیں تو اس نے سارا تمہارا بیک گراؤنڈ بتا دیا۔ فاخرہ چاہتی تھی کہ وہ تمہارے پاس اُڑ کر پہنچ جائے، مگر پھر یہ مجبوری آڑے آ گئی کہ تم پر چوری کا کیس تھا۔ اس نے یہ کیس واپس لینے کا ارادہ کرلیا، پھر خدا نے اس کی مدد کی اور اصل چور پکڑا گیا۔ فاخرہ کو اس سے بہت خوشی ہوئی کہ تم نے وہ ہار نہیں چرایا تھا۔ وہ ایک بہت بڑی بے عزتی سے بچ گئی تھی۔ اور......"

"تو کیا...... عالیہ ہی فاخرہ ہے؟" ساحر نے آمنہ کی گفتگو کو بریک لگا دیے۔

"جی ہاں! عالیہ ہی فاخرہ ہے۔ فاخرہ اب عالیہ رحمان کے نام سے یہاں موجود ہے اس شہر میں، بحیثیت سیٹھ رحمان کی بیٹی کے۔"

"جب اُسے پتا چل ہی گیا تھا تو وہ خود مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئی؟" ساحر نے ضدی بچے جیسا سوال کیا۔

"اگر وہ خود آتی تو شاید کئی راز دوسروں کے سامنے ظاہر ہوجاتے۔ تمہیں اپنے سامنے دیکھ کر وہ خود پر کنٹرول

نہیں رکھ سکتی تھی، اس لیے وہ نہیں آئی، پھر اس نے مجھے بھیج دیا کہ میں تمہیں لے آؤں۔"

"کہاں؟" اور آپ مجھے اپنے فلیٹ پر کیوں لائیں؟ یہ سب باتیں وہ خود بھی بتا سکتی تھی۔" ساحر نے شکوہ کیا۔ آمنہ زیر لب مسکرا دی۔

"بائی دا وے کیا میں آپ کو بھیا کہہ سکتی ہوں؟" ساحر کی آنکھیں نم ہوگئیں، اک مدت بعد کسی نے اسے بھیا کہنا چاہا تھا۔

"ارے...... یہ آپ کو کیا ہوا؟ میں نے کوئی غلط بات کہہ دی کیا؟ بھئی آپ اور فاخرہ دونوں...... آپ سمجھ گئے ہوں گے میں کیا کہنے والی تھی۔ میں چونکہ عالیہ میرا مطلب ہے فاخرہ کی دوست ہوں، اس حوالے سے میں نے پوچھا تھا۔" وہ ایک دم بوکھلا گئی تھی۔

"معافی چاہتا ہوں۔ دراصل مجھے اپنے ماضی کی یاد آگئی تھی۔ میری ایک بہن تھی نیلم۔ حیرت انگیز حد تک وہ آپ کے مشابہہ تھی۔ اس وجہ سے میری آنکھیں ذرا...... خیر جانے دیں یہ کوئی خاص بات نہیں، یہ اک عرصے سے اسی طرح ہیں۔ آپ مجھے بھیا کہہ سکتی ہیں۔ اب میری بھی کوئی بہن نہیں ہے، یہ کمی پوری ہو جائے گی۔ ویسے آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔" اس نے آنسو پونچھتے ہوئے وضاحت دی۔

"شکریہ۔ بھیا، میں آپ کو اُن کے گھر لے جانے کے لیے آئی تھی، لیکن اپنے فلیٹ پر اس لیے لائی ہوں، تاکہ آپ کو تمام باتیں بتا سکوں کہ اگر کہیں آپ کو فاخرہ پر کوئی شک ہو تو وہ دور ہو جائے۔ وہ آپ کے معاملے میں بہت حساس ہے، کہیں روانی میں آپ اس سے کوئی ایسی بات نہ کہہ دیں جو اس کے دل پر بوجھ بن جائے۔ میں ایسا نہیں چاہتی تھی، کیوں کہ وہ مجھے بہنوں کی طرح عزیز ہے۔ اور ہاں آپ مجھے میرے نام سے اور تم کہہ کر بھی مخاطب کر سکتے ہیں، چھوٹی بہن جو ٹھہری۔ لڑکیوں کو بڑی کہلانے کا کوئی شوق بھی نہیں ہوتا نا۔" آمنہ نے چہکتے ہوئے اپنا جواب ختم کیا، ساحر کو لگا جیسے اس کے بچھڑے ہوئے اپنے شاید پھر سے اس کے پاس چلے آئے ہیں، بس روپ اور طرح کے ہیں۔

"ہوں! جیسے تمہاری مرضی۔ اچھا کیا جو یہاں لے آئی ہو اور تم نے سب کچھ مجھے بتا دیا۔ اب تم میری کہانی سنو تاکہ میرا ماضی بھی تمہارے سامنے روشن ہو سکے۔" یہ کہتے ہوئے ساحر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پھر سارے حالات اسے سنا دیے جو اس پر بیتے تھے۔

"اوہ! تو چچا کریم واپس آگئے ہیں۔" فاخرہ نے اُن کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ "کمال ہے بھیا، آپ سب ہمارے اتنے قریب تھے، لیکن وہی بات کہ "آنکھ اوجھل، پہاڑ اوجھل" خیر اب آپ چلیں۔ میرے ساتھ، فاخرہ تو گویا اب تک پاگل ہو چکی ہوگی، مزید انتظار نہیں کر سکتی۔ اس سے پہلے کہ کوئی مجھے ڈھونڈتا ہوا یہاں آجائے، ہمیں چلنا چاہیے...... آئیں۔"

آمنہ نے کافی کے برتن سمیٹتے ہوئے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی۔ مزید صبر تو اب میرے بس کا روگ بھی نہیں ہے، چھ سال انتظار کیا ہے میں نے۔" وہ کھڑا ہو گیا۔

"تو کیا آپ کو یقین تھا کہ فاخرہ زندہ ہے اور وہ واپس آجائے گی۔" آمنہ نے کچن میں سے ہانک لگائی۔

"ہاں مجھے یقین تھا۔" وہ کچن کے دروازے پر پہنچ گیا۔

"وہ کیسے؟ دراصل جو لاش پولیس والوں نے فاخرہ سمجھ کر دفن کی تھی، وہ تقریباً مسخ شدہ تھی، لیکن اس کے پاؤں اور ٹانگیں وغیرہ تو سلامت تھیں۔ فاخرہ کا بایاں پاؤں بچپن میں تھوڑا سا جل گیا تھا۔ اس کے انگوٹھے پر جلنے کا نشان اب بھی موجود ہوگا، لیکن اس لاش کے پاؤں میں ایسی کوئی نشانی مجھے نظر نہیں آئی۔ اس وجہ سے مجھے یقین تھا۔" اس نے گویا انکشاف کیا اپنی چالاکی کا۔

تو پھر آپ غلط رستے پر کیوں چل رہے تھے اور اس دنیا کو مجرم کیوں سمجھنے لگے تھے؟" ایک اور سوال ہوا۔

"میں چار سال بعد جیل سے رہا ہوا تھا اور ان چار سالوں میں ایک بار بھی فاخرہ نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ رہا ہو کر میں نے اسے بہت تلاش کیا، مگر سب بے سود رہا، پھر مجھے لگا کہ شاید سلیم، طاہر، ہمارا نام نہاد باپ۔ اُس نے فاخرہ کو اغوا کر لیا ہو اور...... باقی تم سب سمجھ سکتی

ہو۔ وہ کمینہ اب اس شہر میں نہیں ہے۔ میں نے اس تک پہنچنے کے لیے اور فاخرہ کے بارے میں جاننے کے لیے یہ راستہ اختیار کیا تھا، مگر چاچا کریم کے بار بار سمجھانے پر میں نے اس گناہ کی زندگی سے توبہ کرلی ہے اور سب کچھ خدا پر چھوڑ دیا ہے۔''

''چلیں خدا نے آپ کی سن تو لی اور آپ کی محبت واپس مل گئی۔''

''اچھا چلیں اب، فاخرہ انتظار کر رہی ہوگی۔'' آمنہ نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''ہاں چلو۔'' پھر وہ دونوں بلڈنگ سے باہر آکر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ چند منٹوں بعد وہ سیٹھ رحمان کی شان دار کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں داخل ہو رہے تھے۔ آمنہ ساحر کو وہاں بٹھا کر خود کہیں غائب ہوگئی تھی۔ ساحر وہاں حیران، گم صم سا ہو کر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد ڈرائنگ روم کا ایک دروازہ کھلا اور ایک ملازم آیا۔ اس کے ہاتھ میں جوس کا گلاس تھا، وہ ساحر کو دے کر چلا گیا۔ وہ جوس کیا خاک پیتا، اسے تو آنے والے لمحوں کا انتظار مارے دے رہا تھا۔ کچھ پل اور گزر گئے، پھر اس کی نظر ڈرائنگ روم سے دوسری منزل کی جانب جانے والی سیڑھیوں پر پڑی اور جم کر رہ گئی۔ فاخرہ ان پر سے نیچے آرہی تھی۔ وہ اس کے سامنے پہنچ گئی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے دُھل کر صاف ہوگئی تھیں اور اس کا سُرخ و سفید چہرہ آنسوؤں میں بھیگ کر دھلے ہوئے گلاب کی طرح کھل اٹھا تھا، جس پر آنسو شبنم کے قطرے کی طرح محسوس ہو رہے تھے۔ اس کی لمبی گھنی، کالی سیاہ زلفیں بے ترتیبی سے اس کے شانوں پر بکھری ہوئی تھیں۔ اس کی سانسوں کا اُتار چڑھاؤ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ دوڑتی ہوئی آئی ہے۔ اسے دیکھ کر ساحر کی آنکھوں کی ضیاء بڑھ گئی، فاخرہ اسے اب پہلے سے بھی زیادہ حسین نظر آرہی تھی۔ شدتِ جذبات سے اس کے لیے ضبط کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھا۔

''فاخرہ...... تم واپس آگئی ہو۔ کتنی دیر لگا دی تم نے، دیکھو کیا حالت ہوگئی ہے میری۔ تمہاری جدائی نے مجھے کیا سے کیا بنا دیا ہے۔'' وہ شکوہ کر رہا تھا۔

''انتظار تو تم نے بھی بہت کروایا ہے، خیر چھوڑو، گلے شکوے تو ہوتے رہیں گے، تم ذرا فریش ہو جاؤ۔ لو یہ کپڑے لو اور سامنے باتھ روم ہے۔ تمہاری شیو بھی بڑی ہوئی ہے۔ مجھے آج سے چھ سال پہلے والا ساحر ملنا چاہیے، جاؤ۔ جلدی کرو۔'' وہ اپنے ہاتھ میں تھامے کپڑے اسے دے رہی تھی۔ ساحر نے اس سے کپڑے لے کر صوفے پر اُچھال دیے اور اسے پکڑ کر اپنے سامنے کرلیا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو، ویسے خود پر کنٹرول رکھنا۔'' وہ گویا ڈر گئی تھی۔

''اپنی آنکھوں کی پیاس بجھا رہا ہوں، ویسے اگر آنکھوں کی پیاس بجھاتے بجھاتے۔'' اس نے یہ کہہ کر فاخرہ کو بازوؤں میں بھر لیا اور پھر اس نے اپنی پسندیدہ من مانی شروع کردی۔ فاخرہ نے کسمسا کر اسے رُک جانے پر مجبور کر دیا۔ وہ خالی خالی آنکھوں سے اُسے تکنے لگا۔

''ہوش کرو، کوئی دیکھ لے گا۔ بھاگ نہیں جا رہی ہیں۔ ہم اکیلے نہیں ہیں یہاں پر۔'' اس نے فاخرہ کی بات گویا سنی ہی نہیں تھی۔ اس نے اپنی گرفت مزید سخت کردی۔ فاخرہ کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔

''پلیز چھوڑ دو مجھے۔

اگر مزید، چند لمحے گزر گئے، تو میری سانس رُک جائے گی۔'' وہ اٹک اٹک کر بول رہی تھی۔ اس نے اپنی گرفت ڈھیلی کردی، مگر اسے چھوڑا نہیں۔

''ساحر لگتا ہے تم ہوش میں نہیں ہو، اسے تشویش ہوئی۔ محبت مدہوشی کا نام ہے۔''

''تو پھر ایسے میں بھیا اپنے ہوش میں کہاں رہ سکتے ہیں۔'' آمنہ ان کے سامنے کھڑی تھی۔ ساحر نے بڑبڑا کر فاخرہ کو چھوڑ دیا۔ آمنہ دبی ہنسی ہنسنے لگی۔ اپنی یہ ہنسی بند کرو۔ سارا موڈ خراب کر دیا تم نے وہ آمنہ کو ڈانٹ رہا تھا۔

''ارے میں تو یہ تولیہ وغیرہ دینے آئی تھی۔ یہ لیں اور جائیں، جا کر اپنا حلیہ درست کریں۔ فاخرہ بہت زیادہ صفائی پسند ہے۔'' آمنہ نے اپنی بات پوری کرتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا تولیہ اور سیفٹی ریزر ساحر کو تھما دیا۔ ساحر نے بے بسی سے باری باری آمنہ اور فاخرہ کی جانب دیکھا اور باتھ روم کی جانب قدم بڑھا دیے۔

☆☆......☆☆







ممتاز احمد

سرگودھا سے، نفس کی شکار ایک عورت کی لرزہ خیز داستان

میرا نام مدیحہ ہے میں نے ایک امیر گھرانے میں آنکھ کھولی۔ تین بھائی اور تین بہنیں ہیں میرے والد بزنس مین تھے تینوں بھائی ابو کے ساتھ شریک کاروبار تھے میں اپنے سب بہن بھائیوں سے چھوٹی ہوں اور بہت لاڈلی بھی تھی قدرت نے ہم سب کو خوب حسلیے نوازا تھا یوں کہہ لیں حسن اور خوب صورتی ہمارے خاندان کی میراث ہے ہم میں سے کسی کو بھی پڑھائی میں دلچسپی نہ تھی سب بہن بھائیوں کی بس واجبی سی تعلیم تھی چونکہ گھر میں دولت کی ریل پیل تھی تو سب کی یہی سوچ تھی کہ ہمیں کون سا نوکریاں کرنی ہیں جیسے جیسے بہن بھائی جوان ہوتے گئےتو والدین نے باری باری سب کو شادی کے بندھن میں باندھ دیا۔

☆......☆......☆

میں نے میٹرک کے بعد مزید پڑھنے سے انکار کر دیا میں شروع سے ہی رومان پسند لڑکی تھی اور مجھ میں یہ رومانس پسندی عشقیہ ناول، رسالے پڑھ پڑھ کر اور انڈین فلمیں دیکھ دیکھ کر آئی تھی ہمارا ایک بڑا سا گھر تھا تینوں بھابیاں گھر کو سنبھالتی تھیں اس کے علاوہ کام کاج کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ بھی گھر میں موجود تھی تو گھر میں میرے کرنے کا کوئی کام نہ تھا جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ مکمل آزادی تھی میں وی سی آر VCR پر انڈین رومانوی فلمیں دیکھتی عشقیہ ناول پڑھتی اور نت نئے فیشن کرتی جس کا اثر یہ ہوا کہ میرے دل میں بھی خواہش ہونے لگی کہ فلمی ہیرو کی طرح کوئی میرے حسن جمال کے قصیدے پڑھے مجھ سے محبت کرے اپنا دل میرے قدموں میں رکھے میری اداؤں کی خوب تعریف کرے وغیرہ وغیرہ مگر اتفاق سے ہمارے خاندان برادری میں کوئی ایسا میرا ہم عمر لڑکا نہیں تھا اور نہ ہی محلے میں مجھے کوئی چاہنے والا تھا میرا آئیڈیل یہ تھا کہ گورا چٹا خوبصورت دراز قد والا رومانس پسند لڑکا ہو خوب شوخ چنچل ہو ہنس مکھ ہو خوش لباس ہو بے شک غریب ہو مگر مجھے شدت سے چاہنے والا ہو۔

میری عمر جب سترہ سال ہوئی تو ایک انتہائی امیر فیملی سے میرا رشتہ آیا لڑکے کی عمر 26 سال تھی وہ بہت بڑا امیر بزنس مین تھا چونکہ شریف اور بہت ہی معزز خاندان سے تھا تو فوراً چٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہوا اور میری شادی ہوگئی۔ میں نے اپنے خاوند وقاص کو شادی کی پہلی رات پہلی مرتبہ دیکھا وقاص ایک ذمہ دار انتہائی سلجھے ہوئے سنجیدہ کم گو انسان تھے وقاص نے پہلی رات مجھے دل جان سے پسند کیا اور

اس شادی کو اپنی خوش قسمتی قرار دیا۔

☆......☆......☆

وقاص بہت اچھے تھے میرا ہر طرح سے خیال رکھتے تھے مگر میرے آئیڈیل کے برعکس تھے شادی کے بعد دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا اب میں وقاص کے ساتھ جس گھر میں بھی جاتی میری بہت تعریف کی جاتی کہ اتنی خوب صورت ہوں مگر میں یہ تعریف وقاص کے منہ سے سننا چاہتی تھی اور میری یہ شدید خواہش تھی کہ وقاص مجھے محبوبہ بنا کر رکھے مجھ سے رومانس کرے صبح وشام میرے حسن کی تعریفیں کرے مگر وقاص ایسا نہ کرتے دعوتوں کا سلسلہ ختم ہوا تو ہم ہنی مون کے لیے دوبئی، شارجہ، ابوظہبی گئے خوب گھومے پھرے پھر پاکستان میں بھی خوب سیر کی کراچی، لاہور ،اسلام آباد، مری، سوات اور شمالی علاقہ جات میں تفریح کے لیے گئے۔

وقاص مجھے بن مانگے ہزاروں روپے دیتے مجھے شاپنگ کرنے اور کہیں آنے جانے کی مکمل آزادی تھی میں نت نئے فیشن کے مہنگے قیمتی ملبوسات، جیولری شوز ،میک اپ کا سامان اور دیگر اشیاء خریدتی رہی مجھ پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی ساس سسر بہت اچھے تھے انہوں نے مجھے کسی بات پر نہیں ٹوکا بلکہ مجھے خوش دیکھ کر انہیں بھی خوشی ہوتی میں جو بھی لباس پہنتا مجھ پر سج جاتا ہر کوئی میرے ذوق کی تعریف کرتا مگر میں یہ تعریف وقاص کے منہ سے سننا چاہتی تھی میرا جب دل کرتا اپنے میکے چلی جاتی اور وقاص کو فون کر دیتی مجھے واپسی پہ گھر لے جائیں انہیں معمولات میں دو سال کا عرصہ بیت گیا ابھی تک ہمارے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

ایک خاص بات یہ تھی کہ جب سے بیاہ کے اس گھر میں آئی تھی تو وقاص کا کاروبار بہت بڑھ گیا، دن بدن ترقی کرنے لگا۔ پہلے کی نسبت بہت فائدہ ہونے لگا۔ وقاص مٹی کو ہاتھ ڈالتے تو وہ سونا بن جانے والی مثال تھی۔ وقاص اکثر کہتے مدیحہ تو لکشمی کی دیوی ہو جب سے اس گھر میں آئی ہو میرے لیے بہت خوش قسمت ثابت ہوئی ہو تمہارے وجود کی برکت سے میرا کاروبار خوب ترقی کر رہا ہے۔ مجھ پر دن رات دھن برس رہا ہے وقاص کی زبان یہ کہتے نہ تھکتی تھی مگر میں چاہتی تھی کہ وقاص مجھ سے عشق لڑائے میرے حسن کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے میں خوب بن سنور کر قیمتی پرفیوم، باڈی اسپرے لگا کر میک اپ کر کے وقاص کے آگے پیچھے گھومتی دلکش ادائیں دکھاتی مگر وقاص اتنا ہی کہتے مدھو بہت اچھی لگ رہی ہو۔

وقاص بہت چاہنے والے انسان تھے مگر ان کے پیار میں والہانہ پن کی کمی تھی مزید کچھ عرصہ گزرا تو میرے ساس سسر یکے بعد دیگرے وفات پا گئے پھر میری خواہش پس وقاص نے ایک مہنگے اور پوش علاقے میں دو کنال کا پلاٹ لے کر بہت عالیشان کوٹھی تعمیر کروائی جب ہم نئی کوٹھی میں شفٹ ہوئے تو اس کی سیٹنگ میں نئے فرنیچر کی خریداری پردے وغیرہ لگانے میں مصروف ہوگئی کوٹھی کے لان کی دیکھ بھال کے لیے مالی تھا صفائی کے لیے ملازمہ الگ تھی کپڑے دھونے کے لیے بھی ملازمہ الگ تھی ایک زیرو میٹر قیمتی کار وقاص نے میرے لیے خریدی اور مجھے ڈرائیونگ سکھائی میں خود ہی کار لے کر شاپنگ کرنے گھومنے پھرنے چلی جاتی بے فکری کی زندگی تھی ہر طرح کا عیش وآرام حاصل تھا ٹیلی فون پر امی سے بہنوں سے بھائیوں سے لمبی لمبی باتیں کرتی۔

☆......☆......☆

شادی کے پانچ سال بعد اللہ نے اپنے کرم سے نوازا دو بیٹیاں اور ایک بیٹا پیدا ہوا سب سے بڑی بیٹی علیشاہ تھی اس سے دو سال چھوٹی عشال تھی اس سے دو سال چھوٹا بیٹا صہیب تھا پھر میں بچوں میں مگن ہوگئی وقاص کا کاروبار دن بدن پھیل رہا تھا جس کی وجہ سے وہ بہت مصروف رہنے لگے صبح گھر سے نکلتے اور رات گئے واپس آتے میری امی ابو بھی وفات پا گئے تھے دو بھائیوں نے کاروبار دوسرے ملک شفٹ کر لیا تھا اور دونوں بہنیں بھی اپنے خاوندوں کے ساتھ اور بچوں کے ساتھ بیرون ملک سیٹل ہوگئی تھیں اب میرا صرف

ایک بھائی پاکستان میں رہ گیا تھا بچے بڑے ہونے لگے تو انکو مہنگے اسکول میں داخل کروایا صبح وقاص تینوں بچوں کو اسکول چھوڑ دیتے پھر واپس آ کر ناشتہ کرتے اور تیار ہو کر اپنے بزنس آفس چلے جاتے تھوڑی دیر بعد ملازمائیں آ جاتیں ایک دو گھنٹے میں سب کام نمٹا کر چلی جاتیں ایک بجے بچوں کو چھٹی ہوتی تھی تو میں خود انہیں کار میں جا کر لے آتی وقاص کو گھر واپسی میں بہت دیر ہو جاتی اور وہ کھانا بارہ بجے گھر آتے اور کھانا کھا کر سو جاتے بچے اپنا ہوم ورک کر کے اپنے کمرے میں سو جاتے جبکہ میں شدید بوریت اور تنہائی کا شکار ہوتی تھی۔

☆......☆......☆

بوریت کا حل یہ نکالا کہ اپنی سابقہ ماضی کی روش کی طرف لوٹ آئی اور انڈین فلمیں دیکھنا شروع کر دیں اب وی سی آر VCR کی جگہ ڈی وی ڈی DVD اور سی ڈی CD پلیئر نے لے لی تھی وقاص کے آنے تک میں مختلف فلمیں دیکھتی اب یہ میرا پسندیدہ مشغلہ بن گیا تھا اب آہستہ آہستہ میں نے غیر اخلاقی انگلش فلمیں دیکھنی شروع کر دی تھیں ایسی مخرب اخلاق، شرمناک غیر اخلاقی مووِیز دیکھنی شروع کر دی ایسی سی ڈیز لینے کے لیے میں برقعہ پہن کر نقاب کر کے کالا چشمہ پہن کر رکشہ میں بیٹھ کر ایک سات سا دس کلومیٹر دور واقع ایک علاقے میں سی ڈی شاپ سے لینے جاتی تھی وہاں سے مجھے ہر ورائٹی کی سی ڈیز جن میں انگلش، انڈین، پاکستانی اور دیگر ممالک کی شامل ہوتی تھیں پٹھورے مہینے کا کوٹہ لے کر آتی تھی اور دکاندار مجھ سے ڈبل پیسے وصول کرتا تھا وہ جتنے پیسے مانگتا میں ادا کر کے خرید لیتی برقعہ پہن کر میں اپنے آپ کو مکمل چھپا کر جاتی کہ کوئی مجھے پہچان نہ سکے اور ایسا میں احتیاط کرتی اب میں ایسی گندی فلموں میں سکون اور آسودگی تلاش کرنے لگ گئی مگر سکون کے بجائے دن بدن میری طلب بڑھتی جاتی۔

کچھ دن بعد صہیب کی سالگرہ تھی تو دو چار دن تیاری میں مصروف رہی اور اتفاق سے سالگرہ والے دن اتوار تھا وقاص نے پورا دن آفس سے چھٹی کی شام کا فنکشن تھا مہمان آنا شروع ہو گئے وقاص نے اپنے ایک کزن جہانزیب کو جو کہ سرکاری ملازم تھا حال ہی میں دوسرے شہر سے ٹرانسفر ہو کر ہمارے شہر آیا تھا کو بمعہ فیملی مدعو کیا تھا جہانزیب اپنی بیوی تنزیلہ اور بیٹے جنید کو لے کر آیا۔

میں نے جیسے ہی جنید کو دیکھا تو دیکھتی رہ گئی وہ ہو بہو میرا تراشا ہوا آئیڈیل تھا گورا چٹا سرخ انتہائی خوب صورت دراز قد جس کے چہرے پر بلا کی معصومیت بھی تھی اور شوخی بھی بہترین ڈریس میں ملبوس وہ پہلی نظر میں میرے دل میں اتر گیا اس نے مجھے آنٹی کہہ کر سلام کیا اور میں نے وعلیکم السلام کہہ کر پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا جنید جس کی عمر سولہ سال تھی میٹرک میں پڑھ رہا تھا وہ جہانزیب اور تنزیلہ کی واحد اکلوتی اولاد تھا انتہائی لائق اور ذہین پڑھائی میں تیز اسٹوڈنٹ تھا نرسری سے 9th تک پوزیشن ہولڈر تھا اب 10th کلاس میں پڑھ رہا تھا اب اس کے سالانہ بورڈ کا ایگزام قریب تھا۔

☆......☆......☆

جب سالگرہ کا فنکشن ختم ہوا سب مہمان چلے گئے مگر میں نے جہانزیب اور تنزیلہ کو رات کے کھانے کے لیے روک لیا اور تنزیلہ سے دوستی کر لی جنید بہت ہنس مکھ اور شوخ چنچل لڑکا تھا جنید میرے تینوں بچوں سے گھل مل گیا اب میں ہر دوسرے تیسرے دن جنید کو دیکھنے کی خاطر تنزیلہ کا پاس جانے لگی اور کافی دیر وہاں بیٹھی رہتی تنزیلہ میری پکی دوست بن گئی وہ بہت اچھے اخلاق والی بہت شائستہ عورت تھی میری بہت عزت کرتی جہانزیب اور تنزیلہ اپنے بیٹے جنید پر بہت توجہ دیتے تھے وہ اسے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔

میرے کہنے بلکہ شدید اصرار کرنے پر جنید کبھی کبھار تھوڑی دیر کے لیے ہمارے گھر آ جاتا مگر جلدی واپس چلے جاتا کیوں کہ فائنل ایگزام بہت قریب تھا پھر وہ اپنے امتحان کی تیاری میں مصروف ہو گیا جب اس کے امتحان ختم ہو گئے تو وقاص کو بتا کر تنزیلہ جنید اور اپنے تینوں بچوں کو لے کر گھمانے مری ایبٹ آباد لے گئی دو تین دن خوب سیر کرائی پھر واپس اپنے شہر

آ گئے اب جنید روزانہ شام کو ہمارے گھر آ جاتا پھر چاروں بچے مل کر خوب کھیلتے کودتے دھما چوکڑی کرتے اور بہت خوش ہوتے پھر میں ان کو کار میں بٹھا کر گھمانے کے لیے لے جاتی ہم آئسکریم کھاتے جوس پیتے پھر مہنگے ہوٹل سے کھانا کھا کر جنید کو اس کے گھر چھوڑنے جاتی تھوڑی دیر تنزیلہ کے پاس بیٹھتی پھر بچوں کو لے کر گھر واپس آ جاتی بچے آتے ہی اپنے کمرے میں سو جاتے اور میں وقاص کے آنے تک مووی دیکھتی۔

☆......☆......☆

جنید بہت مزے مزے کی باتیں کرتا تھا لطیفے سناتا تھا نت نئی شرارتیں کرتا میں خوب ہنستی میں جنید کے ساتھ کنواری لڑکیوں جیسی حرکتیں کرتی اس کے ساتھ خوب چھیڑ خانی کرتی تو وہ کہتا ''آنٹی'' آپ بہت نٹ کھٹ ہیں آپ اتنی اسمارٹ اور فٹ ہیں کہ کوئی مان ہی نہیں سکتا کہ آپ شادی شدہ تین بچوں کی ماں ہیں تو اس پر میں جان بوجھ کر کہتی کہ ''مذاق اچھا کر لیتے ہو'' تو جنید کہتا نہیں آنٹی! آپ تو بہت خوب صورت ہیں فلمی ہیروئن لگتی ہیں۔ جنید کے منہ سے اپنی تعریف بہت اچھی لگتی میں کہتی ''جنید تمہارے وقاص انکل کو تو میں ذرا بھی اچھی نہیں لگتی تو وہ کہتا ''آنٹی! انکل تو بہت بدذوق ہیں آپ تو سچ مچ میں بہت پیاری ہیں کہ جاپانی گڑیا لگتی ہیں'' اور یہ سب کچھ جنید معصومیت اور بھول پن سے کہتا۔

جنید کے منہ سے ایسی باتیں سن کر مجھے بہت تسکین ملتی وہ مجھے بہت اچھا لگتا اور مجھے جنید پر بہت پیار آتا اور میں اس کے سر کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی اور گال پر ہلکی سی چٹکی کاٹ دیتی جنید کے لیے مزے مزے کا کھانے بناتی وہ جس طرح کے کھانے بناتی وہ جس طرح کے کھانے یا ڈش کی فرمائش کرتا میں خود بنا کر اسے کھلاتی وہ میرے ہاتھ کے بنے کھانے کی دل کھول کر تعریف کرتا جسے میں سن کر نہال ہو جاتی اور وہ لاڈ سے میرے ہاتھ چوم لیتا تو میری روح خوشی سے سرشار ہو جاتی۔

☆......☆......☆

ایک دن میں نئی سی ڈی لے کر آئی جس میں ایک جوان اٹھارہ سال کے لڑکے اور میری ہم عمر آنٹی کی فلم تھی میں نے وہ شرمناک مووی رات کو دیکھی تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی میں نے اس آنٹی کی جگہ اپنے آپ کو اور اس لڑکے کی جگہ جنید کو محسوس کیا وقاص رات کے بارہ بجے گھر آتے اور آتے ہی سو گئے جب کہ میں ساری رات انگاروں پر لوٹتی رہی بہت تشنگی محسوس کی اگلے دن جب وقاص اپنے بزنس آفس اور بچے اسکول چلے گئے تو ناشتے کے بعد جب میں نے ملازماؤں کو چھٹی دے دی کہ ضروری کام سے باہر جا رہی ہوں تو نہا دھو کر خوب بن سج کر تیار ہوئی اور دس بجے کار لے کر سیدھی جنید کے گھر چلی گئی تنزیلہ سے ملی تو وہ بہت مصروف تھی میں نے کہا مجھے بازار میں کام ہے تو میرے ساتھ آؤ جس پر اس نے کہا وہ کپڑے دھو رہی ہے نہیں جا سکتی تم جنید کو ساتھ لے جاؤ اور یہی میں چاہتی تھی تنزیلہ نے جنید سے کہا بیٹا تم آنٹی کے ساتھ چلے جاؤ تو

جنید نے ڈریس چینج کیا اور میں اسے ساتھ لے کر بازار آ گئی ایک دو چھوٹی موٹی چیزیں خریدیں جنید کے ملیا پینٹ شرٹ خریدی اور ساڑھے گیارہ بجے گھر آ گئی جنید کو ٹی وی لاؤنج میں بٹھا دیا میں نے جان بوجھ کر خود لڑکے اور آنٹی والی شرمناک مووی سی ڈی پلیئر میں لگائی ہوئی تھی ریموٹ کنٹرول ٹیبل پر پڑا ہوا تھا تو جنید نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کیا تو فلم چلنے لگی اس میں پہلے پانچ سے سات منٹ کا سین نارمل تھا جس میں لڑکا اور آنٹی باتیں کرتے ہیں جب ان کی شرمناک حرکتیں شروع ہونے لگیں تو میں جان بوجھ کر اٹھ گئی اور جنید سے کہا میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں اور اسے تنہا چھوڑ دیا اب ظاہر ہے جنید نے وہ سارے مناظر دیکھے ہوں گے۔

☆......☆......☆

میں پندرہ بیس منٹ کے بعد چائے کا کپ لے کر آئی تو اس نے ٹی وی بند کر دیا وہ اچھا خاصا ڈسٹرب لگ رہا تھا میں نے چائے کا کپ پکڑاتے ہوئے جان بوجھ کر اپنا ہاتھ اس کی انگلیوں سے ٹچ کیا

حکمتِ عملی

تقریباً 6 ہزار پاکستانی اس وقت مرچنٹ نیوی سے وابستہ ہیں، جو روزی کمانے کی خاطر گہرے پانیوں میں سفر کرتے ہیں۔ تیز و تند موجوں کا سامنا کرتے ہیں، طوفانوں سے لڑتے ہیں، مہینوں گھروں سے دور رہتے ہیں تا کہ اپنے گھر والوں کو وہ سہولیات دے سکیں جو ان کا حق ہے۔ دسمبر 2009ء کو بھی ایک بحری جہاز جس پر 29 پاکستانی سوار تھے ان بحری قذاقوں کے ہاتھوں یرغمال بنا مگر بعد میں تاوان ادا کرنے کے بعد وہ تمام افراد بخیر و عافیت اپنے پیاروں سے آن ملے مگر ہر شخص خوش نصیب بھی تو نہیں ہوتا...... ہر بیٹے کے نصیب میں باپ کی خدمت نہیں ہوتی...... ہر بیٹی کو والدین کی جانب سے دی گئی دعا کہ سدا سہاگن رہنا عرشِ بریں پر شرف قبولیت نہیں پاتی...... ہر ماں کی بھی یہ خواہش کہ میرا بیٹا میرے جنازے کو کاندھا دے پوری نہیں ہوتی...... مگر یہ تو ہوسکتا ہے کہ ذمہ داران، بحری قذاقوں سے نمٹنے کے لیے موثر حکمت عملی تیار کریں، سانحہ کے بعد پورے دکھ سے بیان دینے کے بجائے عمل سے ثابت کریں کہ اس بار وہ واقعی میں دکھی ہیں۔

منزہ سہام کے کالمز کی کتاب ''اُجلے حروف'' سے ایک اقتباس

دور اس کے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گئی اس نے آدھا کپ چائے کا پی کر پیالی میز پر رکھ دی اس کی بچائی ہوئی چائے میں نے پی لی اور مخمور نگاہوں سے میٹھی مسکراہٹ سے بڑے لگاؤ سے اس کو دیکھنے لگی پھر صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر اپنا سر دبانے لگی جنید نے پوچھا آنٹی! ''کیا بات ہے؟'' تو میں نے کہا سر میں درد ہے تو جنید نے کہا آنٹی میں دبا دوں......؟

تو میں نے کہا ہاں جنید یہ کہہ کر میں صوفے پر لیٹ گئی اور اپنا سر اس کی گود میں رکھ دیا تو وہ ہولے ہولے میرا سر دبانے لگا مجھ پر نشہ کی کیفیت طاری ہونے لگی جنید نے کہا آنٹی! اگر زیادہ درد ہے تو کوئی میڈیسن کھالیں تو میں نے کہا میری میڈیسن تم ہو جس پر وہ حیرانگی سے بولا

آنٹی کیا مطلب......؟

میں نے کہا تمہارے ہاتھوں میں تو جادو ہے تم دباتے رہو مجھے آرام اور سکون مل رہا ہے کسی میڈیسن کی ضرورت نہیں ہے اور ساتھ ہی پیار بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگی اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے ہاتھ تھام کر اپنے گالوں پر لگایا اور چوم لیا اور نشیلی آواز میں کہا جنید تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو اور یہ کہہ کر اس کو سینے سے لگا لیا اور دیوانگی سے اس کا منہ گال چومنے لگی اب وہ بھی صحت مند جوان لڑکا تھا اس پر فلم کا اثر بھی تھا اور میرے بوسوں نے اپنے ساتھ لپٹانے کی وجہ سے اس پر شیطان حاوی ہوگیا تھا میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اسے بیڈ روم میں لے آئی اور وہ کسی روبوٹ کی طرح میرے ساتھ میرے کمرے میں آگیا میں نے روم لاک کر دیا۔

☆......☆......☆

جب ایک گھنٹے بعد ہم دونوں کمرے سے باہر آئے تو جنید اپنا بچپن لڑکپن بھول پن اور معصومیت کھو چکا تھا اور ایک گھنٹے میں میری پرلطف قربت نے اسے لڑکے سے مرد بنا دیا تھا۔ میں بہت خوش تھی جیسے بہت بڑا معرکہ فتح کر لیا ہو مجھے تسکین ملی اور پیاس بجھی۔ اُدھر جنید بھی زندگی میں پہلی مرتبہ ایک انتہائی حسین خوب صورت جوان عورت کے لمس سے آشنا ہوا تھا اس پر بھی سرشاری کی کیفیت طاری تھی بس پھر کیا ہوا

ب جنید بلا ناغہ روزانہ آ جاتا اور پھر خوب رنگ رلیاں
تا۔

کچھ دن اور گزرے تو وقاص کو 15 دن کے لیے
ون ملک جانا تھا وہ اگلے روز چلا گئے میں نے تنزیلہ
بھارات کو جنید کو ہمارے گھر بھیج دیا کریں اکیلے
ڈر لگتا ہے وہ بچوں کے ساتھ سو جایا کرے گا تو
طرح وہ پندرہ راتیں میں نے جنید کے ساتھ میاں
کی طرح گزاریں مین اس قدر زلت کی گہرائی
گر چکی تھی کہ سب کے سامنے اسے جنید بیٹا کہہ کر
تی اور تنہائی میں میری جان، جند جان، سویٹ شہزادہ
پتہ نہیں کیا کچھ کہتی اور آنٹی سے اس کی محبوبہ بن
میں نے ایک طرف اپنے خاوند کی امانت میں
نت کی مرتکب ہو کر اپنی عزت پامال کر رہی تھی تو
سری طرف ایک معصوم لڑکے کے کردار کو داغ دار کر
عاقبت خراب کر رہی تھی وہیں دنیا والوں کی
ں میں دھول جھونک رہی تھی۔

تنزیلہ اور جہانزیب اپنے لخت جگر جنید کو میرا
بچہ سمجھتے تھے اور خالہ مذ ہمیکے گھر اندھا اعتماد کر کے
تے تو میں ان کے اعتماد کی دھجیاں اڑا رہی تھی
اس پندرہ دن یورپ میں گزار کر آ گئے میرے لیے
سارے قیمتی چیزیں لے کر آئے اور اپنی محبتیں مجھ
پر نچھاور کیں۔

کچھ دن بعد جنید کا میٹرک کا رزلٹ نکلا تو اس
بورڈ میں سیکنڈ پوزیشن حاصل کی تھی اس کی شاندار
یابی کی مبارک باد دینے جہانزیب اور تنزیلہ کے
آ گئی ان کو مبارک باد دی بہت سے قیمتی تحفے
گھڑی، مہنگا کیمرہ، پرفیوم، کپڑے وغیرہ لے گئی
ایک لاکھ روپیہ نقد دیا کہ اپنی موٹر سائیکل خرید لو تو
پر اس کے والدین نے بہت احتجاج کیا یہ سب
سے منع کیا میں نے بیشری اور ڈھٹائی سے کہا کہ
را خالہ اور بھنجے کا نجی معاملہ ہے تو کہا میرا کوئی حق
جنید پر ......؟ تو میرے اسرار پر بادل نخواستہ
سب کچھ قبول کرنا پڑا وہ بے چارے دل میں یہ
رہے تھے شاید میں جنید کو اپنا داماد بنانے کا ارادہ
ہوں جو اتنی نوازشات کر رہی ہوں۔

☆......☆......☆

پھر میں نے پوری فیملی کو گھر بلا کر شاندار دعوت
کھلائی پھر جنید کا FSC میڈیکل کا داخلہ ایک بہت
بڑے کالج میں ہو گیا جنید نے ہونڈا موٹا سائیکل
125 زیرو میٹر خرید لیا اور اس نے کالج آنا جانا
شروع کر دیا ہم پچھلے ڈیڑھ دو مہینے سے شیطانی فعل
مسلسل کر رہے تھے تو جہاں میری ہوس پوری ہو رہی
تھی تو وہیں جنید کو اس کا خوب چسکا پڑ گیا اب اس کا
میرے بغیر دل نہیں لگتا تھا وہ میری قربت کا عادی ہو
گیا تھا۔

اب جیسے ہی اس کا پیریڈ خالی ہوتا وہ سیدھا
میرے پاس آ جاتا اور ہم بیڈ روم میں بند ہو جاتے کئی
دفعہ وہ کالج جانے کے بجائے سیدھا میری طرف
آ جاتا اور چھٹی کے وقت واپس لوٹ جاتا جس کا نتیجہ
یہ نکلا کہ وہ آہستہ آہستہ پڑھائی سے غافل ہوتا گیا میں
اس کو ہزاروں روپے دیتی موٹر بائیک کا پیٹرول ٹینک
فل کروا دیتی وہ سارا دن آوارہ گردی کرتا کالج کی سطح
پطر ہونے والے امتحان میں اس کی کارکردگی کچھ
بہتر رہی مگر دو سال بعد جب بورڈ کا FSC کا
رزلٹ آیا تو پوزیشن ہولڈر جنید بمشکل ساٹھ فیصد نمبر
حاصل کر سکا بہت تھوڑے نمبر آئے تھے اور ان نمبروں
کے ساتھ کسی بھی میڈیکل کالج میں داخلے کا کوئی چانس
نہ تھا جب جہانزیب اور تنزیلہ نے جنید کا رزلٹ دیکھا تو
وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے تنزیلہ رونے لگ گئی کیوں کہ ان کی
امیدوں کا واحد مرکز تھا مگر اس نے ان کی امیدوں پر
پانی پھیر دیا تھا جنید کے والدین اور کالج کے ٹیچر بہت
پریشان تھے کہ اتنا بریلینٹ اسٹوڈنٹ پوزیشن ہولڈر
ایک دم اتنا نیچے کیسے آ گیا اتنا خراب رزلٹ؟۔

☆......☆......☆

جنید میرے دیئے ہوئے ہزاروں روپوں سے
خود بھی عیاشی کرتا اور اپنے دوستوں کو بھی خوب کھلاتا
پلاتا عیاشی کرواتا تو اس کے دوست پوچھتے کہ تمہارا
باپ تو ایک چھوٹا سا سرکاری ملازم ہے تو تم یہ شان
آن بان نیا موٹر بائیک اور اتنے ڈھیر سارے پیسے
کہاں سے لیتے ہو......؟ تو وہ چٹخارے اور مزے لے

کر میرے اور اپنے تعلقات کا ذکر خوب مرچ مصالحہ لگا کر کرتا کہ آنٹی مدیحہ اپنے جسم کے ساتھ ساتھ ہزاروں روپے بھی روزانہ دیتی ہے۔

جب جہانزیب نے کالج جا کر تحقیق کی اپنے طور پر جنید کے دوستوں سے الگ الگ جا کر بہت پیار اور راز داری سے ملے تو اس کو تمام صورتحال کا پتہ چل گیا دونوں میاں بیوی حیران اور ششدر رہ گئے میرے کالے کرتوتوں کی مکمل داستاں سے وہ مکمل آشنا ہو گئے دونوں میاں بیوی انتہائی سمجھ دار تھے معاملہ فہم تھے شور اور واویلہ مچانے کے انہوں نے خاموشی اختیار کر لی کیوں کہ میرا کچھ بگڑتا یا نہ بگڑتا مگر ان کا بیٹا ضرور بدنام ہو جاتا انہوں نے خاموشی سے ہمارے ساتھ اپنے تعلقات میل جول ختم کر دیا۔

تنزیلہ نے جنید کے آگے ہاتھ باندھے بہت روئی خدا کے واسطے دیے تو جنید سنبھل گیا فوری طور پر گھر میں ٹیوٹر کا بندوبست کیا گیا دوبارہ داخلہ بھجوایا گیا موٹر سائیکل بھی بیچ دیا اور ہر طرح سے اس کا پہرہ دیا جانے لگا تا کہ وہ یکسوئی سے امتحان کی تیاری کر سکے۔

ادھر میری یہ حالت تھی کہ مجھے دو سال سے کسی نشے کی طرح جنید کی لت پڑ گئی تھی اب میں ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی اپنی اس عادت سے مجبور ہو کر میں نے مختلف جوان لڑکوں سے دوستیاں لگائیں میں ہر لڑکے میں جنید کو تلاش کرتی مگر ان میں سے کسی میں بھی جنید جیسی بات نہیں تھی۔

☆......☆......☆

انہیں دنوں میں میری دوستی ایک نئے لڑکے ھاشم سے ہوئی جو کہ کافی حد تک جنید سے مشابہ تھا ایک غریب گھرانے کا لڑکا تھا عمر اٹھارہ سال تھی بے روزگار تھا وہ روزانہ آ کر جنید کی کمی پوری کرتا اس کا جنید جیسا انداز تھا مجھے ہر لحاظ سے مطمئن کرتا تھا جس کے بدلے کے لیے میں اسے ہزاروں روپے دیتی اس کی ہر فرمائش پوری کرتی تو اس طرح میں اپنے خاوند کی کمائی دونوں ہاتھوں سے لٹا رہی تھی۔ میں اب جنسی مریضہ بن چکی تھی اور اپنی دھن میں اتنی مگن تھی کہ اپنے تینوں بچوں سے مکمل غافل ہو چکی تھی بچوں کی پڑھائی کیسی جا رہی ہے وہ اسکول میں کیسے ہیں مجھے اس بات کا بالکل علم نہیں تھا۔

کوئی دو سال پہلے وقاص نے اپنے کام کے لیے ایک ملازم رکھا تھا تو اس کے لیے ایک نیا زیرو میٹر موٹر سائیکل خرید کر اسے دیا کہ وہ جلدی جلدی بازار اور ارد گرد کے کام نمٹا سکے ایک سال وہ ملازمت کرتا رہا پھر وہ نوکری چھوڑ کر چلا گیا تو اس طرح پچھلے ایک سال سے وہ موٹر سائیکل ہمارے گیراج کے ایک کونے میں کھڑی تھی۔ ایک دن ہاشم نے مجھے بہت خوش کیا تو میں نے ترنگ میں آ کر وہ موٹر سائیکل اس کو تحفے میں دے دی جسے لے کر وہ بہت خوش ہوا کہ خوب صورت جوان آنٹی کے جسم کے ساتھ ساتھ ہزاروں روپے اور مفت میں موٹر سائیکل بھی تو اس کی موج ہو گئی۔

☆......☆......☆

کوئی ایک ہفتے بعد اچانک وقاص نے مجھ سے پوچھا اس موٹر سائیکل کا پوچھا تو مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو میں نے جھوٹ بول دیا کہ موٹر سائیکل چوری ہو گئی ہے تو وقاص نے پوچھا کس طرح چوری ہوئی ......؟ تو میں نے بہانا بنایا کہ ملازمہ جسکا نام راشدہ ہے ایک دن گیٹ کھلا چھوڑ گئی تھی تو اچانک ایک چور اندر گھس آیا اور موٹر سائیکل لے کر بھاگ گیا میں نے بہت شور مچایا مگر کسی نے میری آواز نہیں سنی۔ میں نے اپنے طور پر وقاص کو مطمئن کرنے کی کوشش کی تو وقاص خاموش ہو گئے وقاص ایک کروڑ پتی بزنس مین تھا تو ہمارے نزدیک اُس ستر اسی ھزار روپے کی مالیت کی موٹر سائیکل کی اہمیت ستر روپے جتنی تھی ہمارے لیے وہ بہت ہی معمولی اور غیر اہم آئیٹم تھی۔

وقاص کے دل میں پتا نہیں کیا بات آئی انھوں نے اگلے روز پولیس اسٹیشن میں موٹر سائیکل کی ایف آئی آر درج کروا دی۔ چونکہ وہ موٹر سائیکل وقاص کے نام تھی تو ان کو یہ خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں چور وہ موٹر سائیکل کسی واردات میں استعمال نہ کرے اور ان دنوں چوری شدہ موٹر سائیکلوں میں بم فٹ کر کے دھماکے بھی کیے جا رہے ہیں تو انھوں نے کسی بھی

ناخوشگوار سنگین صورتحال سے بچنے کے لیے تھانے میں رپورٹ درج کروائی تھی تاکہ خدا نخواستہ ایسی صورتحال میں وہ بری الذمہ ہوں گے۔

خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اگلے روز ایک پولیس ناکے پر ہاشم کو موٹر سائیکل پر پولیس نے پکڑ لیا سے گرفتار کر کے موٹر سائیکل سمیت تھانے لے گئے کیوں کہ ایف آئی آر کے مطابق ہاشم چور تھا اور چوری شدہ موٹر سائیکل سمیت پکڑا گیا تھا تھانیدار نے فون کر کے وقاص کو پولیس اسٹیشن بلایا تو انہوں نے وہ موٹر سائیکل پہچان لی۔

ہاشم مان نہیں رہا تھا کہ اس نے موٹر سائیکل چوری کی ہے۔ پولیس نے پوچھا کہ اگر چوری نہیں کی تو وہ اس کے پاس کیسے آ گئی؟ جس پر وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا جب تھانیدار نے روائتی طریقے سے تفتیش کی تو اس نے دومنٹ میں اگل دیا کہ یہ موٹر سائیکل بیگم وقاص مدیحہ نے اسے تحفے میں دی ہے اور تحفہ کیوں کس لیئے دیا اور ہاشم کا کیا تعلق ہے مدیحہ سے تو اس نے ساری اسٹوری بک دی اور میرے کالے کرتوت وقاص کے سامنے آ گئے۔ تھانیدار ہاشم کی بات تصدیق میرا بیان اور تفتیش کے لیے وقاص اور ہاشم کے ساتھ ہمارے گھر آیا جب یہ صورت حال دیکھی تو میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور رنگ اڑ گیا میں نے انکار کیا مگر تھانیدار بہت جہاندیدہ اور تجربہ کار آفیسر تھا وہ ساری صورت حال سمجھ گیا کہ ہاشم سچ بول رہا ہے میں جھوٹ بول رہی ہوں۔

☆......☆......☆

ہاشم نے بتایا کہ اگر میں چور ہوتا تو وہ اس طرح آرام سے موٹر سائیکل پر نہ گھوم رہا ہوتا اس نے یہ بھی بتایا کہ بیگم صاحبہ نے موٹر سائیکل کی رجسٹریشن بک اور وقاص کے شناختی کارڈ کی کاپی بھی خود دی تھی کہ اپنے نام ٹرانسفر کروالو۔ نوکرانی راشدہ نے بھی بیان دیا کہ وہ ہمیشہ ذمہ داری سے گیٹ بند کرتی ہے کبھی کھلا نہیں چھوڑتی ہے اور اس نے مزید بھی تصدیق کی کہ ہاشم روزانہ بیگم صاحبہ سے ملنے آتا تھا مگر وہ خاموش رہتی تھی اور اپنی زبان بند رکھی بلکہ مزید یہ ہوا کہ راشدہ

نے جنید کین بات بھی وقاص کو بتا دیا کہ سوا دو سال وہ بھی آتا رہا یہ سن کر وقاص شدید صدمے میں آ گئے انہوں نے بڑے مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا اور پولیس کو دے دلا کر معاملہ رفع دفع کروایا۔

پھر جہانزیب اور تیز یلہ سے جا کر پوچھا اور تعلقات ختم کرنے کی وجہ پوچھی تو جہانزیب نے ساری بات بتا دی اور جنید والا معاملہ وقاص کو بتایا اور بتایا اس لیے خاموشی اختیار کر کے میل جول ختم کر دیا کہ مدیحہ کے ساتھ ساتھ جنید کی بھی بدنامی نہ ہو وقاص کو جب میرے تمام کالے کرتوتوں اور شرمناک حرکتوں کا علم ہوا گھر سے لاتعداد موویز کی سی ڈیز بھی مل گئیں تو وقاص نے مجھے خوب مارا۔ مار مار کر جب تھک گئے تو نڈھال ہو کر صوفے پر گر گئے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

میں ان کے قدموں سے لپٹ گئی اور رو رو کر معافیاں مانگنے لگی مگر وقاص نے مجھے ایک ٹھوکر سے پرے دھکیل دیا اور غصے سے دھاڑ کر بولے دفع ہو جاؤ بے غیرت عورت تم نے میرے پیار اور آزادی کا یہ صلہ دیا۔

☆......☆......☆

میری عزت اور غیرت کا جنازہ نکال دیا میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا اور تمہیں طلاق دیتا ہوں میں نے ہاتھ جوڑے گڑگڑائی مگر وقاص نے میری ایک نہ سنی کہنے لگے کہ تم نے میری عزت وقار اور اعتماد کی دھجیاں اڑا دی ہیں تم ایک بے حیا، بے شرم انتہائی گھٹیا اور گری ہوئی عورت ہو اب میں تم کو ایک منٹ بھی برداشت نہیں کر سکتا اور یہ کہہ کر انہوں نے مجھے طلاق دے دی اور کہا کہ جو کچھ یہاں سے لینے ہے اپنے ساتھ لے جاؤ اور دوبارہ کبھی اپنی منحوس اور مکروہ شکل نہ دکھانا مجھے تم سے شدید کراہیت اور گھن آ رہی ہے اور ہاں زندگی میں بھی بچوں سے ملنے کی کوشش بھی نہیں کرنا میں ان کو تمہارے گھناؤ اور گندے کردار کا بتاؤں گا اب دور ہو جاؤ میری نظروں سے اور ہمیشہ کے لیے دفع ہو جاؤ۔

میں روتی پیٹتی وہاں سے نکلی اور بوجھل قدموں کے ساتھ رکشہ پر بیٹھ کر بھابھی کے گھر پہنچی اور زور

زور سے رونے لگی بھابھی مجھے اس طرح روتے دیکھ کر پریشان ہوگئیں اور بار بار پوچھنے لگی کیا ہوگیا مگر میں کچھ نہیں بتا رہی تھی تو اس نے فون کر کے بھائی کو بلوایا جب بھائی گھر آئے تو میں ان کے گلے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی جب ان کو پتہ چلا کہ وقاص نے مجھے طلاق طلاق دے دی ہے تو وہ سناٹے میں آگئے۔ وہ مجھ سے بار بار پوچھتے کہ طلاق کیوں دی تو میں کیا بتاتی بس میں روئے جاتی رہی۔

☆......☆......☆

پھر بھائی وقاص سے ملے جب ان کو ساری بات کا علم ہوا تو وہ سکتے میں آگئے جب بھابھی کو مکمل بات کا طلاق کی وجہ اور میری بدکرداری کا پتہ چلا تو اس نے مجھے اپنے گھر میں رکھنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ کل کو یہ ہمارے بچوں پر بھی بری نظر رکھے گی اور کیا پتہ ہمارے بچوں کو بھی خراب کر دے یہ سن کر میرے پاؤں تلے زمین نکل گئی اور میری روح زخمی ہوگئی میں تو اس کے بچوں کی پھوپھی تھی ایسا سوچ بھی نہیں سکتی تھی مگر میرا کردار جو سامنے آ گیا تھا اس کے مطابق تو میں اسی سلوک کی مستحق تھی کیوں کے میں نے ایک منہ بولے رشتے کی تقدس کو پامال کیا تھا۔

بہر حال کچھ دن بھائی کے گھر میں بالائی منزل پر ایک کمرے میں گزارے میں بھابی جن کی نظروں میں نفرت، غصہ اور حقارت تھی تو ان کا سامنا نہیں کر سکتی تھی بس یہی ہر وقت کمرے میں بند رہتی نوکرانی تین ٹائم کا کھانا دے جاتی جو میں زہر مار کر لیتی پھر بھائی نے ایک علاقے میں ایک چھوٹا سا مکان خرید کر میرے نام کر دیا اور ضرورت کا سامان بھی ڈال دیا تھا خدا کا شکر ہے ٹھوکریں کھانے اور رُلنے سے بچ گئی آخر میرا بھائی ماں جایا تھا تو اس نے مجھ پر یہ احسان کیا تھا چنانچہ میں اس مکان میں شفٹ ہوگئی۔

☆......☆......☆

اب میں دن رات روتی ہوں مجھے اپنے گناہوں اور کرتوتوں پر شدید ندامت ہے اللہ سے معافی مانگتی رہتی ہوں مگر بھابی کہ وہ الفاظ میرے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح لگے جن کے مطابق کہ کل کو میں ان کے بچوں کو بھی خراب کر دوں گی میں اپنی نظروں سے خود گر چکی ہوں جی چاہتا ہے زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں اگر خودکشی حرام نہ ہوتی تو اب تک کر چکی ہوتی اپنی جنت کو میں نے اپنے ہاتھوں برباد کر دیا۔

یہ مکان جس محلے میں واقع ہے وہاں سب متوسط طبقے کے لوگ رہتے ہیں یہ شکر ہے کہ کسی کو میرے ماضی کا علم نہیں ہے میں نے یہی مشہور کیا ہوا ہے کہ لاوارث بیوہ ہوں اور ہاں یہ بتانا بھول گئی ہوں کہ ہاشم کے ساتھ ناجائز تعلقات کے نتیجے میں ایک ناجائز بچہ نے اسی گھر میں جنم لیا میرے اور ہاشم کے ناجائز تعلقات کی نشانی بیٹے کی شکل میں میرے پاس ہے اس کا نام سہراب رکھا ہے اور ولدیت کے خانے میں ہاشم کا نام لکھوایا کیوں کہ وہ ہو بہو ہاشم کی کاپی ہے۔

☆......☆......☆

بھائی ہر مہینے معقول رقم میرے بنک اکاؤنٹ میں جمع کروا دیتا ہے اور میں مہینے بعد جا کر بنک سے لے آتی ہوں محلے والوں کو یہی بتاتی ہوں مرحوم خاوند کی پنشن ہے تنہائی شدید کرب میں وقت گزر رہا ہے اپنوں کی صورت دیکھنے کو ترس گئی ہوں کوئی مجھ سے ملنا پسند نہیں کرتا علیشباہ، عشال اور ضہیب بہت یاد آتے ہیں تو بہت روتی ہوں ہاں اب رونا ہی میرا مقدر ہے تنہائی سے بچنے کے لیے سلائی اسکول جوائن کر لیا ہے۔

☆......☆......☆

صحت بہت گر گئی ہے سب حسن و جمال ختم ہو گیا ہے شوگر، بلڈ پریشر کی مریضہ ہوں جسم پھول گیا نظر بھی کمزور ہے۔ میری روح کے زخموں کی کسک بہت بے چین رکھتی ہے۔ نماز، روزہ، تلاوت کرتی ہوں رو رو کر گناہوں کی معافی مانگتی ہوں مگر روح کو لگے زخم ہر وقت رستے ہیں سکون نہیں ملتا۔ سہراب کی پرورش کر رہی ہوں کہ اب یہی میرے بڑھاپے کا سہارا ہے ۔ میری گناہوں کی معافی اور سکون کے لیے ضرور دعا کیجئے گا یہ میری درخواست ہے۔

☆☆......☆☆

تیسرا شعلہ

چشم آزار

ایم ارشد وفا

گوجرانوالہ سے، خوبصورت چہرے کے پیچھے چھپے بدصورت کردار کی تصویر

نیلی نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب ایک زور دار آواز میں بند کر دی اور بڑے ہی الجھے ہوئے انداز میں وہ غزالہ کی طرف گھوم گئی اور بڑے ہی چبھتے ہوئے انداز میں بولی۔

''بس یا کچھ اور تعریف رہ گئی ہے اس پرنس کی تمہارے پاس۔''

''ایمان سے نیلی وہ اتنا اسمارٹ اور ہینڈسم ہے کہ میں نے آج تک ایسا آدمی نہیں دیکھا''

غزالہ کے منہ سے اتنی تعریف سن کر نیلی جھلا گئی

''دیکھو غزالہ اگر تم مجھے پارٹی میں اس لیے بلا رہی ہو کہ میں اس سے مرعوب ہو جاؤں گی تو یہ اس کی غلط فہمی ہے تم جیسی لڑکیوں نے ہی ایسے لڑکوں کا دماغ خراب کر رکھا ہے نہ جانے کتنی لڑکیاں اس کے ہاتھوں زک اٹھا چکی ہوں گی۔ مگر عقل پھر بھی نہ آئی۔''

نیلی کی باتیں سن کر غزالہ مسکرا پڑی اور اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھماتے ہوئے شرارت سے بولی۔

''تم لاکھ ڈائیلاگ بولو مگر تم کو کل پارٹی میں آنا ہوگا۔''

''اچھا بھائی......'' غزالہ ہاتھ ہلاتی ہوئی پردے کے پیچھے غائب ہوگئی اور نیلی سوچتی رہ گئی کہ لڑکی ہے یا آفت خیر کل دیکھا جائے گا یہ سوچتے ہوئے اس نے دوبارہ ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب کھولی مگر غزالہ کی باتوں سے ذہن بالکل مایوس ہو چکا تھا وجہ کتاب تپائی پر پھینک کر باغ کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی اس کی نظریں دور افق میں جمی ہوئی تھیں۔

اچانک اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے دور جانی پہچانی آنکھیں اوراق ماضی سے اسے جھانک رہی ہوں ...... ہاں یہ آنکھیں...... یہ آنکھیں...... شمع ہی کی تو ہیں جو اس کی عزیز ترین سہیلی تھی شمع جو شمع تھی یا شاید اپنے نام کی طرح اس کی تقدیر میں جلنے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا ماضی کے کچھ اور دریچے وا ہوئے۔ کچھ اور نقوش نمایاں ہوئے۔ کچھ اور زخم تازہ ہو گئے۔

☆......☆......☆

آج سے پانچ سال قبل نیلی کے والد کا تبادلہ حیدر آباد سے کراچی ہوا اس نے جب اس شہر میں قدم رکھا تو اسے ہر چیز اجنبی سی لگی، وہ کھوئی کھوئی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی اگلے دن اس کا کالج میں داخلہ ہو گیا مگر اس کا دل نہ لگ رہا تھا اجنبی چہرے اجنبی ماحول وہ کالج کے لان میں تنہا ایک درخت سے ٹیک لگائے کھڑی تھی کہ اچانک آہٹ سن کر چونک پڑی

ایک طرف اپنے سامنے ایک کانمی سی لڑکی کو دیکھ کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ سی دوڑ گئی۔

''مجھے شمع کہتے ہیں'' آنے والی لڑکی نے مسکرا کر کہا اور آگے ہاتھ بڑھا دیا۔

اور مجھے ......نیلم......تمہیں نیلی کہتے ہیں۔ نیلی نے گڑبڑا کر جلدی سے کہا اور اس کا ہاتھ تھام لیا یہ تھی نیلی اور شمع کی پہلی ملاقات ...... پھر تو یہ دوستی اتنی پکی ہوئی کہ وہ دونوں ایک جان دو قالب بن گئیں پھر ایک دن شمع نے بہت ہی راز کی بات نیلی کو بتا دی اور تب اس پر یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ جاوید سے جلد ہی اس کی منگنی ہونے والی ہے انکی محبت چار سال کی ہو گئی تھی۔

نیلی کے والد کراچی میں تین سال ہی رہے اور پھر انکا تبادلہ اسلام آباد ہو گیا نیلی اور شمع میں جدائی حائل ہو گئی مگر ان کی دوستی اب بھی قائم رہی ہے جب تک کہ جب شمع کی منگنی جاوید کے ساتھ ہوئی تھی تو اس نے وہ تصویریں تک نیلی کو بھجوا دی تھیں ......

اس کے بعد اس کی کوئی خبر نہ ملی ...... ایک دن اس کو شمع کا لکھا ہوا نہایت ہی مختصر سا خط کراچی سینیٹوریم سے موصول ہوا۔

خط پڑھ کر اس کا دل زور سے دھڑکنے لگا جس میں صرف یہ لکھا تھا۔

''میں آج سینی ٹوریم میں ہوں اور وہ چاند جو کبھی میرے دل کو منور کرتا تھا وہ کہیں اور ضیا پاشی کر رہا ہے نیلی! ایک چکوری کا جو انجام ہوتا ہے ...... وہی اپنا ہوا ...... اب دعا ہی کر دینا ...... یہ شمع جلد گل ہو جائے جسے میں نے اپنا سمجھا تھا ...... وہ ہرجائی تھا بھونرا تھا جو کسی اور پھول پر منڈلا رہا ہوگا۔''

وہ خط پڑھ کر نیلی کتنا روئی یہ اس کو آج بھی یاد ہے۔

اچانک نیلی کو اپنے کاندھے پر کسی کا ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا وہ چونک پڑی پیچھے نیلی کی امی کھڑی تھیں وہ نیلی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر چونک گئیں ارے! نیلی تم رو کیوں رہی ہو کیا ہوا؟ کسی سے لڑائی ہو گئی؟ ایک



ہی سانس میں وہ نہ جانے کتنے سوالات کر گئی۔

''کچھ نہیں امی..... آپ بیکار پریشان ہو رہی ہیں مجھے شمع یاد آ گئی تھی'' اس نے اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا۔

دوسرے دن وہ ناخنوں پر پالش لگاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ غزالہ کے ہاں جائے۔ مگر آخر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی شام کو غزالہ کی پارٹی میں پہنچ گئی

گیٹ پر ہی غزالہ اس کو دیکھتے ہی بڑے معنی خیز انداز سے مسکرائی اس کے مسکرانے پر نیلی کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

''کیوں کیا بات ہے؟''

''اف توبہ..... نیلی! تم تو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی ہو ویسے آج جچ رہی ہو'' غزالہ نے کہا نیلی نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اس کے ایک دھپ جماتے ہوئے کہا ''اچھا بکواس بند کرو ادھر اُدھر لوگ کھڑے ہیں کیا سوچیں گے چلو اندر چلیں'' نیلی نے غزالہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے۔

ایک طائرانہ نظر لان پر ڈالی تو لان کے ایک کونے میں لڑکیوں کی ایک ٹولی کسی کے گرد بیٹھی تھی نیلی کی نظروں کے تعاقب میں بھی غزالہ کی نظریں بھی اسی سمت میں اٹھ گئیں۔

''نیلی آؤ تم کو مہمان خصوصی سے ملاؤں وہ نیلی کو گھسیٹتے ہوئے اس طرف چل پڑی

''شکیل بھائی! ان سے ملیے یہ میری عزیز ترین سہیلی نیلی اور نیلی ان سے ملو یہ میرے کزن شکیل۔''

نیلی آنکھیں پھاڑے شکیل کو دیکھ رہی تھی اچانک غزالہ نے اس کی چٹکی کاٹ لی۔

''ارے'' کہہ کر نیلی چونک گئی۔

نیلی کے اس طرح چونکنے ہونے پر باقی لڑکیاں اور شکیل بھائی زور سے ہنس پڑا اور نیلی جھینپ گئی۔

''اچھا اب آپ کا تعارف ہو چکا۔ ذرا میں اندر خالہ جان سے بھی مل آؤں'' نیلی نے اپنی بوکھلاہٹ کو سنبھالا دیتے ہوئے مسکرا کر غزالہ کی طرف دیکھا اور ایک اچٹتی سی نظر شکیل پر ڈالتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

غزالہ کے یہاں پارٹی بڑی زور دار تھی کہیں شام کے نو بجے نیلی کو گھر جانے کی اجازت ملی ..... گھر آ کر بھی نیلی کھوئی کھوئی سی تھی۔ اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ شکیل کو بہت پہلے سے جانتی ہو وہ آنکھیں جیسے اس نے پہلے بھی کہیں دیکھ رکھی ہوں مگر کہاں..... کہاں؟ ساری رات اس کی ان ہی سوچوں میں گزر گئی صبح کو وہ اٹھی تو طبیعت بڑی مکدر سی تھی سرخ سرخ آنکھیں اس کی پریشانی اور الجھنوں کی غمازی کر رہی تھیں۔

ناشتے کی میز پر بھی وہ کھوئی کھوئی سی تھی۔ یہاں تک کہ آخر اس کی امی نے ٹوک ہی دیا۔

''نیلی بیٹے! کیا بات ہے تم کچھ پریشان ہو؟''

جی..... جی نہیں امی جان! ایسی کوئی بات نہیں ذرا رات کو ٹھیک سے نیند نہیں آئی تو اس وجہ سے سر میں درد ہے اور کوئی بات نہیں۔''

تو پھر بیٹے آج تم کالج نہ جاؤ تو اچھا ہے امی نے تسلی آمیز انداز میں کہا

''نہیں امی ..... آج تو بڑی ضروری کلاس ہے اگر نہ گئی تو بڑی مشکل ہو گی'' نیلی نے خالی پیالی میز پر آگے کھسکاتے ہوئے کہا اور کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

اپنے کمرے میں آ کر نیلی نے کتابیں سنبھالیں اور کالج روانہ ہو گئی کالج میں جب غزالہ نے اس کی حالت دیکھی تو معنی خیز انداز میں مسکرا پڑی نیلی نے اس کی مسکراہٹ نظر انداز کر کے کتابیں سنبھالیں اور لان میں آ کر بیٹھ گئی تھوڑی ہی دیر بعد غزالہ سر پر کھڑی تھی

''کیا بات ہے نیلی! بڑی کھوئی کھوئی سی لگ رہی ہو کل تو بڑی اکڑ رہی تھی غزالہ نے بڑی شوخی سے مسکراتے ہوئے کہا''

''بکومت غزالہ! میں کل سے پریشان ہوں مجھے لگتا ہے جیسے میں نے تمہارے کزن شکیل صاحب کو کہیں دیکھا ہے..... مگر کہاں..... یہ یاد نہیں آ رہا؟''

نیلی صاحبہ! آپ نے خوابوں میں دیکھا ہو گا ''غزالہ نے فخریہ انداز میں کہا

معاف کرنا..... میرا دماغ ابھی اتنا خراب نہیں ہوا کہ میں ایسے الٹے سیدھے خواب دیکھوں۔"
نیلی نے تیوریاں چڑھا کر کہا
پھر وہ دونوں چپ ہو گئیں کیوں کہ کچھ اور لڑکیاں آ گئی تھیں اور موضوع بدل چکا تھا پھر نیلی نے کافی دن ذہن پر زور دینے کے بعد شکیل کے متعلق سوچنا چھوڑ ہی دیا اس دن کی تقریب کے بعد وہ پھر غزالہ کے گھر بھی تو نہیں گئی تھی نہ جانے کیوں اس کو یہ آنکھیں بے وفا لگنے لگیں تھیں اور ان کو دیکھ کر اس کی تیوریاں چڑھ جاتی تھیں.....

☆......☆......☆

اور پھر اس دن تو نیلی پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے جب اس نے شام کو دیکھا کہ غزالہ کچھ خواتین کو ساتھ لے کر اس کے گھر آئی ہے گاڑی سے اترنے والی خواتین میں غزالہ کی امی کے علاوہ سب ناآشنا شکلیں تھیں یہ کون لوگ ہیں نیلی نے حیران ہو کر سوچا..... مگر مہمانوں کی خاطر بھی تو ضروری تھی ان کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر امی کو اطلاع دے کر وہ اشارے سے غزالہ کو بلا کر اپنے کمرے میں آ گئی۔
"ارے یہ کون لوگ ہیں؟" نیلی نے بستر پر لیٹتے ہوئے کہا غزالہ نے بجائے جواب دینے کے گنگنانا شروع کر دیا۔
"میں تم سے پوچھ رہی ہوں یہ کون لوگ ہیں؟"
"ارے ہوں گے کون نظر نہیں آتا خواتین ہیں" غزالہ نے جیسے اس کو اور چڑایا "کیا بکواس لگا رکھی ہے ٹھیک ٹھیک کیوں نہیں بتاتیں"
بجائے کچھ بتانے کے غزالہ نے شوخی سے مسکراتے ہوئے کہا، ایمان سے نیلی تم بہت خوش قسمت ہو!!" "کیوں؟ کیوں بھلا؟" نیلی نے آنکھیں حیرت سے پھیلاتے ہوئے کہا
ارے بیوقوف ابھی بھی بات سمجھ نہیں آئی..... سنو وہ جو اپنے شکیل بھائی ہیں نا.....!"
"ہاں تو کیا ہوا ان کو؟" نیلی میں بات کاٹ دی
ارے ہونا کیا ہے غزالہ نے مسکراتے ہوئے کہا

پیمبر

تمہاری آنکھیں
کھلی کتاب لگتی ہیں
اور اتنی مقدس
جتنے آسمانی صحیفے
اپنی آنکھوں سے
مرے دل پہ دستک دینے والے
تم مری محبت کے
پیمبر ہو!!

شاعر: علی رضا عمرانی

..... ان کو محبت ہو گئی ہے۔
"مگر کتنی عدد لڑکیوں سے ہوئی ہے یہ بھی پوچھا تم نے" نیلی نے بڑے تیکھے لہجے میں پوچھا۔
"پہلے تو درجن سے تھی اب صرف تم سے ہے" غزالہ نے بڑے اطمینان سے پوچھا
"کیا؟" نیلی یوں اچھل پڑی جیسے بچھو نے کاٹ لیا ہو تمہارا دماغ تو صحیح ہے غزالہ۔" دماغ بالکل صحیح ہے جبھی تو ان خواتین کو یہاں دیکھ رہی ہو یہ خواتین ان کی ماں اور بڑی باجی ہیں۔" "اف میرے خدا یہ کیا ہوا..... نہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا"..... یہ کہہ کر نیلی نے اپنا گھومتا ہوا سر پکڑ لیا۔
اس کی یہ حالت دیکھ کر ایک لحہ کو غزالہ بھی گھبرا گئی اور پھر ان عورتوں کے جانے سے پہلے نیلی اپنے کمرے سے نہیں نکلی۔
شکیل کے متعلق سوچتے ہوئے نہ جانے کیوں نیلی کا دل جیسے بیٹھنے لگا عجیب سی گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے ایسا کیوں ہوتا تھا یہ اسے خود بھی معلوم نہ تھا..... پھر اس نے اس واقعے کو ذہن سے جھٹک دیا۔

☆......☆......☆

امتحان سر پر تھے امتحانی فارم میں اپنی ایک تصویر چسپاں کرنی تھی اس نے سوچا چھوڑو اب کون نئی تصویر بنوائے البم سے کوئی پرانی تصویر نکال کر لگا لی جائے یہ سوچ کر اس نے البم کھولا پھر اچانک جیسے

وہ اچھل پڑی سامنے صفحہ پر شمع اور جاوید کی شادی کا فوٹو چسپاں تھا اف تو ...... تو ...... یہ وہ حضرت ہیں جاوید صاحب اب اس بے چاری کو ٹھکرا کر زندہ در گور کر کے اس طرف آئے ہیں اب نیلی کو یاد آیا کہ اس تصویر کو دیکھ کر اس نے شمع کو خط لکھا تھا کہ تیرے منگیتر کی آنکھیں اتنی خوب صورت ہیں کہ بے وفا سی لگتی ہیں۔

آج اس کو اپنا جملہ یاد آرہا تھا اور اب اسے یاد آرہا تھا کہ وہ پہلی بار شکیل کو دیکھ کر کیوں چونک پڑی تھی تصویر کو دیکھ کر جہاں اس کی خلش کو سکون مل گیا وہاں اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی اور پھر کافی دنوں کے بعد جب اس کی امی نے اس کے خیالات شکیل سے متعلق جاننا چاہے تو اس نے بجائے کچھ جواب دینے کے شمع اور جاوید کی منگنی والی تصویر ان کے ہاتھوں میں تھما دی۔

☆......☆......☆

وہ بڑی مطمئن سی کالج سے نکلی تھی ابھی وہ تھوڑی ہی دور چلی ہوگی کے اچانک ایک کار اس کے پاس آکر رک گئی گھوم کر اس نے دیکھا سامنے ڈرائیونگ سیٹ پر شکیل بیٹھا تھا پیچھے غزالہ بیٹھی تھی۔

''کہاں جارہی ہو؟'' غزالہ نے پوچھا آؤ تم کو گھر چھوڑ دوں گی نیلی نے بڑی نرمی اور پرسکون سی آواز میں کہا...... ''نہیں مجھے گھر کا راستہ معلوم ہے میں خود چلی جاؤں گی''

دروازہ کھول کر غزالہ اتر آئی ...... توبہ ہے نیلی راستہ میں بحث نہ کیا کرو'' غزالہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی گاڑی میں بٹھالیا اور حالات کو دیکھتے ہوئے وہ چپ رہی تھوڑی دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ گھر کے بجائے ایک ہوٹل میں کھڑی ہے

''یہ کیا ...... یہاں کیا کام ہے؟'' نیلی نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے پوچھا

''کام کیا ہوگا ذرا چائے پئیں گے'' غزالہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا اندر کافی خنکی تھی اور ماحول بہت دل فریب تھا تینوں ایک میز کے گرد بیٹھ گئے بیٹھنے کے بعد غزالہ کو اچانک کوئی کام یاد آ گیا تو وہ اٹھ کر چلی گئی۔ شکیل اور نیلی اکیلے تھے دونوں خاموش تھے وقت رواں دواں تھا اچانک شکیل نے پہل کی

''نیلی! آپ کے گھر والوں نے میری درخواست مسترد کیوں کر دی

نیلی پہلے بڑی خاموشی کے ساتھ اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی اور پھر بولی اس کا جواب لینے آپ میرے گھر آجائیے گا۔''

اگلے دن نیلی نے اس کا استقبال ڈرائنگ روم میں ہی کیا امی کو وہ پہلے بتا چکی تھی وہ بھی آکر وہاں بیٹھ گئیں اچانک نیلی بولی

''میں اپنا البم لے آؤں آپ دیکھیں گے؟

''شکیل نے کہا...... ضرور...... اس کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ جو راز اس نے آج تک کسی کو بھی نہیں بتایا وہ آج افشا ہو جائے گا۔

نیلی نے البم لا کر شکیل کے کے ہاتھوں میں تھما دیا سارا البم دیکھنے کے بعد جوں ہی شکیل کی نظر آخری صفحہ پر پڑی تو وہ چونک گیا اور پھر نیلی کی آواز اس کی اپنی روح میں اچھی طرح اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''کیوں شکیل صاحب! اب تو آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ہم نے آپ کی درخواست کیوں مسترد کی آپ کو شاید پتہ نہ ہو کہ مجھے اپنی سہیلی شمع کتنی عزیز تھی اور وہ آپ کو وہاں پارٹی میں دیکھ کر چونک پڑی تھی اور جس سے آپ غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے وہ بھی یہی تھا آپ کو پہلی بار دیکھ کر مجھے ایسے لگا کہ میں نے آپ کو پہلے کہیں دیکھا ہے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے اس نے مجھے کسی کا مجرم بننے سے بچالیا اب آپ جا سکتے ہیں مجھے آپ کی اس حسین شکل سے نفرت ہے یہ کہہ کر'' نیلی کمرے سے ہوا کے جھونکے کی طرح نکل گئی اور شکیل ہلتے پردے کو دیکھتا رہ گیا۔

تصویر پر اس کی نظریں جم کر رہ گئیں اس کے نیچے شکیل (جاوید) کے نیچے نیلی کا ریمارک تھا۔

''بے وفا آنکھیں''

☆......☆......☆

ناگن

اعجاز احمد نواب

زندگی صرف وہی تو نہیں جو ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ زندگی تو وہ بھی ہے، جسے ہم صرف سوچتے ہیں۔ نیا سلسلہ ''ناگن۔'' آپ کو یقیناً ایک نئی دنیا، نئی زندگی میں قدم رکھنے پر مجبور کر دے گا۔ ہزاروں سال کی تپسیا پر پھیلا، زندگی کا نیا رنگ۔ ناگن کے روپ میں، آپ کو ضرور تسخیر کرے گا

قسط نمبر: 11

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

جوگی مہاراج کے پردادا کو اس کے گرو نے مرتے سمے شیش ناگ کا جوڑا دان کیا تھا اور بتایا تھا کہ ان ناگوں کے سر پر تاج کے نشان ہیں اور آنکھوں میں سنہری روشنی۔ آنکھوں کی سنہری روشنی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ بادشاہ سانپ ہیں۔ اگر یہ سو سال تک زندہ رہ گئے تو یہ نہ صرف انسان کے روپ میں آ جائیں گے، بلکہ ہر جاندار کا روپ دھار سکیں گے۔ زمین کی تہوں میں چھپے خزانے



ان کی دسترس میں ہوں گے اور اس وقت یہ جس کے قبضے میں ہوں گے یہ اسی کے حکم کے غلام ہوں گے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے ہر ساون میں اماوس کی رات ناگ دیوتا کے حضور ایک مرد اور ایک عورت کی قربانی دی جائے۔ جان جوکھوں میں ڈال کر ان کے پرکھوں نے ان ناگوں کو ناز و نعم سے پالا تھا اور نگہبانی کا یہ عمل اب جوگی مہاراج کے حصے میں آ چکا تھا۔ وہ رات بھی اماوس کی رات تھی اور ان ناگوں کی عمر کے سو سال مکمل ہونے جا رہے تھے۔ جوگی مہاراج نے یہ کہانی بیس سال سے ساتھ رہنے والے چیلے صابو کو سنائی تو اس کی نیت میں کھوٹ آنے لگا۔ گرو مہاراج ہاتھ میں خنجر تھامے ناگ منتر کا جاپ کر رہے تھے اور صابو انہیں طنزیہ نظروں سے دیکھ کر زیر لب مسکرا رہا تھا۔ جاپ مکمل کر کے جوگی مہاراج نے بلی کا عمل مکمل کیا۔ دونوں ناگ اور ناگن انسانی خون میں اشنان کر رہے تھے اور سرخ زبانیں نکال کر خون چاٹ رہے تھے۔ جوگی مہاراج بیٹھے یہ منظر غور سے دیکھ رہے تھے، یہی وہ لمحہ تھا جس کا صابو کو انتظار تھا۔ اس نے پلک جھپکنے میں خنجر کا وار مہاراج کی گردن پر کیا اور گرو مہاراج پتھرائی آنکھوں سے اپنے چیلے کو دیکھتے رہ گئے۔ صابو لاش ٹھکانے لگا کر جب کمرے میں آتا ہے تو پٹاری والی جگہ ایک خوب صورت نوجوان مرد اور سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی موجود تھے۔ صابو انہیں کہتا ہے کہ تم میرے غلام ہو۔ وہ ان کے نام ارجن اور شکنتلا تجویز کرتا ہے۔ تب ارجن اور شکنتلا اسے بتاتے ہیں کہ انہیں معلوم ہے کہ صابو ان کا گرو مہاراج نہیں بلکہ ایک چیلا ہے۔ تب صابو کے خون سے شیش ناگ کا یہ جوڑا اپنی پیاس بجھا کر شہر کا رخ کرتا ہے۔ لوگ اسے دیکھ لیتے ہیں اور اس پر تیل ڈال کر آگ لگا کر مار ڈالتے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر شکنتلا غصے میں آ جاتی ہے اور کہتی ہے۔ ''ارجن کے قاتلوں! تم نے میرے ناگ کی ہتھیا کر کے بڑا انیائے کیا، تم ناگن کی طاقت اور انتقام سے واقف نہیں، شکنتلا تمہاری زندگیوں میں زہر گھول دے گی۔ میں اس گاؤں کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گی، تم موت مانگو گے لیکن موت بھی تم سے روٹھ جائے گی۔ ایک ایک کو تڑپا تڑپا کر ماروں گی میں پھر آؤں گی اور تمہارے لیے قیامت بن کر آؤں گی۔'' شکنتلا گاؤں کے لوگوں سے جان بچا کر بھاگتی ہے اور جنگل میں موجود ریاست تابانہ کے مہاراجہ رام ناتھ کے قافلے تک جا پہنچتی ہے۔

مہاراجہ رام ناتھ اس کی خوب صورتی دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں اور اسے اپنی کنیز بنانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ مہارانی ماریہ مہاراجہ رام ناتھ کو بتاتی ہے کہ شکنتلا ناگن ہے اور انسانی روپ میں انہیں بے وقوف بنا رہی ہے اور اس کے لیے وہ چاہیں تو شاہی پنڈت گرو نرائن سے تصدیق کر سکتے ہیں۔ مہاراج اس سے کہتے ہیں کہ اگر شکنتلا ناگن ہوئی تو اس کو آگ میں جلا دیا جائے گا اور اگر یہ الزام جھوٹا ثابت ہو گیا تو ماریہ کو اسی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ ایک ہجوم شکنتلا کی رہائش گاہ پہنچتا ہے۔ مہارانی ماریہ اپنے لباس میں چھپا کر لایا جانے والا آئینہ اچانک شکنتلا کے سامنے کر دیتی ہے جس میں ایک بڑی سی ناگن لوگوں کو نظر آتی ہے۔ سپہ سالار بلگرام شکنتلا کے بجائے راجہ رام ناتھ کو گرفتار کر لیتا ہے۔ سامری شکنتلا، بلگرام اور پریہ تابانہ کی حکومت پر اپنی گرفت مضبوط کر چکے تھے۔ کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف نہ ہو سکتا تھا۔ ہر طرف ظلم کا راج تھا۔ شکنتلا جاپ کے ذریعے کالی ماتا کی مہان شکتی کے حصول میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ شکنتلا اب صرف ناگن نہ تھی بلکہ جادوگرنی بن چکی تھی۔ شکنتلا سبز آنکھوں اور گھنگریالے بالوں والے نوجوان کو دیکھ کر مبہوت رہ جاتی ہے۔ وہ شکنتلا کو بتاتا ہے کہ وہ جنات کے بادشاہ خسکران کا بیٹا شکران ہے اور تمہارا کوئی جادو مجھ پر کارگر نہیں ہوگا۔ شکنتلا خسکران کو دوست بنانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ وہ بھی اس کا ساتھ دینے پر راضی ہو جاتا ہے۔ سامری گرو نرائن کو منڈل جاپ سے باز رکھنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے گرو شداد کی روح سے مدد طلب کرتا ہے۔ سامری جادوگر کی ملاقات خسکران سے ہوتی ہے۔ شکنتلا، شکران اور سامری تینوں گرو نرائن کے منڈل کے پاس جا پہنچتے ہیں لیکن گرو نرائن اپنا جاپ مکمل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ شکنتلا کی ساری شکتیاں معطل ہو گئی تھیں اب وہ بالکل ایک عام سی کمزور بے بس لڑکی تھی۔ گرو نرائن شکنتلا سے کہتا ہے کہ چھٹکارے سے بولو کیا تم نہیں چاہتیں کہ ناگن نہ رہو بلکہ براہ راست میرا حکم مانو۔ ادھر پریہ حیران تھی کہ کئی دن گزر گئے نہ شکنتلا واپس آئی اور نہ سامری یا خسکران۔ پریہ کو پتا تھا گرو نرائن شکنتلا کو غلام بنانا چاہ رہا ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ شکنتلا کا غلام بن جانا اس کے حق میں بہتر ہے تاکہ وہ حکومت پر قبضہ کر کے ملکہ بن جائے تب اچانک خسکران آتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ گرو نرائن تیرتھ جاپ میں کامیاب ہو کر شکنتلا کے جسم و جان اور اس کی تمام شکتیوں پر قابض ہو گیا ہے اور سامری بھی اس کے پاس قید ہو گیا ہے، یہ سن کر وہ خوش ہو جاتی ہے۔ سامری کو ہوش آتا ہے تو سامنے گرو نرائن اور لکشم ناتھ موجود تھے۔ تب وہ اپنے دیوتا کا ریکا کو اپنی سہائتا کے لیے پکارتا ہے، گرو نرائن منتر پڑھتا ہے اور نیلی آگ کے شعلے سامری اور شکنتلا کو گھیر لیتے ہیں۔ شکنتلا گرو نرائن کو بھی اس آگ میں کھینچ لیتی ہے اور ان کے جسم جلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ جب شکنتلا کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ ایک ویران اور بنجر جگہ پر موجود تھی۔ اس کا جسم بری طرح جلا ہوا تھا اور زخموں میں پیپ پڑ چکی تھی، اسی حالت میں شکنتلا تڑپتی سسکتی آبادی تک پہنچتی ہے جہاں اس پر کتے حملہ کر دیتے ہیں اور وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ جب اس کو ہوش آتا ہے تو وہ ایک گھر میں موجود ہوتی

ہے ایک نوجوان لڑکا، لڑکی اور ادھیڑ عمر عورت اور مرد موجود تھے۔ علاج اچھی خوراک اور مکمل آرام سے اس کے زخم بھرنے شروع ہو چکے تھے۔ لڑکی سندری شکنتلا کی دوست بن گئی ہے۔ شکنتلا دیکھتی ہے کہ سندری کا بھائی گگن رات گئے چپکے سے روز باہر نکل جاتا ہے۔ شکنتلا کو خود میں خون کی کمی محسوس ہوتی ہے اور وہ چنکار کو یاد کرتی ہے۔ وہ اس وقت حیرت زدہ رہ جاتی ہے جب چنکار کو اپنے سامنے کھڑا دیکھتی ہے، وہ سوچتی ہے کہ اس کو کھوئی ہوئی شکتیاں واپس مل گئی ہیں۔ شکنتلا کھوئی ہوئی شکتیاں پاکر کھلکھلا اٹھتی ہے۔ گاؤں کے کھیتوں سے نوجوان کی لاش ملتی ہے جس کی شہ رگ کاٹ کر اس کا خون پی لیا گیا تھا۔ گاؤں کے لوگ اس بات سے بہت خوف زدہ ہوتے ہیں۔

دلاور نامی شخص جس کو سادھو کوٹھاری نے اپنے بس میں کیا ہوا تھا۔ کوٹھاری دلاور سے کہتا ہے کہ تمہارے ذریعے ایک جن میرے قبضے میں آئے گا جو میرے تمام کام پل بھر میں کردے گا۔ پھر تو بھی کوٹھاری کا چیلا بن کر عیش کرنا۔ پریہ خسکران اور دونوں کی مدد سے حکومت کر رہی تھی اور دونوں کو خوش رکھتی تھی۔ تب ایک روز خسکران شکنتلا کی تلاش میں نکلتا ہے اور پھر واپس نہیں آتا اور پھر ایک روز وہ بلگرام کو بھی قید خانے میں ڈال دیتی ہے جہاں بھوک پیاس سے ایڑیاں رگڑ کر بلگرام بھی بے بسی کی موت مارا جاتا ہے۔ شکنتلا کو چنکار بتاتا ہے کہ سندری کے بھائی گگن کو ایک چڑیل خوب صورت لڑکی بن کر اپنے جال میں قید کر چکی ہے اور روزانہ تھوڑا تھوڑا کر کے اس کا خون پیتی ہے۔ چنکار شکنتلا کو اس جگہ لے جاتا ہے جہاں گگن مدہوشی کی حالت میں تھا اور وہ لڑکی اس کا خون پینے کو اس پر جھکی ہوئی تھی۔ تب وہاں اچانک شکنتلا نمودار ہوتی ہے اور کالی دیوی کا جاپ پڑھ کر اس چڑیل کو آگ لگا کر ہلاک کر دیتی ہے۔ گگن کو ہوش آتا ہے تو وہ اسے سب بتا کر گھر واپس جانے کا کہتی ہے۔ سپیرا کر دنڈیا اور اس کے چیلا شیش ناگ کو اپنے بس میں کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے وہ بڑی تپسیا میں مصروف تھے۔ کوٹھاری دلاور کو ساتھ لے کر قبرستان پہنچتا ہے اور کدال سے ایک قبر کی مٹی ہٹاتا ہے۔ قبر سے جواں سالہ عورت کی لاش نکلتی ہے۔ دلاور اس کے بال کاٹ کر اپنے پاس محفوظ کر لیتا ہے۔ وہاں سے کوٹھاری اسے ایک مکان کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے اور دلاور سے کہتا ہے کہ اس مکان میں میاں بیوی اور ان کی ایک جواں سال بیٹی ہے، بوڑھے کو باہر بلا کر میں ابھی قتل کرتا ہوں، جبکہ لڑکی کو تو ہی لائے گا میرا ہاتھ لگانا منع ہے۔ اس کے بعد دلاور دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اندر سے ایک ادھیڑ عمر شخص باہر نکلتا ہے، کوٹھاری اس پر حملہ کر دیتا ہے اور اسے گردن سے دبوچ لیتا ہے۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر دلاور مکان میں گھس جاتا ہے۔ جہاں ایک کمرے میں نوجوان دوشیزہ موجود تھی اور دروازے کی آواز سے نیند سے بیدار ہوئی تھی۔ وہ دلاور کو دیکھ کر خوف زدہ ہو کر چلانے لگتی ہے۔ دلاور اس لڑکی کو بے ہوش کر کے باہر کوٹھاری کے پاس لے آتا ہے، کوٹھاری اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا ہے، اور دلاور کے ساتھ اپنی شکتی کے ذریعے ایک بنجر اور بیابان علاقے میں پہنچ جاتا ہے۔ اور اس دوشیزہ کو ایک چتا پر لٹا کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیتا ہے۔ لڑکی ہوش میں آ کر رونے گڑگڑانے لگتی ہے۔

دلاور کو اس پر ترس آ جاتا ہے اور وہ کوٹھاری پر حملہ کر دیتا ہے۔ کوٹھاری غصے میں آ کر اسے ہاتھ پاؤں ہلانے کی طاقت سے محروم کر دیتا ہے اور پھر اپنے جنتر منتر میں مشغول ہو جاتا ہے، تب ایک نیلا شعلہ آسماں سے زمین کی طرف آتا ہے جس کے ساتھ دھواں سا تھا، وہ دھواں جو کہ خسکران جن تھا، آہستہ آہستہ بوتل میں داخل ہو جاتا ہے۔ کوٹھاری ڈھکن لگا کر بوتل کا منہ بند کر دیتا ہے اور خوشی میں ناچنا شروع کر دیتا ہے اور دلاور سے کہتا ہے کہ کوٹھاری آج بہت بڑی شکتی بن گیا ہے، ایک جن اس کے قابو میں آ گیا ہے جو اس کے سارے کام کرے گا۔ کوٹھاری اس سارے عمل کے بعد سامان سمیٹ کر اٹھنے کی تیاری کر رہا ہوتا ہے کہ راجہ ہری داس کے سپاہی اسے گرفتار کر لیتے ہیں۔ راجہ ہری داس عیاش ہونے کے باوجود ایک رحم دل اور رعایا کا خیال رکھنے والا حکمران تھا۔ اس نے جادوگر اور جادوگرنیوں کے خلاف سخت قانون بنایا ہوا تھا جس کی وجہ سے پوری راجدھانی میں جادو ٹونے کرنے والا نہیں تھا۔ کوٹھاری کئی بار اس جرم میں گرفتار ہوا تھا لیکن وہ ہر بار فرار ہو جاتا۔ اس بار اسے گرفتار کر کے ہری داس کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور سزا کے طور پر اس کے ہونٹ سی دیے گئے تھے۔ ہری داس کو کوٹھاری کے تھیلے سے برآمد ہونے والا سامان دکھایا جا رہا تھا جس میں ایک شیشے کی بوتل بھی تھی جس میں دھواں بھرا ہوا تھا۔ راجہ اس بوتل کو کھولنے کا حکم دیتا ہے اور چند ہی لمحوں میں میدان میں خسکران جن موجود تھا جو بوتل میں بند تھا۔ تمام لوگ اسے دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ خسکران کوٹھاری کو آزاد کروا دیتا ہے اور وہ اسے پوری ریاست کو آگ لگا دینے کا حکم دیتا ہے۔ ادھر گگن شکنتلا کے متعلق سوچتا ہے کہ شکنتلا کو کیسے اس چڑیل کا پتا چلا اور کیسے اسے ختم کر دیا۔ شکنتلا گگن سے رات کو گاؤں سے باہر بیری کے درختوں کے پاس ملنے کے لیے کہتی ہے۔ شکنتلا کو خون کی پیاس بے تاب کرتی ہے، لیکن گگن کے گھر والوں کے احسانات کی وجہ سے وہ گگن کا خون پینا مناسب نہیں سمجھتی۔ وہ رات کے وقت سانپ کے روپ میں ایک گھر میں داخل ہو جاتی ہے اور ایک عورت کے خون سے اپنی پیاس بجھاتی ہے۔ ان خونی وارداتوں سے گاؤں میں کہرام مچ جاتا

گھر والوں کے احسانات کی وجہ سے وہ ھگن کا خون پینا مناسب نہیں سمجھتی۔ وہ رات کے وقت سانپ کے روپ میں ایک گھر میں داخل ہو جاتی ہے اور ایک عورت کے خون سے اپنی پیاس بجھاتی ہے۔ ان خونی وارداتوں سے گاؤں میں کہرام مچ جاتا ہے۔ پنچایت میں فیصلہ کیا جاتا ہے کہ گاؤں میں نئے آنے والوں کو علاقہ بدر کر دیا جائے اور وہ لوگ گاؤں کے مکھیا ھگن کے پتا سے شکنتلا کو بھی علاقے سے باہر نکالنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

(اب آپ آگے ملاحظہ کیجیے)

صحن میں آ کر شکنتلا نے چاروں طرف طائرانہ نظریں دوڑائیں۔ وسیع و عریض صحن کے وسط میں شفاف پانی کا بہت بڑا مستطیل تالاب تھا، یہ بہت پوتر تھا جس کے گرداگرد بوہڑ کے پرانے درخت سر جھکائے کھڑے تھے۔ درختوں کے نیچے کئی لوگ ڈیرے ڈالے بیٹھے تھے۔ صحن سے کافی آگے مندر کی اندرونی عمارت تھی۔ جس کے چاروں طرف برآمدے تھے چھوٹے چھوٹے کئی دروازوں کے علاوہ ایک بہت بڑا چوبی دروازہ تھا۔ جس پر ناگ دیوتا پھن پھیلائے کندہ تھا۔ چھوٹے دروازوں پر چھوٹے سانپوں کی شبیہیں نمایاں تھیں۔

اردگرد کے برآمدوں میں چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں، درگاہ میں آنے والی جنتا کے لیے تھیں۔ دور سے آنے والے احباب یہاں معمولی کرایہ دے کر قیام کر لیتے تھے۔

شکنتلا بڑے دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔ لیکن داخل ہوتے ہی ٹھٹھکی۔ یہ تقریباً ہزار گز لمبا اور چھ سو گز چوڑا دیوان تھا جس کے بیچوں بیچ بے شمار سروں والا ناگ دیوتا کا بہت بڑا سنہرا بت پھن پھیلائے ہوا میں معلق کھڑا تھا۔ اس کے علاوہ چاروں طرف دیواروں پر بھی مختلف شکل کے سانپوں کی چوبی کاری ہوئی تھی۔ دیواروں کے اندر بے شمار ان گنت طاق بنے تھے جن میں حنوط شدہ سانپ رکھے تھے۔ ہر طاق میں ایک سانپ اور ایک روشن چراغ تھا۔ فرش چھت اور دیواریں سنہری تھیں چراغوں کی جھلملاتی روشنیوں میں عجب سماں تھا۔ ہر طرف سنہری روشنیاں سنہری سانپ سنہری در و دیوار...... شکنتلا کو یوں محسوس ہوا جیسے سونے کی کان میں گھس آئی ہو۔ دیوداسیاں مختصر چولیوں اور مختصر گھاگھروں میں آ جا رہی تھیں۔ بے شمار لوگ ناگ دیوتا کے بت کے آگے روشن آگ کے الاؤ کے گرد پوجا پاٹ میں مصروف عمل تھے۔ شکنتلا حیرانگی سے شیش ناگ کے دیوقامت سنہری مجسمے پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔ جو کسی سہارے کے بغیر زمین سے اچھی خاصی اونچائی پر بلند ہوا میں ساکت کھڑا تھا۔ جتنا زمین سے بلند تھا اتنا ہی چھت سے نیچے تھا۔ اور ٹھیک اتنے ہی دائیں بائیں کی دیواروں کے فاصلے پر تھا۔ درجنوں چھوٹے منہ کے علاوہ بالکل درمیان میں بار شیش ناگ کا سر تھا۔ جس کا منہ پوری شدت سا کھلا ہوا تھا۔ اور سرخ زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ ناگ مندر کی اس عظمت کو دیکھ کر اور پروقار اور پرہیبت مناظر کو سامنے پا کر شکنتلا کا بے اختیار جھکتا چلا گیا۔ اسی اثناء میں مندر میں ٹن ٹن کی آوازیں آنے لگیں...... سب کھڑے ہونے لگے...... یہ سورج دیوتا کی آمد کا اعلان تھا۔ سورج نکل رہا تھا۔ ٹن ٹن کی آوازیں ایک مخصوص انداز اور مخصوص آواز کے ساتھ آنے لگیں۔ آگ کے الاؤ کے گرد جمع لوگ الٹے قدموں ہٹنے لگے۔ دیوداسیاں الاؤ کے گرد جمع ہونے لگیں۔ ان کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ مختلف کونے کھدروں سے دیوداسیاں زرق برق چولیاں اور گھٹنوں سے اوپر تک گھاگھرے میں ملبوس برآمد ہونے لگیں۔ پاؤں میں گھنگھرو ہونے کی وجہ سے ان کے چلنے سے چھن چھن کی آوازیں آتیں۔ تمام دیوداسیاں دائرے میں جمع ہو گئیں۔ شکنتلا ایک کونے میں کھڑی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اس پر عجیب سرور چھانے لگا۔ ناگ دیوتا پر پیار آنے لگا۔ ٹن ٹن کی تال اب بلند اور تیز ہو چکی تھی۔ اچانک بین کی مدھر دھن اس کی آواز میں شامل ہو گئی دیوداسیوں کے پاؤں حرکت میں آ گئے۔ وہ ایک ساتھ تھرکنے لگیں۔ گھنگھرو یک آواز جھنجھنانے لگے۔ ٹن ٹن کی آواز بین کی سریلی دھن اور گھنگھروؤں کی چھنچھناہٹ سے ایک جب محفل موسیقی بپا ہو گئی۔ تمام یاتری دیواروں کے ساتھ لگ کر ہولے ہولے جھومنے لگے اور پھر مختلف سانپ دروازوں اور درزوں سے نکل کر چکنے سنہری فرش پر پھسلتے ہوئے دیوداسیوں کی طرف بڑھنے لگے۔ شکنتلا بھی جھومنے لگی۔ سانپ دیوداسیوں کے پیروں میں لوٹنے لگے۔ لیکن کسی بھی دیوداسی کا پاؤں کسی سانپ کے اوپر نہیں پڑ رہا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سانپ دیوداسیوں کی ٹانگوں سے لپٹ کر ان کے جسموں پر چڑھنے لگے اور ان کے سینوں کے گرد لپیٹا لینے لگے۔

بین کی لے بلند ہونے لگی۔ گھنگھروؤں کی چھنا چھن بڑھ گئی۔ رقص تیز ہو گیا پھر تمام دیوداسیوں نے اپنے دائیں

ہاتھ ناگوں کے سروں کے پاس رکھ دیے اور منہ کے پاس سے سانپوں کو پکڑ لیا۔ سانپوں نے سینوں کے گرد سے لپیٹا کھول دیا تمام سانپ بری طرح ناچتی دھمالیں ڈالتیں دیوداسیوں کے ہاتھوں میں تھے۔ ہر دیوداسی نے ایک ہاتھ سے سانپ کا منہ اور دوسرے سے اس کی دم پکڑ رکھی تھی سانپوں کے منہ انہوں نے اپنے منہ کے قریب کر لیے تمام سانپ بار بار سرخ زبانیں منہ سے باہر نکال کر اندر کر رہے تھے۔ دیوداسیاں بھی اپنی آنکھیں بغیر جھپکائے سانپوں کی طرف دیکھ کر انہی کے انداز میں اپنی زبانیں بار بار نکال رہی تھیں۔ شکنتلا کو سارا مندر گھومتا ہوا نظر آنے لگا۔ بین کی سریلی لے اس کے دماغ میں گھس رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا اپنے وجود پر سے اختیار ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اور پھر داسیوں نے اپنی زبانیں یک لخت سانپوں کی زبانوں کے ساتھ لگا دیں۔ سانپوں نے ان کی زبانوں پر ڈس لیا۔ سانپوں کے ڈستے ہی دیوداسیوں نے انہیں ہاتھوں سے چھوڑ دیا۔ اس کے ساتھ ہی موسیقی تھم گئی مل کھڑ کنا بند ہو گیا بین کی آواز ختم ہو گئی۔ دیوداسیوں کے ہاتھوں سے گرنے والے سانپ کوئی حرکت نہ کر رہے تھے۔ شکنتلا سمجھ گئی کہ یہ سنگ چور ہو گئے ہیں کوئی دیوداسی ان کو ہاتھ لگائے گی تو یہ چور چور ہو کر بکھر جائیں گے۔ یہ شیشے کے سانپ بن گئے ہیں، اب تمام دیوداسیاں آگ کے روشن الاؤ کے گرد گھیرا ڈالے سر جھکائے کھڑی تھیں کہ ایک طرف سے شور اُٹھا...... شکنتلا نے سر گھما کر دیکھا تو ناگ دیوتا کے بت کے عقبی دروازے سے ایک پالکی برآمد ہو رہی تھی جس پر سفید کشیدہ کاری ہوئی تھی اس کے اوپر ایک بھاری بھرکم شخص بیٹھا تھا۔

''ہو نہ ہو یہ ناگ مندر کا بڑا پروہت ہے۔'' شکنتلا نے سوچا۔

اس کی سوچ ٹھیک نکلی...... یہ لکشمن داس تھا...... جس کا ناگ مندر بلکہ پورے قصبہ ناگ بھون میں سکہ چلتا تھا۔ انتہائی سرخ و سپید رنگت نوکیلی بڑی مونچھیں سر صفاچٹ لیکن ٹنڈ کے پچھلی طرف ایک گھنی چوٹی جو ہندوؤں کا مخصوص مذہبی انداز ہے۔

پالکی کے چار ہٹے کٹے کہار تھے جو شکلوں سے ہی مشٹنڈے نظر آ رہے تھے۔ ان کے پیچھے پیچھے پجاریوں اور سادھو سنتوں کی قطار تھی۔

پالکی کو الاؤ کے قریب فرش پر رکھ کر لکشمن داس کو باادب باہر نکالا گیا...... اتنی دیر میں ایک بہت بڑا سنہری تخت رکھا جا چکا تھا۔ لکشمن داس اس پر براجمان ہو گیا۔

اس کے تخت پر بیٹھتے ہی ایک ہڑبونگ مچ گئی۔ پوجا پاٹ اور یاترا کے لیے آئے ہوئے ہر شخص کی کوشش تھی کہ پروہت لکشمن داس سے آشیرباد لے لے۔

چار آدمی ایک بہت بڑی چادر چاروں کونوں سے تھامے اس کے پاس کھڑے ہو گئے۔ تخت پر ایک بڑا سا پیالہ رکھ دیا گیا تھا، اس میں سیندور تھا۔

تمام یاتریوں کی قطار بنوائی گئی۔ اب ایک ایک آدمی آتا لکشمن داس سیندور کے پیالے میں انگلی ڈبو کر اس کے ماتھے پر تلک لگا کر اس کے حق میں دعا کے لیے ہاتھ اُٹھاتا اور وہ شخص پہلو سے ہو کر دوسری طرف چادر کے اندر اپنی استطاعت کے مطابق تانبے کے سکے یا تھیلیوں میں بند اجناس یا زیور وغیرہ ڈال دیتا۔

ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق چڑھاوا چڑھا رہا تھا۔

شکنتلا ایک طرف کھڑی یہ تمام منظر دیکھ رہی تھی۔ مرد اور عورتوں کی ایک نہ ختم ہونے والی قطار تھی جتنے لوگ کم ہوتے اتنے ہی اور آ کر قطار میں لگ جاتے۔ شکنتلا باہر نکل کر برآمدوں میں گھومنے لگی۔ جہاں پرشاد تقسیم ہو رہا تھا۔

کچھ دیر بے مقصد دالان میں گھومنے کے بعد شکنتلا دوبارہ دیوان میں آ گئی جہاں پر رش ختم ہو چکا تھا۔ تمام یاتری آشیرباد لینے کے بعد لکشمن داس کے تخت پوش کے سامنے نیم دائروں میں بیٹھ گئے تھے۔ ناگ مندر کے پروہت کی حیثیت سے لکشمن داس کا وعظ شروع ہو چکا تھا۔

ہندو مذہب کی تعریف ناگ دیوتا کی عظمت سانپوں کا احترام پوجا پاٹ کی تاکید بیان کرتے کرتے لکشمن ناگ دیوتا کے ایمان کی باتیں کرنے لگا۔ شکنتلا سمجھ گئی کہ لکشمن داس نے ہی کامنی کو اغوا کروایا ہے اسی لیے اب اپنی تقریر میں ناگ دیوتا کی توہین کی باتیں کرنے لگا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا...... ''ہندو دھرم میں دیوتاؤں کا بہت بڑا مقام اور عزت ہے۔ ناگ

دیوتا مہان اور پوتر شکتی ہے...... اس کا اپمان کرنے کا دھار بھی اوش من سے کھرچ دینا چاہیے...... جنتا اور ناگ دیوتا کے پیروکار جانتے ہیں کہ اگر کسی کی اولاد نہ ہو رہی ہو تو وہ ناگ مندر آ کر منت مانتا ہے کہ اگر پہلی اولاد لڑکی ہوگی تو وہ اس کو ناگ دیوتا کی داسی بنا دے گا۔ پھر اولاد ہونے پر اپنی پہلی کنیا کو ناگ دیوتا کو بطور چڑھاوا دے جاتے ہیں۔ ناگ مندر میں دیوداسی کا بڑا مقام اور عزت ہے۔ کئی سالوں کی تپسیا کے اور عبادت کے بعد ناگ داسی کو وِش کنیا کا روپ دے دیا جاتا ہے۔ ناگ مندر کی تمام داسیاں...... پوتر...... مہان اور ستی ساوتری ہیں۔ یہ تمام کنیائیں چاہے یہ برہمن ہوں، کھشتری ہوں یا اچھوت یہاں آ کر پوتر ہو جاتی ہیں۔ ناگ مندر میں داخل ہونے کے بعد یہ مردوں پر اور مردان کنیاؤں پر حرام ہو جاتے ہیں پرنتو ہمارے ناگ مندر میں ایک ایسی وِش کنیا ہے جو گزشتہ دنوں یہاں سے بھاگ کر فرار ہو کر ایک اچھوت اور پلید شخص سے بیاہ رچا کر اس سے ہم بستری بھی کر لی۔"

پروہت لکشمن داس کی اس بات نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور تمام لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے...... شور مچ گیا۔ تو لکشمن داس نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں خاموش کرا دیا اور پھر بولا...... فکر کی کوئی بات نہیں۔ ناگ مندر کے حفاظتیوں نے انہیں رنگے ہاتھوں گردنوں سے دبوچ کر اپنی گرفت میں کر لیا ہے۔ ان دونوں پاپیوں کو ابھی جنتا کے سامنے لا کر پیش کر دیا جائے گا۔ اب یہ تم لوگوں...... یعنی جنتا کا کام ہے ان کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہو۔ میرا کام، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنا ہے۔

"پاپیوں کو پیش کیا جائے......" لکشمن داس کے حکم کے ساتھ ہی کامنی اور ایک جواں سال لڑکے کو زنجیروں میں جکڑے ہوئے ناگ دیوتا کے مجسمہ کے عقب سے گھسیٹتے ہوئے چند حفاظتی ایوان میں لے آئے۔ انہیں دیکھتے ہی عوام پر جوش اور غیض و غضب میں ہو گئے۔ بہت سے لوگ انہیں مارنے کو لپکے۔ دھرم کے نام پر بے گناہ ذاتی عداوت کی بھینٹ چڑھنے لگے۔ شکنتلا بھانپ گئی کہ پروہت نے ایسا کھیل کھیلا ہے اس طرح عوامی جذبات کو برانگیختہ کیا ہے کہ لوگ بے قابو ہو کر ان دونوں پر پل پڑیں اور انہیں موت کے گھاٹ اتار دیں۔ لڑکی تو کامنی ہی تھی لڑکا نہ جانے کون تھا۔ اب شکنتلا کا دماغ تیزی سے کوئی ایسی ترکیب سوچنے میں مصروف تھا کہ عوام کو قابو کیا جا سکے۔ حفاظتی کامنی اور لڑکے کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے اور عوام یعنی جنتا کو ان سے دور رکھنے لگے! اور پھر شکنتلا کا سخت تناؤ کا شکار چہرہ پرسکون ہوتا چلا گیا۔ شاید وہ کسی فیصلہ پر پہنچ چکی تھی۔ وہ زیب لب مسکرانے لگی اور پھر اٹھ کر تیزی سے ایک کونے میں چلی گئی۔ لکشمن داس عوام کو پرامن اور پرسکون رہنے کی ہدایت کر رہا تھا۔ حالاں کہ سارا کیا دھرا اسی کا تھا۔

☆......☆......☆

ریاست کی چھوٹی چھوٹی تحصیلوں میں تقسیم کرنے کی پریہ کی سیاست کامیاب رہی تھی۔

اس سے جہاں پریہ پر کام کا بوجھ کم ہو گیا تھا وہاں اس کے اختیارات مضبوط ہوئے تھے۔ ہر تحصیل کی راجکماریاں کے اپنے وزیر اور درباری تھے۔ جو اپنے علاقے کی دیکھ بھال کرتے تھے اور ملکہ عالیہ پریہ کو باقاعدہ ماہانہ وظیفہ بھجواتے تھے۔ جو اس قدر زیادہ ہوتا کہ وہ سارا مہینہ انہیں اکٹھا کرتے ہوئے گزار دیتے۔ اس کو جمع کرنے کے لیے مذکورہ راجکماری ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کرتی۔ طرح طرح کے محصول، جرمانے اور جائیداد کی ضبطی کے آئے دن کے احکامات سے ریاست کی تمام جنتا پر خوف و دہشت پھیل چکی تھی، رہی سہی کسر سرکشا دل کے اراکین پوری کر دیتے مسلح تربیت یافتہ نوجوانوں پر مشتمل پریہ کے یہ ذاتی حفاظتی تھے جو ہر تحصیل میں دندناتے پھرتے۔ راجکماریاں بھی ان سے ڈرتی تھیں۔ پوری ریاست تابانہ میں پریہ کی دہشت بیٹھ چکی تھی۔ مخالفت کے معمولی شک کی بناء پر بھی گرفتار ہونے والے کڑی سزائیں پانے لگے۔

انہی دنوں ہمسایہ ریاست دھرم پور کے راجہ کی شادی میں شرکت کا بلاوا آیا تو پریہ شرکت کرنے گئی اور وہاں کے راجہ کا محل دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس قدر خوبصورت ترین محل یہ تو پورا شیش محل ہے۔ وہ سوچنے لگی۔ میرا محل تو اس سے کہیں کم تر ہے! تابانہ واپس پہنچتے ہی اس نے اپنے لیے ایک نیا خوبصورت ترین محل بنانے کا اعلان کر دیا۔ جگہ کی تلاش شروع ہو گئی۔

ریاست بلکہ اردگرد کی ریاستوں سے بھی تعمیراتی ماہرین بلا لیے گئے کچھ ہی عرصے میں ہزاروں ایکڑ پر ایک شاندار محل تعمیر کرنے کا منصوبہ تیار کر لیا۔ منصوبہ پریہ کی جلت کے عین مطابق تھا۔

محل کی ایک مکمل حفاظتی قلعے کی طرز پر تعمیر شروع ہوگئی۔

محل کے زیرزمین ایک قید خانہ اور محل کے گرد گرد سو گز چوڑی خندق کھودنے کا منصوبہ بھی شامل تھا۔ خندق کے اوپر لوہے اور لکڑی کے دو پل ایک محل کے سامنے اور ایک عقب میں۔ جس پر پریہ فوجی چوکیاں قائم کرنا چاہتی تھی۔ اور بنیادیں سیسہ پلائی بنانا چاہتی تھیں۔

پریہ چاہتی تھی کہ یہ قلعہ بند شیش محل کم سے کم عرصہ میں تیار ہو جائے۔

ماہرین نے تخمینہ لگا کر بتایا کہ یہ منصوبہ بہت زیادہ اخراجات کے باعث قابل عمل نہیں کیونکہ اس کی تیاری کے لیے ہزاروں راج مزدور اور قیمتی ساز و سامان درکار تھا۔ لاکھوں کے اخراجات ریاست کے لیے برداشت کرنا ممکن نہ تھا۔ لیکن پریہ کے ذہن پر ایک ہی دھن سوار تھی۔

اس نے منصوبہ شروع کرنے کا حکم دیا اور تمام تحصیلوں کی راجکماریوں کو محل میں طلب کر لیا۔ اجلاس شروع ہو گیا۔ پریہ جڑاؤ تخت پر بیٹھ گئی۔ راجکماریوں نے اس کے چرن چھو کر اعلان وفاداری کا اعادہ کیا اور پریہ نے بات شروع کی۔

تابانہ کی دس تحصیلیں ہیں اور تم میں سے ہر ایک اپنی اپنی تحصیل کی سیاہ وسفید کی مالک ہے! مجھے شیش محل کی تعمیر کے لیے رقم، سامان اور مزدور درکار ہیں۔ جو تم مہیا کرو گی۔ سب سے پہلے تابانہ کی سرحدوں کو خاردار تار لگا کر بند کر دو اور جگہ جگہ فوجی چوکیاں بنا دی جائیں تاکہ تابانہ کا کوئی باشندہ ریاست سے ہجرت نہ کر سکے۔ اس کے بعد انتہائی سخت اور ظالمانہ قوانین رائج کر دیے جائیں۔ ہر شخص چاہے وہ کسان ہے یا جاگیردار...... دکاندار ہیں یا صنعت کار...... اپنی آمدنی کا آدھا حصہ شاہی خزانہ میں جمع کروائے اس سے پہلے ہر گھر کی تلاشی لے کر سونا اور جواہرات بحق سرکار ضبط کر لیا جائے۔ ہیرے سونے اور چاندی کا استعمال عام آدمی کے لیے جرم قرار دے کر شاہی خزانے میں جمع کرا دو...... اور خلاف ورزی پر گرفتار شخص کو قید بامشقت کی سزا سنا کر انہیں مزدور بنا کر یہاں بھیج دو۔

اگلے ہی دن سے شیش محل کی تعمیر شروع کر دی گئی۔ نئے قوانین کا اعلان کر کے پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی تابانہ اچھی خاصی بڑی ریاست تھی۔ شیش محل کی مجوزہ جگہ کے چاروں طرف بھی خاردار تار لگا کر مزدور قیدی اس کے اندر پہنچنا شروع ہو گئے اور گردی ریاستوں سے محل کی تعمیر میں کام آنے والے ساز و سامان کی ترسیل شروع ہو گئی۔ جلاد اور فوجی پہریدار مزدوروں کے گرد کوڑے لے کر کھڑے کر دیے گئے۔ صبح سے شام اور رات سے صبح تک مسلسل کام شروع ہو گیا۔ گروہ بنا دیے گئے ہر روز راج مزدوروں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ ساز و سامان گھوڑوں، گدھوں، اونٹوں اور چھکڑوں پر لدا ہوا پہنچنے لگا۔

ایک لمحہ ضائع کیے بغیر کام جاری تھا۔ ہر وقت کوڑوں کے شڑاپ شڑاپ کی آوازیں اور قیدی مزدوروں کی چیخیں چاروں طرف گونجتی رہتیں۔ جیسے ہی کسی مزدور نے ہاتھ روکتے ہوئے ذرا دم لیتا...... کوڑے مار مار کر اسے خون میں نہلا دیا جاتا۔ ظلم وتشدد کی لہر نے پورے تابانہ کو لپیٹ میں لے لیا۔ سیکڑوں مزدور کوڑوں کی مار نہ سہتے ہوئے مر جاتے جن کی لاشیں محل کی دیواروں میں چن دی جاتیں۔ اور ان کا خون پانی کی جگہ استعمال کر دیا جاتا۔ دنوں کے اندر شیش محل کا نقشہ زمین سے اٹھنے لگا۔ خوابوں کی تعبیر کو آنکھوں کے سامنے پا کر پریہ کی ہوس تیز ہونے لگی۔ مزید راج مزدور ماہرین بلوا کر کام کی رفتار اور تیز کرنے کا کہتی۔ اس تمام عرصے میں تابانہ کی حدود میں گرفتار کسی شخص، عورت کو سزائے موت نہ سنائی گئی بلکہ قید بامشقت کے لیے شیش محل بھیج دیا جاتا۔

چند ہی مہینوں میں شیش محل تیار ہو گیا...... یہ ایک وسیع وعریض بلند و بالا عمارت تھی جس کی حدود کے اندر ضروریات زندگی کی ہر چیز سما دی گئی، قسم قسم کے پھلدار اور پھولدار پودے، درخت، باغات، مصنوعی جنگل، جنگل اور باغات کے درمیان سے گزرتی ہوئی پانی کی خوبصورت نہر...... جابجا مصنوعی آبشاریں! محل کی اندرونی دیوار کے ساتھ ساتھ غلہ اجناس کے ذخیرے کی کوٹھڑیاں، ہتھیاروں اور اسلحہ کے گودام...... ہاتھی گھوڑے اور ان کے اصطبل...... کنیزوں، غلاموں

اور محافظوں کے رہنے کی جگہیں۔

مرکزی محل ہی اصل شیش محل تھا۔ دیواریں فرش چھت اور ستون اس قدر ملائم اور چمکدار کہ ہاتھ اور قدم پھسل پھسل پڑتے تھے۔ دربار کے لیے انتہائی وسیع وعریض کمرہ کے دو اطراف درباریوں کے لیے سنہرے کام سے مرصع قیمتی کرسیاں جو داخلی دروازے سے خاصا اندر آنے کے بعد شروع ہوئی تھیں۔ شروع کی کرسیاں نیچی اور بعد میں بتدریج اونچی ہوتی چلی جاتیں...... دونوں قطاروں کے آخر میں سب سے بلند خوبصورت اور شفاف چبوترے پر ہیرے جواہرات اور سونے سے مزین تخت جو ملکہ پر یہ کے لیے تھا۔ تخت کے اوپر مور کے پروں سے بنے مورچھل لٹک رہے تھے۔ جن سے ریشمی ڈوریاں بندھی تھیں جنہیں کھینچنے سے مورچھل آگے پیچھے حرکت کر کے ہوا دینے لگتے اور ہوا تخت اور چبوترے پر آتی اس چبوترے کے عقب میں قیمتی پردے لٹک رہے تھے۔ جہاں سے ملکہ کی آمد ہوتی تھی اور اس سے بھی پیچھے رہائشی کمرے تھے جہاں محافظوں کے جلو میں ملکہ کی خواب گاہ تھی۔ جس کی خوبصورتی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی تھی۔

نئے قانون کے تحت دربار میں داخل ہونے سے بہت پہلے جوتے باہر اتار دیے جاتے اور آنے والا سر سے پگڑی، ٹوپی اور تاج کلے وغیرہ اُتار کر ہاتھوں میں تھام کر سر کو جھکا لیتا تھا۔ جوں جوں دربار میں حاضری دینے والا آگے بڑھتا جاتا چاہے وہ ملزم ہوتا یا مدعی فریادی ہوتا یا درباری سرکاری افسر ہوتا یا بیرونی سفیر وہ جھکتا چلا جاتا حتیٰ کہ ملکہ عالیہ پر یہ کے روبرو ہوتے ہوئے اس کا جھکنا ضروری تھا ورنہ شاہی دربار کی توہین میں سر بھی قلم ہو سکتا تھا۔

مرکزی محل کی تہہ میں ایک پراسرار زنداں بھی بنایا گیا جس میں غداروں اور دشمنوں کے لیے عبرت ناک اور دلخراش سزاؤں کے لیے تمام لوازمات جمع کر لیے گئے۔ اس زنداں خانے میں بھی جانے کے دو ہی راستے تھے۔ ایک پر یہ کی خوابگاہ سے ملحقہ بند کمرے سے سیڑھیاں نیچے جاتی تھیں۔ اور دوسرا راستہ دربار سے نیچے جاتا تھا دونوں راستوں پر کڑے پہرے تھے۔ یہ زنداں خانہ پر یہ نے صرف ذاتی انا اور تسکین کے لیے بنوایا تھا۔ ایک پروقار شاہانہ تقریب میں پر یہ پرانے محل سے شیش محل میں پورے کروفر کے ساتھ منتقل ہوگئی۔ ملکہ بننے کے بعد آج پہلی بار پر یہ نے فراخدلی اور رحم کا جذبہ اختیار کرتے ہوئے شیش محل کی تعمیر میں شامل تمام مزدور قیدیوں کو رہا کرنے کا پروانہ جاری کیا۔ اور ریاست میں امن وامان کو بحال کرنے اور زندگی کو عام ڈگر پر ڈالنے کے لیے جرمانے اور نئے قوانین منسوخ کر دیے تاکہ عوام میں حکومت کی مخالفت کم ہو۔ لوگوں کا دھیان عام کاموں میں بٹ جائے اور پر یہ اتنی دیر میں سنبھل جائے اور محل کے انتظامات وغیرہ درست کر لے۔

اب پر یہ انتہائی شاطر اور چالاک ہونے کے ساتھ ساتھ تجربہ کار ہوگئی تھی اور ریاست تابانہ کے سیاہ وسفید کی مکمل مالک بن چکی تھی۔ ریاست کے کونے کونے میں متعین سرکاری کلیدی عہدیداروں کو شیش محل طلب کرلیتی اور ان سے سختی سے جانچ پڑتال کرتی۔

☆......☆......☆

پر یہ اس وقت اپنے کمرہ خاص میں موجود تھی جس میں ہر طرف شیشے کی دیواریں اور قیمتی شیشے کا فرش تھا۔ اعلیٰ معیار کی مسہری اور اس کے علاوہ مہمانوں کے لیے چند نشستیں بھی تھیں۔ بے شمار کھڑکیاں تھیں جو باغیچے کی طرف کھلی تھیں۔ چھت کے وسط میں قیمتی اور نفیس بہت بڑا فانوس تھا جس میں رنگین شیشے تھے۔ پورا کمرہ پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا جو جا بجا قد آدم گلدانوں میں سجے تھے۔ اس کے علاوہ سرخ گلاب کے سیکڑوں تازہ پھول مسہری کے تین اطراف لڑیوں کی شکل میں لٹک رہے تھے۔ پر یہ خوبصورت لباس میں اپنے بستر پر نیم دراز شراب کی چسکیاں لے رہی تھی۔ شراب کا نشہ اس کی آنکھیں سرخ کر چکا تھا۔ اردگرد کنیزیں غلام اور حفاظتی اہلکار جھکے کھڑے تھے۔ عین اسی وقت باہر برآمدے میں شور اُٹھا اور بہت سے قدموں کی آوازیں ابھریں۔ پر یہ چونک پڑی۔ اس نے نظریں اُٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ تو بوکھلا اٹھی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا...... وہ سمجھی کہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ ایسا تو اس نے سوچا تک نہ تھا۔ یہ کیا ہوگیا...... اب کیا ہوگا...... پر یہ کا دل بیٹھنے لگا۔

☆......☆......☆

لکشمن داس کی خواہش تھی کہ ہجوم بے قابو ہو کر کامنی اور قیدی لڑکے پر ہلہ بول دے اور جتنا اس دونوں کو مار ڈالے۔ غیض وغضب کے آثار بتا رہے تھے کہ ایسا ہی ہونے والا ہے کیونکہ محافظوں نے کھسکنا شروع کر دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ ہجوم گھیرا توڑ کر دونوں قیدیوں تک رسائی حاصل کر لیتا کہ اچانک ناگ مندر کے تمام سانپ ایک ساتھ پھنکار نے لگے اور اس کے ساتھ ہی چھن چھنا چھن چھن کی آوازیں آنے لگیں۔ آواز اس قدر اونچی تھی کہ ہجوم میں شامل تمام یاتری اور سادھو پنڈت گردنیں موڑ کر دیکھنے لگے۔ تو انہوں نے عجیب نظارہ دیکھا ایک قیامت ڈھا دینے والے لچکدار حسن کی مالک حسینہ اعضائی شاعری کا مظاہرہ کر رہی تھی اور مندر کے کونے کھدروں سے سانپ نکل نکل کر اس کے گرد گھیرا ڈال کر اپنے اپنے سر زمین پر لگانے لگے۔

''یہ شکنتلا تھی...... جس نے کامنی کو بچانے کے لیے یہ ناٹک رچایا تھا۔ وہ ایک اوٹ میں چلی گئی تھی اور وہاں سے اس نے تمام سانپوں کو دماغی لہروں کے ذریعے پیغام ارسال کیا کہ میں ناگن دیوی ہوں میری اطاعت نہ کرو گے تو ناگ دیوتا کے قہر کا شکار ہو جاؤ گے۔ فوراً اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر آؤ اور میرے سامنے آ کر اطاعت کا اظہار کرو۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی خوشبو بکھیرنی شروع کر دی۔ اس کا پیغام وصول پا کر سانپ اپنے بلوں سے باہر آ گئے اور شکنتلا پھنکار کر سانپ بنی اور دوسری پھنکار کے ساتھ انسان بن گئی اور کالی دیوی کے شبھ جاپ کی مدد سے اس نے گھنگھروؤں کی تیز آواز بھی پیدا کر لی تھی حالانکہ اس کے پیروں میں گھنگرو موجود ہی نہ تھے۔ یہ سب جادوئی شکتی کا مظاہرہ تھا۔''

اور اب شکنتلا ناچ رہی تھی۔ گھنگھروؤں کی لے اس کے پاؤں کی حرکت سے مطابقت رکھتی تھی سب حیرانگی سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ یہی شکنتلا کی اچھا تھی سب لوگ دائرہ بنا کر رقص دیکھنے لگے۔ لکشمن داس بھی اس خوبصورت جوانی کو حیرانی سے منہ پھاڑ کر تکنے لگا۔ سانپ شکنتلا کے گرد اگرد سر جھکائے بیٹھے تھے اور ان کی تعداد مسلسل بڑھ رہی تھی جانے کہاں کہاں سے سانپ آ رہے تھے۔

اس وقت ناگ مندر میں تمام سانپوں، لوگوں، پنڈتوں، پجاریوں کی نگاہوں کا مرکز شکنتلا تھی۔ جس کا سرخ وسپید شریر چراغوں کی روشنی میں تھرک رہا تھا اور اس کے رقص میں شدت پیدا ہو رہی تھی۔

لوگوں کا جم غفیر اکٹھا ہونے لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے شکنتلا کے پاؤں رقص کرتے کرتے فرش سے کچھ اوپر اٹھنے لگے اور تقریباً زمین سے دو بالشت اوپر آ کر ٹھہر گئے۔ رقص مسلسل جاری تھا اور وہ اپنے پیروں کو اسی طرح حرکت دے رہی تھی جیسے وہ زمین پر ہی کھڑی ہو لیکن وہ ہوا میں رقص کر رہی تھی۔ اچانک دیکھنے والی نگاہوں نے محسوس کیا کہ رقاصہ کے ہاتھوں کی انگلیوں نے سانپوں کی طرح نظر آنا شروع کر دیا ہے۔ اور رقاصہ کے سر، کان اور منہ سے بھی چھوٹے چھوٹے ناگ نکل کر لہرانے شروع ہو گئے۔ ہوا میں ناچتی لڑکی جس کے جسم سے سانپ نکل رہے تھے جیسے ناگ بھون کے مندر کا ہر سانپ مجرا کر رہا ہو۔ یاتری حیرانی، محویت اور عقیدت سے دیکھنے لگے رقص کی شدت میں کمی آنے لگی ہاتھوں پیروں کی حرکت تھمنے لگی۔ پیر فرش پر واپس ٹک گئے، موجود لوگوں میں سے کسی عقیدت مند نے ناگن دیوی کی جے کہہ دیا پھر کیا تھ۔ اثا گن دیوی کی جے...... ناگن دیوی کی جے کی ہاہا کار مچ گئی تھی۔ سجدے میں پڑے ہوئے ناگوں کی موجودگی میں کسی کو شکنتلا تک پہنچنے کی سکت نہ ہوئی۔ اب شکنتلا کے جسم سے سانپ بھی غائب ہو چکے تھے رقص تھم چکا تھا اور پھر شکنتلا نے پرزور پھنکار ماری اور شیش ناگن کا روپ اختیار کر گئی...... اور دائرے میں گھوم گھوم کر شوکریں مارنے لگی۔ یہ منظر دیکھ کر لوگوں میں کھلبلی مچ گئی۔ ایک شور اٹھا۔ لیکن کسی ردعمل سے پہلے ہی زبردست شوکر کے ساتھ شکنتلا انسانی روپ میں ظاہر ہو گئی۔ لیکن اب اس کا اپسراؤں کا حسن اور راجکماریوں جیسا شاہانہ وبیش قیمت لباس اور تر وتازہ مسکراتا چہرہ ناگ بھون میں موجود ہر آنکھ کو خیرہ کر رہا تھا۔ سانپ بدستور اس کے گرد دائرہ بنائے، اپنے پھن زمین سے لگائے ہوئے تھے۔ شکنتلا نے نظریں اٹھا کر ہر سمت طائرانہ نظریں دوڑائیں اور ہاتھ کے اشارے سے سب کو خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور پھر باآواز بلند مخاطب ہوئی۔

''ناگ دیوتا کے پیروکارو...... ناگن دیوی تم سے مخاطب ہے! میں ناگ دیوتا کے حکم سے تم لوگوں کے پاس آئی ہوں۔ میری بات غور سے سننا اور عمل کرنا۔ ورنہ ناگ دیوتا کا قہر یہاں موجود ہر شخص کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔''

ناگ بھون اور اس میں موجود یہ ناگ مندر سیکڑوں سال سے ناگ دیوتا کی عظمت و توقیر کی نشانیاں ہیں۔ پیروکار یہاں پر اپنی بچیوں کو دان کر کے داسیاں بنا دیتے ہیں ان میں سے کچھ کنیا ئیں وش کنیا کے رتبے تک جا پہنچی ہیں۔ یہ سب ناگ دیوتا کی منشا سے ہوتا ہے پرنتو کچھ عرصے سے یہاں پر موجود دیوداسیوں کی عزتوں کو داغدار کیا جا رہا ہے! دھرم کی بجائے شیطانیت کے پجاریوں کا قبضہ ہو گیا اور ناگ مندر کا مہان پروہت لکشمن داس جو تم لوگوں کے سامنے پوتر بنا بیٹھا ہے! سب سے بڑا راکشش ہے ناگ مندر کو دان ہونے والی ہر کنواری کنیا کی عزت کو پہلے ہی دن لوٹ لیتا ہے اسی کارن ناگ یاتریوں کی آشائیں اور مرادیں بھی کچھ عرصے سے پوری نہیں ہو رہی کہ ناگ مندر کا تقدس اس پلید نے بھرشٹ کر دیا ہے۔

''آج ناگ دیوتا کے حکم سے میں یہاں آئی ہوں اور حالات درست کر کے واپس چلی جاؤں گی۔''

یہ کہہ کر شکنتلا خاموش ہو گئی جبکہ یاتری بپھر گئے۔ بازی الٹ چکی تھی پانسہ پلٹ چکا تھا۔ وہ لوگ جو لکشمن داس کی سیوا کرتے نہ تھکتے تھے اس پر حملہ کی نیت سے بڑھنے لگے۔ لکشمن داس کی حالت دیدنی تھی۔ اس کا رنگ فق ہو چکا تھا۔ چہرے پر نیلاہٹ چھانے لگی۔ سکتہ کی کیفیت میں آ گیا۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں کی طرح چپ چاپ بیٹھا رہ گیا۔ اس کے وہم گمان میں بھی نہ تھا اسے تو علم میں تھا کہ ناگ دیوتا کا کوئی وجود نہیں یہ سب مایا کمانے کے چکر ہیں۔ ناگ دیوتا کا بت جو ہوا میں معلق تھا۔ وہ بھی لکشمن کے ذہن کی پیداوار تھا۔ سونے کے اس بت میں بہت سا لوہا بھر کر اس کے اطراف کی دیواروں میں ماہرین کی مدد سے اس طرح برابر کے مقناطیس رکھے گئے تھے کہ بت ہر طرف سے کھنچتا تھا۔ لیکن مقناطیسوں کی عین برابر طاقت کے باعث وہ کسی طرف بھی جانے کی قوت نہ رکھتا تھا۔ نتیجتاً وہ ہوا میں معلق تھا۔

دیکھنے والوں پر یہ منظر ناگ دیوتا کی دہشت اور عظمت ثبت کر دیتا اور لکشمن داس عرصہ دراز سے دولت سمیٹنے اور عیاشی میں مصروف تھا لیکن اچانک یہ ناگن دیوی کہاں سے نمودار ہو گئی۔ لکشمن کے ذہن میں آندھیوں اور بگولوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ بپھرے ہوئے ہجوم کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو چلے تھے۔ بھاگنے کے تمام راستے مسدود تھے۔ موت یقینی تھی شکنتلا نے جب حالات اپنے حق میں دیکھ لیے تو وہ ہاتھ بلند کر کے کڑکدار آواز میں گرجی۔

''ناگ بھون کے باسیو اور ناگ مندر کے یاتریو۔ ناگن دیوی کے حکم پر قدم روک لو۔'' اس کا گرجتا حکم سن کر ہر قدم اپنی جگہ ساکت ہو گیا چاروں اور خاموشی چھا گئی اور شکنتلا اپنی زلفوں کو جھٹک کر مسکرائی اور باوقار طریقے سے قدم قدم چلنے لگی۔ سانپ تیزی سے کھسک کر اسے راستہ دے رہے تھے۔ اس کے بعد تمام لوگ کائی کی طرح پھٹ کر شکنتلا کے لیے راستہ بنانے لگے۔ شکنتلا کا رخ لکشمن داس کی طرف تھا۔ ناگن دیوی کو اتنا قریب پا کر لکشمن داس تیزی سے کھڑا ہو گیا۔ شکنتلا اس سے کوئی بات کہے بغیر اس کے سنہری تخت پوش پر براجمان ہو گئی۔ لکشمن داس اس کے چرن چھونے کی نیت سے جھکا اور شکنتلا کے گورے گورے پیروں کو چھونے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن شکنتلا نے زور سے جوتے کی نوک اس کے منہ پر ماری۔ لکشمن بلبلا کر ہٹا۔ اس کی ناک سے خون کی پتلی لکیر نکل آئی۔

''پاپی...... راکشش...... '' شکنتلا غصے میں نظر آنے لگی۔ ''ہمیں چھوئے گا تو جل کر خاکستر ہو جائے گا۔ تیرے جرائم کی فہرست طویل اور قد تیرا بہت چھوٹا ہے۔'' شکنتلا کی ڈانٹ سے مکروہ شکل لکشمن بری طرح سہم گیا۔ اور ایک طرف سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

''ناگ مندر کے تمام پجاریوں اور دیوداسیوں کو حاضر کیا جائے۔'' شکنتلا کا حکم پا کر ناگ مندر کے محافظ حرکت میں آ گئے کئی پرجوش جوان بھی ان کے ساتھ چلے گئے۔ ''تمام لوگ دیواروں کے ساتھ ساتھ آلتی پالتی مار کر بیٹھ جائیں اور سب دروازے بند کر دیے جائیں۔'' دیوی کے حکم کی تعمیل ہوئی۔ سانپوں نے تخت پوش کو گھیر لیا۔ شکنتلا دونوں بازو تخت کی ہتھیوں پر رکھ کر منہ اوپر اٹھا کر آنکھیں بند کر کے ایسے خاموش ہو گئی جیسے مراقبہ میں چلی گئی ہو۔

دیوان میں موجود سب لوگوں کی نظریں شکنتلا کے بناؤ سنگھار سے بھرپور معصوم لیکن چمکتے دمکتے چہرے پر لگی تھیں۔

سب سوچ رہے تھے کہ اتنی خوبصورت لڑکی کوئی دیوی ہی ہو سکتی ہے! ابھی ان کی آنکھوں نے شکنتلا کے دالہانہ رقص کا مظاہرہ بھولا نہ تھا۔ اس کے جسم کے نشیب و فراز بھی قاتلانہ تھے اور بیٹھنے کا انداز بھی شاہانہ تھا۔ شکنتلا نے جان بوجھ کر آنکھیں بند کر کے یہ انداز اپنایا تھا۔ تاکہ مرد اور جوان لڑکے حسن کی انگیٹھی پر عشق کی تپش جی بھر کر سینک لیں اور اس کے دیوانے بن جائیں تاکہ ان کے ذہنوں اور دلوں پر گرفت مضبوط ہو جائے۔

زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ناگ مندر کے محافظ مندر کے تہہ خانے اور اندرونی کمروں سے تمام پجاریوں کو بری طرح مارتے ہوئے لے آئے ان کے پیچھے پیچھے درجنوں دیوداسیاں بھی سر جھکائے خراماں خراماں چلی آ رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں حیرانی اور خوف کی ملی جلی آمیزش سے لبریز تھیں۔

''مت مارو انہیں.....'' شکنتلا نے بازو ہوا میں بلند کر کے تاثرات سے عاری چہرے اور لہجے میں کہا۔ تو محافظوں اور بپھرے نوجوانوں کے قدم یکدم رک گئے۔

تمام پجاری جن کی تعداد ایک درجن سے زائد تھی آتے ہی ناگن دیوی کے حضور جھک گئے۔ اور زار و قطار ہونے لگے۔ اب شکنتلا کے اشارے پر کامنی اور دوسرے نوجوان کو بندھن سے آزاد کر دیا گیا۔

''تمہارا نام کامنی ہے لڑکی۔'' شکنتلا انکشاف کے انداز میں بولی تو سب لوگ چونک پڑے..... کامنی نے بھی ابھی ہی شکنتلا کو دیکھا تھا۔

کیونکہ رسیوں سے جکڑی کامنی کا رُخ مخالف سمت تھا۔ وہ فوراً ساری صورت حال سمجھ گئی اور اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

''میں ناگن دیوی ہوں اور ناگ دیوتا کے حکم سے آئی ہوں مجھے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کی ہدایت ہے۔ ظالموں کو سزا اور مظلوموں کو پورا انصاف دوں گی۔ کامنی تم جتنا کو مندر کی اندرونی اصل کہانی اپنی زبان سے سناؤ۔''

''مم.....مم.....'' کامنی کھنگار کر بولی۔ ''میرا نام کامنی ہے!''

''میرے ماتا پتا بے اولاد تھے ناگ مندر آ کر انہوں نے منت مانی کہ پہلی بیٹی ہوئی تو اسے ناگ مندر کی دیوداسی بنا دیں گے۔ ''منت پوری ہو گئی میں دنیا میں اپنی مصیبتوں کے ساتھ آ گئی.....'' کامنی گلوگیر لہجے میں بول رہی تھی۔

''بچپن گھر کی چار دیواری کے اندر گزارا عمر کے سولہویں برس میں قدم رکھا تو والدین مجھے یہاں لے آئے..... میرے ساتھ میری چھوٹی بہن لکشمن بھی تھی جو مجھ سے زیادہ خوبصورت تھی ساتھ ہمارے دو بھائی بھی تھے۔

یہ آج سے تین سال پہلے کا قصہ ہے۔

لکشمی کو دیکھ کر پجاریوں کی نیت خراب ہو گئی انہوں نے میرے والدین کو ڈرایا دھمکایا کہ دونوں بیٹیوں کو دیوداسیاں بنا دو ورنہ ناگ دیوتا تمہارے پورے گھر پر قہر نازل کریں گے۔ غربت اور بیماری تمہارے گھر ڈیرے ڈال لیں گی۔ والدین رضامند نہ تھے پرنتو بھائیوں نے اپنا جیون سکھی رکھنے کے لیے پجاریوں کی حمایت کر دی۔ گھنٹہ بھر تقریب ہوئی۔ پہلے ہمارے گلوں میں سانپ ڈالے گئے ہم بہت ڈر رہی تھیں لیکن سانپ بے ضرر تھے۔

پھر ہمیں سفید سوتی ساڑھیاں پہنا کر اسی لکشمن داس نے ہمارے ماتھوں پر سیندور ملے ہمیں سارا جیون ننگے پاؤں رہنے، نگاہیں جھکائے رکھنے اور صرف عبادت کرنے کی ہدایت دی۔ سب لوگوں میں پرشاد تقسیم کیا گیا اور ناگ دیوتا کے بت کے نیچے سے ایک دروازہ کھول کر ہمیں اندر داخل کر دیا گیا دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی طویل سیڑھیاں نظر آئیں جو نیچے جا رہی تھیں۔ دونوں بہنیں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے اترنے لگیں ہاتھ کو ہاتھ سجائی نہ دیتا تھا۔ خاصی سیڑھیوں کے بعد ایک کمرہ آ گیا۔ اس کمرے میں ہر طرف دروازے ہی دروازے تھے ہر دروازے کے سامنے ایک ایک پہریدار کرسی ڈالے بیٹھا تھا مجھے ایک پہریدار نے بلایا اور دروازے کے اندر جانے کو کہا۔ لکشمن بھی میرے ساتھ آنے لگی تو اسے دوسرے پہریدار نے بازو سے پکڑ کر دوسرے دروازے سے اندر دھکیل دیا اس دن سے آج تک اس کی صورت کو ترس گئی ہوں۔ کامنی کی سرمئی آنکھیں چھلک پڑیں اور وہ ساڑھی کے پلو سے پلکوں کے بھیگے گوشے صاف کرنے لگی۔

دروازے سے اندر داخل ہو کر دیکھا تو پھر سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں لیکن یہ سیڑھیاں سیدھی نہ تھیں بلکہ گھومتی ہوئی

تھیں۔ جو ایک دروازے کے سامنے جا نکلیں دروازہ کھلا ہوا تھا حالانکہ سیڑھیاں مزید نیچے جا رہی تھیں لیکن اس دروازے میں کھڑی موٹی اور کالی سی بدصورت عورت نے گھورتے ہوئے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا...... اندر گئی تو مجھے ہر طرف دیوداسیاں نظر آئیں جو ایک دائرے میں بیٹھی تھیں۔ موٹی عورت بھی میرے ساتھ تھی۔ اس نے مجھے ڈانٹنے کے انداز میں بتایا کہ میں سب دیوداسیوں کی تربیت کرتی ہوں۔

سارا دن مجھے بتایا جاتا رہا کہ دیوداسی کا کام ناگ دیوتا اور دھرم کی سیوا کرنا، سادہ غذا کھانا، سفید کپڑے پہننا، نگاہیں جھکا کر رہنا ہے۔ لیکن شام ہوتے ہی مجھے نہلا دھلا کر ریشمی لباس پہنا کر لکشمن داس کی خواب گاہ میں دھکیل دیا گیا۔ میں آہ و زاری اور منتیں کرتی رہ گئی لیکن اس ظالم نے مجھے نوچ کھسوٹ لیا اور اس کے بعد میں دن کو تو ستی ساوتری دیوداسی بنی رہتی اور اندھیرا پھیلتے ہی ہمیں بیسواؤں کا کردار ادا کرنے کے لیے کسی نہ کسی پنڈت پجاری یا ان کے مہمان کی خدمت کے لیے بھیج دیا جاتا۔ تین سال ہو گئے ہیں گناہ کی اس چتا میں جلتے ہوئے آج تک مجھے اپنی بہن کامنی کا بھی کچھ پتا نہیں چلا سکا ہے!

کامنی کے خاموش ہوتے ہی شکنتلا نے باقی دیوداسیوں سے اس کے بیان کی تصدیق کی تو سب نے بیک زبان تصدیق کی پھر کیا تھا ہجوم نے مطالبہ کیا کہ لکشمن داس سمیت تمام پنڈت پجاریوں اور ان کے رفقاء کار کو موقع پر سزا دی جائے۔

شکنتلا بھی اب وش کنیا ساتھ لے کر شری راج کو پہنچانا چاہتی تھی لہٰذا اس نے دماغی لہروں کے ذریعے سانپوں کو حکم دیا کہ تمام مجرموں کو ڈس کر ہلاک کر دو صرف شری راج کو چھوڑ دو۔

حکم ملتے ہی سانپوں کا جم غفیر بڑھا اور سادھوؤں، پجاریوں اور پنڈتوں کو گھیر کر انہیں ڈسنے لگا، لمحوں کے اندر ان کی نیلی لاشیں سب کے سامنے گر گئیں۔ لکشمن داس کے بارے میں ناگن دیوی نے حکم دیا کہ اس کے گلے میں زنجیر باندھ کر اسے ناگ دیوتا کے بت کے ساتھ باندھ کر رکھا جائے اور روزانہ آنے والا ہر یاتری اس کو جوتے مارے۔ تھوڑی ہی دیر میں لکشمن کے گلے میں لوہے کا پٹا ڈال کر اسے ناگ دیوتا کے بت کے ساتھ باندھ دیا گیا۔

اب باری باری لوگ اس کے سر منہ اور کمر پر جوتے برساتے گزرنے لگے۔ لکشمن داس بلبلانے لگا شکنتلا مسکرا رہی تھی۔

اب اس نے ناگ دیوتا کے تہہ خانے میں موجود خزانہ نکلوایا اور غرباء میں تقسیم کروا دیا۔ اور پھر سب کو جانے کا حکم دیا۔

اس کے بعد چند محافظوں اور درجہ دوئم کے برہمچاریوں کو جمع کر کے بتایا کہ کامنی آج سے مندر کی مہان پجارن ہے۔ اس کا حکم مانا جائے اور پھر اس نے دو صحت مند اور خوبصورت وش کنیاؤں کا انتخاب کر کے اپنے ساتھ چلنے کو کہا، اور گھوڑوں والی بگھی حاصل کی اور رخصت ہو کر وہاں سے چل پڑی۔ کامنی نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن شکنتلا کو ابھی بہت سے کام تھے وہ رُک نہ سکتی تھی وہ چل پڑی رات کا وقت تھا بگھی شکنتلا کے بتائے ہوئے راستے پر چل رہی تھی۔ ایک جواں سال شخص اس کا کوچوان تھا جو شکنتلا نے اسی نسبت سے ساتھ لے لیا تھا کہ منزل کے قریب پہنچ کر اس سے آسودگی بھی حاصل کروں گی اور اس کا خون بھی...... شکنتلا کو وشواس تھا کہ شری راج اس کی راہ تکتا ہوگا اور یونہی ہوا...... کہ شکنتلا کو یوں محسوس ہوا کہ جانا پہچانا علاقہ آ گیا ہے اس نے بگھی رکوائی باہر نکل کر دیکھا تو سامنے اس کو وہی ٹیلا نظر آیا جس پر شری راج تپسیا میں معروف تھا۔ شکنتلا قطعاً حیران نہ ہوئی کہ اس کے لیے یہ شعبدے اب معمولی تھے۔ اس کی اپنی زندگی پراسرار جادو بھری تھی اسے پہلے ہی اس بات کا یقین تھا کہ شری راج اسے اپنی طرف خود ہی کھینچ لے گا۔

اب شکنتلا نے ٹیلے سے چند قدم کے فاصلے پر بگھی رکوائی...... اور دونوں لڑکیوں اور کوچوان کو پیدل ساتھ چلنے کو کہا۔

☆......☆......☆

"واہ شکنتلا واہ......" شری راج اپنے دبلے اور لمبے وجود کے ساتھ ان کے سامنے کھڑا تھا شکنتلا وش کنیاؤں اور کوچوان سمیت ٹیلے پر بنے ہوئے مکان کی ایک کوٹھری میں شری راج کے پاس پہنچ چکی تھی۔ دونوں لڑکیاں اور کوچوان شری راج کی عجیب شکل اور طویل قد اور اس کے گھر کی پراسرار ہیبت سے سخت خوفزدہ نظر آتے تھے۔

"کھڑی ہو جاؤ دونوں......" شری راج نے وش کنیاؤں کو حکم دیا تو دونوں بے اختیار کھڑی ہو گئیں۔ شری راج بھی ان کے سامنے کھڑا ہو گیا! انہیں دیکھنے لگا اور زیر لب کچھ بڑبڑانے لگا اور اچانک دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بنا کر لڑکیوں

بے سر پر کے مارنے لگا تو شکنتلا حیرت سے اچھل پڑی پہلے جھٹکے کے ساتھ دونوں لڑکیاں ٹخنوں تک زمین کے اندر دھنس گئیں دوسرے جھٹکوں کے ساتھ ان کی ٹانگیں گھٹنوں تک دھرتی کے اندر سما گئیں۔ چند لمحوں کے بعد ہی دونوں لڑکیوں کا یہ حال تھا کہ وہ سینے تک زمین میں دھنس چکی تھیں اور خوف و دہشت سے بری طرح چلا رہی تھیں اور شکنتلا کی طرف مترحم نظروں سے دیکھتی تھیں۔ لیکن شکنتلا اب ان کی طرف متوجہ نہ تھی اس کا کام ختم ہو چکا تھا۔

لڑکیاں زمین میں دھنستی چلی گئیں پھر پراتی روشنی شری راج نے انہیں قید کر لیا تھا پھر شری راج شکنتلا کو لے کر اسی جوہڑ کے کنارے آ گیا اور ایک پتھر پر اس کو بٹھا دیا۔

"سنو شکنتلا اب تم آزاد ہو۔ کوئی بھی روپ بہروپ بدل سکتی ہو!"

"پرنتو۔۔۔ آپ نے مجھے جادو بھی سکھانا تھا شری راج جی۔۔۔۔" شکنتلا بڑی بڑی آنکھیں اس کے چہرے پر جما کر بولی۔

"شری راج کا ہر وعدہ پکا وعدہ۔۔۔۔" شری راج نے مضبوط لہجے میں کہا۔

کسی پرانے شمشان گھاٹ میں منڈل کھینچو اس دائرے کے اندر اور باہر ایک کنواری کنیا کا خون چھڑکو اور چالیس روز تک پیروں کے پنجوں کے اوپر اکڑوں بیٹھ کر میرے بتائے ہوئے جنتر پر عمل کرو تو گنیش دیوتا کی ایک ایسی شکتی تجھے دان ہو جائے گی جسے سحر روپ کہتے ہیں۔ اس شکتی کی تین خوبیاں ہیں پہلی یہ کہ تم پر عام جادوگر جو بیر مہابیر پر دسترس رکھتے ہیں کے جادو اثر نہیں کر پائیں گے۔ مرا ہر سیکھے جادوگر کا جادو تم پر چل سکے گا اور سیکھے خال خال ہی ہوا کرتے ہیں دوسرا یہ کہ کوئی کالے جادو کا ماہر تیری کسی شکتی پر پابندی نہ لگا سکے گا جب تک اسے گنیش دیوتا کی آشیرباد حاصل نہ ہو جائے اور آخری خوبی یہ کہ تو گرجن داس کے سحر سے آزاد ہو جائے گی۔ اور آئندہ کوئی سیکھے سے کم تر جادوگر تیرے لیے جاپ کرنے کی جرأت نہ کرے گا اور وہ بھی جیسے ہی کوئی ایسا جاپ شروع کرے گا تجھے خبر ہو جائے گی۔" اور پھر شری راج نے شکنتلا کو جنتر پڑھنا سکھایا۔

"او میرے شری راج۔۔۔۔" شکنتلا ایک دم اچھل اٹھی اور اٹھ کر اس نے بوڑھے شری راج کو بازوؤں میں بھر لیا۔ "میں یہ جاپ کل ہی شروع کر دوں گی۔" "پرنتو شکنتلا کل کا سورج نکلنے سے پہلے پہلے تو یہاں سے چلی جائے گی۔ کیونکہ آج رات میں ایک وش کنیا کا خون پی لوں گا۔۔۔۔ اس میں اتنا وش ہوگا کہ میں عارضی طور پر مدہوش ہو جاؤں گا اور مدہوش کے لمحات میں اگر تو نزدیک ہوئی تو میرے لیے خود پر قابو رکھنا مشکل ہو جائے گا اور عورت میرے لیے اس طرح زہر قاتل ہے جس طرح وش کنیا کا خون کسی عام آدمی کے لیے موت ہے۔"

"یہ مدہوشی کتنے عرصے کے لیے ہوگی شری راج۔" شکنتلا نے بھولپن سے پوچھا۔ "دو دن اور دو راتوں کے لیے۔ لہٰذا تو یہاں سے نکلنے والی بات کر۔"

فکر نہ کرو شری راج۔۔۔ تو نے شکنتلا کو زبردستی روکا تھا۔ شکنتلا دل ہی دل میں مسکرا کر بولی۔ شکنتلا اپنا انتقام لے کر رہتی ہے۔ آج رات میں تیرا گیان بھرشٹ کروں گی اور سحر روپ جاپ میں مکمل ہونے کے بعد تیری تکہ بوٹی کرنے بھی آؤں گی۔

"کہاں کھو گئی ہو شکنتلا ادھر دیکھو۔" شری راج کی آواز سن کر شکنتلا چونکی اور شری راج نے جدھر اشارہ کیا تھا اس طرف دیکھا تو بے اختیار اپنی جگہ اٹھ کر چیخی اور طربیہ انداز میں بولی۔ "ارے چنکار تم۔۔۔۔ کب آئے اور کس طرح آئے۔" "شنکران کو میں نے اپنی ضمانت دی تھی کہ تم چنکار کو دے دو حسنکران کو ضرور زندہ تلاش کیا جائے گا۔

"شری راج جی میں آپ کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں شکنتلا شری راج کے چرن چھو کر بولی۔"

"پرنتو حسنکران کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں؟"

"ہاں صرف اتنا کہ وہ گوتھاری نامی سادھو کی قید میں ہے۔"

"پرنتو گوتھاری کے پاس تم اکیلی نہ جانا بلکہ سامری کو ساتھ لے جانا۔"

"سامری جی کہاں ملیں گے؟"

گرجن داس سے مقابلے کے بعد اس کے استاد کی بدروح نے سامری کو روپوش ہونے کا مشورہ دیا تھا سامری اب تجھے تابانہ میں مل سکتا ہے۔

''شری جی اتنا علم آپ کے پاس ہے آپ اتنے مہان ہیں پھر تپسیا کس لیے کر رہے ہیں۔'' شکنتلا نے شری راج کو ٹٹولا۔
''میں ماضی قریب اور مستقبل قریب کے ان واقعات کا پتا چلا لیتا ہوں جن کا پتا چلانا چاہوں۔ مگر اب اپنے نئے جاپ میں کامیاب ہونے کے بعد ہر قسم کے واقعات اور دلوں کے اندر جھانکنے کا بھی مجھے فن مل جائے گا۔''
شری راج کی بات سُن کر شکنتلا نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسے خطرہ تھا کہ شری راج کہیں اس کے من کا چور نہ پکڑ لے، وگرنہ سارا کھیل بگڑ جاتا پھر شری راج نے اسے دوسری کوٹھڑی میں بھیج کر اندر سے کنڈی لگانے کی ہدایت کی۔
''مالکن......'' چھنکار کی آواز سُن کر شکنتلا چونکی اور پھر مسکرا دی۔
''کیا ہے بدشکلے؟''
''بڑا بھیانک منصوبہ بنا رہی ہے تُو مالکن۔''
''چپکا بیٹھا رہ تو اور مجھے بتانا جب یہ دش کنیا کا خون پی کر مدہوش ہو جائے۔''
''خون تو وہ پینا شروع ہو گیا ہے۔ بس تھوڑی دیر رُک جا۔'' چھنکار نے کہا اور شکنتلا خاموش بیٹھ گئی۔
چھنکار کے اشارے پر شکنتلا اس وقت کوٹھڑی سے باہر نکلی جب دش کنیا کا زہر پوری طرح شری راج کو اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔ شکنتلا نے دیکھا کہ شری راج دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر ایک طرف بیٹھا ہے۔ سینے تک زمین میں دھنسی ایک لڑکی کا سر دھڑ سے کٹ کر تھوڑی دور پڑا تھا اور شری راج نے شاید اس کی شہ رگ پر منہ رکھ کر خون پی لیا تھا۔ جب کہ دوسری لڑکی زبردست خوف و ہراس کا شکار نظر آتی تھی۔ شکنتلا کو دیکھ کر پکارنے لگی لیکن شکنتلا نے کوئی توجہ نہ دی کیونکہ اب اس سے شکنتلا کو کوئی غرض نہ تھی۔ وہ صرف شری راج کی تپسیا بھرشٹ کرنے کی خواہاں تھی۔
شکنتلا آہستگی سے چلتی ہوئی شری راج کی پشت پر جا پہنچی...... اور دونوں ہاتھ اس کی بغلوں سے نکال کر باہیں اس کی کمر کے گرد حائل کر دیں اور سر شانوں پر رکھ دیا...... شری راج نے کوئی حرکت نہ کی تھوڑی دیر انتظار کے بعد شکنتلا لڑکی اور چھنکار کا احساس کیے بغیر شری راج کے مردہ جذبات جگانے کی کوشش کرنے لگی شری راج نے شکنتلا کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ دھیرے دھیرے بات بڑھنے لگی۔ بہار اور خزاں مل کر کھیلنے لگے۔
باسی کڑھی میں اُبال آنے لگا۔ اسی سالہ شری راج بہکنے اور بے وقت کی راگنی بجانے لگا۔ دش کنیا خوف و حیرت کا شکار تھی چھنکار مسکرا رہا تھا۔ شکنتلا انتقام لینا چاہتی تھی۔ بات بڑھنے لگی بند ٹوٹنے لگے پیمانے لبریز ہوتے ہوتے چھلک پڑے بادل گرجے بجلی کڑکی ساون برسا لیکن جل تھل نہ کر سکا۔ البتہ حبس کا سماں پیدا کر گیا۔ شری راج اوندھا پڑا تھا۔ شکنتلا کی آنکھوں میں سرخ ڈورے اور بیتاب ہو گئے اس نے زور سے شری راج کو الگ کر کے پٹخا اور چھنکار کو لے کر نکل گئی لڑکی سینے تک دھنسی چیختی رہ گئی۔

☆......☆......☆

یہ ایک پرانا شمشان گھاٹ تھا جو ویران تھا۔ یہاں اب مردے جلانے کے لیے بھی کبھی کبھار ہی کوئی آتا تھا۔ اسی گھاٹ میں شکنتلا نے درختوں کی جھنڈ کی اوٹ میں سنکھرپ جاپ کے لیے جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ کنواری لڑکی کا حصول شکنتلا کے لیے مشکل بات نہ تھی۔ لڑکی کی گلہ کٹی لاش جس کا منہ اذیت ناک انداز میں کھلا ہوا تھا ایک طرف پڑی تھی دائرے کے اندر اور باہر سرخ خون جم رہا تھا۔
شکنتلا بیٹھی شری راج کا بتلایا ہوا جاپ شروع کر چکی تھی چھنکار اس کی حفاظت کے لیے منڈل کے باہر موجود تھا۔ چند دن تو خیریت سے گزر سکے پھر شکنتلا کو مختلف شکلیں ڈرانے کے لیے آنے لگیں لیکن شکنتلا کے لیے ڈر گھر کی کھیتی تھی۔ لہٰذا اس کا کچھ نہ بگڑا اور وہ چالیس دن کا سنکھرپ کامیابی سے کرنے کے قریب ہو گئی۔ آخری روز رات جانے کون سا پہر تھا جب شکنتلا شری راج کے بتلائے ہوئے جاپ کا ورد جاری رکھے ہوئے تھی۔ اچانک شکنتلا کو محسوس ہوا جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ ساری زمین ہل رہی تھی درختوں کی ٹہنیاں ایسے حرکت میں تھیں جو طوفان کا پیش خیمہ ہو۔ چہار سو رونے اور ماتم کرنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ شکنتلا نے یک لخت آنکھیں کھول دیں لمحے بھر کو اس کا جاپ رُک گیا۔ لیکن پھر شکنتلا

نے سر کو جھٹکا اور جاپ جپنے میں مصروف ہوگئی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ یہ جاپ مکمل ہونے کی نشانیاں ہیں سب شعبدے اور آنکھوں کے دھوکے ہیں۔

اچانک کسی جانور کے چلنے سے زمین ہلنے لگی۔ جیسے کوئی بہت بڑی جسامت کا دیو چلا آ رہا ہو...... شکنتلا نے پھر آنکھیں کھولیں تو منڈل کے عین سامنے ایک بہت بڑی بلا کو پایا...... جس کا دھڑ دس ہاتھیوں کے برابر لیکن چار چھوٹی چھوٹی ٹانگیں تھیں...... جبکہ گردن بہت لمبے زرافے کی مانند تھی۔ جس کے اوپر بہت بڑا منہ تھا جبڑا مگر مچھ کی طرح آگے کو نکلا ہوا۔

یہ بلائے ناگہانی اپنا منہ پوری طرح کھولے ہوئے بھاگی چلی آ رہی تھی۔ اور ہر گزرتے لمحے کے ساتھ شکنتلا کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے بھاگنے سے زمین بری طرح زلزلے کی کیفیت میں تھی۔ یعنی کوئی خواب یا دھوکہ نہیں حقیقت ہے۔ شکنتلا نے سوچا۔ ایک پل میں اسے فیصلہ کرنا تھا کہ بیٹھی رہے یا بھاگ جائے یہ نہ ہو کہ وہ اسے سراب سمجھتی رہے اور بلا اسے روندتی ہوئی گزر جائے۔ لیکن پھر جانے کیا ہوا اس کی نظر منڈل سے باہر چمتکار پر پڑی جو ہاتھ کے اشارے سے اسے پرسکون رہنے کی ہدایت کر رہا تھا۔ چمتکار کا اشارہ پا کر شکنتلا نے جان لیا یہ سب خوفزدہ کر کے عامل کو بھگانے کے طریقے ہیں اور پھر جیسے ہی وہ دیو ہیکل بلا بھاگتی ہوئی شکنتلا کے سر پر پہنچی تو منڈل سے ٹکراتے ہی پھک کی آواز کے ساتھ دھواں بن کر ہوا میں تحلیل ہوگئی اور شکنتلا نے سکھ کا سانس لیا۔

لیکن زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ٹپ ٹپ بارش شروع ہوگئی۔ بڑی بڑی بوندیں گرنے لگیں۔ شکنتلا نے توجہ نہ دی۔ لیکن اس وقت وہ غور کرنے پر مجبور ہوگئی جب اس نے دیکھا کہ بوندیں سرخ رنگ کی ہیں جیسے خون۔ گرم گرم تازہ خون۔ جو ارد گرد کی زمین اور درختوں کو سرخ کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا شمشان گھاٹ لال رنگ کی چادر تان گیا۔ خون سیلابی پانی کی طرح بہنے لگا۔ لیکن حیرت کی بات تھی کہ دائرے کے اندر پانی نہ آ رہا تھا اور نہ بارش ہو رہی تھی۔ شکنتلا نے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد آنکھیں کھولیں تو کچھ بھی نہ تھا۔ حالات پرسکون ہو چکے تھے۔

''ہاہاہا......'' اچانک ایک قہقہہ گونجا تو شکنتلا نے یکدم پیچھے دیکھا تو دھک رہ گئی۔ اس کا دل ڈولنے لگا۔ گرونرائن کھڑا تھا شکنتلا کے سیاہ ترین دنوں کا مالک۔

☆......☆......☆

''تو کیا سمجھتی تھی کہ سکھرپ جاپ کر کے مجھے زیر کر لے گی۔ چل اٹھ میں تجھے لینا آیا ہوں۔ میری غلام...... دو ٹکے کی عورت۔'' گرونرائن اس کی طرف دیکھ کر زمین پر تھوک کر بولا۔ شکنتلا اچانک اسے سامنے پا کر شپٹا گئی۔ یہ بے وقت کہاں سے آ گیا اب کیا ہوگا۔ شکنتلا نے سوچا لیکن پھر اچانک اس کے ذہن میں چھپا کہ ہوا کہ کہیں یہ بھی آنکھوں کا دھوکہ تو نہیں اور اگر حقیقت میں بھی یہ گرونرائن ہے تو اگر سامری اس کو منڈل سے نہ نکال سکا تو یہ کیسے نکالے گا یہ سوچتے ہی اس نے سکون سے آنکھیں موند لیں۔ کافی دیر گزر گئی۔ کہ اسے اپنے اوپر ہلکی ہلکی چیزیں ٹکرانے کا احساس ہوا۔ اس نے پھر آنکھیں کھولیں...... چمتکار کو سامنے ہی مسکراتا کھڑا پایا۔ شکنتلا نے ارد گرد نظریں دوڑائیں تو دیکھا کہ اس پر کالے رنگ کے گلاب کے پھولوں کی بارش ہو رہی ہے دور پو پھٹ چکی تھی۔ پرندے درختوں پر چہچہا رہے تھے چمتکار اسے منڈل سے باہر آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ شکنتلا بے اختیار مسکرانے لگی۔ سکھرپ جاپ میں وہ سپھل ہو چکی تھی اور اب وہ بہت بڑی شکتی کی مالک تھی کیا سامری اور کیا گرونرائن کیا حکمران اور کیا شری راج وہ سب سے زیادہ مہان، پوتر اور سب پر بھاری ہو چکی تھی۔ پرتعیش اور پرسکون جیون اس کا خواب تھا وہ اسے پورا ہوتے نظر آنے لگا تھا وہ اٹھی اس کی ٹانگیں سوج کر سو چکی تھیں وہ بمشکل تمام منڈل سے باہر آئی چمتکار نے اسے خوش آمدید کہا اور شکنتلا منڈل سے باہر آ کر مارے تھکاوٹ اور بھوک کے گر گئی اور بے ہوش ہوگئی۔ شکنتلا کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو آرام دہ بستر پر پایا۔ یہ ایک خوبصورت منظر تھا چمتکار پاس ہی کھڑا تھا شکنتلا کی آنکھ کھلتے دیکھ کر آگے بڑھا اور چاندی کا بڑا پیالہ شکنتلا کی طرف بڑھایا۔ شکنتلا نے خوشگوار حیرانی سے دیکھا اور پھر مسکرا کر پیالہ تھام کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ پاس ہی ایک شخص کی لاش پڑی تھی۔ جس کی شہ رگ ادھڑی ہوئی تھی اس کے ساتھ ایک صحتمند نوجوان کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ چمتکار نے خون سے بھرا پیالہ شکنتلا کو دیا تھا تا کہ شکنتلا کی

صحت وتوانائی کی تعبیر ہو۔ شکنتلا گرم گرم تازہ خون غٹ غٹ کر کے پی گئی۔

''یہ کون سی جگہ ہے چنکار؟'' شکنتلا ایک کپڑے سے ہونٹ صاف کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ بہت محفوظ مقام پر ہیں آج پورے دونوں کے بعد آپ نیند سے بیدار ہوئی ہیں کہیں تو اور خون پیش کروں۔'' چنکار خوفزدہ نوجوان کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

''نہیں چنکار اب ہم شری راج سے دو دو ہاتھ کرنے نکلیں گے۔'' یہ کہہ کر شکنتلا اپنی جگہ سے اُٹھی۔

☆......☆......☆

شری راج اپنے انجام سے بے خبر اپنی کٹیا میں بیٹھا تھا کہ چنکار شکنتلا کو لے کر اس کے سامنے ظاہر ہو گیا۔ شکنتلا کو اچانک سامنے پا کر تھوڑی دیر کے لیے شری راج کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرائے لیکن پھر وہ سنبھل گیا اور بولا۔ ''تو نے میری ورشوں کی تپسیا بھرشٹ کر دی ہے۔ تمہارا جرم ناقابل معافی ہے اگر تم خود نہ آتیں تو میں تمہیں پاتال کی گہرائیوں سے بھی نکال لاتا۔ شری راج کی آنکھوں میں نفرت عود کر آئی۔'' شکنتلا مسکراتے ہوئے دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھ کر مسکرائی اور بولی۔ ''تمہاری تپسیا برباد ہو چکی ہے مگر شکنتلا کی نہیں میں سکھروپ جاپ میں مکمل ہو چکی ہوں تم نے تو خود ہی کہا تھا۔ شری راج کہ اب مجھ پر صرف سنکھے جادوگر کا ہی زور شاید چل سکے اور تم تو اب مہابیر بھی نہیں رہے۔'' شکنتلا کی بات سن کر شری راج تذبذب میں آ گیا۔

''مجھے اتنا کمزور نہ جان ناگن آنے کا مقصد بیان کر۔''

''شکنتلا اپنے کسی دشمن کو زندہ چھوڑ کر آگے نہیں بڑھتی تو نے میرا راستہ روک کر پریشان کیا تھا۔ اب کتے کی موت مار کر زندگی کی پریشانیوں سے نجات دلا دوں گی تجھے۔'' یہ کہہ کر شکنتلا کے ہونٹ ہلے اور اچانک شری راج جہاں بیٹھا تھا وہاں کی زمین شق ہو گئی لیکن اس سے قبل کہ شری راج زندہ دفن ہو جاتا شری راج جگہ سے غائب ہو گیا۔ شکنتلا ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ اسے اپنے عقب میں آہٹ محسوس ہوئی وہ بلی کی تیزی سے پلٹی تو اسے درجنوں تیز دھار خنجر اپنی طرف لپکتے نظر آئے۔ شکنتلا کچھ کرنے کو سوچ ہی رہی تھی کہ اس نے اپنا وجود ہوا میں بلند ہوتا ہوا محسوس کر لیا اور سارے خنجر سامنے کی دیوار میں پیوست ہو گئے۔ شکنتلا نے چنکار کی طرف دیکھا تو وہ اسے ایک طرف اطمینان سے کھڑا نظر آیا۔ وار خالی جاتے دیکھ کر شری راج تلملا رہا تھا۔

وہ یکبارگی پھر اپنی جگہ سے اچانک غائب ہو گیا شکنتلا اسے گھوم کر چاروں طرف دیکھنے لگی کہ اچانک وار نہ کر دے۔ شکنتلا دیوی آپ کو چنتا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ چنکار کی آواز سن کر شکنتلا رک گئی۔

''آپ سکھروپ جاپ کر چکی ہیں جبکہ شری راج اب صرف مہابیر رہ گیا ہے اس کا کوئی وار آپ پر کارگر ثابت نہیں ہو سکتا۔'' اچھا چھپا کہ ہوا اور آگ کے شعلے چاروں طرف سے شکنتلا کی طرف لپکنے لگے اور آپس میں مل گئے۔ شکنتلا شعلوں کے درمیان گم ہو کر رہ گئی سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ چنکار بھی سہم جاتا۔ اگر شکنتلا ایک زناٹے دار آواز سے چنکار کے سامنے زمین سے باہر نہ آ جاتی باہر آ کر ابھی وہ صحیح طرح سے کھڑی بھی نہ ہوئی تھی کہ اچانک شری راج اس کی ٹانگوں کے پیچھے سے نمودار ہوا اور اس نے بجلی کی سی تیزی سے شکنتلا کی ٹانگیں پکڑ کر پیچھے کو کھینچیں تو شکنتلا منہ کے بل زمین پر گری اور گرتے ہی اس کے ناک اور منہ سے خون جاری ہو گیا۔ شکنتلا اٹھی تو اٹھتے ہی اس کا ہاتھ اپنے منہ کی طرف گیا تو ہاتھ خون سے بھر گیا وہ ابھی سنبھل نہ پائی تھی کہ شری راج نے ڈب سے اڑسا ہوا خنجر نکال کر ہوا میں بلند کیا اس کا نشانہ شکنتلا کے سینے کا مقام تھا اس سے پہلے کہ وہ خنجر شکنتلا کے سینے میں گھونپ ڈالتا چنکار حرکت میں آیا۔ اور پلک جھپکنے میں شری راج کے ہاتھ سے خنجر نکل کر دور جا گرا یہی وہ لمحہ تھا جب شکنتلا سنبھل گئی اور اس نے گھڑپ جاپ کی پہلی آزمائش کی اور منتر پڑھ کر شری راج کی جانب منہ کر کے دونوں ہاتھوں کا ہالا ہونٹوں کے گرد بنایا اور ہولے سے پھونک ماری بادلوں کی زوردار گرج ابھری جیسے پہاڑی کے نیلے پر کہیں بجلی گری ہو روشنی کا ایک شائبہ سا گزرا اور شری راج کے حلق سے ایک زوردار چیخ بلند ہوئی اور پھر شری راج آگ کے شعلوں میں گھرا ہوا نظر آنے لگا۔ شکنتلا ٹھٹک کر پیچھے ہٹی اور دیوار کے ساتھ لگ گئی شری راج چیخیں مارتا ہوا دائیں بائیں بھاگ رہا تھا۔ آگ کے شعلے اس کو مکمل طور پر گھیر چکے تھے اور وہ بری طرح جلنے لگا

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ کوئلہ بن گیا۔" چنکار ..... "شکنتلا غرور کے ساتھ زلفیں جھٹک کر بولی۔

"جی مالکن ..... "چنکار منمنایا۔ "اب ہم تاپانہ چلیں گے میرے راستے کی تمام رکاوٹیں دور ہو چکی ہیں شکنتلا پہلے سے بھی زیادہ مضبوط ہو چکی ہے اب دنیا کی کوئی شکتی شکنتلا کو زیر نہیں کر سکتی اب میں تاپانہ پہنچ کر کچھ عرصہ انتہائی آرام وسکون سے عیش وعشرت کروں گی۔"

"مالکن تاپانہ تک کا راستہ آپ کے لیے بالکل صاف ہے لیکن پریہ اس وقت ملکہ بن کر اپنے پنجے گاڑ چکی ہے۔ آپ بھیس بدل کر ایک لٹی پٹی عورت کے روپ میں جائیں۔ دیکھیں وہ آپ کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے۔"

"ٹھیک ہے چنکار اگر پریہ مجھے ناگفتہ بہ حالت میں دیکھ کر بھی ریاست کی باگ ڈور بغیر حیل وحجت کے میرے حوالے کر دے تو اس کا مقام میری نظروں میں وہی ہوگا اور اگر اس نے کوئی استادی دکھانے کی کوشش کی تو اسے عبرت ناک موت ماروں گی۔"

"آئیں مالکن میں آپ کو تاپانہ لے چلوں۔" چنکار اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

حفاظتی اہلکاروں کے جلو میں شکنتلا کھڑی مسکرا رہی تھی۔ پریہ بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور شکنتلا کی طرف بڑھی اور مہارانی جی کہہ کر شکنتلا کے پاس پہنچ گئی۔

"مجھے پہچانتی ہو پریہ۔" شکنتلا معنی خیز انداز کے ساتھ مخاطب ہوئی۔

"کیوں نہیں۔" پریہ کے ذہن میں ماضی کے واقعات گھومنے لگے۔

اس کا دل ڈول رہا تھا وہ شکنتلا کو ذہن سے مٹا چکی تھی وہ تو ملکہ بن چکی تھی۔ لیکن شکنتلا کے آنے کا مطلب تھا کہ اب ملکہ شکنتلا ہوگی اور پریہ صرف کنیز خاص رہ جائے گی۔ لیکن پریہ کے ذہن میں اچانک سوال اٹھا، شکنتلا اس ٹھاٹ باٹ میں نہ تھی۔ بلکہ اس کے بال گرد سے اٹے تھے اور لباس بھی عام سا تھا۔

"کس سوچ میں ہو پریہ۔" شکنتلا مسکرائی۔

"آں ہاں۔" پریہ پھر چونکی۔ "آیئے مہارانی جی پدھاریے۔" پریہ گم صم بولی اور شکنتلا آگے بڑھ کر تخت پر بیٹھ گئی۔

پریہ اتنے لوگوں کی موجودگی میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔ ان میں سے کئی لوگ اور غلام کنیزیں شکنتلا کو جانتے تک نہ تھے۔ وہ اس پراسرار تبدیلی اور شکنتلا کے انداز تخاطب سے حیران تھے کہ یہ کون ہے جو پریہ کے لیے بھی قابل احترام ہے۔ جبکہ پریہ خود بھی کسی آسمانی عذاب سے کم نہ تھی اور آفت کی پرکالہ تھی۔ ماحول پر عجیب سراسیمگی طاری ہوگئی۔

"کس سوچ میں گم ہو پریہ۔" شکنتلا اس کے چہرے کے تاثرات پڑھتے ہوئے بولی۔ آں ہاں پریہ چونکی۔ کچھ نہیں مہارانی جی اور زبردستی مسکرانے لگی۔ درحقیقت پریہ کو شکنتلا کی آمد سے زبردست دھچکا لگا تھا اور وہ ابھی تک صدمے کی کیفیت سے باہر نہ آسکی تھی۔ شکنتلا ایک گندے سے لباس میں ملبوس تھی پریہ نے تمام لوگوں کو کمرے سے باہر نکال دیا تھا شکنتلا اس کے بستر پریشم دراز تھی وہ ابھی تک شکنتلا کی صحیح صورت حال کا اندازہ نہیں لگا سکی تھی۔

"گروز ائن اور سامری کہاں ہیں۔" پریہ نے شکنتلا کو ٹٹولا۔

"بڑی دور سے اور بڑی مشکل سے تمہارے تک پہنچی ہوں پریہ۔" شکنتلا اس کا مطلب بھانپ کر بے تکے انداز میں بولی۔ "گروزائن نے تو میرے جیون کو بے سکون کر کے رکھ دیا ہے جہاں جاتی تھی سائے کی طرح ساتھ لگا ہوتا تھا۔ اس وقت میری حالت کٹی پتنگ کی سی ہے میری روپ بدلنے کی طاقت میرا جادو میری انسانی اور ناگن کی شکتیاں سب ختم ہوگئی ہیں۔" شکنتلا کے لہجے میں افسردگی اور یاسیت عود کر آئی۔ اس کی باتیں سن کر پریہ غیر محسوس انداز میں چونکی اور اس کی آنکھوں میں چمک ابھری۔

"کیا آپ اس وقت عام سی عورت ہیں؟" پریہ نے تصدیق چاہی۔

"ہاں پریہ۔ میں مجبور اور بے سہارا ہوں۔ تم پر میرے بہت سے احسانات ہیں میں ایک عرصہ سے انسانی خون اور کڑیل مرد کے لیے ترس گئی ہوں۔"

گروزائن خود تو مر گیا لیکن مجھے ایک عام سی لڑکی بنا گیا ہے۔ اب اپنی طاقت کے حصول کے لیے مجھے چالیس دن کا

کشٹ کاٹنا ہوگا لیکن اس سے پہلے میں چاہوں گی کہ ہشاش بشاش ہو جاؤں۔"
"اور پھر دوبارہ طاقت حاصل کر کے مجھے کنیز بنا کر خود ملکہ بن جاؤ؟" پریا اپنی جگہ سے اُٹھ کر کڑکدار آواز میں بولی۔
"ناممکن شکنتلا بی بی۔ اب ریاست تابانہ کی ملکہ پریا ہے جس کے ایک اشارے پر بڑے بڑے امراء کی گردن زنی کردی جاتی ہے۔" اس کے ساتھ ہی پریا نے تالی بجائی تو ایک کنیز سر جھکائے اندر داخل ہوئی۔ "محافظ کو بھیجو۔" پریا گردن اکڑا کر بولی۔ لمحوں میں دو سپاہی اندر داخل ہوئے اور جھک گئے۔ "اس نانہجار عورت کو گرفتار کرلو۔" پریا نے رعونت سے کہا تو سپاہیوں نے حیران ہو کر دیکھا۔ "یہ ہماری ملکہ عالیہ ہیں۔" ایک سپاہی قدرے جھجک کر بولا۔ "میرے ٹکڑے کھا کر مجھ ہی پر بھونکتا ہے کتے۔" پریا غصے میں ایک زوردار طمانچہ اس کے منہ پر جما کر بولی اور پھر تالی بجائی اور کنیز کو مزید محافظ بلانے کا حکم دیا۔
اتنی دیر میں دوسرا سپاہی تیزی سے آگے بڑھا اور شکنتلا کو قابو کر کے اس کے ہاتھ باندھنے لگا۔ شکنتلا نے کوئی مزاحمت نہ کی اتنے میں مزید سپاہی اور افسر اندر آگئے اور پریا کے حکم سے انہوں نے شکنتلا کے گلے میں چمڑے کا پٹہ ڈال کر اپنی طرف سے اسے بے بس کردیا۔ شکنتلا نے بلا مزاحمت گرفتاری دے دی۔ اب پریا ناز و ادا سے آگے بڑھی۔ پریا دونوں ہاتھوں سے اپنی خوبصورت گندھی ہوئی چٹیاؤں سے کھیلتی مسکراتی نظریں شکنتلا پر جمائے شکنتلا کی طرف خراماں خراماں بڑھی اور طنزیہ انداز میں مخاطب ہوئی۔
"سانپوں کی ملکہ، تابانہ کی مہارانی، سامری کی داشتہ، کالی ماتا کی مہان پجارن شکنتلا آپ اس لیے یہاں پدھاری تھیں کہ آپ آئیں گی تو پریا آپ کے چرنوں میں بیٹھ کر آپ کے تلوے چومے گی اور آپ کو شکتیوں کے دوبارہ حصول کے لیے مدد کرے گی تاکہ آپ دوبارہ فرعون صفت ملکہ بن کر پریا کو کنیز عالیہ کے عہدے پر فائز کردیں۔
"یہ آپ نے کیسے دھچکا کرلیا رام ناتھ کی وددواہ۔" پریا انگشت سے شکنتلا کی ٹھوڑی اونچا کرتے ہوئے بولی۔ پھر لہجہ بدل کر غصے کے انداز میں بولی۔ "پریا اس شکنتلا کی سدھائی ہوئی ہے جس کا کہنا ہے کہ دشمنوں کو کبھی پنپنے نہ دو اور پریا یہی کرتی آئی ہے آج پوری ریاست میں پریا کی منشا کے بغیر پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ آج میں مضبوط ترین حکمران ہوں بس مجھے تمہارا ہی انتظار تھا آج تمہارا فتنہ بھی ختم ہوا۔ اب میں لامحدود اختیارات کی مالک بن کر ساری زندگی تابانہ پر حکومت کروں گی۔ لے چلو اس حرامزادی کو باہر کھلے میدان میں اور اس پر تیل چھڑک کر آگ لگا دو میں اسے اب کسی قیمت پر زندہ نہیں دیکھنا چاہتی۔" پریا نے حقارت اور شان بے نیازی سے کہا تو سرکاری اہلکار گلے میں بندھے پٹے کو کھینچنے لگے شکنتلا کا پارہ لبریز ہونے لگا اس نے چنکار کی طرف دیکھا جو کسی اور کو نظر نہ آتا تھا وہ ایک جانب چپ چاپ کھڑا تھا۔ اس نے ہولے سے شکنتلا کو باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ باہر شیش محل کے باغ میں کھلی جگہ لا کر شکنتلا کو کھڑا کردیا گیا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کی پریشانی نہ تھی۔ پریا ایک خوبصورت شیشوں سے مزین تخت پر براجمان مطمئن اور مسرور تھی چند لمحوں میں شکنتلا کا کانٹا بھی نکل جائے گا اور پھر میں ساری زندگی اطمینان اور عیش و عشرت کے ساتھ حکومت کروں گی۔ شکنتلا کو کئی لوگوں نے پہچان لیا تھا اور وہ جانتے تھے کہ یہ سابق ملکہ ہے لیکن جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ اس وقت شکنتلا کی حیثیت سزائے موت کے قیدی اور پریا کی مطلق العنان ملکہ کی تھی۔ اب شکنتلا نے حالات پلٹنے کا فیصلہ کرلیا اور پریا کو مخاطب کر کے با آواز بلند بولی لیکن لہجہ اس نے درخواستانہ رکھا۔ "پریا تو جانتی ہے کہ میں تابانہ کی ملکہ ہوں اور تجھے اپنے نائب کے طور پر حکومت سونپ کر گئی تھی۔ تو تو فقط ایک معمولی باندی تھی۔ میں نے ہی تجھے بغیر سفارش کے کنیز عالیہ بنایا تھا اور تو آستین کا سانپ بن گئی۔ اب بھی وقت ہے میری مدد کر۔"
"بکواس بند کر نیچ ذات۔" پریا اپنی جگہ غصے سے مٹھیاں بھینچ کر کھڑی ہوگئی اور آگے بڑھ کے زوردار طمانچہ شکنتلا کے منہ پر دے مارا۔ "آگ لگا دو اس کو۔" پریا نے موت کا پروانہ جاری کردیا اب مزید برداشت شکنتلا کے بس میں نہ تھی ورنہ اس کی جان خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ اس نے آہستگی کے ساتھ سکھرپ منتر پڑھا اور ایک خیال من میں لا کر اپنے چاروں طرف پھونک ماری تو پھک کی آواز کے ساتھ ہی چاروں طرف آگ کے شعلے بھڑکنے لگے جنہوں نے ایک دائرے کی شکل میں شکنتلا کو اپنے حفاظتی حصار میں لے لیا تھا۔ شعلے خاصے بلند تھے اور ان کی زد میں آ کر کئی لوگ بھسم

ہونے لگے۔ ہر طرف اس اچانک آفت سے ہاہا کار مچ گئی پریہ بے اختیار تخت سے کھڑی ہوگئی پہلے تو وہ یہ سمجھ کر خوشی سے نہال اٹھی کہ شکنتلا کو آگ لگائی گئی ہے لیکن پھر شعلے اپنی بلندی کم اور دائرہ وسیع کرنے لگے تو پریہ کی خوبصورت جبیں پر پسینے کے قطرے نمودار ہوگئے۔ آگ اپنا دائرہ کھلا کر رہی تھی اور تمام لوگ تیزی سے پیچھے سرک رہے تھے۔ اس ہڑبونگ میں شکنتلا نے لوٹ کھائی اور سانپ بن گئی اور دوسری لوٹ کے ساتھ ہی شاہی پوشاک میں ملبوس ملکہ شکنتلا بن گئی۔

اس کے ساتھ ہی چنکار حرکت میں آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام سپاہیوں اور محافظوں کے ہاتھوں سے نیزے بھالے تلواریں خنجر اور دیگر ہتھیار نکل کر اڑتے ہوئے شکنتلا کے قدموں میں ڈھیر ہوگئے۔ پلک جھپکنے میں تمام محافظ سپاہی آگ کے الاؤ کے بار نبتے رہ گئے اور تیز دھار ہتھیار الاؤ کے اندر ڈھیر کی صورت میں جمع ہوگئے۔ ہتھیاروں کے پاس کھڑی شکنتلا چمکیلے بھڑکیلے ریشمی شاہانہ روپ میں کمر پر ہاتھ رکھے کھڑی مسکرا رہی تھی اس کی بڑی بڑی چمکتی آنکھیں ہجوم پر تھیں اور سیاہ گھنیری زلفیں تیز ہوا میں لہراتی ہوئی اسے پراسرار بنا رہی تھیں ہر شخص کے قدم اپنی جگہ پر جم کر رہ گئے پورے مجمع پر سکوت طاری ہوگیا پریہ کا چہرہ خوف سے پیلا پڑنے لگا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ شکنتلا اپنی پوری طاقت کے ساتھ عنان حکومت سنبھالنے آئی تھی اور محض اس کی آزمائش کی خاطر ایک کمزور عورت ہونے کی اداکاری کر رہی تھی اور اس آزمائش میں پریہ بری طرح ناکام رہی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ اب اس کا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ بچاؤ کی کوئی صورت نہیں شکنتلا بے گناہوں کو میری طرح معاف نہیں کرتی دشمنوں کو تو عبرت کا نشان بنا دیتی ہے اس نے ارد گرد نظریں دوڑائیں۔ شکنتلا اس کی طرف متوجہ نہ تھی بلکہ ہجوم کی طرف دیکھ رہی تھی۔

پریہ اچانک ایک طرف دوڑنے لگی اور ہجوم میں گھس گئی اس کی طرف کوئی متوجہ نہ تھا بلکہ ہر کوئی اپنی جان بچانے کی فکر میں تھا۔ پریہ کا لمبا چوڑا شاہی لباس اس کے بھاگنے میں رکاوٹ تھا ساری آن بان دھری کی دھری رہ گئی دوڑنے سے پریہ کا سانس پھولنے لگا لیکن موت سے خوف زدہ ہوکر بھاگے جا رہی تھی شیش محل انتہائی وسیع و عریض تھا۔ اس کے اپنے حکم سے بنائے گئے راستے آج اسے میلوں طویل محسوس ہو رہے تھے جو ختم ہونے کا نام نہ لیتے تھے۔ لیکن پریہ جلد از جلد محل سے باہر نکل کر بھاگ جانا چاہتی تھی۔ کیونکہ محل کی حدود میں تو اس کی خوفناک اور اذیت ناک موت یقینی تھی آخر کار محل کا صدر دروازہ اسے نظر آ گیا۔ یہاں کے حفاظتی انتظامات ختم ہو چکے تھے پہرے دار بھاگ چکے تھے۔

پریہ تیزی سے باہر نکلتی چلی گئی باہر نکلتے ہی اسے ایک جانب چند گھوڑے نظر آئے سائیس شاید بھاگ گیا تھا۔ یہ شاہی گھوڑے لگتے تھے پریہ کو گھڑ سواری نہ آتی تھی اور نہ اس نے کبھی سیکھنے کی کوشش کی تھی پھر بھی مرتی کیا نہ کرتی وہ تیزی سے ایک ایسے گھوڑے پر سوار ہوگئی جس پر کاٹھی پڑی تھی۔ رکابوں میں پاؤں پھنسا کر راسیں تھام لیں اور انگل پچو طریقے سے ایڑ لگانے لگی۔ گھوڑا اس اچانک افتاد سے گھبرا کر ہنہنانے لگا اور دو چار دفعہ آگے پیچھے ہونے کے بعد اگلی دونوں ٹانگیں اُٹھا کر پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہوگیا۔ پریہ نے دونوں پیر اس کی کمر کے ساتھ لگا کر کس لیے اور ہاتھوں میں راسیں تھامے ہوئے گھوڑے کی گردن سے لپٹ گئی۔ پھر اچانک گھوڑا ایک طرف سرپٹ بھاگ نکلا۔ یہی پریہ کی منشا تھی کہ محل سے کہیں بہت دور نکل جائے ادھر شکنتلا نے آگ بجھا دی تھی بلکہ آگ بجھنے کے بعد یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہاں کبھی آگ لگی ہی نہ تھی۔ پریہ کی شکنتلا کو قطعاً فکر نہ تھی۔ کیونکہ اسے پتا تھا کہ وہ چنکار کی گرفت سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتی۔ جتنا دوڑ سکتی ہے دوڑ لے...... محل کے ساتھ ساتھ پوری ریاست میں منادی کرادی گئی کہ پریہ ملکہ نہ تھی بلکہ شکنتلا کی عدم موجودگی میں ملکہ بن بیٹھی تھی اب اسے برطرف کر دیا گیا ہے اور عنقریب اسے سزا دی جائے گی۔ اگلے دن صبح تمام راجکماریوں اور سرکردہ وزراء اعلیٰ درباریوں اور امراء کا اجلاس طلب کر لیا گیا۔ سارا دن شکنتلا نے شیش محل کا دورہ پوری آن بان کے ساتھ کیا اور محل کی شان و شوکت دیکھ کر پریہ کے ذوق کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکی۔ شام کے وقت جب پریہ کی بنائی گئی خواب گاہ میں شکنتلا داخل ہوئی تو تھکن سے چور چور تھی اس نے خواب گاہ کے باہر پہرے پر متعین پہرے دار کو اندر بلایا۔ یہ ایک خوبصورت اور بھرپور کڑیل جوان تھا۔ جس نے شکنتلا کو سرور کی وادیوں کی سیر کروائی لیکن جب وہ نیند کی گود میں اُترا تو شکنتلا اس کی شہ رگ سے منہ لگا کر اس کا سارا خون پی گئی اور پھر پورے سکون سے سو گئی۔ لیکن سونے سے پہلے چنکار کو حکم

دیا کہ صبح جب میں اٹھوں اور دربار لگے تو پریہ پیش ہونی چاہیے۔
ادھر پریہ گھوڑے کی پشت سے چمٹی تھی اور گھوڑا انجانی منزل کی طرف سرپٹ بھاگے چلا جارہا تھا۔ خوف سے پریہ نے آنکھیں بند کررکھی تھیں۔ کافی دیر اسی عالم میں گزر گئی۔ پتا نہیں کون سی جگہ تھی۔ اچانک پریہ کو زبردست جھٹکا لگا اور وہ اچھل کر گھوڑے کی پشت سے جدا ہوکر گر پڑی درد کے شدید احساسات ابھرے اور پریہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔
کافی دیر رونے کے بعد اس نے ہولے سے سر اٹھایا اردگرد دیکھا تو یہ ایک گھنا جنگل تھا وہ ایک درخت کے نیچے لیٹی تھی۔ گرنے سے اسے کچھ چوٹیں تو آئی تھیں مگر لمبی لمبی گھاس کی وجہ سے بچت ہوگئی تھی، اب جو اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ویرانیاں...... اور سناٹا...... کبھی کبھار کسی جانور کے بولنے کی آواز سکوت کو توڑتی اور پھر وہی گھمبیر سناٹا اور خاموشی چھا جاتی۔ اپنے بھاری بھرکم لباس کو سمیٹ کر پریہ اٹھی اور اداس نظروں سے اردگرد دیکھنے لگی۔ اس کے جسم کے مختلف حصوں پر خراشیں آچکی تھیں اور لباس بھی پھٹ گیا تھا۔ کافی دیر اسی عالم میں گزر گئی۔ دوپہر ہوئی شام ہوگئی بھوک اور پیاس نے سر اٹھانا شروع کردیا۔ آس پاس کے درخت بھی عجیب شکلوں کے تھے کسی پر کوئی پھل نہ تھا اور اس گھنے جنگل میں پانی کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا اس کے ذہن میں مختلف سوچیں گڈمڈ ہورہی تھیں۔ کیا شکنتلا مجھے تلاش کرلے گی؟ میرے ساتھ کیا سلوک کرے گی؟ آگ میں زندہ جلادے گی۔ ہاتھی کے پاؤں تلے کچلوادے گی۔ تلوار سے سر قلم کروائے گی یا بوٹیاں کاٹ لے گی۔ جو جو سزائیں وہ خود دوسروں کو دیتی تھی وہی اب اسے یاد آنے لگیں۔ ہوسکتا ہے اپنی بگھی میں جتوادے...... رام رام...... یہ خیال آتے ہی اسے جھرجھری سی آگئی اس سزا سے تو موت ہی اچھی ہے کس طرح بگھی کے آگے جتے ہوئے قیدی خوفناک انداز میں ڈکرایا کرتے تھے کیا معلوم شکنتلا جی مجھے معاف کردیں آخر میں ان کی پرانی نمک خوار ہوں۔ سوچتے سوچتے اس کا ذہن پراگندہ سا ہونے لگا۔ اس کے سر میں درد شروع ہوگیا وہ اٹھ کر اِدھر اُدھر گھومنے لگی۔ اب رات ہورہی تھی۔ اندھیرا چھانے لگا۔ اب کیا کروں۔ کدھر جاؤں۔ تھکن سے اس کا جسم چور ہورہا تھا۔ اذیت ناک موت اور آنے والے ہولناک وقت کے تصور کو ذہن میں لیے وہ نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ نیند تو کانٹوں اور تختہ دار پر بھی آجاتی ہے ایک زوردار چبھن سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ چند لمحے تو وہ سوچتی رہی کہ کسی غلام کنیز نے جگایا ہوگا لیکن جب شکنتلا کا دلکش سراپا نظروں میں واضح ہوا تو نیند اور خمار اُڑ گیا۔ وہ خواب نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل مارے خوف کے تیز تیز دھڑکنے لگا۔ شکنتلا پوری حقیقت کے ساتھ اس کے سامنے تھی اور اس سونے جو ہرات اور شیشوں سے مزین تخت پر بیٹھی جس پر بیٹھنا کل تک پریہ کا مقدر تھا۔ اور تمام درباری درجہ بدرجہ بیٹھے تھے۔ پریہ ان کے درمیان خود کو مجرموں کے کٹہرے میں پاکر مارے شرم اور خوف کے زمین میں گڑ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کل تک یہ درباری وزراء اور حفاظتی اہلکار میری ایک نگاہ کے منتظر رہتے تھے کہ کہیں ملکہ کے ماتھے پر شکن نہ پڑجائے اور آج وہ سب اسے طنزیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے کسی آنکھ میں پریہ کے لیے رحم کا جذبہ نہ تھا کیونکہ خود پریہ نے بھی کسی پر رحم نہ کیا تھا پریہ کے دل میں ہول اٹھنے لگے اس کا دل بیٹھا جارہا تھا وہ بھوکی پیاسی بھی تھی۔ پھر شکنتلا کی آوازیں اس نے سنی۔ "نسل در نسل کی اس کنیز کی ساری کہانی میں نے آپ کو سنادی بلکہ کچھ لوگوں کو پہلے سے معلوم تھی۔ میں ملکہ نہ ہوتی تو یہ آج بھی ایک معمولی کنیز ہوتی...... ہم نے اسے پوری ریاست میں سب سے ممتاز اور بااختیار کردیا لیکن نیچ ذات کو عزت راس نہ آئی۔
"لیکن اب سے کچھ دیر بعد اس کے جیون کا وہ دور شروع ہوگا، جو کتے سے بدتر ہوگا۔ یہ موت مانگے گی لیکن زندگی اس کا پیچھا نہ چھوڑے گی۔" شکنتلا کی باتیں سن کر پریہ کی حالت غیر ہوگئی وہ دوڑی اور شکنتلا کے پیروں میں جاکر سر رکھ دیا۔
"ملکہ عالیہ مجھ بدنصیب کو معاف فرمادیجیے، میں آپ کی باندی ہوں۔ میری آنکھوں پر لالچ کا ملمع چڑھ گیا تھا۔ میں نے آپ کا اپمان کیا ہے۔" پریہ گریہ زاری میں مصروف تھی۔
شکنتلا تخت سے اُتری اور پریہ کی چٹیا مروڑ کر اسے اوپر اٹھایا۔ "معافی مانگنے کے لمحات گزر گئے ہیں ملکہ عالیہ...... اب پانی سر سے گزر چکا ہے نہ تو نے کبھی کی آب بکاسی تھی اور میرا تو دل ہی پتھر کا ہے، مجھ سے نرمی کی اُمید رکھنا تمہارا پاگل پن ہوگا۔"
"دربار میں موجود ہر شخص وعورت باری باری اُٹھ کر اپنا اپنا جوتا اُتار کر پریہ کے سر پر مارے۔" شکنتلا نے دلچسپ

فرمان جاری کیا۔ سب لوگ حیرت سے دیکھنے لگے۔

سب سے پہلے راجکماریاں اٹھیں۔ شکنتلا کا حکم پا کر تمام راجکماریاں اٹھیں اور پریہ کے پاس آ گئیں، پریہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ایک راجکماری اس کے پاس آئی اپنا خوبصورت جوتا اُتارا اور شکنتلا کی طرف دیکھ کر زور سے پریہ کے گال پر جمایا۔ پریہ بلبلا کر رہ گئی اور رونے لگی اور شکنتلا کی طرف منہ کر کے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ اس کے ہاتھ بھی کانپ رہے تھے اب اگلی راج کماری بڑھی اس نے اپنا جوتا اتارا اور پریہ کے سر پر تڑاخ سے برسایا اور پھر تو نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ باری باری ہر درباری عورت و مرد آگے بڑھتا پریہ کے سر، منہ، شانوں یا جسم کے کسی حصے پر زور سے جوتا جماتا تھوڑی ہی دیر میں پریہ زمین پر گر چکی تھی۔ پریہ کو اپنی اس حالت پر تے آنے لگی، عروج کی بلندیوں کے بعد ذلت و رسوائی کی یہ پستی، اس کی سوچوں سے بھی کم سطح کی تھی۔ خاصی دیر شکنتلا نے یہ شغف جاری رکھا اور پھر اپنی جادوگری کا رعب جمانے کے لیے اس نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو اپنی نشستوں پر بیٹھنے کا حکم دیا اور کالی ماتا کا منتر جپ کر پھونکا تو سب دربار نے حیرت سے انگلیاں دانتوں میں دبالیں۔ شکنتلا نے پلک جھپکی اور ایک چھپاکے کے ساتھ سونے کی سلاخوں سے بنے ایک پنجرے نے اسے قید کر لیا۔

''پریہ رانی۔'' شکنتلا زلفوں کو جھٹک کر بولی۔ ''ابھی تو شروعات ہیں میں تمہیں زندگی کے بہت سے رخ دکھاؤں گی۔'' سارا دن اور پھر ساری رات پریہ کو پنجرے کے اندر بھوکا پیاسا قید رکھا گیا۔ اس کے اردگرد محل کی رونقیں جاری تھیں لیکن اس کی گریہ زاری سننے والا کوئی نہ تھا۔ اگلی صبح شکنتلا نے اسے پنجرے سے نکالا اور بھرے دربار کو اپنے جادو سے مزید مرعوب کرنے کے لیے چنکار کو آہستگی سے حکم دیا کہ پریہ کو کوڑا لے کر اتنے زوردار طریقے سے تشدد کرو کہ اس کی آواز ہر آدمی کے کانوں تک پہنچے۔

پھر کیا تھا پریہ کی کربناک فریادیں تھیں اور تماشا دیکھنے والی آنکھیں اور سننے والے کان پریہ کو دیکھتے دیکھتے شکنتلا کو وہ وقت یاد آ گیا جب یہی چنکار گرو نرائن کے حکم سے خود شکنتلا کی کھال ادھیڑ رہا تھا۔ خیال کے آتے ہی شکنتلا خوف سے جھرجھری لے کر رہ گئی لیکن پھر اپنے خیالات کو جھٹک کر پریہ کا تماشا دیکھنے لگی جو پاگلوں کی طرح بھاگ کر جان بچانے کی کوشش میں تھی اور پھر کافی دیر کے بعد شکنتلا نے چنکار کو بس کرنے کا حکم دیا۔ پریہ کے خون کے چھینٹوں سے قالین سرخ ہو رہا تھا خود پریہ کو بھی احساس ہو رہا تھا کہ میں کس آسانی سے دوسروں کو ایسی سزائیں دیتی تھی۔ لیکن یہ تو موت سے بدتر سزا ہوتی ہے۔ شکنتلا کے حکم سے اسی حالت میں پریہ کو پھر قید میں ڈال دیا گیا۔ کھانے کے نام پر برائے نام خوراک دی گئی اگلے دن پھر دربار لگا تو پریہ حاضر تھی کہ اس کا سارا وجود بالکل صحیح سلامت تھا۔ شکنتلا کے حکم سے شاہی سواری تیار ہوئی تاکہ پریہ ڈھول باجوں کے ہمراہ شکنتلا کی سواری کے آگے آگے رقص کرنا شروع کر دے۔ پورا شہر اس منظر کو دیکھنے امڈ آیا کہ سابق حکمران پریہ شاہی بگھی کے آگے آگے سب کے سامنے کیسے رقص کرتی ہے۔

شکنتلا نے رقص شروع کرنے سے قبل پریہ کو اپنے سامنے طلب کیا۔

''سو پریہ آج تمہیں ڈھول کی تال پر رقص کرتے ہوئے پورے شہر کا چکر لگانا ہے سارا وقت کوڑے تمہاری خدمت کرتے رہیں گے۔ اگر تم تھک کر گر گئیں تو تمہارے ساتھ سزا دن کا بھیانک سلسلہ جاری رہے گا۔ جب تک کہ آتما تمہارے شریر کو نہ چھوڑ جائے۔ اور اگر تم نہ گریں اور کوڑے کھاتے کھاتے رقص جاری رکھا اور پورا شہر گھوم گئیں تو تمہاری بہتری کے بارے میں سوچوں گی۔''

پریہ آج کی نئی خون آشام سزا سن کر مارے خوف کے کانپنے لگی۔ اس کی ساری اکڑ گزشتہ دو دنوں میں نکل چکی تھی وہ بے اختیار گر کر شکنتلا کے قدموں سے لپٹ گئی۔ ''دیا کر دیجیے مہارانی جی، آپ کے پہلے بھی مجھ کرموں جلی پر بے شمار احسانات ہیں ایک اور احسان کر دیں۔ میں ساری زندگی کتے سے زیادہ آپ کی وفادار رہوں گی۔''

''آزمایا ایک ہی بار جاتا ہے میری لاڈلی۔'' شکنتلا نے پاؤں اس کی گردن پر رکھ کر کہا۔ آج موت کا رقص تو تمہیں کرنا ہی پڑے گا باقی باتیں تو بعد میں ہوں گی۔

اور پھر تابانہ کے باسی ایک نیا تماشہ دیکھنے لگے کہ وہ پریہ جو جب پہلے کنیز عالیہ کے روپ میں عوام کے سامنے آئی تھی اور خوف و ہراس کی علامت بن گئی تھی اور پھر کچھ ہی عرصے کے بعد جب شکنتلا منظر عام سے غائب ہوئی تو پریہ کا ملکہ عالیہ کا روپ عوام نے دیکھا کہ سفاکی، ظلم اور فرعونیت کی چلتی پھرتی تصویر کا نام پریہ تھا۔ اور آج پریہ کس بے بسی کے ساتھ شکنتلا کی شاہی سواری کے آگے کوڑوں کی لے پر ذلت و رسوائی کی شکل میں رقص کر رہی تھی۔ شکنتلا ایک ایسے تخت پر نیم دراز تھی جس کے نیچے لکڑی کے چھوٹے چھوٹے پہیے لگے تھے اور غلام اسے دھکیل رہے تھے اور اس کے تخت کے عین سامنے پیروں میں گھنگھرو اور دوپٹا کمر میں باندھے کھلے بالوں کے ساتھ پریہ ننگے پاؤں روتے تڑپتے ڈھول کی تھاپ پر دیوانہ وار ناچ رہی تھی۔ جیسے ہی اس کے پاؤں مدہم پڑتے جلاد کا ہاتھ حرکت کرتا اور شائیں کی آواز گونجتی اور اس کے ساتھ ہی پریہ کی چیخ بلند ہوتی، گھنگھروؤں کی لے اور ڈھول کی تھاپ کوڑوں کی شڑاپ، رقاصہ کی چیخیں اور خون کے بکھرتے قطرے اور جادوگر ملکہ شکنتلا کی آن بان اور سحر انگیز حسن، مل کر ماحول کو بیک وقت پراسرار بنا رہے تھے۔ شاہی کارواں سارا دن شہر کی سڑکوں پر گھومتا رہا اور سارا دن پریہ نگاہ عبرت بنی رہی۔ اس کا لباس پھٹ کر چیتھڑوں میں تبدیل ہو رہا تھا۔ جسم کی کھال رنگین ہو چکی تھی۔ بھرے بازار میں اس کی دلدوز چیخیں گونجتی رہیں۔ وہ بار بار گرتی اور اُٹھتی اس آس پر کہ شاید شام تک حواس قائم رکھ لوں تو شکنتلا اسے معاف کر دے۔

☆......☆......☆

شکنتلا شاہی خواب گاہ میں موجود تھی اور خواب گاہ میں شکنتلا کے علاوہ صرف پریہ تھی جس کے زخموں پر طبیب نے مرہم کا لیپ کر رکھا تھا۔ سوجی ہوئی آنکھوں اور چہرے پر تکلیف، خوف اور اُمید کے تاثرات کے ساتھ ساتھ ہاتھ باندھ کر شکنتلا کے روبرو تھی۔ شکنتلا شاہی لباس میں ملبوس تھی۔ سر پر سونے کا تاج جگمگا رہا تھا۔ اور وہ مسہری پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھی تھی۔

''سنو پریہ۔'' شکنتلا مخاطب ہوئی تو پریہ ہمہ تن گوش ہو گئی۔

''میں سانپ بھی ہوں اور سانپوں کی ملکہ بھی، اور اس وقت اتنی شکتی میرے پاس ہے کہ سامری یا کوئی اور جادوگر میرے سامنے اب کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ تمہیں تمہارے کرتوتوں کی جو سزا دی جا رہی ہے یہ اگر ہزار سال بھی جاری رہے تو تمہارا جرم زیادہ ہے اور سزا کم، لیکن اس کے باوجود میں تمہیں معاف کر رہی ہوں۔''

''میں یہ احسان زندگی بھر نہ بھولوں گی...... ملکہ عالیہ۔'' پریہ مارے خوشی کے شکنتلا کے پاؤں دیوانہ وار چومنے لگی۔

''میں تم سے اب بھی پیار کرتی ہوں۔ میرا اب کوئی بھروسا نہیں کہ کب مجھے کہاں جانا پڑ جائے ساری مصیبتیں ختم ہو چکی ہیں تاہم ابھی حسکران کو تلاش کرنا ضروری ہے۔ میں جب یہاں ہوا کروں گی تو تم صرف میری کنیز ہو گی۔ میری عدم موجودگی میں تم میری قائم مقام ہو گی اور تمہیں کنیز عالیہ مخاطب کیا جائے گا۔'' اس گفتگو کے بعد شکنتلا نے پورے محل اور ریاست میں ایک بار پھر پریہ کی تعیناتی کی منادی کرا دی۔ پریہ اظہار تشکر کے طور پر بار بار شکنتلا کے پاؤں پڑ جاتی پریہ ایک بار پھر بحال ہو گئی لیکن دلدوز سزائیں ملنے کے بعد شکنتلا کے کسی حکم سے روگردانی اس کے بس میں نہ تھا۔

شکنتلا خود شاہی کاموں میں دلچسپی نہ لیتی اس کے دل و دماغ پر تو حسکران سوار تھا کہ نہ جانے کب لشکران کی آمد ہو جائے اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔ ایک دن وہ اپنی سوچوں میں گم تھی کہ اچانک ایک چھپاکے کے ساتھ اس کے ذہن میں سامری کا نام ابھرا۔ اس نے سوچا کیوں نہ سامری کو یاد کر کے دیکھوں۔ سامری...... سامری...... سامری...... شکنتلا نے زیر لب تین دفعہ دہرایا۔ تین دفعہ سامری کا نام لیتے ہی جیسے زلزلہ آ گیا۔ پورا کمرہ ہل کر رہ گیا اور پھر سامری کی بھاری آواز گونجی۔ ''سامری کا جادو ہمیشہ سر چڑھ کر بولتا ہے۔'' سامری لمحے کے اندر حاضر ہو گیا۔ اسے دیکھ کر شکنتلا کی باچھیں کھل اٹھیں۔ شکنتلا مسہری سے نیچے اُتر کے دیوانہ وار بھاگی اور دھڑام سے سامری کے سینے جا لگی۔ سامری نے اسے بھینچ لیا۔

''دنیا گول ہے سامری...... اس بات کا مجھے آج وشواس آیا۔ ساری دنیا گھوم کر آج میں تم سے پھر آن ملی ہوں۔'' شکنتلا کھلی جا رہی تھی۔

''کیسی ہو شکنتلا۔'' سامری نے اس کا خوبصورت چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں تھام کر کہا۔

''میں ٹھیک ہوں، تم سناؤ سامری کہاں رہے۔''

''کہاں تک سنو گی..... کہاں تک سناؤں..... یہ میری اور تمہاری خوش بختی ہے کہ ہم ایک لمبے عرصے کے بعد دوبارہ اس وقت ملے ہیں جب ہم دونوں ہی بے حد شکتی مان ہو گئے ہیں۔ ایک سال کی کٹھن تپسیا میں نے صرف اس لیے کی ہے کہ وہ راز پا جاؤں کہ اگر کوئی پجاری منڈل کے اندر جاپ کر رہا ہو تو اس کو کیسے باہر نکالا جائے کیونکہ گرونرائن کے مقابلے میں مجھے جو شکست ہوئی تھی وہ میرے لیے بہت بڑا صدمہ اور رسوائی تھی۔

''بیٹھیے نا سامری جی..... باتیں ہوتی رہیں گی۔'' شکنتلا نے سامری کو شانوں سے پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''سب سے پہلے تو مجھے یہ بتائیں کہ جب گرونرائن سے مقابلے میں ہم سب کو آگ لگ گئی تھی اور میں بے ہوش ہو گئی تھی تو آپ نے کیا کیا اور اتنا عرصہ کہاں رہے۔''

''یہ ایک طویل بات ہے شکنتلا، جب ہمیں آگ نے گھیرا تو گرونرائن ادھورے جاپ کے ساتھ پلک جھپکنے میں غائب ہو گیا۔ اسی طرح میں تمہیں لے کر اس جگہ چھوڑ آیا جہاں تم نے اپنے آپ کو پایا۔ وہ ایسی جگہ تھی جہاں گرونرائن داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ خود میں بھی آگ سے نڈھال ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو اپنی جادو نگری تک محدود کر لیا اور کسی کو منڈل سے باہر نکالنے کے جاپ کے لیے تپسیا کرنے لگا اس کے علاوہ ستمرا کے مرنے کے بعد مجھے ایک موکل کی بھی ضرورت تھی جو میرے کام کر دیا کرے اسی قسم کے کاموں میں مصروف ہو گیا اور پھر الجھتا چلا گیا۔ ابھی کل ہی تو میرا منڈل جاپ مکمل ہوا ہے۔''

''یعنی کل سے پہلے میں بلاتی تو تم نہ آتے۔'' شکنتلا حیرت سے بولی۔

''بالکل.....'' سامری اسے گہری نظروں سے دیکھ کر بولا۔

''پریہ کے ساتھ کیا سلوک کر رہی ہو؟''

''پریہ کو سبق دے کر معاف کر رہی ہوں سامری کہ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں میں تو اب ایک جگہ زیادہ عرصے تک نہیں رہ سکتی نہ جانے کب کہاں جانا پڑ جائے۔''

''پرنتو ایک بات تجھے بتا دوں شکنتلا کہ پریہ نے صرف اپنی جان بچانے کے لیے تجھ سے معافی مانگی ہے ورنہ وہ اب تجھ سے نفرت کرنے لگی ہے یا تو اس کا قصہ ہی ختم کر دو اور یا پھر اس کو اس قدر دبا کر رکھو کہ وہ تجھے کوئی اوتار سمجھے اور اپنے آپ کو تمہارے مقابلے میں حقیقتاً حقیر جان لے۔

''اس کو مار بھی دیا جائے تو پھر کوئی دوسرا اس کی جگہ مجھے مقرر کرنا پڑے گا اس کو نئے سرے سے تربیت دینی پڑے گی۔ ہاں تمہاری یہ بات دل کو لگتی ہے کہ اس کو خوب دبا کر رکھا جائے اور وقتاً فوقتاً بھرے دربار میں اس کی بے عزتی کرتی رہوں تاکہ سب اس کو صرف کٹھ پتلی سمجھیں اور اصل حکمران کے طور پر شکنتلا کو پہچانا جائے۔

''بہتر تو یہی رہے گا۔''

''خسکران کے بارے میں کچھ جانتے ہو سامری؟'' شکنتلا نے پرامید نظروں سے سامری کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''ہوں۔'' سامری سوچنے کے انداز میں بولا۔

''خسکران اس وقت ایک سادھو کی قید میں ہے جس کا نام کوٹھاری ہے اور اس نے ایک خاص عمل کے ذریعے اس کو اپنا غلام بنا لیا ہے۔ سامری سر اٹھا کر شکنتلا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ شکنتلا اس کا بیان سن کر ہکا بکا رہ گئی۔''

کوٹھاری کون ہے؟ جس نے خسکران جیسے طاقتور جن پر قبضہ کر لیا ہے۔'' شکنتلا حیرت سے بولی۔

''نہ صرف خسکران بلکہ دلاور نامی ایک مسلمان نوجوان بھی اس کے احکامات کا پابند ہے اور خسکران کو اس نے اس نوجوان کی مدد سے ہی قابو میں کیا ہے۔'' سامری انکشاف انگیز انداز میں بول رہا تھا۔

''اب کیا ہوگا سامری۔ خسکران نہ ملا تو لشکران مجھے زندہ نہ چھوڑے گا۔'' شکنتلا متفکر تھی۔

''خسکران کو کوٹھاری کی گرفت سے رہا کر کے لانا ہوگا۔''

''تم میری سہائتا کرو گے نا؟''

''تو پھر کوئی ترکیب سوچو نا سامری۔'' شکنتلا سماجت سے بولی۔

''وقت لگے گا چلو واپس چلتے ہیں اور پھر سامری نے شکنتلا کا ہاتھ پکڑا اور اگلے لمحے وہ محل کے اندر شکنتلا کے مخصوص کمرے میں آ دھمکے۔

''مطلب یہ ہوا کہ کوٹھاری نام کا یہ سادھو خاصی شکتیوں کا مالک ہوگا۔ جس نے شاہ جنات کے بیٹے کو قابو کر رکھا ہے۔ جس پر لشکران بھی بے بس تھا۔ جس کے نام سے شکنتلا ڈرتی ہے۔'' شکنتلا نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''یہ بات نہیں شکنتو۔'' سامری اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لیتے ہوئے گویا ہوا۔

''خسکران جب تک آزاد تھا خسکران کی سلطنت میں اس کی پل پل کی خبر رہتی تھی۔ کہ وہ ہر وقت وہاں ایک مخصوص انڈے میں نظر آتا رہتا ہوگا۔ کوٹھاری کے زیر کرتے ہی وہ نظروں سے بھی اوجھل ہوگیا ہے اور اس کی خبر بھی نہ ملتی ہوگی۔ یہ کالی شکیوں کی گمسن گیری ہوتی ہے۔''

''اب کیا ہوسکتا ہے۔'' شکنتلا نے پُر امید نظریں سامری کے مکروہ چہرے پر گاڑ دیں۔

''سب کچھ ہوسکتا ہے اب سامری پہلے والا سامری نہیں۔''

''اور شکنتلا بھی پہلے والی شکنتلا نہیں۔'' شکنتلا نے سامری کی بات اُچک کر بانہوں میں تھامتے ہوئے مسکرا کر کہا اور دونوں اپنے اپنے انداز میں ہنسنے لگے۔ دونوں کی ہنسی تیز ہوتی چلی گئی۔

☆......☆......☆

دلاور اس وقت پتھریلے پہاڑوں کے درمیان کھڑا تھا اس کے ساتھ انسانی روپ میں خسکران بھی موجود تھا۔ یہ ایک بے آب و گیاہ علاقہ تھا جہاں دھوپ کی کرنیں بدن کاٹتی تھیں دور دور تک اس میں کسی ذی روح کی موجودگی عبث تھی۔ دونوں کو دو دن قبل کوٹھاری نے اس بیابان میں پہنچایا تھا۔ یہ سرخ پہاڑیاں تھیں جن کے پار ہارا کاری کا جنگل تھا۔ جہاں تبریشا کا قبیلہ آباد تھا تو کوٹھاری کا جادو یہاں آ کر دم توڑ گیا تھا۔ اس سے آگے انہیں خود ہی جدوجہد کرنا تھی۔ ان کے آگے بھی موت تھی اور پیچھے کوٹھاری بھی زندگی کا دشمن بنا بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے سے تعارف کرالیا تھا۔ دلاور نے خسکران کو بتادیا تھا کہ کوٹھاری اور عنکبوت اس کی بیوی کو اٹھا کر لے گئے ہیں اور اب خود میں بھی پھنس چکا ہوں۔

''میری کہانی مختلف ہے۔'' خسکران بولا۔ ''میں ایک جن ہوں اور انسانی بستیاں دیکھنے نکلا ہوا تھا۔''

''گھومتے گھومتے ایک دن میں ایک ملک جا نکلا جہاں بہت ظالم ملکہ حکومت کرتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ انسانوں سے گھوڑوں کا کام لے رہی تھی مجھے یہ بات عجیب لگی میں اس کے سامنے آ گیا۔ وہ مجھے گرفتار کر کے محل لے گئی۔ رات کو مجھے ایک خوبصورت لڑکی کی خوابگاہ میں داخل کردیا گیا تو یہ جان کر حیران ہوا۔ وہ ظالم اصل میں کٹھ پتلی تھی۔ اصل ملکہ تو وہ تھی جس کی خوابگاہ میں مجھے لایا گیا تھا اور اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ کہ وہ ہر روز ایک نوجوان کے ساتھ شب بسری کے بعد اس کا خون پی جاتی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ دراصل وہ انسان نہیں ناگن ہے جو انسان بن چکی ہے۔''

''ناگن......؟'' دلاور حیرانی سے بولا۔

''ہاں جو سو سال زندہ رہ کر انسانی روپ میں آ گئی ہے۔ خسکران نے یقین دلا کر کہا اور ایک دن ایک ہندو پجاری نے ایک کٹھن تپسیا کے بعد ایک ایسا جاپ کیا کہ وہ ناگن جس کا نام شکنتلا ہے اس کے تابع ہوگئی۔ جیسے ہم دونوں کوٹھاری کے تابع ہیں۔''

''لیکن اس کی محبت کا میں اس قدر عاشق ہوگیا تھا کہ اس کے عشق میں دیوانہ ہو کر مارا مارا پھرنے لگا۔ اور اس آوارہ گردی کے دوران ایک دن کوٹھاری کے شکنجے میں آ گیا۔

''خسکران بھائی......'' دلاور افسردگی سے بولا۔

''کوٹھاری نے تمہیں قید کرنے کے لیے مجھے زبردستی استعمال کیا۔ میں بھی تمہارا مجرم ہوں۔''

''نہیں دلاور۔'' خسکران اس کا ہاتھ تھام کر ملتے ہوئے بولا۔

''ہم دونوں ہی آفت زدہ ہیں کوٹھاری ہم دونوں کا آقا ہے ہم دونوں اس کی مرضی کے خلاف قدم نہ اٹھانے پر مجبور

ہیں۔ تمہارا کوئی دوش نہیں۔"

"لیکن اللہ نے چاہا تو...... ایک دن یہ کوتھاری میرے ہاتھوں ہی مارا جائے گا۔" دلاور نے کہا۔

"اللہ......؟"

"یہ کیا ہوتا ہے۔" خسکران حیران ہو کر بولا۔

"یہ وہ عظیم ذات ہے جس کے قبضے میں تیری میری، کوتھاری اور سب کی جان ہے اور وہ کل کائنات کا مالک وخالق ہے۔"

"تو پھر اپنے اللہ سے کہو نا کہ ہمیں آزاد کروا دے۔"

"اس پاک ذات کی ہر بات میں دانائی ہے۔ یہ امتحان کی گھڑیاں ہیں۔ انشاء اللہ جلد بیت جائیں گی۔"

"تمہاری باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔" خسکران جھلا کر بولا۔

"لیکن ہم دونوں کی منزل ایک ہے۔ اور وہ ہے تبریشاہ اس کی موت ہی ہماری زندگی اور آزادی بن سکتی ہے۔ ان سنگلاخ پہاڑوں سے پیچھے جائیں گے تو کوتھاری ہماری خبر کے لیے بیٹھا ہے اور آگے ہارا کاری کا جنگل ہے۔ جہاں ہارا قبیلے کے لوگ...... "دلاور بات کرتے کرتے اچانک چپ ہو گیا۔ تم نے کچھ سنا خسکران، سانپ کی سی آواز آتی ہے لیکن کل سے اب تک تو...... یہاں کسی ذی روح کو نہ دیکھا نہ سنا۔ یہ آواز کہاں سے آئی اور اس قدر گرم موسم میں، جب پہاڑ آگ اُگل رہے ہیں۔

"شش شش شش......" اب کے آواز خاصی اونچی اور قریب سے آئی تھی۔ خسکران تو خیر جن تھا۔ تاہم دلاور کا ایک انسان ہونے کے ناطے اس آواز سے ڈر جانا ایک فطری عمل تھا وہ تیزی سے کھڑا ہو گیا۔ اس وقت چھپاک کی آواز کے ساتھ ایک کئی گز لمبا لیکن اس سے باریک سانپ سامنے آ گرا۔ اور پھن اٹھا کر جھومنے لگا۔

اس قدر پتلا اور اس قدر لمبا عجیب الشکل سانپ دلاور نے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ لیکن ساتھ ہی اس کا دایاں ہاتھ غیر محسوس انداز میں قریب ہی پڑے پتھر کی طرف سرکنا شروع ہو گیا۔ لیکن اس حرکت کو سانپ نے بھی شاید محسوس کر لیا تھا اس کا پھن دلاور کے ہاتھ کے اوپر گرنے کے لیے بڑھا لیکن خسکران نے چابکدستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بجلی کی سی تیزی سے سانپ کا پھن پکڑ لیا اور سرعت کے ساتھ دوسرے ہاتھ سے اس کی دم قابو کر کے اسے کھینچا۔

سانپ خسکران کی طاقت کے سامنے بے بس ہو گیا اور چیخ کی آواز کے ساتھ درمیان سے دو ٹکڑے ہو گیا۔ تو خسکران نے زور سے گھما کر سانپ کے دونوں ٹکڑے دور پھینک دیے اور خود دوبارہ دلاور کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

"اس طرح کا سانپ میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔" خسکران نے دلاور سے کہا۔

"تمہاری تو سانپ سے دوستی ہے۔ شکنتلا تمہاری دوست تھی جو کہ تمہارے کہنے کے مطابق سانپ ہے۔ تمہیں اس سانپ کو مارتے وقت اپنی دوست کا خیال نہیں آیا۔" دلاور ہنستے ہوئے بولا۔

"آیا تھا لیکن وہ سانپ نہیں سپنی ہے۔ اور وہ سانپ کی شکل میں ہوتے ہوئے بھی انسانی آواز میں بول سکتی ہے۔"

"حیرت ہے مجھے اسے دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہو چکا ہے۔" دلاور واقعی حیران تھا۔

"ایک دفعہ دیکھ لو گے تو دوسری دفعہ دیکھنے کی حسرت دل میں لیے پھرو گے۔"

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں خسکران۔" دلاور مضبوط لہجے میں بولا۔

"دلاور نفس کا اتنا کمزور بھی نہیں کہ ایک عورت کے پیچھے لگ جائے۔"

"غزالہ کا پیچھا کرتے ہوئے بھی تو اس حال میں مبتلا ہوئے ہو۔" خسکران طنزیہ انداز میں بولا۔

"اس کی اور کیا بات ہے وہ میری شرعی بیوی ہے اس کی حفاظت اور تلاش میرا فرض ہے۔"

"چلو شرط لگ گئی دلاور بھائی......" خسکران خوش مزاجی سے بولا ایک دفعہ شکنتلا کو دیکھ لو...... غزالہ کو بھول جاؤ گے۔"

"شرط کو چھوڑو...... لیکن خود دیکھ لینا۔ ہاں ن ایک دفعہ اس نیت سے اسے دیکھنے کی حسرت ضرور ہے کہ سانپ سے انسان بننے والی وہ مافوق الفطرت ہستی کیسی ہے۔"

"اچھا چھوڑ دا یہ باتیں۔" خسکران موضوع بدلتے ہوئے بولا۔

''یہ بتاؤ کہ اب کیا کریں۔ یہ پہاڑیاں اور ان کی آگ برساتی گرمی تو ہماری جان نکال لیں گے ہمیں جلد از جلد انہیں عبور کر کے ہاراکاری کے جنگل میں داخل ہونا ہے۔''

''میں تو عام سا انسان ہوں۔'' دلاور مسکرایا۔ ''بتاؤ گے تو تم ہی کہ کل شام سے چل رہے ہیں یہ کب ختم ہوں گی اور ہم کب جنگل میں داخل ہوں گے۔''

''یہ بھی درست ہے۔'' خسکران خاموش ہو گیا اور پھر فوراً ہی چونک پڑا۔ اور تیزی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کی پریشانی دلاور بھانپ چکا تھا۔

''کیا بات ہے خسکران بھائی'' دلاور تیزی سے بولا۔ ''کچھ نادیدہ قوتیں ہمیں گھیرا ڈال رہی ہیں۔'' خسکران ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا۔ سرمئی رنگ کا دھواں ایک طرف سے پھیلنے لگا بڑھتے بڑھتے دھواں انسانی قد سے کئی گنا اونچا ہو گیا اور پھر دھواں خاص انداز سے ملنے لگا اور مختلف شکلیں اختیار کر رہا تھا۔ اب آہستہ آہستہ سے وہ ایک خاص شبیہ میں منتقل ہونے لگا۔ اب دلاور نے دیکھا کہ ایک دیوہیکل سیاہ بھجنگ سی چیز ظاہر ہو رہی تھی۔ دلاور سمجھ گیا یہ بھی کوئی جن ہے..... خسکران چونک کھڑا تھا۔

ظاہر ہونے والے جن کا قد بہت خاصا بڑا تھا۔ اور بڑی بڑی گول آنکھیں اس نے دلاور اور خسکران پر جما رکھی تھیں۔

''ہو ہو ہو ہو۔ اپنے آقا کے حکم سے تمہاری تلاش میں نکلا تھا بچو۔ اس نے مجھے سندیس دیا کہ تمہیں تلاش کر کے یہ سندیسہ تم تک پہنچا دوں۔''

''بولو۔ کیا کہنا چاہتے ہو۔'' اب دلاور کو خسکران مطمئن نظر آ رہا تھا کیوں کہ وہ خود بھی جن بلکہ شاہ جنات کا بیٹا تھا۔

''جتنی جلدی ہو سکے سرخ پہاڑیوں سے پرے چلے جاؤ۔ ورنہ خیر ہو ہی نہیں سکتی۔''

''خسکران جانے کے لیے نہیں تمہارے اور قبیلے سمیت تبریشیا کو مٹانے کے لیے آیا ہے۔''

''شاہ جنات کے بیٹے۔ عنکبوت اپنے مالک کا حکم مانے گا۔ تمہارا کوئی لحاظ نہیں کرے گا۔''

''تت..... تم عنکبوت ہو.....'' دلاور چونک کر بولا۔ اسے ایک دم غزالہ یاد آ گئی۔ ''تم ہی نے میری بیوی کو اغوا کیا تھا۔ مجھے تمہاری ہی تلاش تھی۔''

''تو چپ رہ آدم زادے..... ورنہ بھسم کر دوں گا۔'' عنکبوت نے دلاور کو آنکھیں نکالیں۔

میرے ساتھ بات کر عنکبوت۔ میرے اور تبریشیا کے راستے سے ہٹ جاؤ ورنہ پچھتاوے کے لیے بھی سے نہ دوں گا۔''

''پچھتاوا کس کا مقدر بنے گا اور فتح کس کے ہاتھ آئے گا یہ تو وقت ہی بتائے گا جب تمہارا اور میرا پنجہ لڑے گا۔''

ابھی پنجے لڑا لیتے ہیں۔'' خسکران نے للکار ماری۔

''ابھی میں صرف تمہیں اپنے مالک تبریشیا کا پیغام سنانے آیا تھا تم سے مقابلہ پھر کبھی ہو گا۔''

''پھر ملاقات کے لیے آئے تو بھاگنے کا بہانہ سوچ کر آنا۔'' خسکران مسکرایا۔

اور پھر اسی ملاقات میں تم سے بات بھی کروں گا اور ہاتھ بھی..... جس دن تجھے نیست نابود کر دوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے عنکبوت کا جسم دھوئیں میں تحلیل ہونے لگا۔

''نہ ملے تو بھی ڈھونڈ لوں گا۔'' خسکران کے ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ غائب ہو گیا۔

''کشکران بھئی یہی وہ عنکبوت جن ہے جو میری بیوی کو میری آنکھوں کے سامنے چھت پھاڑ کر لے گیا تھا کچھ کرو خسکران بھائی۔'' دلاور کا دل بھر آیا۔

☆......☆

(حیرت کے بھید رنگوں سے آباد اس سلسلے وار ناول کی اگلی قسط ماہ دسمبر میں ملاحظہ کیجیے)

تین کہانیاں

جس میں مرد ہی نہیں خواتین بھی مردوں کے اس معاشرے میں
اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات ہمارے پاس بھیج سکتی ہیں

منزلِ عشق کے راہی

مومنہ بتول

کراچی سے، ایک عاشقِ محمدؐ کے شیدائی کا سچا ماجرا

مجھے اس فلیٹ میں میں شفٹ ہوئے محض چار ماہ ہی ہوئے تھے۔ دراصل دو دیوروں کی شادی کے بعد جب گھر کچھ چھوٹا محسوس ہونے لگا تو سسر صاحب نے نہ صرف ہمیں الگ گھر کا مشورہ دیا بلکہ اپنے طور پر بروکر سے ملنا بھی شروع کر دیا اور ایک بڑی رقم کا حصہ بھی میرے شوہر کے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیا، تو ہمیں بھی سنجیدہ ہونا پڑا، چوں کہ میں اپنے سسرال سے الگ ہونے کے موڈ میں ہرگز بھی نہیں تھی، مگر جب میری ساس نے گھٹنوں بیٹھ کر محبت بھرے انداز میں مجھے اس بات کا احساس دلایا کہ اب تمہارے بچے بڑے ہو رہے ہیں، لہٰذا اپنا گھر بنانے کا یہ بہترین وقت ہے اور پھر نہ ہم لوگ تم سے ناراض ہیں..... جاؤ ہنسی خوشی اپنے گھر کی بنیاد رکھو، تو ہم دونوں نے بھی اس طرف سوچنا شروع کیا۔ میرے مشفق سسر نے محض دو ڈھائی ماہ کے عرصے میں ہمیں چار کمروں کا ایک چھا سا فلیٹ اچھے اور پوش علاقے میں دلوا دیا اور پھر آخرکار ہم اپنے نئے فلیٹ میں شفٹ ہو ہی گئے۔

نیا گھر، نیا ماحول، نئے لوگ! پھر گھر کی سیٹنگ، بچوں کے اسکول و کالج کے ایڈمیشن کی مصروفیات، کوچنگ کی تلاش، غرض ہر مرحلے سے نبٹتے نبٹتے ہمیں چار ماہ لگ ہی گئے تھے اور اب کچھ دنوں سے میں فراغت محسوس کر رہی تھی اور پلان کر رہی تھی کہ قریبی عزیزوں کو مدعو کر کے ذکر محمد ﷺ یعنی محفل میلاد اور قرآن خوانی کروالوں..... تقریباً ہفتے بھر سے ذہنی و جسمانی تھکن بخار بن کر حملہ آور ہو گئی تھی اور اس روز بھی بخار کی حدت بہت زیادہ ہو رہی تھی۔ طبیعت بے حد گھبرا رہی تھی۔ عصر کا وقت تھا اور میں ڈرائنگ روم میں ہی صوفے پر لیٹی ہوئی تھی..... کہ اچانک قوالی کی آنے والی آواز نے مجھے ہمہ تن گوش کر دیا۔ میری طبیعت کا رجحان نعتوں، منقبتوں اور قوالیوں کی طرف کچھ زیادہ ہی ہے۔ وہ آواز..... بے حد پُرسوز تھی۔ پھر قوالی بھی من پسند تھی اور قوالی پڑھنے والا بھی دل کے ٹکڑوں کو چیر کر رکھ گیا تھا..... ''بھر دو جھولی میری یا محمد ﷺ'' میں بے تاب سی ہو کر کھڑکی کی طرف آئی تھی۔ سامنے کا سارا منظر خالی تھا، مگر ہوا کے کاندھے پر سوار وہ دل سوز آواز، وہ گداز انداز، ٹوٹے لہجے کی رقت، الفاظ کی گرفت، شاید آج جمعرات ہے اور کوئی مانگنے والا..... اپنے جذبے، اپنی مجبوری..... لوگوں پر بڑے رازدارانہ انداز میں عیاں کر رہا ہے..... میری نگاہ خود بخود اپنی مٹھی میں دبے نوٹ پر پڑی، جو کہ میں اسی نیت سے لے کر کھڑی ہوئی تھی..... تب ہی سامنے بنے اپارٹمنٹ کی بالکونی سے کسی

خاتون نے کچھ پھینکا اور وہ آواز مجسم سامنے آ گئی تھی۔
''سفید ململ کے کلیجے شلوار کرتے میں ملبوس وہ درمیانے قد کا...... پریشان حال، شخص جس کے سر پر مخملی ٹوپی تھی اور اس کے ہاتھ خالی تھے۔ نہ کوئی ساز، نہ کوئی ڈھول یا دف...... نہ سارنگی مگر اس کے لہجے کی گرج الفاظ پر مضبوط گرفت تھی۔ اس کی آواز کا سوز۔ اس کے ٹوٹے دل کی آواز بن کر فضا میں بکھر رہا تھا۔
''اس طرح پھینک کر دینا اس بندے کی توہین ہے۔ یہ تو غلامانِ رسول ﷺ ہے۔ نعت گو ہے، اس کو تو بہت ادب، احترام اور شائستہ انداز میں نذرانہ دینا چاہیے۔''
میرے ہاتھ سے نوٹ کارپٹ پر گر چکا تھا۔
''یا اللہ کس طرح میں اس معصوم کی مدد کروں۔''
پھر ایک دم ہی! میں...... کعبہ رُخ ہو گئی تھی اور میرے دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھ گئے تھے۔ ''میرے معبودِ برحق...... میرے پروردگار! میرے مولا، مجھ گناہ گار بندی کی...... دل کی آواز سن لے۔ اس انجان شخص کے لیے۔ ایک مسلمان بھائی کے حق میں، ایک مسلمان بہن کی دعا قبول فرما لے۔ یہ غریب جو کہ شانِ رسول ﷺ میں نعتیہ کلام پڑھ رہا ہے، اسے قبول فرما لے...... اس کی جھولی بھر دے، اس کا مقام بلند کر دے، اس کا دامن بھر دے...... اس کا خالی دستر خوان بھر دے۔ اسے اتنا دے کہ یہ عاشقِ رسول ﷺ آج کا مانگنے والا ہاتھ کل دینے والا بن جائے۔ اس کی محتاجی دور کر دے، اس کے ذریعۂ معاش کا اتنا انتظام کر دے کہ عشقِ محمد ﷺ میں یہ نعتیں پڑھ کر مانگنے کے بجائے رسولِ اکرم ﷺ کے عشق و محبت میں نعتیں سننے آنے والوں کی دل کھول کر تواضع کر سکے۔ یا خدا اس دل سے نکلتی اس سچی دعا کو قبول فرما لے، میرے مالک...... صدقے تیرے نور کے تاج والے۔''
یہ الفاظ میرے منہ سے نکل رہے تھے اور اشک آنکھوں سے تسلسل سے بہ رہے تھے۔ میرا وجود سراپا دعا بن گیا تھا۔ بخار کی حدت تھی، جذبات کی شدت تھی یا پھر میرے دل میں لگی آتشِ عشقِ محمدی ﷺ کارفرما تھی کہ میری ہتھیلیاں تک جل رہی تھیں، پھر میں نے درود شریف پڑھ کر اس دعا پر قبولیت کی مہر ثبت کر دی اور آمین کے بعد ہاتھ اپنے بھیگے چہرے پر پھیر لیے...... یہی گھڑی تھی جب یکدم ہی میرا دل سکون سے بھرنے لگا تھا۔ نہایت اطمینان و سکون میرے جسم میں اترنے لگا تھا۔ بخار بھی یکلخت ٹوٹ گیا تھا اور ایک خوش گوار سا ہلکا پن محسوس ہو رہا تھا، گویا میں نے بہت ضروری کام، بہت اچھے اور بہت ہی احسن طریقے سے پورا کر دیا تھا۔ میں منٹوں میں ہشاش بشاش ہو گئی تھی اور صرف یہی نہیں، بلکہ پورے ہفتے کے بعد میں نے اپنے ہاتھوں سے شام کی چائے بنا کر پی تھی۔
زیست کا سفر، محوِ سفر تھا۔ دن ہفتوں میں بدلنے لگے تھے۔ گھر، گھر داری اور معاملاتِ زندگی میں الجھ کر وہ کیفیت، وہ جذبہ اور اس جذبے کی سرشاری سے بھی دور ہو گئی تھی جو میرے خدا نے اس لمحے میں میرے دل میں ڈالا تھا۔

☆......☆......☆

چند دن پہلے ہی میرے شوہر نے اپنے بیمار دوست کی عیادت کا ارادہ کیا تھا اور مجھے تیار رہنے کا کہا تھا، سو وقت پر تیار ہو کر ہم ان کے گھر پہنچے تھے۔ برجیس صاحب کی عیادت کرتے ان کے بچوں سے ملتے ملاتے اور مسز برجیس کے ہاتھوں کے بنے لوازمات سے فارغ ہوتے ہوئے مغرب وہیں پر ہو گئی تھی۔ نماز کے بعد ہم نے اٹھنے کا قصد کیا، تب ہی اچانک مائک پر نہایت خوب صورت تلاوت شروع ہوئی۔ ''ارے آج شاید عاشق محمد کی بزمِ میلاد ہے۔'' بھابی فوراً ہی گویا ہوئیں
''عاشق محمد کی محفلِ محمدی'' برجیس صاحب نے بتایا...... تو میری نگاہیں سوالیہ انداز میں بھابی پر جم گئیں۔
ارے بھئی! ہمارے گھر سے دوسری گلی میں رہتے ہیں عاشق صاحب...... اللہ بخشے ہماری ساس بتاتی تھیں کہ ان کے والدین نجیب الطرفین سید ہیں۔ تقسیم کے بعد سے اسی محلے میں آباد ہیں۔ ان کے والد اچھے محکمے میں اعلیٰ عہدے پر فائز رہے، مگر مجال ہے جو ایک آنے کی بھی رشوت لی ہو۔ اپنی تنخواہ میں چار بچوں کی پرورش نہایت اچھے اور اسلامی ماحول میں کی۔ دونوں میاں بیوی سچے عاشقانِ رسول ﷺ تھے۔ پابند صوم و صلوٰۃ۔ اپنی بچت سے ہر چھ ماہ بعد ان کے گھر محفلِ قوالی اور محفلِ میلاد بڑی دھوم سے مناتے تھے اور اہلِ محلہ شامل ہو کر ثواب

دارین حاصل کرتے تھے۔

جس سال یہ تقریب منعقد نہیں ہوتی، اہل محلہ سمجھ جاتے کہ اس سال عاشق محمد کے والدین کی بچت کسی یتیم لڑکی کی شادی، کسی بے بس طالب علم کی فیس یا پھر کسی بیوہ کے گھر کے راشن کی صورت میں پہنچ چکی ہے۔

والد کی ریٹائرمنٹ کے ڈیڑھ سال بعد ان کے آفس میں ان کے بیٹے کو بطور اکاؤنٹنٹ رکھا گیا۔ پنشن اور دیگر اخراجات کو منہا کر کے ان لوگوں نے اپنے گھر کو تھوڑا بہت بنالیا۔ بیٹیوں کی شادیاں کیں..... اس تگ و دو کے جھمیلے میں والد صاحب کچھ ایسے بیمار پڑے کہ باوجود علاج کے جانبر نہ ہو سکے۔

صدمے کے دنوں سے نکل کر عاشق محمد کی ماں نے ایک غریب دیندار گھرانے کی شریف لڑکی ڈھونڈ کر اس کی شادی کر دی۔ سو یہ گھرانہ ہنسی خوشی رہنے بسنے لگا تھا۔ عاشق محمد یکے بعد دیگرے دو بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ اس کے اخراجات بڑھ گئے تھے، مگر اس نے اور اس کی ماں نے اپنے باپ کے مشن کو جاری رکھا ہوا تھا کہ اچانک تقدیر نے پلٹا کھایا، کچھ اس طرح کہ غیظ و غضب کے سائے اس کی زندگی پر اثر انداز ہونے لگے۔ ہوا یوں تھا کہ اپنی قابلیت، ایمان داری، محنت کے بل پر وہ اونچی پوسٹ تک پہنچا تو راشی افسران کے حلق کی ہڈی بن گیا، سو افسروں کی ملی بھگت سے اس پر غبن کا نہ صرف الزام لگایا گیا، بلکہ جیل بھی بھیج دیا گیا۔ چھ ماہ دس دن کی جیل کاٹنے کے باوجود وہ ایمان پر ثابت قدم رہا۔ کچھ اس کے اعلیٰ اخلاق، سچا مسلمان اور پنج وقتہ نماز و وظیفہ اور کچھ اپنی حیثیت کے مطابق وکیل کر لینے سے وہ جیل سے باہر تو آ گیا، مگر تقدیر کی ٹھوکریں اب بھی اس پر حاوی تھیں۔ اس کے پایۂ استقلال میں کوئی کمی نہیں تھی۔ اس کا ایمان اب بھی پکا تھا۔ تمام اہل محلہ اس کے گواہ تھے..... مگر اس کا حوصلہ اچانک اس وقت جواب دے گیا جب اس کے حق میں اٹھتے بوڑھی ماں کے دو ہاتھ بھی بغیر علاج بیماری سے لڑتے لڑتے بے دم ہو گئے۔ عاشق محمد پر وقت کی کاری ضرب لگی تھی۔ وہ بالکل ٹوٹ چکا تھا۔ خالی ہاتھ، خالی دامن لیے جب وہ گھر لوٹتا تو بیوی کی سوالیہ نگاہیں اور بچوں کے کملائے چہرے دیکھ کر وہ رو پڑتا۔ اس کے سجدے طویل ہو جاتے۔ چھوٹی سی مزدوری بھی ملتی تو دو پیسے کی آس میں وہ کام کر گزرتا، مگر حالات جوں کے توں ہی رہے اور دو سال بعد..... جب اس کے مقدمے کا فیصلہ ہوا اور اس کے ایماندارانہ جذبات کا سرعام قتل ہوا اور وہ رسوا کر کے

ڈکالا گیا تو پھر اس کے صبر کا دامن لبریز ہو گیا تھا۔ وہ گھر والوں اور لوگوں سے بچتا بچاتا جیٹی کے پل پر خودکشی کی نیت سے گیا تھا۔ اس کے حوصلے اور اس کی ہمت جواب دے گئی تھی اور وہ خودکشی جیسی قبیح حرکت کرنے جا رہا تھا۔ سمندر پر تفریح کے لیے آنے والے لوگ بھی اس کی راہ میں حائل ہو رہے تھے۔ وہ بے دم سا پل کی منڈیر پر بیٹھ گیا تھا، سر جھکائے، پشیمان، شرمندہ، پھر اس کا کلیجہ پھٹنے لگا تو بے اختیار اس کے گلے سے مدحتِ رسول ﷺ، نعت کی صورت میں ادا ہونے لگی۔ کتنے اشعار اس کے سریلے گلے سے قوالی یا نعت کی صورت ادا ہوتی رہیں۔ اسے ہوش تو جب آیا، جب کسی مہربان ہاتھ کی گرمی کا احساس ہوا۔ سر اٹھانے پر اسے ایک خوب صورت خاتون دکھائی دیں جو کہ اس سے کہہ رہی تھیں کہ بیٹا ''تمہاری آواز بہت پُر سوز ہے، جس خوش الحانی سے تم قوالی گا رہے تھے، یہ اس کا انعام ہے..... رکھ لو بیٹا..... کبھی اس مولا کی ناشکری نہ کرنا..... اور نہ ہی نعتیں پڑھنا چھوڑنا۔'' تب اس نے لرزتی انگلیوں سے وہ نوٹ تھام لیا، جو اس کے مقدر کے دروازے پر پہلی دستک دے رہا تھا..... پھر عاشق محمد نے اپنا ذوقِ دیوانگی عشقِ محمد میں پا لیا اور قدرت خدا کی..... کچھ عرصے بعد جب اس محکمے میں کوئی نیا با اختیار افسر آیا اور اس کو اس ایمان دار عاشق محمد ﷺ کی بابت معلوم ہوا تو اس نے وہ کیس از سرِ نو کھلوایا۔ پچھلی افسر سے احتساب کیا۔ یہی نہیں بلکہ تمام روداد جان کر اس نے نہ صرف عاشق محمد کو باعزت طور پر اس کے عہدے پر بحال کیا، بلکہ اپنے ذاتی کاروبار میں اسے اپنا پوسٹ منیجر بنا دیا۔ رب العزت نے اس کے دن کیا پھیرے کہ عاشق محمد نے پھر سے اپنی محافل سجانا شروع کر دیں۔ اب ہر مہینے کی چندی جمعرات کو وہ اعلیٰ قسم کے کھانے پکواتا ہے۔ نعتیں پڑھی جاتی ہیں۔ قوال آتے ہیں، ختم قرآن ہوتا ہے اور آخر میں اہلِ شرکت شکم سیر ہوتے ہیں۔ سب سے آخر میں عاشق محمد اپنی پُر سوز آواز میں ہدیۂ عقیدت پیش کرتا ہے۔''

یہ سب بتا کر بھابی خاموش ہو گئیں..... مگر سب پر سکوت ہی چھایا رہا، یوں لگ رہا تھا گویا وقت ٹھہر گیا ہے۔ پھر بے اختیار سب کے منہ سے سبحان اللہ نکلا تھا۔ کافی دیر تک اس کی ذات ہماری گفتگو کا حصہ رہی۔ رات کی سیاہی غالب آنے پر ہمیں واپسی کا ارادہ کرنا پڑا۔ مائک پر اب نہایت احترام سے نعتیں پڑھی جا رہی تھیں۔ پھر یک دم ہی وہی مانوس آواز، وہی پُر سوز لہجے میں قوالی ''بھر دو جھولی میری یا محمد ﷺ'' شروع ہوئی اور میں بے جان سی ہونے لگی۔ کچھ مہینوں پہلے کی سنی جانے والی آواز..... اور آواز کے سحر میں گم ہوتی میری ذات، میرے جذبات۔ سب کچھ ایک فلم کی طرح آنکھوں کے آگے آ رہا تھا۔ میرا دل بے قابو ہو رہا تھا..... میری بے چینی کو میرے شوہر بھانپ گئے تھے۔ کچھ وہ بھی میری دلی کیفیت سے واقف تھے..... میرے جذبۂ ایمانی ان پر روشن تھے، سو کچھ کہے بغیر انہوں نے گاڑی کا رخ آنے والی آواز کی سمت موڑ لیا تھا۔ گاڑی سے اُتر کر ہم پیدل ہی اس چوڑی گلی میں داخل ہوئے تھے جو کہ بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ قطاریں خوب صورت نشستوں کی صورت بھری ہوئی تھیں اور سامنے بڑے سے اسٹیج پر خانہ کعبہ کے پورٹریٹ کے پیچھے قوالی گاتے قوال..... اور بیچ میں بیٹھا وہ شخص سو فیصد وہی تھا..... مگر آج اس کے کپڑے بے داغ، سفید براق تھے۔ سر پر وہی مخملی ٹوپی تھی۔ وہی پُر سوز آواز، وہی والہانہ انداز..... یک بارگی میرے دل میں انبساط کی لہر دوڑ گئی۔ (صد شکر رب العالمین) صد شکر..... رب کائنات..... تیرا شکر خدایا..... تو نے مجھ گناہ گار کی دعا اس مسلمان بھائی کے حق میں قبول فرمائی۔ واہ میرے مالک..... صدقے تیری دلبری کے۔ کس طرح تُو نے اس مظلوم شخص کے حق میں میرے دل میں جوت جگائی اور اس جوت سے کتنا نور..... بکھرا..... ''تو جس سے، جب چاہے، جو کام لے تُو ہی جانے۔''

رب لم یزال..... ایک عاشق محمد کے حق میں دوسرے عاشق محمد کی شیدائی کی دعا قبول فرمائی۔ ہم دونوں میں ایک قدر تو مشترک تھی، وہ عاشق محمد تھا اور میں عاشق محمد کی شیدائی۔

آخر ہم دونوں ہی منزلِ عشق کے راہی تھے۔

☆☆.....☆☆

دوسری مرد کہانی

جفا کیسی؟

سید مبارک علی شمسی

حاصل پور سے، ایک عورت پر اندھا اعتماد کرنے والے شخص کی کہانی

فخر عباس میرا بہت اچھا دوست ہے کافی دن بعد میں اس سے ملنے اس کے آفس گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں وہ فخر نہیں ہے جو پہلے ہوتا تھا میں سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا اس کو کوئی ہوش نہیں تھا۔ کسی کے آنے



جانے کا، اس نے ٹیبل پر پڑی فائل بند کی اور اسے جھٹکے سے ٹیبل پر پٹخ دیا اس کا دل کوئی بھی کام کرنے کی طرف مائل نہیں ہو رہا تھا لایعنی سوچوں نے اس کے ذہن کو منتشر کر رکھا تھا اس نے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر اپنے ہاتھوں پہ پیشانی رکھ دی ۔یہ اس کے اندرونی اضطراب کی واضح نشانی تھی اس نے آہستگی سے اپنے ہاتھوں کی مٹھی کو پیشانی سے ٹکرایا

۔

☆......☆......☆

فخر عباس کی آنکھیں تپش سے لہو رنگ ہو رہی تھیں اس کی آنکھوں کے بھاری پپوٹے گزشتہ شب کے رتجگوں کی کہانی سنا رہے تھے اکتاہٹ اور بے زاری اس کے بدن سے لپٹی فخر عباس کو اپنی بے کلی کا شدت سے احساس دلا رہی تھی۔

☆......☆......☆

وہ اونچا لمبا نوجوان اور شاندار خوبصورت مرد اس لمحے وہ بہت تنہا اور اکیلا محسوس کر رہا تھا۔ حزن وملال نے اس کے خوبرو خدوخال کو عجیب سا سوز بخش دیا تھا۔ دوستوں کی بے وفائی اور محبت میں ناکامی نے اس کے دل میں ایسا گداز پیدا کر دیا کہ سہانے موسموں میں بھی اسے ہر طرف خزاں ہی خزاں دکھائی دیتی تھی۔ اس کے لب میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اس کی درد بھری داستاں بیان کرنے سے رک نہ پائے۔

☆......☆......☆

''فخر عباس غیر ملکی فرم میں مینیجر تھا اور ساتھ ساتھ ایک مقامی فلاحی تنظیم کا ممبر بھی تھا اسے لوگوں کی مدد کرنے اور فلاحی کام کرنے کا بچپن ہی سے بہت شوق تھا ایک دن اس کے نمبر پر کال آئی اس نے ریسیو کی تو دوسری طرف خاتون تھی سلام کے بعد اس نے کہا کہ ''آپ فخر عباس بات کر رہے ہیں ناں؟'' فخر نے کہا جی ہاں بول رہا ہوں''۔ تو وہ بولی مظلوم لڑکی ہوں اس دنیا میں اللہ کے سوا میرا کوئی نہیں میں منڈی بہاوالدین کی رہائشی ہوں میرے بہن بھائی میرا ساتھ نہیں دیتے۔ پورے گھر میں صرف میرے ابو میرا ساتھ دیتے تھے مگر اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے میرے گھر والوں نے میری شادی ایک عمر رسیدہ شخص کے ساتھ کر دی صرف یہ دیکھ کر کہ اس کے پاس بہت دولت ہے۔

اس نے شادی کے کچھ دنوں کے بعد ہی لڑائی جھگڑا معمول بنا لیا اور مجھ پر ذہنی اور جسمانی تشدد کے پہاڑ توڑ دیے مگر میں اپنے خاندان کی عزت وناموس کی خاطر خاموش رہی اور ہر ظلم سہتی رہی۔

☆......☆......☆

ایک دن اس درندہ شخص نے مجھے جان سے مارنے کا منصوبہ بنا لیا وہ کلہاڑی اٹھانے دوسرے کمرے میں گیا تو میں بھاگ نکلی اور محلے والوں سے پناہ مانگی انہوں نے مجھے میرے گھر پہنچایا۔ اس نے میرے اوپر جھوٹے مقدمات کر رکھے تھے اور میں نے خلع کا دعویٰ بھی دائر کر رکھا ہے مگر 16 ماہ گزر گئے ہیں داد رسی نہیں ہو رہی۔ پیشی پر آتے جاتے وہ مجھے بہت تنگ کرتا ہے۔ میں اکیلی ہوتی ہوں اور مجھے بہت ڈر لگتا ہے کیا آپ میری مدد کر سکتے ہیں مجھے اللہ کے بعد آپ سے امید ہے۔

☆......☆......☆

فائزہ کی داستان سن کر فخر غمگین ہو گیا اس نے فائزہ کو ہر طرح کے تعاون کی یقین دہانی کروائی وقت تیزی سے گزرتا رہا اور مقدمات چلتے رہے، پیشیاں پڑتی رہیں۔ فائزہ اور فخر کی فون پر بات ہوتی رہی ،گو کہ ملاقات نہ ہوئی مگر وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے فخر اسے بیلنس بھجواتا رہا اور اپنی تنخواہ میں سے اسے دوسرے اخراجات کے لیے پیسے بھیجتا رہا۔

☆......☆......☆

ایک دن رات فون پر بات ہو رہی تھی تو فائزہ رو پڑی فخر نے بہت پوچھا مگر فائزہ نے نہ بتایا اور کال بند کر دی۔ فخر کی بے چینی مزید بڑھ گئی کچھ دیر بعد فائزہ نے میسج کیا کہ ''آپ بہت اچھے انسان ہیں میں آپ کو اپنانا چاہتی ہوں۔ آپ آ کر مجھے یہاں سے لے جاؤ ۔'' فخر نے جب یہ میسج پڑھا تو اچانک اس کے پاؤں تلے زمین نکل گئی اس نے میسج کا جواب دیا کہ آپ نے اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر لیا؟ حالانکہ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا تک نہیں، جانتے نہیں بس ایک فون کال پر ایک

تیسری مرد کہانی

جیسے کو تیسا

فوزیہ فرید احمد

گجر خان سے، مرد کے ظرف پر مبنی ایک خاص کہانی

"میں نے بہت عرصے پہلے کہیں پڑھا تھا کہ مرد بہت کم ظرف ہوتا ہے اپنے آپ سے منسلک ہر رشتے کو آئینے کی طرح شفاف دیکھنا چاہتا ہے عورت کی چھوٹی سے چھوٹی غلطی کو بھی معاف کرنا اسے اپنی مردانگی کی توہین لگتی ہے اور اپنی بڑی سے بڑی خطا کو ہنس کر ٹال دیتا ہے گویا خطائیں کرنا اس کا پیدائشی حق ہو مجھے اس بات کی گہرائی کا اتنا پتہ نہیں چلا تھا جتنا آج اور اس وقت چل رہا تھا۔"

میں یعنی عالیہ بخاری فقط ساتھ روز کی دلہن اس



وقت سمندر کے کنارے بیٹھی اپنے شوہر سے اسکی محبوبہ کے قصے سن رہی تھی۔ اسے خبر ہی نہ تھی کہ میرے دل پہ کیا بیت رہی ہے؟ وہ اپنی ہی ترنگ میں شادی سے پہلے کے قصے ہنس ہنس کر سنا رہا تھا شاید وہ میرا ظرف آزما رہا تھا......؟ اس کی آنکھوں میں بے پناہ دیے روشن تھے' وہ مجھے سب باتیں اس طرح بتا رہا تھا جیسے میں اس کی بیوی نہیں بلکہ کوئی گرل فرینڈ ہوں وہ مجھ سے کچھ پوچھ رہا تھا میں ایک دم خیالات سے چونکی ۔کیا بات ہے تمہاری طبعیت تو ٹھیک ہے نہ؟ اس نے فکر مندی سے میری طرف دیکھا تھا ،شاید اس نے میرے دل کا حال میرے چہرے سے پڑھ لیا تھا وہ فکر مند دکھائی دے رہا تھا۔ ''جج......ٹھیک ہوں میں۔''

''اچھا میں سمجھا کہ سمندر پر آنے سے نوشی کی طرح تمہاری بھی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔'' پھر وہی ذکر، پھر وہی اذیت، پھر وہی کہانی میں چپ چاپ اسے دیکھتی رہی ۔وہ ایک بار حال پوچھ کر پھر اپنی باتوں میں کھو گیا تھا۔

تمہیں پتا ہے عالیہ نوشی بہت خوب صورت تھی اتنی خوب صورت کہ وہ یہاں میرے ساتھ سمندر کے کنارے بیٹھی ہوتی تھی تو سمندروں کی خوب صورتی بھی ماند پڑ جایا کرتی تھی۔''

'......ایک بات پوچھوں آپ سے؟'' میں نے ڈرتے ہوئے پہلی بار زبان کھولی۔'' ہاں پوچھو۔''

آپ نے اس کے بجائے مجھ سے شدی کیوں کرلی؟''

''تم سے؟'' وہ کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا پھر اچانک خاموش ہو گیا میں نے اپنی بات کو پھر دھرایا اس نے مجھے دیکھا اور پھر سمندر کی آتی جاتی لہروں پر اپنی نظریں ٹکا دیں۔تھوڑی دیر بعد خود ہی گویا ہوا۔

''تم سے شادی کرنا میری مجبوری تھی۔ اگر میں تم سے شادی نہ کرتا تو ابا مجھے جائیداد سے عاق کر دیتے اور اماں نے مجھے دودھ نہ بخشنے کی دھمکی دی تھی مگر میں نے اس شرط پر تم سے شادی کے لیے ہای بھری تھی کہ میں اپنی مرضی سے دوسری شادی بھی کروں گا۔''

یہ الفاظ نہیں تھے پگھلا ہوا سیسہ تھا جو میرے کانوں میں انڈیلا گیا تھا مجبوری شرط، دھمکی؟ کیا اس بنیاد پر ان کا رشتہ استوار ہوا تھا؟ چند ہی لمحوں میں کلیدان نے اسکی ذات کو بے وقعت کر دیا تھا اور وہ ضبط کی آخری حدوں کو چھو رہی تھی پھر بھی خاموش تھی وہ بھی کیا کرتا وہ خود بے بس تھا اپنی محبت کے ہاتھوں شاید کلیدان کو اس کی بے بسی پر رحم آ گیا تھا اس نے عالیہ کے یخ ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔'تم بہت! اچھی ہو عالیہ میں تمہاری رفاقت پر خود کو خوش نصیب کہہ سکتا ہوں مگر میں کیا کروں؟ مجھے نوشی کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیتا اماں ابا کے آگے میں مجبور تھا ورنہ تمہاری زندگی کبھی خراب نہیں کرتا۔''

واہ رے مرد! تیری مجبوریاں اپنے مفاد کے لیے تم لوگ کچھ پل لگاتے ہو، کسی کی زندگی سے کھیلنے کے لیے اور عورت سے پھر بھی وفا کی امید رکھتے ہو۔عالیہ نے تلخی سے سوچا۔

''اگر کوئی مسئلہ ہے تو مجھ سے کہو'' اس کے جملے نے مجھے گویا آگ لگائی تھی جھٹکے سے سر اٹھا کر نہایت ترشی سے بولی۔

''کون کون سے مسائل حل کریں گے چند روز کی دلھن جب واپس اپنے گھر کی دہلیز پر اس طرح قدم رکھے گی تو کیا گزرے گی اس کے ماں باپ پر؟ تم نے سوچا؟ جسکی جوان بہنیں گھر میں موجود ہوں، وہاں پر میرا جانا، ان کے رشتوں پر کیا اثر ڈالے گا، تم نے سوچا؟ وہ ہچکیوں سے رونے لگی تھی۔

''میں تمہیں طلاق نہیں دوں گا عالیہ! تم میرے گھر میں ہی رہنا۔ مگر میری مجبوری ہے میں نوشی سے شادی ضرور کروں گا۔''

''تمہاری آنکھوں میں کتنا بے گانہ پن تھا یہ میں شادی کی پہلی رات سے جانتی ہوں، مگر مسٹر کلیدان! ہم جو عورت ذات ہوتی ہیں ناں؟ ہمیں صبر کرنا آتا ہے ہمیں اذیت سہنا آتی ہے ہمیں بے اعتنائی برداشت کرنا آتی ہے قربانی دینا ہماری فطرت ہے اور یہی ازل سے ہماری قسمت ہے مگر میں تم سے پوچھنا چاہتی ہوں تم مرد کب تک عورت کو سزا دیتے رہو گے؟ کب تک اس کا امتحان لیتے رہو گے؟'' وہ شدت سے رونے لگی تھی۔

وہ اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے اشکوں کو دیکھ رہا تھا شاید اسے رحم آیا تھا اس لڑکی پر پھر اسی کیفیت میں عالیہ کا ہاتھ تھامنے لگا مگر اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا وہ خجل سا ہو کر رہ گیا تھا وہ اب بھی رو رہی تھی روتے روتے اس نے خود ہی خاموشی کو توڑا تھا اور ایک جھٹکے

سے اپنا چہرہ صاف کیا شاید وہ اس لمحہ کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی؟ شاید اسے اپنی عزت نفس کو بچانا تھا اور اپنے ماں باپ کو کسی پریشانی سے بچانا تھا......؟

''کلیدان مجھ پر ایک احسان کرو گے؟''

''ہاں بولو شاید کلیدان کے پاس الفاظ ختم ہو چکے تھے''

میں شادی سے پہلے کسی لڑکے کو پسند کرتی تھی تم مجھے آج ہی طلاق دے دو میں اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ عالیہ کے الفاظ نے کلیدان کو بت بنا دیا الفاظ تھے یا بم جو اس مرد کے پرخچے اڑا گئے تھے عالیہ یہی اذیت کلیدان کے چہرے پر دیکھنا چاہتی تھی جو مسلسل وہ عالیہ کو دے رہا تھا۔

''وہ ہے کون؟'' کچھ دیر میں وہ بولا۔

''میری خالہ ہیں دور پار کی، انکا بیٹا ہے۔''

''اگر میں تمہیں طلاق نہ دوں تو؟'' غصے اور حیرت کی ملی جلی کیفیات سے کلیدان کے دماغ کی نسیں جیسے پھٹنے کو تھیں۔

عالیہ جانتی تھی کہ مرد صرف امتحان لینا چاہتا ہے امتحان دینا اس کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

''عالیہ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا اگر تمہارے دل میں کوئی اور تھا تو تم نے کیوں گزارے میرے ساتھ یہ سات روز؟'' کلیدان کے لہجے کی کاٹ واضح تھی عالیہ جواب دے سکتی تھی اس کی ہر بات کا مگر وہ دینا نہیں چاہتی تھی نا کردہ گناہوں کی سزا اگر عالیہ کو ملی تھی تو تھوڑی ہی تپش سہنا کلیدان کے حصے میں بھی آنا چاہیے تھا عالیہ کو واقعی یقین آ گیا تھا کہ مرد واقعی بہت کم ظرف ہوتا ہے۔

''میں اس بات پر ایک سودا بھی کر سکتی ہوں مگر سمجھوتہ تمہیں بھی کرنا پڑے گا۔'' عالیہ نے کلیدان کے سوالات کو نظر انداز کر دیا۔

''کیسا سودا؟ کیسا سمجھوتہ؟'' اس کی بات نے ششدر کر دیا تھا وہ کچھ دیر اسے تکتا رہا پھر بولا۔

''وضاحت کرو'' ۔وہ خاموش رہی تھی۔

عالیہ اس کے ہر سوال کا جواب دے سکتی تھی کہ جب تم مرد لوگ محبت کرو تو تمہارا عشق اور جب عورت کرے محبت کرے تو وہ بے غیرتی؟ جب تم مرد لوگ دوسری شادی کرنا چاہو تو اسلام کا حوالہ، جب عورت کرے تو بے حیائی۔ یہ کیا انصاف تھا؟

''تم بولو گی یا میں جا کر تمہارے ماں باپ کو سب کچھ بتا دوں'' کلیدان کا غصہ آسمان کو چھونے لگا تھا۔

''میرے ماں باپ کو بتانے سے بھی کچھ حاصل نہیں ہو گا یا تو تم مجھ طلاق دے دو...... یا پھر ساری زندگی مجھے اپنے گھر رہنے دو تمہاری ویسے بھی سرکاری نوکری ہے کسی دوسری جگہ پوسٹنگ کروا لو وہیں نوشی سے شادی کر لینا نہ تمہارے گھر والوں کو پتا چلے گا اور نہ ہی میرے'' عالیہ کے لیے یہ سب کچھ کہنا بہت مشکل تھا مگر اسے اپنی عزت اور اپنے ماں باپ کو پریشانی سے بچانا تھا، اپنی بہنوں کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں بننا چاہتی تھی...... ''اسے زندگی کے ساتھ سمجھوتہ کرنا تھا اس میں چاہے اس کی جان ہی کیوں نہیں جاتی۔

''ٹھیک ہے مجھے منظور ہے'' مرد تھا سے اپنا مفاد نظر آ رہا تھا۔ وہ اتنا ظرف کہاں سے لاتا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر کسی دوسرے کی عزت بنا دیتا......؟

عالیہ کے وجود میں سوئیاں چبھ رہی تھیں وہ سخت اذیت میں تھی وہ جانتی تھی اس نے مرد کے دل میں شک ڈال دیا ہے اور یہ شک کا ناگ کلیدان کو نہیں بلکہ اسے ہی ڈستا رہے گا جب جب کلیدان اس کے سامنے آئے گا وہ بتانا چاہتی تھی کہ اس نے محبت صرف اپنے شوہر سے کی ہے، وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ اس کی کوئی خالہ ہی نہیں تو خالہ کا بیٹا کہاں سے آئے گا؟ وہ چیخ چیخ کر والدین سے کہنا چاہتی تھی کہ اپنی ضد اور انا کی خاطر بیٹیوں کو قربان مت کریں آپ کی انا اور ضد میں صرف اور صرف نقصان لڑکی کا ہی ہوتا ہے کسی کا کچھ نہیں جاتا مگر وہ بول نہیں سکتی کیوں کہ اسے اپنی زندگی کی قربانی دینا ہوتی ہے یا اپنے والدین کو، بہنوں کو راحت...... اور ہمیشہ کی طرح عورت نے ایک ہی انتخاب کیا اپنی زندگی کی قربانی دینے کا انتخاب۔ عالیہ کی آنکھوں میں نمی تھی چہرے پر کرب کے آثار تھے ایک پل کو اس نے کلیدان کی آنکھوں میں دیکھا ان آنکھوں میں اس کے لیے نفرت ہی نفرت تھی پھر بنا کچھ کہے وہ ساحل سمندر سے اٹھی اور واپس جانے کو چل دی۔

☆☆......☆☆

دیارِ غیر سے، زندگی کی تصویریں

سرحد پار سے پہلی کہانی



دشمن زندہ کیوں رہے!

سنبل

اپریل 2014 میں شائع ہونے والی کہانی "دشمن زندہ ہے" کا جواب

یہود کے چنگل میں پھنس جانے والے ایک مردِ مومن کی خاص کہانی

عریش سوہیل اور جیسیکا کی بات سن کر سن ہو گیا
۔وہ کیا سوچ کر آیا تھا اور یہاں ان لوگوں کا کیا پلان
تھا......اسے اب اپنے ڈیڈ اور مما کی باتیں یاد آ رہی
تھیں، خصوصاً ڈیڈ کی بات کہ اگر کر سکو تو معلوم کرو پردہ
کہانی کیا ہے؟ اور اب اسے پردہ کہانی کا پتا چل گیا
تھا آگے کا لائحہ عمل کیا ہوگا۔ اسی وقت جیسی نے
اچانک چونک کر کہا

"میرا خیال ہے کہ ایک بار میں اسے چیک کر
لیتی ہوں کہیں وہ جاگ نہ رہا ہو ورنہ پرابلم کریگا
۔ابھی پتہ نہیں یہ چیف کا پلان کیا ہے آگے"

"ہاں واقعی دیکھو پتا نہیں اس نے دودھ پیا بھی
ہے یا نہیں" سوہیل نے بھی اس کی تاکید کی اور اس
سے پہلے کہ جیسی اٹھتی عریش بجلی کی سی تیزی سے روم
میں واپس آیا اور اس نے دودھ کا خالی گلاس ہاتھ میں
پکڑا اور بیڈ کے درمیان میں گر کر آنکھیں موند لیں۔؟
اور تھوڑی ہی دیر بعد جیسی کمرے میں تھی اور جیسی کے
او کے کرتے ہی سوہیل بھی کمرے میں تھا۔

☆---☆---☆

"یہ تو سو چکا ہے اسے اب کل دوپہر سے پہلے
ہوش نہیں آنے والا" جیسی نے ہنس کر سوہیل سے کہا۔

"ہاں اور یہ وقت ہمارا ہے" سوہیل نے جیسی کو
ہاتھ سے پکڑ کر خود سے قریب کیا، اسی وقت جیسی کے
موبائل کی بیپ ہونے لگی۔ اس نے موبائل کا گرین
بٹن پریس کر کے موبائل کان سے لگایا۔

"ہیلو چیف!" اس نے کہا اور پھر بات کرنے لگی
زیادہ تر وہ جی جی اور جی ہاں میں بات کر رہی تھی
عریش کی اس وقت پہلو بدلنے کی بڑی خواہش تھی جسے
اس نے اپنے اندر ہی مار دیا۔ اور تب ہی جیسی نے
موبائل بند کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔

☆---☆---☆

"کیا کہہ رہے تھے چیف؟" سوہیل نے پوچھا

"پلان میں کچھ تبدیلی کی گئی ہے اب اسے G - 8
منتقل نہیں کرنا ہے اس کی برین واشنگ تو کرنی ہے مگر
اس طرح کے یہ ہوش و حواس میں بھی مسلمانوں سے
نفرت کرے۔" جیسی کے لہجے میں سانپ کی سی مکاری
تھی۔

"ہاں وہ تو ٹھیک ہے مگر یہاں کیسے؟ اور انہیں
G - 8 کیوں منتقل نہیں کیا جا رہا" سوہیل نے پوچھا

"یہ یہاں مسئلہ ہی کریگا اور ہمارے درمیان
آئے گا اور اب دوری برداشت نہیں ہوتی" سوہیل
نے کہا تو جیسی کھلکھلا کر ہنسی

"یہ تو چیف جانے اور انہیں سب کو اسی طرح
ٹریٹ کرنا ہے" جیسے کہ اب تک کیا جاتا رہا ہے اور اسی
محبت سے انہیں مسلمانوں سے نفرت کرانی ہے مان
کے خلاف کرنا ہے" جیسی نے کہا "اور اس کے لیا دوری
کو برداشت کرنا پڑیگا آفٹر آل شوہر ہے یہ شخص میرا"

"وہ بولی تو دونوں کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔

☆---☆---☆

اور اس کے بعد اپنی پلاننگ پر عمل درآمد شروع
ہو گیا جیسی کا وہی محبوبانہ انداز تھا خود سپردگی والا مگر خود
اس کے جذبات ختم ہو چکے تھے پچھلی رات اسے بے
ہوش سمجھ کر سوہیل اور جیسی نے اسی بیڈ روم میں جو
اخلاقی حدود پار کی تھیں اس نے اسے جیسی سے نفرت
کروا دی تھی۔ وہ بہت لیے دیے رہنے لگا تھا اور اس
بات کو جیسی جیسی گھاگ عورت نے فوراً محسوس کر لیا تھا

"کیا بات ہے؟ کوئی الجھن ہے کیا؟" اس
وقت جیسی سفید ڈبل جارجٹ اور گرین کلر کی نیکسی میں
ملبوس تھی اور کسی اپسرا سے کم نہیں لگ رہی تھی مگر عریش
نے اسے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا کیوں کہ وہ اس
کی نظر میں اپنا حسن اور پاکیزگی کھو چکی تھی اب وہ اس
کوئی خون آشام چڑیل اور کسی Prostatute کی
مانند دکھائی دیتی تھی اور اسے یاد آتا تھا کہ ڈیڈ نے کہا
تھا کہ یہودی اپنے مقاصد کے لیے اپنا پیسہ اور اپنی
عورت کے بے دریغ استعمال کرتے ہیں اور وہ دیکھ
چکا تھا۔

☆---☆---☆

"نہیں کوئی بات نہیں ہے بس گھر والے یاد
آ رہے ہیں۔" وہ دل گرفتگی سے بولا۔

"اوہ! تو Home sick ہو رہے ہو" وہ
بڑے محبوبانہ انداز میں اس کے آگے لیٹ گئی مگر اس

نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تو وہ سوچتے ہوئے بولی''
''چلو آؤٹنگ پر چلتے ہیں'' ''نہیں بس میری گھر بات کروا دو میں بہتر محسوس کرونگا۔ پتا نہیں میرا موبائل فون کہاں ہے، دل نہیں رہا میرے تمام کانٹیکٹ نمبر اس میں فیڈ ہیں۔'' وہ اسی انداز لاپرواہی میں بولا جس انداز میں یوں اسے ٹریٹ کیا جا رہا تھا۔

''ہاں...... موبائل تو تمہارے پاس ہی ہوگا ناں! کہاں جائیگا'' جیسی نے محتیاط انداز میں کہا۔

''نہیں وہ تم نے جہاز میں بیٹھنے سے قبل مجھ سے لے کر اپنے پرس میں رکھا تھا پھر واپس نہیں کیا'' عریش نے اسے یاد دلانا چاہا۔

☆......☆......☆

''نہیں وہ تو تمہیں واپس کر دیا تھا تمہیں یاد نہیں ہے اور پرس میں تو میں خالی کر چکی ہوں۔ ہوتا تو میں تمہیں دے چکی ہوتی سویٹ ہارٹ'' وہ اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس کے قریب ہوتے ہوئے اس کے سینے سے آ لگی مگر اس کے جذبات سرد ہی رہے اور اس نے سوچا کہ ''او وہ اب ہمارا رابطہ دنیا سے منقطع رہے گا اور ہمارے پیاروں کو کچھ پتہ نہیں چل سکے گا کہ ہم کن تاریک راہوں میں مارے گئے مگر نہیں اتنی آسانی سے نہیں۔ میں اتنی آسانی سے ان کا تر نوالہ نہیں بنوں گا میں فدائی تو بنوں گا مگر مسلمانوں کے خلاف نہیں یہودیوں کے خلاف'' اس کی سوچ بہت دور تک اس کی ہمسفر تھی۔

☆......☆......☆

اور جیسی تھی کہ اس میں گھسی چلی جا رہی تھی اور اسے جیسی سے اور اپنے وجود سے گھن آ رہی تھی اکائی آ رہی تھی اور وہ جیسی تب ہی اس کے قریب آنے لگتی جب اسے گھر یاد آتا وہ کوئی ایسی بات کرتا جو یہودیوں کے خلاف کرتی گویا وہ اسے اپنے وحشی اور شراب کے نشے میں غرق کر کے ہو بنات بھلا دینا چاہتی مگر اب تو وہ اسے حسین لگتی ہی نہیں تھی اور شراب بھی اس پر اپنی تاثیر کھو چکی تھی۔

☆......☆......☆

اگلے

کچھ ہی دنوں میں اسامہ اور اس جیسے بہت سارے مسلمانوں کو باقاعدگی سے G - 8 لایا جانے لگا جہاں ان کو جدید اور خودکار اسلحہ چلانے کی ٹریننگ دی جانے لگی اس نے جن ہتھیاروں کے کبھی نام نہیں سنے تھے وہ یہاں اسرائیل آ کر اس نے دیکھ لیے اور چلانا بھی سیکھ لیے۔ مختلف قسم کے بم اور ایٹم بم کا باپ نیوکلیئر بم یہ سب نہ صرف اس نے دیکھ لیے بلکہ انھیں ہینڈل کرنا اور بووقت ان کا استعمال انھیں بغیر ہتھیاروں کے بھی لڑنے کی تربیت دی جاتی تھی۔ انھیں ہر طرح سے لڑنے کیلئے ٹرینڈ کیا جاتا تھا۔ مشکل گھاٹیوں میں چڑھنا اترنا۔ بیلی کاپٹر سے پیرا شوٹ اور رسیوں کے ذریعے اترنا پانی کے اندر سانس روکنے کی تربیت غرض ہر قسم کی تربیت انھیں دی جاتی تھی۔ اور ہر دن کے دو گھنٹے ان کی برین واشنگ کی جاتی تھی۔ انھیں آڈیو ویڈیو کلپس دکھائے جاتے تھے جس میں بار بار ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے حملوں کو ہائی لائٹ کیا جاتا اور وہ سمجھتا بھی تھا اور آجکل سوچتا بھی تھا کہ اگر ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر مسلمانوں نے حملہ کیا تھا تو کیا وجہ تھی کہ اس دن ورلڈ ٹریڈ سینٹر میں کام کرنے والے یہودی غیر حاضر تھے'' اس کے علاوہ بھی مختلف ویڈیو کلپس دکھائے جاتے جس میں مسلمانوں کو مختلف مقامات پر لڑتے دکھایا جاتا اسے یہ سب ٹھیک لگتا مگر اگر یہ سب ٹھیک بھی تھا تو اپنے وطن اور مذہب کے لیے لڑنا کوئی غلط بھی نہیں اور مسلمان اسلام کی سربلندی کے لیے جہاد کرتے ہیں اور یہ دہشت گردی کے زمرے میں قطعاً نہیں آتا۔ اور اس سب کے بعد سب سے آخر ایک ڈیڑھ سے دو گھنٹے کا لیکچر ہوتا تھا جس میں مسلمانوں کو عیاش، ظالم و جابر اور دہشت گرد ثابت کرنے میں سر دھڑ کی بازی لگا دی جاتی تھی۔ اس نے اپنے سامنے اپنے ہی بھائیوں کو گروہوں میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھا تھا جو کہ کٹر مسلمان تھے۔ وہ اس سلسلے میں بحث کرتے ان کی اس انداز میں برین واشنگ کی جاتی کہ وہ پھر اسی راستے پر چل پڑتے اور اگر کوئی بہت ہی راسخ العقیدہ ہوتا تو پھر اس

کا آخری حل ڈرگس کا استعمال کروا کر ان کی ذہنی صلاحیت کو سلا کر کیا جاتا تھا۔

☆......☆......☆

اس نے اب تک ان کی کسی بھی بات کا اقرار یا انکار نہیں کیا تھا جو اسے سکھایا گیا اس نے سیکھ لیا اور جو دکھایا گیا اس نے دیکھ لیا ہاں وہ ان کے خیالات سے متفق نہیں تھا مگر اس نے اس بات کو کسی سے ڈسکس بھی نہیں کیا تھا وہ خود کو نیوٹرل ظاہر کرتا تھا۔ اب اس نے جیسی کے ساتھ بھی رویہ بھی بہتر کر لیا تھا کیوں کہ انھیں شک نہ ہو سکے اس کے لیے بہت ضروری تھا۔ اور وہ تیار تھا سب کچھ کے حالات فیس کرنے کے لیے مگر یہ اس کے ذہن میں کلیئر تھا جب بھی اسے استعمال کیا گیا وہ مسلمانوں کو نقصان نہیں پہچائے گا بلکہ ان کو ایسا ناقابل تلافی کرے گا کہ یہ سب یاد رکھیں گے اور اسے کیا کرنے ہے یہ پلین اس کے ذہن میں تھا۔

اس دن ٹریننگ سینٹر میں جشن کا سا سماں تھا تمام ٹرینیز شراب پانی کی طرح پی رہے تھے اور کچھ ہی دیر میں اس جشن کی وجہ بھی سامنے آ گئی ان کے ساتھ ایک سترہ اٹھارہ سال کا لڑکا ہوتا تھا عمیر احسن اس نے ایک خودکش حملے میں ایک نمازیوں سے بھری مسجد کو تباہ کر دیا، ساتھ ہی وہ خود ہی فناہ ہو گیا اور اس دن جیسی بھی شراب کا گلاس ہاتھوں میں تھامے اس کے پاس چلی آئی۔

☆......☆......☆

''دیکھا کتنا بہادر تھا عمیر'' اس نے گلاس سے سیپ لیتے ہوئے کہا اور عریش نے سوچا بہادر یا بے وقوف جس نے اپنے ہی مذہب اور اپنے ہی قوم کے لوگوں کو عین عبادت کے درمیان ان اردینوں کے لیے مار دیا جو ہم مسلمانوں کو دہشت گرد ثابت کرتے ہیں اور خود ایسے کارنامے انجام دیتے ہیں مگر وہ بولا تو الفاظ چینج تھے۔''

☆......☆......☆

''ہاں بہادر اور کم عمر بھی''

''ہاں مجھے ایسے ہی بہادر لوگ اچھے لگتے ہیں'' وہ

دل یا دنیا

بجا ہے اس کا یہ کہنا
کہ مجھ کو آزماتی ہو!
بڑی خود ساختہ ہی اُلجھنیں
مجھ کو ستاتی ہو......
کہ جب میں آزماؤں گا......
تو مری آزمائش پر
کہو تم پورا اترو گی؟
یہاں پر میرا دل مجھ سے
لڑائی مول لیتا ہے......
اسے ملنے کی جلدی ہے
مجھے دنیا کی فکریں ہیں......
کہاں معلوم ہے مجھ کو
کہ آخر کون جیتے گا
میرا دل یا کہ یہ دنیا!

شاعرہ: شگفتہ شفیق

دلکشی سے مسکرائی عریش نے سوچا، ہاں تم میں خود میں تو بہادری کی شدید کمی ہے سو اس کام کے لیا بھی مسلم اور تم تو اس قدر ڈرپوک ہو کہ اگر تیس 30 یا چالیس 40 مسلمان ایک جگہ کھڑے ہو کر ''نعرۂ تکبیر''''اللہ اکبر'' کا نعرہ لگا دیں تو تمہاری پوری فوج کی پینٹیں گیلی ہو جائیں۔ مگر اس نے کچھ نہیں کہا، خاموشی سے سر ہلاتا رہا۔

☆......☆......☆

اور اس کے بعد تو یہ سلسلہ دراز ہی ہو گیا ہر دو چار دن بعد جشن اور ایک نئی موت جسے یہاں شہادت کہتے ہیں وہ اسے شہادت ماننے کو تیار ہی نہیں تھا معصوم نہتے لوگوں کو مارنا شہادت کے زمرے میں نہیں آتا ان لوگوں نے ان معصوم لوگوں کے ذہنوں میں جہاد اور شہادت جیسے وسیع مقاصد جذبوں کو بہت غلط انداز

میں اجگر کیا تھا اسے پتا تھا کہ بہت جلد اس کی باری آنے والی ہے اور وہ اس کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا پھر اس یا اشارہ مل گیا کہ کل اس کی باری ہے اسے ایک دن پہلے ہی اس کے بارے میں بریف کیا گیا تھا کہ دھماکہ اسے کرنا تھا خودکش اور وہ بھی ایک اسکول میں جس کے برابر ایک Hospatal تھا۔ اس کے ساتھ ایک بچے کو جانا تھا اسکول میں، بعد مین بچے کو اسکول سے نکل کر Hospatal میں داخل ہو جانا تھا جبکہ اسے وہی اسکول میں رکنا تھا اور پھر اسکول کے آپس کے تبادلے کے بعد دونوں کو ایک ساتھ دھماکہ کرنا تھا۔

☆......☆......☆

''مگر بچہ کیوں ساتھ جائیگا'' اس نے سوال کیا۔

''ڈفر! تم بچے کو اسکول میں ایڈمیشن کے لیے لے کر جاؤ گے'' جیسی نے جھنجھلا کر کہا۔

''اور پھر میرے اسکول میں رکنے کا کیا جواز ہے'' اگر رکنا ہی ہے تو بچہ رکے اس نے بڑی مفاہمت سے پوچھا

''ہاں ٹھیک ہے'' واقعی رکنا تو بچے کو چاہیے ٹھیک ہے بچہ اسکول میں رکے گا تم ہاسپٹل میں بلاسٹ کرو گے'' چیف نے جیسی کو آنکھ کے اشارے سے کول کیا۔

''ٹھیک ہے ریموٹ کنٹرول ریموٹ کنٹرول تمہارے پاس ہونگے وقت اور حالات کے مطابق بلاسٹ تمہیں خود کرنے ہیں'' چیف نے تحمل سے کہا۔

''ٹھیک ہے! میں تیار ہوں'' اس نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہوا۔

اور اس رات جیسی نے اسے اپنے قرب سے نوازنے کی کوشش کی مگر اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ''میں کل کے حملے کے بارے میں غور کرنا چاہتا ہوں'' اور جیسی ہنسی تھی وہ سب اس خوش فہمی کا شکار تھے کہ انھوں نے مسلمانوں کے خلاف سازش اور فلائی تیار کر لیا تھا مگر انھیں پتا نہیں تھا کہ وہ فدائی تو ہے مگر مسلمانوں کے خلاف نہیں خود ان کے خلاف......

رات وہ اور جیسی G-8 میں رکے تھے وہ اپنے پلان پر پوری سنجیدگی سے سوچ بچار کرنا چاہتا تھا اور اپنا پلان فل پروف رکھنا چاہتا تھا۔ آج جیسی اس پر بڑی وارے صدقے جا رہی تھی اس نے اپنے محبوبانہ انداز میں کہا۔

☆......☆......☆

''تم جس کام کے لیے جان دے رہے ہو، وہ بہت عظیم مقصد کیلئے۔'' جیسی نے اس کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا تھا۔

''تم مجھے یاد کرو گی؟'' اس نے نرمی سے جیسی کی بانہیں اپنے گلے سے نکالتے ہوئے پوچھا۔

''یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ پہلے میں تم سے محبت کرتی تھی مگر میں اب تم سے عشق کرتی ہوں'' وہ بڑے انداز میں بولی تو وہ بڑے عجیب انداز میں ہنسا۔

''تم لوگ اس کاز کے لیے کیم کیوں نہیں کرتے'' اس نے پوچھا

''تو اور کیا کرتے ہیں'' وہ ٹنک کر بولی۔

''میرا مطلب کاز کے لیے جان دینے سے'' وہ تحمل سے بولا۔

☆......☆......☆

''تمہارے بعد ہماری ہی باری ہے'' وہ بڑے انداز سے مسکرائی ''ہم لوگ بہت جلد جنت میں ملیں گے'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور عریش کا دل چاہا کہ وہ قہقہے لگائے جنت میں اور تم لوگ ...... اللہ کی ٹھکرائی ہوئی قوم تمنے ایک ملک بھی دھوکے سے حاصل کیا، ورنہ اللہ نے تمہیں اس لائق بھی نہیں سمجھا کہ صرف ایک ملک تمہیں دے دیتا۔

☆......☆......☆

''ہاں ضرور'' مگر وہ بولا تو بالکل الٹ بولا۔

اور پھر رات کو لیٹ کر اس نے سوچنا شروع کیا G-8 میں اسلحے اور ایمونیشن بڑی مقدار میں تھا اس کے علاوہ یہاں پر ٹرینرز بھی بڑی تعداد میں موجود ہوتے تھے۔ وہ تمام لڑکیاں جو مسلمز کو ورغلا کر لاتی

تھیں وہ ہوتی تھیں اور تمام مسلمز بھی تھے جو خود فدائی سمجھتے تھے اور ان کا آلہ کار تھے۔ اگر دونوں دھماکے یہاں G-8 میں ہو جاتے تو ان کا بڑا بھاری اور جانی نقصان اور مالی نقصان ہوتا اور اگر ایسا ہو جاتا ہے تو..... اس وقت اس کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی اور اسے واچ کرتے ہوئے ان لوگوں نے جیسی کو دیکھا "یہ ہنس کیوں رہا ہے؟ اس کے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔ جیسی جا کر پتا کرو" اور جیسی فوراً اس کے پاس گئی۔

☆......☆......☆

"ڈارلنگ کیا سوچ رہے ہو" وہ پیار لہجہ میں سمو کر بولی۔

"کچھ نہیں ڈیڈ کا تعلق پاکستان سے ہے وہ بچپن سے مجھے اپنے فیورٹ پوئٹ کی پوئٹری سنایا کرتے تھے جو کہ خاصی مشکل بھی مگر ڈیڈ نے اتنی زیادہ سنائی کہ مجھے رٹ گئی اور وہ پھر اس کی Meanang بھی بتاتے تھے میں وہ تمہیں سناتا ہوں تمہیں اردو تو آتی ہے ناں ام نے بتایا تھا" وہ اتنے سکون سے بات کر رہا تھا کہ جیسی، جیسی گھاگ بھی اس کے اندر اٹھتے طوفان کا اندازہ نہیں لگا سکی۔

"ہاں ہاں سناؤ مجھے اردو آتی ہے" وہ جوش سے بولی۔

"تو سنو

یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

"تو جسے شہادت مقصود ہو اور وہ اسے مل بھی رہی ہو تو اس سے زیادہ خوش قسمت کون ہو سکتا ہے" وہ آنکھیں بند کر کے جذب سے بولا۔

"اوہ! تو تم اس لیے اتنا خوش ہو" وہ ہنس کر بولی۔

"ہاں پھر کیا وجہ ہوگی" وہ عام سے لہجہ میں بولا۔

"ہاں واقعی اور کیا وجہ ہوگی" وہ مطمئن لہجہ میں بولی۔

☆......☆......☆

دوسرے دن وہ نارمل انداز میں صبح اٹھ کر نہایا دھویا۔ پھر اسے بومب والی جیکٹ پہنائی گئی۔ اس میں تین طاقتور بومب تھے۔ اسی طرح اس کے ساتھ جس بچے کو جانا تھا اس کی جیکٹ میں بھی دو بم تھے ان کو ایک مرتبہ پھر سے بریف کیا گیا۔ انھیں انکے تمام مسلمان ساتھیوں سے ملایا گیا۔ ان دونوں کی بہادری پر ایک سیر حاصل لیکچر دیا گیا اور اب وہ چلنے کے لیے تیار تھے اور عریش نے ایک نظر ہال پر ڈالی تمام مسلمہ ٹرینیز، لڑکیاں اور دیگر عملہ وہاں موجود تھا اور ان کے بالکل پیچھے گودام اسلحے، آتش گیر اور تابکار مواد بھرا ہوا تھا۔ اور بس اس نے اس بچے کا ہاتھ پکڑا اور زیر لب پہلا اور دوسرا کلمہ پڑھا اور ریموٹ کا بٹن پش کر دیا۔

لمحوں میں جوش سے بھرے ہوئے انسان چیتھڑوں میں بدل گئے اور دھماکوں کا ایک نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ملک کی ہائی کمان الرٹ ہو گئی مگر عریش انھیں جو جرک دے گیا تھا وہ ناقابل تلافی تھا جانی نقصان تو جو ہوا سو ہوا مگر مالی نقصان نے ان کو دیوانہ کر دیا۔

☆......☆......☆

اور اگلے لمحے پورے ملک کا الیکٹرونک میڈیا حرکت میں آ چکا تھا ہو کوئی دوسرے سے آگے تھا عریش کو دہشت گرد ثابت کرنے میں اور اس کے بعد اس ہونے والے نقصان کی تفصیل بھی بتائی جا رہی تھیں۔

☆......☆......☆

اور یہاں سے بہت دور امریکہ میں عریش کے والدین دکھ اور خوشی کی کیفیت سے مغلوب ٹی وی اسکرین کو دیکھ کر کبھی ہنستے اور کبھی روتے تھے اور بہنیں کبھی بھائی پر فخر کرتی تھیں کبھی روتی تھیں۔ اور اس کے ڈیڈ بھی زیر لب اور بھی با آواز بلند یہ شعر پڑھتے تھے۔

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی۔

☆......☆......☆

سرحد پار سے دوسری تصویر

گلا ٹمیکس

گل مینا خان

کینیا کے ایک خاندان کی جاں بخشی کی کتھائے خاص

اوبر نے سوپ میں چمچ چلا کر اپنی بیوی گوما کو دیکھا جو تیسری بار اُمید سے تھی۔ اُسے گوما اور اپنے دونوں بچوں سے بہت محبت تھی۔

یہ خاندان اور ان جیسے بے شمار افریقی خاندان کینیا کے



باسی جو چائے اور کافی کے باغات میں کام کرتے تھے۔ انہیں ملنے والی اُجرت دو وقت کے کھانے کے لیے ناکافی تھی اور اس پر طرہ یہ کہ وہ تمام نہ ختم ہونے والے سودی قرضوں میں جکڑے تھے جو انہیں بحالت مجبوری لینا پڑتا۔ یہاں تک کہ مجبور قبر میں اور نئی نسل قرض میں جکڑی جاتی۔

گوما نسبتاً ایک سگھڑ عورت تھی۔ اُس نے اپنے ایک کمرے کے گھر سے ملحقہ صحن میں بطخیں پال رکھی تھیں، ساتھ میں کھیرے اور گوگو بھی اُگائے تاکہ کچھ بچت ممکن ہو!

"میں بے چارہ کیا کروں؟ آخر کہاں جاؤں؟ کہاں سے تم لوگوں کی دیہاڑی بڑھاؤں۔ ہماری تو اپنی بچت کچھ زیادہ نہیں۔ بس آج کے بعد میں یہ بات نہ سنوں!"

ٹھیکیدار جوزی نے ہاتھ جھاڑ کے بات ختم کی۔

باغات کے اصل مالک تو کبھی کبھار آتے، مگر یہ ظالم مالکوں کا مالک بن بیٹھا تھا۔ اُس کا تازہ ترین غصہ سارن نامی مزدور پر تھا جو اپنی بیوی اور چار لڑکیوں سمیت چائے کے باغات میں کام کرتا، مگر خالی ہی پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہوتا۔

سارن کی چھ بیٹیوں کے بعد ایک بیٹا اُمید کی کرن تھا اُس خاندان کے لیے، مگر اب وہ بچہ قریب المرگ تھا۔ سارن اور اُس کی بیوی جس کا ہر طرح سے منت زاری کر کے تھک گئے تب تمام مزدوروں نے مل کر بات کرنے کی ٹھانی۔

جوزی کی کئی بیویاں آنجہانی ہو چکی تھیں۔ ساتھ کئی بچے بھی، تین بیٹے زندہ تھے جو جوزی کے لیے تقریباً ناکارہ تھے دو بیٹے تو تاڑی میں دھت رہتے اور چھوٹا بیٹا انگلینڈ میں زیرِ تعلیم تھا اور باپ سے اس طریقہ کاروبار پر نالاں بھی، جوزی دولت کے لیے ہر حربے پر یقین رکھتا تھا۔ اب وہ اپنی بے شمار دولت جو مزدوروں کی کمائی سے حاصل کی تھی کے ساتھ انہی مزدوروں کی بیویوں کے ساتھ عیش کرنے میں مست تھا۔

رسل پیشے کے اعتبار سے ایک اُستاد تھا، بیوی کے کینسر نے اُسے جوزی کے باپ سے قرض لے کر علاج کرانے پر مجبور کر دیا، مگر بیوی کو جانا تھا وہ چلی گئی اور رسل مکڑی کے اس جال میں اُلجھ کر رہ گیا۔ اوبر کے ذہن میں باپ کی خواہش یادداشت میں موجود تھی۔ وہ اپنے بیٹے کو پڑھا لکھا مہذب انسان بنانا چاہتا تھا۔

"اوبرا میرے بچے، جب یہ قرض ادا ہو جائے گا تو ہماری زمین بھی ہمیں واپس مل جائے گی ہم وہاں ایک اسکول اور فارم ہاؤس بنائیں گے۔ وہاں ہم جانور پالیں گے اور سبزیاں اُگائیں گے، تب باپ اوبر کا منہ چومتا اور کہتا بیٹے! ہم مل کر کام کریں گے مکئی اور کیلے کی میٹھی روٹی کے ساتھ بھنا گوشت، ارے بھئی میری دودھ والی کافی کہاں ہے؟"

تب اوبر کا خاندان اس بات پر کھلکھلا کے ہنس پڑتا!!

ایک مچھر اوبر کو ماضی سے حال میں لے آیا، وہ بھری سانس لے کر اُٹھ بیٹھا۔ گوما اور بچے سو رہے تھے وہ انہیں چاہنے کے باوجود اچھی خوراک نہ مہیا کر سکتا تھا۔ نہ وہ زیادہ بچوں کے حق میں تھا۔ پہلے پہل جب اُسے اپنے ساتھیوں سے اپنے خیالات شیئر کیے تو سب نے اُس کا مذاق اُڑایا کہ ابھی تک اُس میں تعلیم کے جراثیم موجود ہیں! اس علاقے میں کافی کی تاڑی عام بنائی اور پی جاتی تھی اوبر کو اس کام میں مہارت حاصل تھی جبھی جوزی اسے کسی قدر رعایت دیتا۔

"تمہیں ماں مریم کا واسطہ کچھ رقم دے دو میرا اکلوتا بیٹا مر جائے گا۔ میں بھی کبھی تمہاری خدمت گزار رہی ہوں۔ تم نے جو کہا میں نے کیا۔ تمہیں خدا کا واسطہ!" یہ رجسیکا تھی جس پر جوانی میں جوزی نے زبردستی نظرِ عنایت رکھی تھی۔ جوزی نے آنکھیں اُٹھا کے نزدیک کھڑے ملازم کو دیکھا تو اُس نے سارن کی بیوی کو گھسیٹ کر کمرے سے باہر کر دیا۔

سارن پہلو بدل بدل کر اپنی اکلوتی نرینہ اولاد کے غم میں بے قرار تھا۔ اُسے اپنے بیٹے کی چھوٹی چھوٹی توتلی باتیں، قدم قدم، چلنا گرنا اور اس کے مستقبل کے خواب جگا رہے تھے۔

"آہ.....!" سارن نے بند آنکھوں اور پپڑی جمے ہونٹوں والے نیم جان ننھے وجود پر نظر ڈالی۔

"میں کروں گا جو کر سکا میرے بیٹے!"

مٹھی بھر ڈالر تھام کے سارن جب کھڑکی سے کودا تو اُس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا، اچانک لوہے کے راڈ نے اُسے سر پر پڑتے ہی ہوش سے بیگانہ کر دیا۔

جوزی اپنے غصب کو دبائے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔

"میں سارن اور اُس کے پورے خاندان کو مزا چکھا دوں گا!! اور وہ بھی تمام مزدوروں کے سامنے تاکہ پھر کسی کو بغاوت کا خیال تک نہ آئے۔" جوزی نے جھاگ اُڑاتے ہوئے کہا۔

''اس طرح تو مزدور بھٹک جائیں گے یاد ہے! اُس دن کیسے یونین بنا کر آ گئے تھے سارن کے ساتھ۔ اگر ان کی سمجھ میں اتحاد کی طاقت آ گئی تو یہ کاروبار ٹھپ ہو جائے گا۔'' جوزی کے معاون لومڑی صفت آرو نے پتے کی بات کی۔ تو وہ مڑ کے اُسے غور سے دیکھنے لگا، پھر کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگا۔ ''واقعی...... تم نے ٹھیک کہا۔''

تب جوزی نے اس بے نقصان چوری سے نیا فائدہ اٹھانے کی پلاننگ کر لی۔

سارن کی بیوی سسک رہی تھی!! بیٹے کے ساتھ شوہر بھی ہاتھ سے جا رہا تھا مگر ایک صورت میں دونوں بچ سکتے ہیں!! جوزی نے گندی آنکھیں گھمائیں!

''کیسے جناب! مجھے بتایئے مجھے دونوں چاہئیں۔''

''تم نے بتایا تھا کہ تمہارا ایک بیٹا ہے، مطلب باقی سب لڑکیاں؟''

''جی ہاں!'' جسیکا نے اثبات میں سر ہلایا اور نہ سمجھی سے اُسے دیکھتی رہی۔

گلا کھنگارتے ہوئے جوزی نے عام سے لہجے میں کہا۔

''تم اپنی بڑی لڑکی یہاں چھوڑ جاؤ، مطلب گھر کا کام کاج کر دے گی اور اس کے بدلے تمہیں تمہارا شوہر بھی ملے گا اور میں تمہارے لڑکے کے علاج کے اخراجات بھی دوں گا۔'' یہ بات مکمل کر کے جوزی اُٹھ کھڑا ہوا۔

جسیکا گنگ رہ گئی اور ساکت سی کیفیت میں جانے کے لیے مڑی۔

''جناب حکم کریں تو جسیکا کو سارن کے پاس لے جاؤں اسے فیصلہ کرنے میں مدد ملے گی۔'' آرو کی بات پر مکروہ قہقہہ گونجا۔

اور ایسا ہی ہوا! جسیکا نے یہ بات ماننے کا فیصلہ کر لیا!

اُس رات نہ جانے کیا بات تھی اوبر کی آنکھ لگتی کھلتی رہی۔ اُس کی چھٹی حس اُسے کسی گڑبڑ کا احساس دلا رہی تھی، اپنا خاندان تو سامنے سو رہا تھا۔

''کہیں سارن کا بیٹا تو نہیں! نہیں خدا کرے ایسا نہ ہو۔ میں صبح کام شروع کرنے سے پہلے جوزی سے بات کرتا ہوں خاص شراب کی دعوت اُڑانے کا لالچ دے کر جس کو صرف میں تیار کر سکتا ہوں۔''

یہ سوچ کر وہ علی الصبح اُٹھ کے جوزی کے مکان کے دروازے پر تھا، جہاں سے جسیکا اور جوزی کی آواز آ رہی تھی، کچھ ہی دیر بعد اس نے جسیکا کو سرخ آنکھوں کے ساتھ نکلتے دیکھا۔

''کیا واقعی تم مجھے ''بلیک شیمپئن'' بنا کر دے سکتے ہو؟''

جوزی نے اوبر کی بات سُن کے خوشی سے آنے والی رات کا تصور کیا۔

''اور ہاں جسیکا کو لڑکے کے علاج کے لیے کچھ رقم دینا ہے تم اُسے بلا لاؤ، سارن اب کیسا ہے؟ آرو نے بتایا تھا وہ پہاڑی سے گر کر زخمی ہو گیا ہے!''

''سارن ٹھیک ہے میں جسیکا کو بلاتا ہوں۔'' اوبر نے جوزی کی مکاری پر کھولتے خون کو قابو کر کے جواب دیا۔

اوبر نے تازی تیار کی اور بوتلوں کو گاڑھے سیال مادے سے بھر کے شام سے ذرا پہلے جوزی کے حوالے رازداری سے کیں تو جوزی کھل اُٹھا......

اندھیرا ہونے کے بعد سارن کی بڑی لڑکی صوفی اور چھوٹی ایکی جوزی اور آرو کے ساتھ کمرے میں موجود تھیں، آنے والے لمحوں کا خوف ان کے چہروں سے عیاں تھا۔ تب جوزی نے ایک انداز دلبرانہ سے صوفی کو جام بنانے کا اشارہ کیا اور وہ خاموشی سے اُٹھ کر ان کے لیے جام تیار کرنے لگی۔

☆......☆

اگلے ہفتے جب جوزی اور آرو کی آخری رسومات ہو چکیں تو جوزی کے بیٹے نومیکل نے بتایا۔

''دونوں کی موت بلا نوشی اور زہریلی شراب سے ہوئی ہے، پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق'' اُس نے کندھے اُچکائے۔

''اب میں واپس جانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ میں یہ کام سائنسی اور انسانی بنیاد پر کرنا چاہتا ہوں!''

''کیا آپ میرا ساتھ دیں گے''

''ہم تمہارے ساتھ ہیں۔'' مزدور جوش سے چلائے۔

''مجھے یقین نہیں آتا ہم آزاد ہو گئے۔'' سارن نے اوبر سے کہا......!

شش...... اوبر نے خاموشی کا اشارہ کیا......!!

وہ سب واقعی آزاد ہو گئے تھے۔

☆☆......☆☆

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ ان ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ ان صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے منسلک ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات ٹوکن منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)...... مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)...... منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)...... اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' 110، آدم آرکیڈ، شہید ملت روڈ۔ کراچی

□ حنا۔ کراچی

o اسلام وعلیکم! بابا صاحب پہلے بھی آپ کو کئی خط لکھے لیکن جواب نہیں ملا۔ اب پلیز اس خط کا مجھے کہانیاں میں فوری جواب دے دیجیے گا۔ 19 سال شادی کو ہو گئے ہیں۔ ایک بیٹی 18 سال کی اور دو بیٹے 16 اور 12 سال کے ہیں۔ ایک بچے کا انتقال ہو گیا ہے۔ جب سے شادی ہوئی ہے سخت پریشان ہوں۔ پیسے پیسے کو ترس گئی ہوں۔ میں نے جس کام کی جب بھی کوشش کی وہ اُلٹا ہی ہو گیا۔ فائدے کے بجائے نقصان ہوا۔ سرمایہ بھی ڈوب گیا۔ میرے سسرال والے کہتے ہیں میں بہت گناہ گار ہوں جو نقصان ہو جاتا ہے۔ 19 سالوں میں شوہر کو کوئی جاب ڈھنگ کی نہ مل سکی۔ سب زیور بک گیا اور اب بیماریوں نے مجھے اور میرے شوہر اور بچوں کو پکڑ لیا ہے۔ مجھے اور میرے شوہر کو گردن اور کمر کے موہروں کی تکلیف ہو گئی ہے۔ میرا بایاں گردہ سکڑ گیا ہے۔ علاج چل رہا ہے مگر اب پیسوں کی کمی کی وجہ سے ہم علاج نہیں کر پا رہے۔ قدرتی آفات ہمارے ساتھ الگ ہیں۔ کبھی بچے کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے اور کبھی کسی کے چوٹ لگ جاتی ہے۔ ڈاکٹر کے پاس جانے کے پیسے نہیں ہوتے۔ سخت بے بسی کا احساس ہوتا ہے۔ اگر یہ بچے نہیں ہوتے تو بخدا میں خود کشی کر لیتی۔ میں نے اپنے شوہر کو بحرین بھی بھیجا تھا۔ اپنے تمام پیسے لگائے لیکن چھ مہینے میں واپس آ گئے۔ جب سے اب تک سخت بیمار اور کمزور ہو کر سیٹ نہیں ہو پائے۔ نہ نوکری ہے نہ صحت، میں گناہ گار ہوں تو میرا رب مجھے معاف کرے۔ کوئی آسان وظیفہ بتائیں کہ بیماریوں سے نجات مل جائے۔ کچھ حالات بہتر ہو جائیں اور ناگہانی مصیبتوں سے حفاظت ہو جائے۔

ابھی ابھی آپ کو خط لکھنے کی وجہ سے ہاتھ میں درد ہو رہا ہے۔ گردن کے درد کی وجہ سے اور شوہر بھی سو نہیں پا رہے۔ موہرے کے درد کی وجہ سے، بابا صاحب! جب میرا رشتہ ہو رہا تھا میں نے اپنا فیصلہ اللہ پر توکل کر کے چھوڑا تھا۔ لیکن شادی کے 19 سال میں میں بالکل کالی ہو گئی، کوئی خواہش پوری نہیں ہوئی۔ سسرال والے وہ خراب اور شرابی، اور ایک نمبر جھوٹے وہ تکلیفیں جو اٹھائی وہ الگ ہیں، پوری سسرال کی بلڈنگ صاف ستھری اور اچھی ہے میرا حصہ دیمک زدہ اور ٹوٹا پھوٹا ہے حالانکہ چھ سال جاپان میں رہ کر پورا گھر میرے شوہر نے بنوایا لیکن اب کوئی نہیں مانتا۔

کوئی آسان وظیفہ بتائیں۔ میں نے بہت سے مولویوں اور اللہ والوں سے معلوم کرایا، سب کہتے ہیں ستارے نہیں ملے مگر میرا قصور؟ میں نے تو اللہ پر چھوڑا تھا۔ بس اب برداشت نہیں ہوتا۔ رشتے دار بھی منہ موڑ رہے ہیں۔ ذلت، تندرستی، بیماری اور مفلسی ہے بس، اللہ کے واسطے جلدی جواب دیں کیونکہ MRI کرانے کے پیسے نہیں ہیں اور نہ علاج شروع کرانے کے۔ کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دیں کیونکہ لکھا نہیں جا رہا۔

☆ بیٹی حنا! یہ وہم دل میں مت پالو کہ تم گناہ گار ہو، اس لیے رزق میں تنگی ہے۔ لوگوں کا کام ہی دکھ دینا ہے یہ کبھی کسی کے کام نہیں آتے۔ جہاں خود نمائی ہو وہاں آگے بڑھ کر مدد کرتے ہیں۔ لیکن سب ایسے نہیں، دنیا میں بہت اچھے لوگ بھی ہیں اور میرے تمام بچے بچیاں بہت اچھے ہیں کوئی نہ کوئی تمہارے لیے فرشتہ بن کر ضرور آئے گا۔ تم دن میں ایک بار سورۃ واقعہ ضرور پڑھو۔ نماز پابندی سے ادا کرو۔ سب اچھا ہوگا۔

□ خالدہ۔ کراچی

o اسلام وعلیکم! بابا جی اللہ آپ کو صحت دے آپ سے کچھ مشورہ کرنا ہے، اس لیے زحمت دے رہی ہوں۔ دہلی کالونی سے بابا جی! میرے بڑے بیٹے مزمل کا **Inter Computer Science** مکمل ہو گیا ہے۔ وہ اس کے بعد **B.COM** اور **M.B.A** کرنا چاہتا ہے مگر وسائل کم ہیں۔ وہ ایک سال سے اسپتال میں نوکری کر رہا ہے مگر ہمیں گھر میں بہت کم دیتا ہے۔ اُسے ہمارا خیال نہیں ہے۔ یہ گورنمنٹ جاب کرنا چاہتا ہے اور اس کو پڑھانے کا بہت شوق ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے بابا جی! شانزہ فاطمہ فرسٹ ایئر پری میڈیکل میں ہے وہ ڈاکٹر بننا چاہتی ہے۔ مگر اسے پڑھنا بہت پڑتا ہے۔ بہت محنت کرتی ہے۔ اپنے خرچ کے لیے سلائی بھی کرتی ہے۔ سخت مزاج ہے۔ بہت غصہ کرتی ہے۔ وہ ڈاکٹر بننا چاہتی ہے اس کے لیے مجھے اپنا زیور بیچنا پڑے گا۔ بابا جی میرا چھوٹا بیٹا مدثر ½16 سال کا ہے۔ اس کا

پڑھائی میں بہت کم دل لگتا ہے۔ بہت ذہین ہے مگر لاپروا بہت ہے۔ ہر وقت موبائل استعمال کرتا ہے۔ وہ اسٹوڈنٹ ویزے پر امریکہ جانا چاہتا ہے کیا یہ ممکن ہے؟ برائے مہربانی اس کے لیے استخارہ کرکے بتادیں کہ اس کے لیے کیا بہتر ہے۔

☆بیٹی خالدہ! اپنے بچوں کو اپنے ساتھ ہی رکھو۔ تعلیم مکمل ہوجائے پھر نوکری کے لیے ضرور باہر نکلیں مگر ابھی نہیں۔ بیٹے کو نرمی و محبت سے سمجھاؤ کہ وہ تمہارے ساتھ گھر کی ذمہ داری سنبھالے۔ بچوں پر الحمد شریف اور چاروں قل پڑھ کر دن میں دو سے تین بار ضرور دم کرو۔ بعد نماز عشاء ایک تسبیح ضرور پڑھو الّٰلھمہ اجرنی فی مصیبتی "اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

☐ سلمٰی۔ مقام نامعلوم

○ السلام وعلیکم! محترم بابا جان! میں پہلی بار خط لکھ رہی ہوں۔ آپ سب کو بہت اچھی دعا پڑھنے کو دیتے ہیں اور سب کے مسائل حل کرتے ہیں۔ میرا ایک مسئلہ ہے میری نواسی کو شادی کے چار سال ہوئے ابھی تک اولاد نہیں ہوئی۔ سب ٹیسٹ کرائے، سب صحیح ہیں آپ اس کے لیے تعویذ اور دعا ضرور بھیجے گا۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔ نواسی کا نام سلمہ ہے۔

☆بیٹی سلمٰی! جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو تاکہ تفصیلی جواب دیا جاسکے۔

☐ سائرہ۔ مقام نامعلوم

○ میں پہلی مرتبہ شرکت کررہی ہوں۔ بہت تعریف سنی۔ بہت لوگوں کو کامیاب دیکھا۔ سوچا میں آزمالوں۔ آج کل دھوکے باز لوگ بہت زیادہ ہیں۔ کسی پر اعتبار کرنے کو دل نہیں کرتا مگر اللہ کے کلام میں برکت ہوتی ہے۔ اس لیے یہاں آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ اگر آپ کو ملا تو پلیز اسی ماہ شائع کردیں۔ پلیز! میرے بہت مسئلے ہیں مگر یہ اہم مسئلہ ہے میری عمر 30-29 سال ہے میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں میں محنت مشقت بہت کرتی ہوں۔ سسرال میں، میں نے سب کی عزت کی مگر کسی نے عزت نہیں دی سوائے شوہر کے۔ وہ اچھے ہیں مگر ان کا گھر میں کوئی حکم نہیں چلتا۔ ساس سسر سب دیورانیاں، جیٹھانیاں، دیور سب خائف ہیں میں نماز پڑھتی ہوں، قرآن پڑھتی ہوں۔ میرے شوہر بہت محنتی ہیں مگر جس کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں نظر وغیرہ لگ جاتی ہے۔ انہوں نے پراپرٹی ڈیلر کا کام شروع کیا ہے مگر گاہک نہیں ہیں۔ پلیز میری مدد کریں۔ کوئی ایسا وظیفہ دیں جو سارے مسئلے حل کردے نہیں تو تعویذ دیں۔ پلیز اپنی بیٹی کی طرح مدد کریں۔ میں ساری زندگی دعائیں دوں گی۔ ایک مسئلہ یہ ہے کہ میرے بال بہت چھوٹے ہیں میرا قد لمبا ہے۔ آپ نے ڈائجسٹ میں علاج بتایا ہے کیسے اور کیا کرنا ہے بتادیں۔ شکریہ

☆بیٹی سائرہ! نماز کی پابند ہو، بہت اچھی بات ہے۔ بعد نماز عشاء ایک بار سورۃ واقعہ پڑھو اور دعا کرو۔ کچھ نہ کچھ صدقہ خیرات ضرور نکالا کرو۔ جو شخص بھی رزق میں برکت چاہے وہ اللہ کی راہ میں ضرور دیا کرے۔ جہاں تک بالوں کا مسئلہ ہے تو بیٹی اس کے لیے تم بھی کہانیاں کے دفتر فون کرکے معلومات لے لو۔ کچھ تفصیل درکار ہوگی اس کے بعد تیل تیار کردوں گا۔ وظیفہ کی مدت ایک ماہ ہے۔

☐ عرشی جاوید۔ صادق آباد

○ بابا جی! میں بہت دکھی ہوکر آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ میں ایک طلاق یافتہ عورت ہوں۔ میری ایک بیٹی ہے جو اس وقت 7 سال کی ہے۔ میرے والد جب تک حیات رہے مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ جب میں واپس اپنے والدین کے پاس آئی تھی تب میری بیٹی صرف 2 ماہ کی تھی۔ دو سال قبل میرے والد کا انتقال ہوگیا۔ بس بابا جان! وہ دن ہے اور آج کا دن سکون جیسے زندگی سے اٹھ گیا ہے۔ میرے دونوں بڑے بھائی اور اُن کی بیویاں بہت کچھ کہے لگاتے ہیں۔ اُن کے بچے بھی میری بیٹی کو بہت مارتے ہیں۔ وہ بے چاری ہر وقت ڈری سہمی رہتی ہے۔ میں اور امی سوائے کڑھنے کے اور کچھ نہیں کرسکتے حالانکہ میں خود بھی اسکول میں پڑھاتی ہوں۔ ابو نے میرے نام سے ایک فلیٹ لیا تھا جو کرائے پر ہے اُس کا کرایہ بھی مجھے ملتا ہے یعنی بابا جان! میں صرف بھائیوں کے گھر میں رہتی ہوں اُن پر بوجھ نہیں پھر بھی وہ مجھے برداشت نہیں کرتے۔ ابھی تو امی ہیں،

اگر انہیں کچھ ہو گیا تو پھر یہ لوگ میرا کیا حشر کریں گے؟ بہت پریشان رہتی ہوں۔ اللہ کے واسطے کوئی حل بتائیے۔

☆ بیٹی عرشی! اگر تمہارے لیے یہ ممکن ہو تو کوئی چھوٹا سا فلیٹ یا پورشن لے کر علیحدہ ہو جاؤ۔ تمہارے گھر کا کرایہ ملتا رہے گا۔ تم سکون سے نوکری کرو اور فارغ وقت میں بچوں کو گھر پر پڑھایا کرو۔ اپنی والدہ کو اپنے ساتھ رکھو۔ بیٹی! ابتداء میں تمہیں شاید یہ سب کچھ بہت مشکل لگے مگر ہمت کر کے ایک بار قدم اٹھا لو۔ یہ تمہارے اور تمہاری بیٹی کے لیے بہت اچھا ہوگا۔ چلتے پھرتے سورۃ فاتحہ ضرور پڑھا کرو۔ بیٹی! دنیا میں کوئی کام بھی مشکل نہیں بس تھوڑی سی ہمت چاہیے۔ انشاء اللہ سارے معاملات طے پا ئیں گے۔ یاد رکھو! جو شخص خود اپنی مدد کرتا ہے اللہ بھی اُس کی مدد کرتا ہے اور کامیابی عطا ہوتی ہے۔

□ منور حسین۔ ریاض

o باباسائیں! میں آپ کا بہت معتقد ہوں۔ جب میں امریکا میں تھا' تب بھی اکثر آپ کو خط لکھتا تھا۔ 8 مہینے قبل میں کمپنی کی طرف سے ریاض آیا ہوں جو کہ میری بھی دیرینہ خواہش تھی۔ باباسائیں! یہاں آنے کے بعد سے حالات بہت ابتر ہیں۔ ریاض میں جو شخص کمپنی کا ہیڈ ہے وہ انڈین عیسائی ہے۔ جب سے اسے پتا چلا ہے کہ میں پاکستانی ہوں' وہ میرا دشمن بن گیا ہے۔ طرح طرح سے پریشان کرتا ہے۔ مجھے اس کمپنی میں جاب کرتے ہوئے 15 سال ہو رہے ہیں اور یہ سارا وقت بہت مطمئن اور اچھا گزارا۔ میں بھی بہت خوش تھا۔ اب اس مسئلے کو لے کر بہت پریشان ہوں۔ آپ میری بیوی کے پڑھنے کے لیے وظیفہ دیجیے۔

☆ بیٹے منور! اللہ پر بھروسا رکھو۔ پریشانیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔ اپنے دل میں کوئی منفی بات مت لاؤ۔ ابھی تمہیں نئی جگہ آئے زیادہ وقت نہیں گزرا۔ کچھ وقت اور گزرے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ نئی جگہ' نئے لوگ' وہ تمہارے لیے نئے ہیں اور تم اُن کے لیے نئے ہو۔ بس ہمت اور صبر سے حالات کا مقابلہ کرو۔ اللہ سب خیر کرے گا۔ بعد نماز فجر اور عشاء سورۃ النحل کی آیت نمبر 30، ایک تسبیح پڑھو یا بیوی پڑھے پھر دُعا کرے۔ مدت 41 دن ہے۔

□ نازش۔ ڈیرہ الہ یار خان

o باباجی! ہمارے شہر میں آپ کا رسالہ بہت مشکل سے ملتا ہے اس لیے چاہتے ہوئے بھی میں ہر ماہ رسالہ نہیں خرید پاتی۔ باباجی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے خاندان والے ہر وقت لڑتے ہی رہتے ہیں۔ کسی کو سکون نہیں۔ کبھی کوئی مسئلہ کھڑا کر دیتے ہیں' کبھی کوئی۔ ہم دادا کے گھر میں رہتے ہیں جہاں میرے دو چچا اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اور ایک غیر شادی شدہ پھوپی رہتی ہیں۔ بڑے بھی آپس میں لڑتے ہیں اور بچے بھی۔ باباجی! مجھے اپنے گھر کا ماحول بالکل پسند نہیں۔ پڑھائی پر بھی بہت برا اثر پڑتا ہے۔ باباجی! کوئی ایسا وظیفہ دیں جس کی برکت سے گھر میں امن و سکون پیدا ہو۔

☆ بیٹی نازش! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ تمہاری سوچ بہت مثبت ہے۔ اللہ کرے تمام مسلمان اس طرح سوچنے لگیں۔ انسان اگر صرف ایک بات طے کر لے کہ اپنے اندر تحمل پیدا کرنا ہے' دوسرے کی بات برداشت کے ساتھ سُننی ہے تو بہت سارے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ ہم لوگوں میں برداشت ہی ختم ہو گئی ہے اس لیے معاشرہ افراتفری کا شکار ہے۔ بہرحال بیٹی! تم نماز فجر اور عشاء کے بعد 3-3 بار سورۃ فتح پڑھو اور دُعا کرو۔ انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔ مدت 3 ماہ ہے۔

□ صائمہ خان۔ خیبر پختونخوا

o باباجی! اللہ کے بعد آپ ہمارا واحد سہارا ہیں۔ خدا کے لیے ہماری مدد کریں۔ ہم لوگ بہت پریشان ہیں۔ ہمارا جوان بھائی 4 سال پہلے ایکسیڈنٹ میں انتقال کر گیا۔ اُس وقت ہمارے والد حیات تھے۔ بھائی کے انتقال کے 3 ماہ بعد ابو بھی بیٹھے بٹھائے اچانک انتقال کر گئے۔ ہماری تو دنیا ہی لٹ گئی مگر باباجی! ہم ماں بیٹیوں نے یہ دکھ برداشت کیے لیکن اب جو مسئلہ ہے اُس نے ہم سب کو بہت پریشان کر دیا ہے۔ ہمارا چھوٹا بھائی نوکری کے سلسلے میں کراچی گیا اور وہاں جا کر اُس نے سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا ہے۔ باباجی! مہینوں

گھر نہیں آتا' رابطہ نہیں کرتا۔ ہم لوگ سوچ رہے تھے کہ وہ ڈھنگ سے کمانے لگے تو ہم بھی کراچی چلے جائیں گے۔ باباجی! آپ میری والدہ کو پڑھنے کو کچھ ایسا دیں کہ بھائی کو اپنی ذمے داریوں کا احساس ہو اور وہ درست راستے پر چلنا شروع کردے۔

☆بیٹی صائمہ! اللہ تمہارے بھائی کو عقلِ سلیم عطا فرمائے۔ بچے ذہنوں کو ماں باپ سے دور نہیں کرنا چاہیے۔ بہرحال جو ہونا تھا' وہ ہوگیا' اب والدہ سے کہو اُس کے حق میں دُعا کیا کریں۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد ایک ایک بار سورۃ یوسف پڑھیں اور دُعا کریں۔ مدت 2 ماہ ہے۔ وظیفہ مکمل ہونے پر مجھے مطلع کرو۔

□ عمران احمد۔ ڈھوک چراغ دین

o باباجی! میں عرصہ 12 سال سے گارمنٹ کا کام کررہا ہوں مگر اب کچھ عرصے سے کاروبار سے برکت بالکل ختم ہوگئی ہے۔ سارا سارا دن گزر جاتا ہے' کوئی گاہک نہیں آتا۔ مہنگائی کے اس دور میں بچوں کا بھی ساتھ ہے۔ مہینہ گزارنا بڑا مشکل ہوگیا ہے۔ بچوں کی فیس' اس کے علاوہ بجلی' پانی' گیس' راشن ان خرچوں نے تو میری کمر توڑ دی ہے۔ سارا مہینہ ٹینشن میں گزرتا ہے۔ باباجی! نوکری تو ہے نہیں کہ اگلے مہینے تنخواہ کے آسرے ہاتھ روک کر گزارہ کرلیں۔ بڑی پریشانی ہے' کوئی حل بتایئے۔ وظیفہ میری بیوی کرے گی۔

☆بیٹے عمران! رزق میں برکت کے لیے بعد نمازِ عشاء سورۃ واقعہ پڑھنا بہت مبارک ہے۔ اس کے علاوہ ہر جمعے کو بعد نمازِ جمعہ کچھ رقم ضرور خیرات کرو۔ کبھی کبھی حالات بہت مشکل ہوجاتے ہیں' ایسے میں صبر اور مستقل مزاجی سے معاملات کو سنبھالنا چاہیے۔ اللہ سے ضرور مدد مانگتے رہو' وہ ضرور اپنا کرم فرمائے گا۔

□ ثمینہ اشرف۔ جھنگ

o باباجی! میں آپ سے مستقل رابطے میں رہتی ہوں مگر کچھ حالات کی وجہ سے اس بار خط کالم میں شائع کروانا چاہتی ہوں۔ میں نے پچھلے خط میں بھی آپ کو لکھا تھا کہ میرے بیٹے بہو آپس میں بہت لڑتے ہیں' ہفتوں دونوں آپس میں بات نہیں کرتے۔ باباجی! اب تو حالات بہت سنگین ہوگئے ہیں۔ میرا بیٹا بہو دونوں ڈاکٹر ہیں اور ایک ہی اسپتال میں ہوتے ہیں۔ مجھے بہو بتارہی تھی کہ میرا بیٹا اب کسی نرس میں دلچسپی لینے لگا ہے' جس کی وجہ سے اُن میں جھگڑے بہت بڑھ گئے ہیں۔ تین بچے ہیں' وہ الگ سہمے سہمے رہتے ہیں۔ باباجی! قصور دونوں کا ہے مگر بہو کا زیادہ ہے۔ مرد تو اَنا پرست ہوتا ہے مگر عورت کو گھر اور بچوں کی خاطر جھکنا چاہیے' وہ یہ بات ماننے کو تیار نہیں۔ پڑھی لکھی ہے' خوش شکل ہے مگر اب تک اُس نے اپنے شوہر کو منانے کی کوشش نہیں کی۔ میرا بیٹا اگر ناراض ہوجائے اور بات چیت بند کردے تو وہ بھی اُس وقت تک بات نہیں کرتی جب تک بیٹا خود سے بات نہ کرے۔ بچے مجھے فون کرکے بتاتے ہیں پھر میں درمیان میں پڑ کر صلح صفائی کرواتی ہوں مگر باباجی! اس طرح سے کب تک چلے گا؟ میں کون سا ہمیشہ رہوں گی؟ پچھلے سال اسی موسم میں میری طبیعت خراب ہوگئی تھی اور میں 5 دن اسپتال میں رہی۔ جب گھر واپس آئی اور بچوں کو قسم دے کر حالات پوچھے تو پتا چلا' دونوں میاں بیوی ڈیڑھ مہینے سے بات نہیں کررہے' کمرے بھی الگ کرلیے ہیں۔ باباجی! آپ میرا دُکھ سمجھ سکتے ہیں۔ خدا کے لیے' ایسا وظیفہ دیں جس کی برکت سے دونوں کو عقل آجائے اور میرا بیٹا بیوی بچوں کے پاس لوٹ آئے۔

☆بیٹی ثمینہ! تمہارا خط پڑھ کر دُکھ ہوا۔ اتنی تفصیل سے شائع کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ بچوں کو اندازہ ہو کہ اُن کے آپس کے رویے کا بھی ماں باپ پر اثر پڑتا ہے۔ جن گھروں میں محبت اور خلوص ہو' ایسے بچوں کے والدین بھی مطمئن رہتے ہیں مگر جہاں یہ سب نہ ہو' وہاں صرف ایک کنبہ ہی نہیں بلکہ پورا خاندان متاثر ہوتا ہے۔ بچوں کو سوچنا چاہیے کہ اس بڑھاپے میں والدین کو اپنی ذات سے دُکھ نہ پہنچائیں اور جو بچے یہ بات سمجھتے ہیں وہ اپنے گھر بہت سنبھال کر چلاتے ہیں۔ یہ دُرست ہے کہ ہمارے معاشرے میں مرد اَنا پرست ہے مگر اسلامی معاشرے میں مرد اپنے کنبے کا سربراہ ہے' وہ محبت اور ایثار کی زندہ مثال ہے' صبر و برداشت کا نمونہ ہے۔ اپنے لیے تو سب جیتے ہیں' دوسروں کے لیے جینا اصل زندگی ہے۔ تمہاری صحت اچھی نہیں' اس لیے سہل وظیفہ دے رہا ہوں۔ پابندی کے ساتھ ایک ماہ کرو۔ انشاء اللہ ضرور کرم

ہوگا۔ بعد نمازِ ظہر اور عشاء 3-3 تسبیح یَاحَفِیظُ یَاحَافِظُ کی پڑھو اول و آخر دُرود شریف، پھر دُعا کرو۔ میری دُعا ہے کہ اللہ تمہیں اولاد کی خوشیاں دکھائے۔

☐ فاخرہ۔ بدین

○ بابا جی! میں بہت پریشان عورت ہوں۔ اللہ نے سب کچھ دیا ہے مگر پھر بھی کوئی سُکھ میسر نہیں۔ میری 5 لڑکیاں ہیں، سب شادی کے قابل ہیں مگر کسی کا رشتہ نہیں آتا۔ پڑھی لکھی ہیں، قبول صورت ہیں، پھر بھی کوئی وسیلہ نہیں بنتا۔ بابا جی! میری راتوں کی نیند حرام ہوگئی ہے۔ بچیوں کے والد تو ہیں نہیں اگر میں بھی نہیں رہی تو اُن کا کیا ہوگا؟ بس یہ سوچتی ہوں تو دل بند ہونے لگتا ہے۔ میں اردو لکھ نہیں سکتی، یہ خط کسی سے لکھوا رہی ہوں۔ آپ مجھے جلد از جلد جواب سے نوازیں، بہت مہربانی ہوگی۔

☆ بیٹی فاخرہ! اللہ تمہاری دُعا جلد از جلد قبول فرمائے اور اولاد کی بے شمار خوشیاں دکھائے۔ کبھی کبھی لگتا ہے جیسے زندگی رک گئی ہے۔ سارے کام رک گئے ہیں مگر اصل میں ایسا ہوتا نہیں ہے۔ زندگی نام ہی حرکت کا ہے، چلتے رہنے کا ہے اور جب تک انسان زندہ ہے، اس کے کام بھی ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ایک ماں ہونے کے ناتے تمہاری پریشانی بجا ہے مگر بیٹی! صرف ایک لمحے کے لیے سوچو تم بچیوں کی ماں ہونے کی وجہ سے پریشان ہو تو، وہ تو ستر ماؤں سے بھی زیادہ محبت کرتا ہے۔ وہ بچیوں کے لیے بہترین اسباب پیدا کرے گا اور تم خود دیکھو گی۔ بس اس پاک ذات پر مکمل بھروسا رکھو۔ مجھ سے تعویذ منگوا کر گھر میں رکھو۔ خوب صدقہ خیرات کیا کرو۔ مجھے حالات سے آگاہ رکھو۔

☐ شمع۔ لاہور

☆ بیٹی شمع! میں تمہیں پھر یہی کہوں گا کہ تعویذ کی برکت ہی سے یہ مسئلہ حل ہوگا۔ کلامِ الٰہی جب ہر وقت پاس ہوتا ہے اور زبان بھی ورد میں مصروف رہتی ہے تو بندے کے ناممکن کام بھی ہوجاتے ہیں لہٰذا اللہ پر مکمل بھروسا رکھو۔ تم جتنی دیر کرو گی، معاملات میں پیچیدگیاں بڑھتی جائیں گی۔

☐ صابرہ۔ کراچی

☆ بیٹی صابرہ! سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 25 ہر نماز کے بعد 33 بار پڑھو اور دُعا کرو۔ مسائل حل ہونے تک وظیفہ جاری رکھو۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔

سحر۔ کوٹری

☆ بیٹی سحر! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور وظیفہ مزید ایک ماہ کرو۔ انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔

☐ راحمہ۔ کوٹری

☆ تمہارا خط مکمل پھٹی ہوئی حالت میں ملا لہٰذا میں مسئلہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔ اگر گھر کے پتے پر جواب چاہتی ہو تو خط میں جوابی لفافے پر اپنا پتا صاف لکھ کر رکھو اور خط رجسٹرڈ پوسٹ کردو تاکہ مجھ تک ضرور پہنچ جائے۔

☐ فرح شاہ۔ دھابے جی

☆ بیٹی فرح! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ تم جس قدر جلد ممکن ہو، مجھ سے تعویذ منگوالو۔ تعویذ منگوانے کے لیے ضروری ہے کہ مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ تفصیلی خط اِرسال کرو۔

☐ علی بخش سومرو۔ دمام

○ بابا جی! میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ کی دُعاؤں کی بدولت میں یہاں پہنچ گیا۔ میری نوکری اچھی ہے۔ آپ کو خط لکھنے میں اس لیے دیر ہوئی کہ کام نیا تھا لہٰذا بالکل وقت نہیں مل رہا تھا۔ میں نیند بھی صرف 4 گھنٹے کی لیتا تھا مگر اب اللہ کا شکر ہے، پہلا ڈرافٹ گھر بھیجا تو امی نے کہا کہ سب سے پہلے اللہ کا شکر ادا کرو اور پھر بابا جی کو خط لکھو۔ بس بابا جی! اسی طرح دُعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ میں آپ کی کوئی خدمت کرسکا تو یہ میری خوش نصیبی ہوگی۔

☆ بیٹے علی! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلے فرمائے۔ اصل میں انسان جب درست سمت کوشش کرتا ہے تو ضرور کامیاب ہوجاتا ہے۔ تم نماز کی پابندی رکھنا اور بیٹے! والدین کی بہت خدمت کرنا۔ انہوں نے تمہاری پرورش بہت محنت سے کی ہے۔ انہیں شکایت کا موقع مت دینا۔ میری دُعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہیں۔

☐ حضرت بی بی۔ دریا خان

○ محترم باباجی! السلام علیکم! باباجی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری شادی کو دس سال ہوگئے ہیں اور میری صرف ایک بیٹی ہے۔ ڈاکٹروں سے چیک اپ کے بعد پتا چلا ہے کہ کچھ اندرونی مسائل کے باعث مزید بچے نہیں ہورہے۔ پلیز' باباجی! مجھے کوئی وظیفہ بتائیں تاکہ میری اولاد ہوسکے اور وہ بھی اولادِ نرینہ یعنی کہ بیٹا کیونکہ میرے شوہر پہلے سے شادی شدہ ہیں اور میرے لیے بہت سے مسئلے ہیں۔ پلیز' میرے اس خط کا جواب جلدازجلد دیں۔

☆بیٹی! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ اولاد کے لیے میں تعویذ دیتا ہوں' ہدیہ اور تفصیل جوابی لفافہ ارسال کرو تو بتائی جائے گی۔

☐ شاہانہ انور۔ شاہ کوٹ

☆بیٹی شاہانہ! اللہ تمہیں عقلِ سلیم عطا فرمائے۔ اپنے والدین پر بھروسا رکھو' وہ تمہارے لیے اچھا ہی سوچتے ہیں۔ خود جو فیصلہ کروگی' اُس میں دکھ اٹھاؤ گی۔ یاد رکھو' جو شخص تمہیں تمہارے والدین سے متنفر کرسکتا ہے' وہ تم سے کبھی بھی مخلص نہیں ہوگا۔ اب بھی وقت ہے' اپنے بڑھتے قدم روک لو ورنہ بہت پچھتاؤ گی۔

☐ ثریا۔ راولپنڈی

☆بیٹی ثریا! اللہ تمہاری حاجات قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ بیٹی! تم جو کام بھی کرو' مستقل مزاجی کے ساتھ کرو۔ نوکری کرنے کے میں دس طرح کی مشکلات ہوتی ہیں اور انسان کو ان مشکلات کو برداشت کرنا چاہیے۔ بہرحال تم نمازِ عشاء کے بعد ایک بار سورۃ نور پڑھو اور دُعا کرو۔ بالوں کے لیے مجھ سے دوا منگوالو۔ انشاء اللہ' ضرور افاقہ ہوگا۔

☐ نسیمہ۔ کھاریاں

○ باباجان! میں بہت عرصے سے آپ کا کالم پڑھ رہی ہوں مگر خط لکھنے کی ہمت پہلی دفعہ کررہی ہوں۔ میری شادی 5 سال پہلے ابو کے جاننے والوں میں ہوئی۔ بظاہر سب کچھ ٹھیک تھا' اس لیے میری رضامندی جانے بغیر یہ شادی طے کردی گئی۔ میں نے بھی ماں باپ کے فیصلے کے آگے سر جھکا دیا۔ باباجان! شادی کے چند ماہ بعد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ میرے شوہر ذہنی بیمار ہیں۔ وہ اپنے مزاج کے خلاف کچھ برداشت نہیں کرتے۔ جو چیز آج صحیح ہے' اُس کو کل غلط کہیں گے۔ پل میں تولہ پل میں ماشہ۔ غصے کی حالت میں زبان بھی بہت گندی استعمال کرتے ہیں۔ میرے گھر والوں کو بالکل برداشت نہیں کرتے۔ مجھ پر ہاتھ بھی اٹھاتے ہیں۔ باباجان! اب میں تھک گئی ہوں۔ ایک منٹ بھی اب اس جہنم میں گزارہ ممکن نہیں۔ آپ مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس کی برکت سے میری جان اس عذاب سے چھوٹ جائے۔ ابھی میرے والد حیات ہیں۔ اگر انہیں کچھ ہوگیا تو میں لاوارث ہوجاؤں گی۔ میں جانتی ہوں کہ میرے بیٹے کو وہ مجھ سے چھین لیں گے۔ میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔ بس میری جان چھڑادیں۔

☆بیٹی نسیمہ! تمہارا خط پڑھ کر بہت دُکھ ہوا۔ تمہارا فیصلہ درست ہے۔ اپنے والد کو ساری صورتِ حال بتادو پھر جو وہ کہیں' ویسے ہی کرو۔ اولاد تمہاری ہے' تمہاری ہی رہے گی۔ نمازِ عشاء کے بعد ایک بار سورۃ یٰسین پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔ بس بیٹی! ہمت رکھنا۔ اللہ سب بہتر کرے گا۔

☐ روبی نور۔ کینیڈا

○ باباجی! میں نے آپ کو پہلے بھی خط لکھا تھا مگر جواب نہیں ملا۔ ہمارا مسئلہ بہت شدید ہے۔ آمدنی بہت کم ہے۔ 4 چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ میرے شوہر سخت محنت کرتے ہیں مگر پھر بھی روزی میں اضافہ نہیں ہوتا۔ باباجی! میں پڑھی لکھی نہیں ہوں' اس لیے نوکری بھی نہیں کرسکتی۔ پاکستان بھی سالوں گزر جاتے ہیں' نہیں آپاتے۔ رشتے دار الگ ناراض رہتے ہیں۔ انہیں ہمارے مسائل کا اندازہ ہی نہیں۔ روزی میں برکت کے لیے وظیفہ دیں' وظیفہ میں خود کروں گی۔

☆بیٹی روبی! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ بیٹی! نماز کی پابندی رکھو اور بکثرت سورۃ الناس کا ورد کیا کرو۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد سورۃ البقرۃ آیات 24-23' 101-101 بار پڑھو، اول و آخر درود شریف 3-3 بار پھر دُعا کرو۔ مدت 2 ماہ ہے۔

☐ امینہ منیر۔ حیدر آباد

☆ بیٹی امینہ! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی کے ساتھ ورد جاری رکھو۔ بیٹی! میں بار بار ایک ہی بات کہتا ہوں کہ جو لوگ اپنے معاملات اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتے ہیں اور مکمل یقین اور اعتقاد کے ساتھ دُعا کرتے ہیں' وہ ضرور کامیاب ہو جاتے ہیں۔ خوش حالی میں اللہ تعالیٰ ربّ العزت کا شکر ادا کرنا اور مشکل میں بھی صابر و شاکر رہنا ہی اصل مومن کی پہچان ہے۔ تم مجھے ایک ماہ بعد حالات سے مطلع کرو۔

□ راشد علی۔ بھکر

o محترم جناب باباجی! السلامُ علیکم کے بعد عرض ہے کہ میں نے پہلے بھی ایک عرض نامہ بھیجا تھا لیکن شاید وہ آپ کو موصول نہیں ہو سکا۔ باباجی! مسئلہ یہ ہے کہ میری والدہ محترمہ جن کی عمر تقریباً 58 برس ہے (اللہ تعالیٰ اُن کی عُمر دَراز کرے!)' اُن کی دائیں ٹانگ اور دائیں بازو میں ہلکا ہلکا درد رہتا ہے۔ یہ صورتِ حال عرصہ بیس سال سے ہے اور ساتھ ہی کمر میں بھی درد رہتا ہے۔ اِس کے علاوہ کافی عرصے سے بائیں نتھنے سے نکسیر پھوٹتی رہتی ہے اور اِس کے علاوہ اکثر اوقات دَم گھٹ سا جاتا ہے اور لمبے گہرے سانس لیتی ہیں اور سر میں بھی کھنچاؤ اور درد سا رہتا ہے۔ کئی ڈاکٹروں سے مشورہ کیا' سب کا یہی کہنا ہے کہ یہ مجموعی طور پر جسمانی کمزوری ہے اور بس۔ باباجی! ہم غریب لوگ ہیں' جو کچھ بن پڑتا ہے' اُن کے لیے اچھی غذا وغیرہ لیتے ہیں لیکن مسئلہ حل نہیں ہو رہا، اِس لیے آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں' یقیناً اللہ کے کلام میں بہت شِفا ہے اور آپ کی دُعاؤں سے مسئلہ حل ہو جائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ! باباجی! میری ایک نوجوان بہن اور جوان ماموں کے بعد دیگرے وفات پا گئے ہیں۔ والدہ کو اُن کا بھی بہت صدمہ رہتا ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ سے دُعا کریں اور ہمیں کوئی ایسا عمل بتائیں جس سے میری والدہ صحت یاب ہو جائیں۔ ہم تاعمر آپ کو دُعائیں دیں گے۔

☆ بیٹے راشد! اللہ تمہاری والدہ کو مکمل صحت عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ ہر نماز کے بعد اَلحمد شریف اور چاروں قُل پڑھ کر والدہ پر ضرور دَم کیا کرو۔ اللہ سے دُعا کرو کہ جو اُن کے حق میں بہتر ہو وہ عطا فرمائے۔ حسبِ استطاعت صدقہ خیرات بھی دیا کرو۔ انشاء اللہ مکمل صحت عطا ہو گی۔

□ ناظم الدین۔ پشاور

o السلامُ علیکم! میرا نام ناظم الدین ہے' عمر 30 سال ہے۔ آپ کو پہلے بھی ایک خط لکھا تھا مسئلے کے لیے' وہ آپ نے اگست کے شمارے میں شائع کیا ہے۔ میں نے مسئلے کا لکھا تھا کہ میری بیوی سے انجانے میں زنا ہوا ہے' وہ اس پر بہت نادم ہے اور دوسرا میری بیوی پر الزام لگا ہے کہ اس کے اپنے بھانجے سے ناجائز تعلقات ہیں۔ باباجی! میں اپنی بیوی کو جانتا ہوں' وہ اپنے بھانجے کو بیٹے کی طرح چاہتی ہے۔ بھانجے کی عمر 24 سال ہے۔ میری بیوی کی عمر 26 سال ہے۔ آپ نے کوئی وظیفہ نہیں بتایا جس سے میری بیوی کو اور مجھے سکون مل جائے۔ باباجی! آپ کو علم ہے کہ خراب کردار کی عورت کبھی بھی اپنے شوہر کو زنا کے بارے میں نہیں بتاتی مگر میری بیوی نے مجھے یہ بات بتائی کہ میں بہت نادم ہوں۔ مجھے کوئی وظیفہ بتا دیں جس سے دل کو سکون مل جائے۔ باباجی! میری بیوی میں ایک عادت لڑکوں والی ہے' جہاں پر لڑکوں کی محفل ہو گی' وہ عورتوں والی محفل چھوڑ کر لڑکوں والی محفل میں جا بیٹھے گی۔ میں نے کئی بار منع کیا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ مجھے لمبے اور خوب صورت لوگ پسند ہیں مگر میں گندے کردار کی نہیں ہوں۔ باباجی! میری بیوی سے زنا رمضان المبارک کے مہینے میں ہوا تھا۔ میری بیوی ناپاکی کی حالت میں تھی۔ باباجی! آپ بتلائیں کہ میری بیوی کے لیے توبہ کے دروازے کھلے ہیں یا نہیں؟ اور دوسرا ہمارے چار بچے ہیں' تین لڑکیاں' ایک لڑکا ہے۔ میں اُسے معاف کر دوں یا طلاق دے دوں؟ میری رہنمائی ضرور فرمائیں۔ ہمارا مسئلہ ضرور شائع کرنا۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ میری بیوی ہر ایک سے محبت سے پیش آتی ہے جس کی وجہ سے میری بیوی پر الزامات لگے ہیں۔ باباجی! آپ بتائیں کہ عورتوں کو مردوں سے فاصلہ رکھنا چاہیے یا نہیں؟ میں آپ کے جواب کا منتظر رہوں گا۔

☆ بیٹے ناظم! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔

بیٹے! تمہارے خط کی روشنی میں تمہیں جواب دے رہا ہوں۔ بیٹے! اس عورت کو جس قدر جلد ممکن ہو اپنی زندگی سے نکال دو یہ عورت تمہارے لیے نقصان دہ ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو ایسی عورت تمہارے بچوں کی کیسی تربیت کرے گی؟ ایک نسل تباہ ہوجائے گی لہٰذا اب مزید دیر مت کرو اور فیصلہ کردو۔ کچھ غلطیاں ایسی ہیں جن کی معافی کی گنجائش نہیں ہوتی۔

□ محمود تنولی۔ سرگودھا

○ باباجی! اللہ آپ کو مزید توفیق دے اور آپ اسی طرح لوگوں کی مدد کرتے رہیں۔ بہت کوشش کے باوجود بھی میری روزی وافر نہیں۔ ذمے داریاں بہت ہیں مگر وسائل نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ہم دونوں میاں بیوی بہت پابندی سے نماز ادا کرتے ہیں اور ان حالات میں بھی جہاں تک ممکن ہو اللہ کی راہ میں دیتے ہیں۔ بچے سب چھوٹے ہیں' اُن کی ضروریات ہی پوری نہیں ہو پاتیں۔ والدین بوڑھے ہیں' بہن بھائی کی بھی ذمے داری بڑا ہونے کے ناتے مجھ ہی پر ہے۔ باباجی! رزق میں برکت اور بیماریوں سے نجات کے لیے کوئی آزمودہ وظیفہ بتایئے۔ وظیفہ میری بیوی اور بہن کریں گی۔

☆ بیٹے محمود! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ نماز کے پابند ہو بہت اچھی بات ہے۔ مشکلات پر صبر کرنا اور آسودہ حالات میں اللہ کا شکر گزار رہنا ہی اچھے مومن کی پہچان ہے۔ وظیفہ دے رہا ہوں' پابندی کے ساتھ کرو۔ انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔ ہر نماز کے بعد 99 بار الحمد شریف پڑھو اور دُعا کرو اول و آخر دُرود شریف لازمی ہے۔ وظیفہ نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ کرو۔ مدت 3 ماہ ہے۔ انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔

□ ثریا۔ رانی پور

☆ بیٹی ثریا! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ حالات تمہارے حق میں نظر نہیں آرہے۔ ایسے میں' میں تعویذ کا ہی مشورہ دیتا ہوں کیونکہ وقت بھی کم ہے لہٰذا مجھے اپنا پتا ارسال کرو تاکہ تعویذ بھیجا جاسکے۔

□ حمیرا پروین۔ بہاول پور

○ محترم باباجی! السلام علیکم! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ میں بی ایس سی کی طالبہ ہوں اور میں آگے پڑھنا چاہتی ہوں۔ میرے گھر والوں نے میری اور میرے بھائی کی ایک ہی گھر میں منگنی کردی ہے۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا میں آگے پڑھ سکوں گی یا نہیں؟ کیونکہ اس سال میں نے بی ایس سی کا امتحان دینا ہے۔ مگر میں نے داخلہ لے کر چھوڑ دیا ہے کیونکہ میرے والد صاحب بیمار تھے اس لیے باباجان! میں گھر میں رہتی ہوں۔ میں دوبارہ بی ایس سی کا امتحان دینا چاہتی ہوں اور میں یہ چاہتی ہوں کہ میرے 600 سے اوپر نمبر آئیں۔ باباجی! آپ میرے لیے دُعا کریں اور خصوصی دُعا بھی کرائیں۔ میں بہت زیادہ مشکلات میں گھری ہوئی ہوں۔ آپ کا رسالہ پڑھتے ہوئے 6 سال ہوگئے ہیں۔ آپ لوگوں کے مسائل حل کرتے ہیں اور دُعائیں لیتے ہیں۔ میں اپنی دُکھی کہانی آپ کو پھر کبھی سناؤں گی خط طویل ہوجائے گا۔ مجھے کوئی اچھا سا اور آسان سا وظیفہ یا دُعا بتائیں۔ میں آسانی سے کرسکوں۔ آپ نے میرے لیے خصوصی دُعا کرنی ہے اور آپ نے مجھے بتانا ہے کہ کیا میری منگنی صحیح جگہ ہوئی ہے یا نہیں؟ اس مسئلے کا حل آپ نے ماہ نومبر میں شائع کرنا ہے۔ باباجی! آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔

☆ بیٹی حمیرا! اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ بے فکر رہو نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ جس قدر ممکن ہو یَا رحمٰنُ کا ورد کیا کرو۔ انشاء اللہ سب خیر ہوگی۔ مدت 41 دن ہے۔

□ فہیم انصاری۔ سیالکوٹ

☆ بیٹے فہیم! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بیٹے! سب سے پہلے تو تم سب افراد ہر وقت باوضو رہو۔ جس قدر ممکن ہو یَا رحمٰن کا ورد کیا کرو۔ حسب استطاعت صدقہ ضرور نکالو۔ نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۂ رحمٰن پڑھو اور پانی پر دَم کرو اور یہ پانی گھر کے تمام افراد دو دو گھونٹ پئیں۔ انشاء اللہ جلد مثبت تبدیلی دیکھو گے۔

□ شہزادی نور۔ کوٹ ادو

○ باباجی! میں اپنے ایک مسئلے کو لے کر بہت پریشان ہوں۔ اب سے کچھ ماہ پہلے تک میں اپنی پڑھائی پر بھرپور توجہ دے رہی تھی ویسے میں پڑھائی میں ہمیشہ سے اچھی

ہوں مگر کچھ ماہ سے محسوس کر رہی ہوں کہ میری دلچسپی پڑھائی میں بہت کم ہوگئی ہے۔ جب پڑھنے بیٹھتی ہوں تو نیند آنے لگتی ہے۔ جو کچھ یاد کرتی ہوں وہ دماغ میں نہیں رہتا۔ میں اپنی اس نیند سے بہت پریشان ہوں۔ اسی پریشانی کی وجہ سے نہ تو نیند آتی ہے اور نہ ہی بھوک لگتی ہے۔ باباجی! مجھے کوئی اچھا سا وظیفہ دیں جس کی برکت سے میں پھر سے پہلے جیسی ہو جاؤں کیونکہ جو صورت حال ہے اُس میں تو میں امتحان میں بری طرح فیل ہو جاؤں گی۔ باباجی! پلیز، مجھے اس شرمندگی سے بچالیں۔

☆بیٹی شہزادی! اللہ تمہیں ہر امتحان میں کامیابی عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بیٹی! تم پہلے یہ معلوم کرو کہ تمہاری ذہنی حالت ایسی کیوں ہے؟ یقیناً کوئی پریشانی ایسی ہے جس کی وجہ سے تمہارا دھیان پڑھائی کی طرف سے ہٹ رہا ہے۔ پہلے اس پریشانی کا حل نکالو ذہن اور دل پر جو بوجھ ہے وہ اپنی بہن یا والدہ سے کہہ کر ہلکا کرو۔ انشاء اللہ، مسئلہ حل ہو جائے گا۔ تم نماز پابندی سے ادا کیا کرو اور بکثرت یا سَمِیعُ، یا حَفِیظُ کا ورد کرو۔ انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔

□ فرحانہ۔ گلشن اقبال۔ کراچی

☆بیٹی فرحانہ! تم پڑھی لکھی، سمجھدار لڑکی ہو پھر بھی اِن باتوں پر یقین رکھتی ہو؟ ہاں، استخارہ ضرور کروانا چاہیے۔ بہرحال ایسا نہیں ہوا۔ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جس کا وقت جب پورا ہو جائے، وہ اللہ کے پاس چلا جاتا ہے۔ بعض اوقات انسان مشکلات میں گھر جاتا ہے اور ایسے میں وہ غلط فیصلے بھی کر جاتا ہے۔ بیٹی! تم نماز کی پابندی رکھو۔ نماز فجر اور عشاء کے بعد 7-7 تسبیح یا وَدُودُ کی پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ وفا۔ ہزارہ

☆بیٹی وفا! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور بکثرت سورۃ الفتح کی آیت نمبر 1 اور 2 پڑھا کرو۔ اول و آخر دُرود شریف پھر دُعا کرو۔ انشاء اللہ، مسائل ضرور حل ہوں گے، بس اللہ کی ذات پر مکمل بھروسا ہونا چاہیے۔

سخن آباد

جی چاہتا ہے

زندگی میں
ہمیں جو بھی پیارا لگتا ہے
کچھ نہ کچھ......
اس کے نام کرنے کو جی چاہتا ہے
چاہے وہ سوچیں ہی کیوں نہ ہوں
سوچوں کی وسعتوں کا اختتام بھی
وہی شخص ہوتا ہے
اور شاید
آغاز بھی!

ایم اشفاق بٹ۔ لالہ موسیٰ

رقاصہ

کس قدر حسین تھی وہ
جو نظر بھی پڑے پتھرا جائے
جانے کیا کر رہی تھی
خاموش بیٹھے سر جھکائے
دیکھ رہے تھے سب اس کو
حاضرین محفل ساکت و بے تاب
اچانک اٹھ کھڑی ہوئی وہ
اور سازندوں نے ساز چھیڑا
اپنی مجبوریاں پیروں میں باندھے
بے دھڑک ناچنے لگی وہ

عنبرین نعیم۔ کراچی

یاد ہے تم کو......

تیری آنکھوں کے دریا کا اترنا بھی ضروری تھا
محبت بھی ضروری تھی بچھڑنا بھی ضروری تھا
ضروری تھا کہ ہم دونوں طواف آرزو کرتے
مگر پھر آرزوؤں کا بکھرنا بھی ضروری تھا
بتاؤ یاد ہے تم کو وہ جب دل کو چرایا تھا
چرائی چیز کو تم نے خدا کا گھر بنایا تھا
وہ جب کہتے تھے میرا نام تم تسبیح میں پڑھتے ہو
محبت کی نمازوں کو قضاء کرنے سے ڈرتے ہو
مگر اب یاد آتا ہے وہ باتیں تھیں صرف باتیں
کہیں باتوں ہی باتوں میں مکرنا بھی ضروری تھا
وہی ہیں صورتیں اپنی وہی میں ہوں وہی تم ہو
مگر کھویا ہوا ہوں میں گم صم بھی تم ہی ہو

شاہد رفیق سہو۔ کبیر والا

عید کا تحفہ

اے جاناں سوچا اس عید کے موقعے پر
کوئی ایسا تحفہ تمہاری نذر کروں
جسے تم عمر بھر یاد رکھو
چاہتے ہوئے بھی نہ بھلا سکو
پھر ایک لمحے کی سوچ نے میرے ہاتھ بلند کیے
کچھ لفظوں کے پھول دعاؤں کی مانند
جو تمہاری زندگی میں خوشیوں کے بہار بھر دیں
کبھی کوئی دکھ اور غم تمہیں چھو نہ سکے
تمہاری زندگی پھولوں کی طرح مسکراتی رہے
یہ دعاؤں کا تحفہ، تمہارا عید کا تحفہ ہے

مور شاہد حسین۔ قمر، شہداد کوٹ

رحم کر میرے مولا

ہر سو بکھری ہوئی لاشیں، روتے ہوئے بچے

غموں کی چھاؤں میں، خوشیوں کو ترستے
بنے گا کیا؟ میرے خدایا!
گلشن رہے، نہ مکاں رہے
بوڑھے بچے جواں، سبھی پریشان ہیں
کھانے کو کچھ نہیں بچا، سب ہی فنا ہیں
سن میری فریاد!
سن میرے اللہ!
بے گھروں کو گھر دے دے
اجڑے کھیتوں کو ہرا بھرا کر دے
اپنی رحمت ہم پر نچھاور کر دے
بچھڑے ہوؤں کو ملا دے
شاہد محمود مغل۔ ماڑی ٹھاکراں کاموکی

غزل

رت جگوں کے حوالے کر کے مجھے
دور بہت دور چلا گیا کوئی
ہر سانس اٹھتی ہے مہک اس کی
خوشبو جیسے روح میں سما گیا کوئی
اثر پذیر نہ ہوا مداوا د مرہم کوئی
دے گیا کچھ ایسا درد دوا کوئی
نہ پوچھا پھر کسی نے سبب اشک رواں
تیرے بعد پھر تجھ سے نہ ملا کوئی
سر شام ستانے لگے یاد کس کی
کوچہ جاں سے ابھرنے لگے صدا کوئی
ڈاکٹر ایچ صغیر احمد۔ سوہاوا، بڑا گواہ

میرے ماہ جبیر کے نام

ہر وقت تیری یاد آتی ہے زندگی بھر نہ بھول پاؤں گی؟
خوشبو اور ادائیں سانسوں اور آنکھوں میں بجی انہیں میں تو چھوڑ گیا
ہم نے تو سنبھال کر تجھے موم کی گڑیا کی مانند رکھا
ایسی کیا کوتاہی ہوئی ہے جو ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ گیا

روٹھنا تیرا مسکرانا تیرا ہونٹ نکال کر رونا تیرا
ایسی ادائیں چھوڑ کر تو، ہمیشہ کے لیے مٹی میں ہم کو رول
ہم تو پل پل کرتے ہیں یاد اور مر مر کر جیتے ہیں
تو مر کر ہمیں، مر مر کر جینے کے لیے چھوڑ گیا
کروٹیں بدل بدل کر سونا بن ستائے ہاتھوں
پاؤں سے کھیلنا تیرا
بہت یاد آتی ہیں ادائیں تیری تو، چھوڑ گیا
لبنیٰ۔ مدینہ ٹاؤن، فیصل آباد

غزل

محبتوں پہ اختیار تھا مگر حوصلہ نہ تھا
اب اس کا غم کیا کریں جو ملا نہ تھا
پھولوں کے ساتھ رہے کانٹے عمر بھر
وہ نصیب تھے کسی اور کے اُن کو پتا نہ تھا
وہ شخص کھیلتا رہا جذبات سے تیرے
پر تم سمجھ نہ سکے وہ تیرا نہ تھا
بارش یہ کیسے ہوئی، آنکھوں میں بس گئی
برسوں کے بعد رویا وہ، جو رویا نہ تھا
جو اس نے راہ بدلی، ہم بھی بدل جائیں گے
سوچا تھا اُس نے ایسا، پر ایسا ہوا نہ تھا
شائستہ جمال۔ کراچی

غزل

چاند ڈوب گیا دل میرا جلتا رہا
اس شکستہ دل میں پھر غم پلتا رہا
میں نے دیکھا نظر بھر کے اُسے
مجھے دیکھ کر وہ پہلو بدلتا رہا
شرمندہ تعبیر ہو گئے سبھی خواب میرے
ہر شخص اپنے سائے کے ساتھ چلتا رہا
وہ ساتھ نہیں تو کوئی بات نہیں
وقت ہنسی خوشی زندگی کٹتا رہا
کھائے ہیں فریب کسی کی وفا میں جاوید
غم کے ماروں کا دل پھر سے سلگتا رہا
محمد اسلم جاوید۔ فیصل آباد

غزل

پتھر دل سے وفا نہیں ہوتی
اپنے لہو سے دغا نہیں ہوتی
جن کی فطرت ہو ڈسنے کی
ان سے کبھی شفا نہیں ہوتی
تو پھولوں کو لاکھ چھپائے
خوشبو کبھی جدا نہیں ہوتی
جو چلتے ہیں راہ سیدھی پہ
انہیں کبھی سزا نہیں ہوتی
جن کو عادت ہو کمانے کی
ان ہاتھوں سے گدا نہیں ہوتی
کاغذی پھول کوئی لاکھ اپنے لے
مہک کبھی روا نہیں ہوتی
زمانہ لاکھ برا کہے حسن
ہم سے بد دعا نہیں ہوتی

ایم حسن نظامی، قبولہ شریف

ہم بھلا کیا کرتے ......

دراز کسی کے سامنے دست سوال کیا کرتے
چاہت کے مال میں مانگنے کا مال کیا کرتے
ضمیر د انا کو زینت بازار دیکھ کر
دل ایسی شے کا کسی سے سوال کیا کرتے
یہ کیا کہا تصور میں بات کر لیتے
شب فراق تھی ذکر وصال کیا کرتے
بے سبب توڑ گیا تھا جو رابطے سارے
اب اس کے واسطے خود کو نڈھال کیا کرتے

نصرت سرفراز۔اسلام آباد

غزل

وہ لوگ بھی ہیں دیکھو مقابل کھڑے ہوئے
جو انگلیاں پکڑ کر ہماری بڑے ہوئے
ہم جیسے لوگ کب ہیں قطار وشمار میں
تم جیسے راستوں میں ہیں جب کہ پڑے ہوئے
شہنائیوں کی گونج سے چیخیں الجھ پڑیں
جو فیصلے ہوئے ہیں بڑے ہی کڑے ہوئے
دیتے ہیں ہم دلیل، وفا اس کے باوجود
وہ اپنی بات پر ہیں ابھی تک اڑے ہوئے
دو چار مل ہی جاتے ہیں رستے میں راہ زن
یوں ہیں ہر ایک گام سپاہی کھڑے ہوئے
کیوں کہ لہو میں تر نہ ہمارا کفن ملے !!!!
اب تک ہمارے دل میں ہیں نشتر گڑے ہوئے
نیر چلو کہ پھر سے کوئی تماشا کریں کوئی
اک عمر ہو گئی کسی سے لڑتے ہوئے

نیر رضاوی۔لیاقت آباد کراچی

غزل

غم کی بھیگی رات ہے ساجد
تنہا میری ذات ہے ساجد
تیری یاد کے جگنو اترے !
آنکھوں میں برسات ہے ساجد
ناممکن ہے وصل ہمارا
کیا اپنی اوقات ہے ساجد
کیا تم میرے ہو سکتے ہو
بس اتنی سی بات ہے ساجد
تم تو بازی جیت چکے ہو
اور ہم کو بس مات ہے ساجد
اس کے ہاتھ میں غیر کی خاطر
پھولوں کی سوغات ہے ساجد
ہر پل میری آنکھ میں آنسو
تاروں کی بارات ہے ساجد

ملک عاشق حسین ساجد۔ہیڈ بکائنی مظفر گڑھ

انتظار

اے جاناں یاد ہے تم نے
ایک دن وعدہ کیا تھا کہ
کسی شام ساحل کے کنارے
ہاتھ میں ہاتھ ملائے
گیلی ریت پر چند قدم چلیں گے
مجھے آج بھی اس شام کا
شدت سے انتظار رہتا ہے
امجد علی۔ چیزل آباد

غزل

وفاؤں کے سلسلے جڑنے لگے ہیں
عنایتوں کے تیری مرحلے بڑھنے لگے ہیں
میرے رت جگے تیری بے رخی میری تنہائیاں
صبر کے شجر پر اب پھل لگنے لگے ہیں
وہ ایک زیست جو کاٹی ہے وقت کے ہاتھوں
درد کے بادل میرے قلب سے چھٹنے لگے ہیں
چلو دیر ہے سہی وقت سہانا تو آیا ہے
رب کی بارگاہ میں
میرے شکر کے سجدے بڑھنے لگے ہیں
چاندی چاندی بالوں میں چاندنی آنکھوں میں ہے
جیجل جی میں چاند جذبے اترنے لگے ہیں
جیجل متیلو۔ کراچی

تم یاد آئے!

آج دل دکھا ہے جاناں
تم یاد آئے ہو
انجانے لوگ ہیں
اپنے کہاں ڈھونڈ پائیں ہم
جاگیں ہیں سوئے نہیں
ایسی ہے میری یہ تنہائی
دن بھی وہی ہے
راتیں بھی وہی مگر......

سانسوں میں سانسیں ہی نہیں
ظفر اللہ رند۔ کوئٹہ

غزل

یہ آرزو ہے میری کچھ تو علاج غم تنہائی ہو
پھر یوں نہ ہو کہ جگہ جگہ رسوائی ہو
ہم نے تو محض ایک پیار کیا تھا
یہ تو نہیں چاہا تھا کہ ہم سے بے وفائی ہو
ہم تو بیمار عشق ہیں یہ محفلیں ہمارے کس کام کی
ہم تو چاہتے ہیں ہم ہوں تیری یاد اور یہ تنہائی ہو
سردی کا موسم اب مجھے راس آتا نہیں
ایسا لگتا ہے تیری یادیں پھر سے لوٹ آئی ہوں
وہ سرد ہوائیں اور دسمبر کی بارشیں
قسم لے لو جو تیرے بعد مجھے راس آئی ہوں
اب تو ان محفلوں سے دور جا بسے مریض عشق
نہیں چاہتے کہ عشق میں ٹھکرائے لوگوں کی چہرہ نمائی ہو
پرنس تابش۔ چشتیاں

آنکھیں چغلی کرتی ہیں

میں جب بھی کچھ
چھپانا چاہوں......
اپنا درد چھپانا چاہوں......
یہ میری کب سنتی ہیں
پل بھر میں یہ بھر آتی ہیں
آنکھیں چغلی کرتی ہیں
شاعرہ: ثانیہ ثانی۔ سیالکوٹ

عشق

عشق میں تمہارے اے میری جاناں
ہر پل تڑپتا ہوں، روتا ہوں، سسکتا ہوں
جیون برباد کرتا ہوں
اور بس اک بات ہی سوچتا ہوں
کیا سب کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے
یا پھر اس آگ میں بس میں ہی جلتا ہوں
وقاص دانش۔ کراچی

سلسلۂ خاص

فیضِ عشق



امجد جاوید

عشق کے متوالوں کے لیے عشق میں ڈوبی ایک خاص الخاص کہانی کا پانچواں حصہ

''نہیں! دیوان، میں بازی ہار گیا ہوں۔ جو کچھ میں نے سوچا تھا، وہ نہیں ہو پایا۔ ظہیر شاہ نے یوں حویلی سے جا کر بہت کچھ غلط کر دیا ہے۔ آج شام تک اگر وہ واپس نہیں آتا تو پھر ہمارے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں آئے گا۔''

''آپ ایسی مایوسی والی باتیں کیوں کر رہے ہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں کسی سے کہتا ہوں وہ ائیر پورٹ سے ظہیر کو نہیں جانے دیں گے۔'' دیوان نے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

''تو پھر جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو۔ شام تک ظہیر شاہ کو یہاں ہونا چاہئے۔'' یہ کہہ کر اس نے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا دی۔

''سرکار، میں پوری کوشش کرتا ہوں۔'' دیوان نے کہا اور الٹے قدموں باہر کی جانب چلا گیا جبکہ پیر سائیں اپنی سوچوں میں کھو گیا۔

☆......☆

نادیہ کو معلوم ہو گیا تھا کہ ظہیر شاہ حویلی چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اسے احساس تو تھا کہ اب اس کی اپنے شوہر کے ساتھ وابستگی تو نہیں رہے گی جو ہونی چاہیے۔ کیونکہ اس تعلق کی توہین خود اس کے شوہر نے کی تھی۔ وہ تو سپردگی کے لیے تیار تھی۔ اس نے اپنی ہار کو ذہنی طور پر تسلیم کر کے اپنا وجود حالات کے دوش پر چھوڑ دیا تھا۔ تعلق میں کوئی خوبصورت اور مضبوطی لانے سے پہلے ہی اس میں ضد اور انا کا زہر گھول دیا گیا تھا۔ مگر اسے کوئی افسوس نہیں تھا۔ یہ اسے پوری طرح احساس تھا کہ اس کے ظہیر کے درمیان ایسا ہی اجنبیت والا تعلق ہی ہو گا۔ ہاں یہ اس کے شعور میں نہیں تھا کہ وہ تعلق کے بندھن میں باندھ کر یوں اجنبی بن جائے گا۔ وہ تو چاہتی تھی کہ ظہیر شاہ یہاں رہے۔ وہ یہاں رہتا تو ہی معاملات میں ہلچل رہتی۔ اب تو جمود طاری ہو چکا تھا۔ اس کی زندگی میں اور حالات کے بہاؤ میں۔ اسے اپنا آپ بہت عجیب سا لگ رہا تھا کہ چلا تو گیا ہے ظہیر شاہ۔ لیکن پوچھا اس سے جا رہا ہے کہ وہ کیوں چلا گیا؟ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ خود پر ان حالات میں ترس کھائے، بے حس ہو جائے یا پھر اپنی مظلومیت کا احساس دلائے۔ اسے واویلا کرنا چاہیے یا پھر خاموش ہو جانا چاہئے۔ وہ ظہیر شاہ کے کمرے میں بیڈ پر بیٹھی مسلسل یہی سوچے چلی جا رہی تھی کہ اماں بی اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ سمٹ کر بیٹھ گئی۔ اماں بی چلتی ہوئی اس کے پاس آ بیٹھی۔ چند لمحے ان کے درمیان خاموشی رہی جسے نادیہ ہی نے تلخ لہجے میں توڑا۔

''آپ شاید پھر یہ پوچھنے آئی ہیں کہ ظہیر شاہ

کیوں چلا گیا؟''

''نہیں، میں سمجھتی ہوں کہ وہ کیوں چلا گیا۔ اسے آج نہیں تو کل چلے ہی جانا تھا۔ لیکن اتنی جلدی چلا جائے گا، یہ امید نہیں تھی۔'' اماں بی نے نجانے کس جذبے کے تحت خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

''یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟۔۔'' نادیہ نے سوچتے ہوئے پوچھا تو اماں بی نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''یہ اس لیے نادیہ کہ وہ اب حویلی کی چھوٹی سی دنیا تک محدود نہیں رہا۔ وہ ایک ایسی دنیا میں جا چکا ہے جہاں سے یہ حویلی بہت چھوٹی محسوس ہوتی ہے۔ اس نے یہاں کبھی رہنا ہی نہیں تھا۔ کیا صرف تمہی اس حویلی میں گھٹن محسوس کرتی ہو؟ وہ بھی یہاں کچھ ایسا ہی احساس رکھتا تھا۔ اسے کوئی بہانہ چاہیے تھا، وہ اسے مل گیا۔ اب وہ تمام تر قصور تم ہی میں نکالیں گے۔''

''یہ تو ہمارے اس معاشرے میں عورت کا مقدر ہے کہ تمام تر الزامات اسی پر لگتے ہیں۔ مرد صاف بچ جاتا ہے۔ لیکن شاید مرد کو یہ نہیں معلوم، گھٹن جب حد سے بڑھ جاتی ہے تو پھر سانس لینا مشکل ہوتا ہے۔ عورت کا سانس رک گیا تو مرد کی دنیا ویران ہو جائے گی۔''

''یہ بات اگر مرد کی سمجھ میں آ جائے تو گھٹن ہی نہ ہو۔ ہمارے اردگرد ساری خوبصورتی عورت کی وجہ سے ہے۔ اگر عورت کی سوچ میں زہر بھر دیا گیا تو سارے منظر زہر آلود ہو سکتے ہیں۔ یہی بات میں تمہیں سمجھانا چاہ رہی ہوں بیٹی۔! باہر کے منظر، حالات اور وقت جیسا بھی آ جائے۔ تم اپنی سوچوں کو زہر آلود مت ہونے دینا، یوں تمہاری زندگی سہل ہو جائے گی۔'' بی اماں نے بہت پیار سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو خیالوں میں کھوئے ہوئے بولی۔

''میں جانتی ہوں بی اماں۔ ا میں نے اختر رومانوی سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ انسانی ذہن میں پڑی ہوئی سوچ ہی اس کی زندگی کی راہیں متعین کرتی ہے۔ سوچ اگر منفی ہے تو انگلی کی پور تک اعمال منفی ہو جاتے ہیں اور مثبت ہوں تو پھر دنیا کے سارے مناظر میں خوبصورت رنگ بھرے جا سکتے ہیں۔ تبھی عورت کے بارے میں کہا جاتا ہے۔ کہ اس کے وجود سے تصویر کائنات میں رنگ ہیں۔''

''تم اختر رومانوی کیوں کہتی ہو۔ تم شعیب بھی تو کہہ سکتی ہو۔؟'' بی اماں نے نجانے کس سوچ کے تحت اس سے پوچھا۔

''میری زندگی میں اختر رومانوی آیا تھا۔ جس نے نہ صرف میری سوچ پر بلکہ میری زندگی پر بھرپور اثرات ڈالے ہیں۔ اس کے دیئے ہوئے خیال اور سوچوں ہی نے میری زندگی کی راہیں متعین کر دی ہیں۔ میں شاید زندگی کو اس نگاہ سے نہ دیکھ سکتی، جیسا مجھے دیکھنا چاہیے تھا۔ میرے اندر بغاوت آگ بن کر مجھے جلا دیتی، لیکن بغاوت کی اسی آگ کو اس نے میری قوت بنا دیا ہے۔ میں اب سمجھ سکتی ہوں کہ زندگی کا سامنا کیسے کرنا ہے۔ جبکہ شعیب، وہ میرے لیے کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتا۔ وہ صرف ایک ماں کا اکلوتا بیٹا ہے۔ جس کے سارے خواب اس کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے وہ میرے لیے لڑتا۔ لیکن جہاں اختر رومانوی آباد ہے۔ وہاں شعیب بسیرا نہیں کر سکتا۔''

''کیا تم شعیب سے نفرت کرتی ہو۔؟'' اماں بی نے مزید کرید کی۔

''نہ نفرت نہ محبت! وہ میرے لیے محض ایک اجنبی ہے۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔

''مگر اب تو وہ ہمارے خاندان کا حصہ بن گیا ہے۔ وہ اس حویلی کا داماد ہے۔ اس سے ناتا جڑ گیا ہے تو تعلق بھی رکھنا پڑے گا۔ اب کیسے۔'' وہ کہنا چاہتی تھی کہ نادیہ نے اس کو بات قطع کرتے ہوئے کہا۔

''وہ اس حویلی کا نہیں، پیر سائیں کا داماد بنا ہے۔ میرا اس سے کیا تعلق اور مجھے ضرورت بھی نہیں ہے اس سے تعلق رکھنے کی۔ میں نے کہا نا، وہ ایک ماں کا بیٹا ہے۔ جس کے سارے خواب اس سے جڑے ہوئے ہیں۔ اگر وہ میرے ساتھ تعلق رکھنا چاہتا، اس کی چاہت میں ہوتی تو وہ احتجاج کرتا، انکار کر دیتا۔ وہ میرے لیے لڑتا اس نے تو خاموشی سے میری بات مان لی۔ جیسے کہ وہ اسی کے انتظار میں ہو۔ اس نے ان سارے تعلقات کو ماں کے رشتے سے دیکھا۔ کہاں وہ پیر سائیں کے ساتھ اپنی مخالفت رکھتا تھا اور کہاں میرے ذرا سے کہنے پر اس کا داماد بن گیا۔ نہیں اماں بی! میرا اس سے کوئی تعلق نہیں

ہے اور میں اس کی کسی خواہش کی پابند نہیں ہوں۔"

"لیکن ظہیر شاہ کے ساتھ بھی تیرا کوئی تعلق نہیں بن سکا۔ وہ تجھے توہین آمیز سلوک کے ساتھ ٹھکرا کر چلا گیا۔ کیا تمہارا اس کے ساتھ تعلق بن پائے گا۔" اماں بی نے ایک دوسرے پہلو سے اسے کریدا۔

"میرا نام اب ظہیر شاہ کے ساتھ جڑ گیا ہے۔۔ وہ جیسا بھی ہے۔ اب میرے سر کا سائیں ہے۔ وہ مجھے جیسے رکھے، وہ مجھے قبول ہے۔ توہین کرے یا عزت دے۔" نادیہ نے اعتماد بھرے لہجے میں کہا تو اماں بی خاموش ہو گئیں۔ ان کا دل چاہ رہا تھا کہ اپنی پوتی کی حالت زار پر رو دیں لیکن وہ نادیہ کو کمزور نہیں دیکھنا چاہ رہی تھیں۔ اس کے اندر جو اس وقت جینے کا حوصلہ تھا وہ اسے قائم و دائم رکھنا چاہتی تھیں۔ اس لیے لرزتے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"تو بتا۔! میری بیٹی، اب تو کیسے رہنا چاہتی ہے۔ اب مجھے دلاور شاہ سے لڑنا بھی پڑا تو میں لڑوں گی۔"

"جیسے پہلے رہ رہی ہوں ویسے ہی رہوں گی۔۔ آپ میرے لیے کیوں پیر سائیں سے لڑیں گی۔؟" نادیہ نے حیرت سے کہا۔

"ظہیر شاہ کے بارے میں تم جو بھی چاہتی ہو۔ مجھے بتاؤ۔ اب میں منواؤں گی۔" بی اماں نے پورے خلوص سے کہا۔

"نہیں۔ میں کچھ نہیں چاہتی۔ اب فیصلہ میں نے اپنی قسمت پر چھوڑ دیا ہے، جو ہونا ہے سو ہو۔ میں اب اپنی قسمت کا سامنا کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہوں۔" نادیہ نے دکھی لہجے میں آہستگی سے مسکراتے ہوئے کہا تو اماں بی خاموش ہو گئیں۔ کافی وقت یونہی گزر گیا تو نادیہ اٹھی اور اس نے اپنا عروسی جوڑا اٹھایا۔ اسے تہہ لگا کر ایک ڈبے میں بند کر دیا۔ سارے زیورات بھی اٹھا کر انہیں ان کے ڈبوں میں رکھا۔ اس کے علاوہ یہاں اس کمرے میں اس کا کچھ نہیں تھا۔ اس نے وہ عروسی جوڑا اور زیورات اماں بی کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ پیر سائیں کے گھر کی امانت ہیں، آپ انہیں دے دیجیے گا۔ میں اب اپنے کمرے میں جاتی ہوں۔"

اس کے یوں کہنے پر اماں بی ایک بار پوری جان سے لرز گئیں، پھر گھٹی گھٹی آواز میں بولیں۔ "یہ ٹھیک ہے کہ تم اس حویلی ہی میں رہو گی۔ ایک ہی چھت کے نیچے مگر یہاں رہو گی تو نہیں یہ احساس تو ہوگا نا کہ ان کی بہو ان کے ساتھ ہے۔"

"ظہیر شاہ نے میرے ساتھ نکاح تو کیا، لیکن ایک بیوی کا مان مجھے نہ دے سکا۔ میں اب کس ناتے انہیں اپنا سسرال تسلیم کر لوں؟ میں اکیلی تھی، اکیلی ہوں اور اکیلی رہوں گی۔ میں انتظار کروں گی کہ ظہیر شاہ کب واپس لوٹتا ہے۔ پھر دیکھوں گی، میرا فیصلہ کیا ہوگا۔" نادیہ نے کہا اور اٹھ گئی۔ وہ چند لمحے اس کمرے میں کھڑی گہرے گہرے سانس لیتی رہی، پھر باہر کی جانب چل دی۔ بی اماں اسے غور سے دیکھتی رہیں اسے روک نہیں سکیں۔

اپنے کمرے میں آتے ہی اسے سکون کا احساس ہوا۔ تاجاں مائی نے کمرے کو یوں صاف کر کے چمکا دیا ہوا تھا کہ جیسے نادیہ ابھی اٹھ کر وہاں سے گئی ہو۔ وہ اپنے کمرے میں چند لمحے سکون سے کھڑی رہی پھر اس کھڑکی سے آ گئی جہاں سے دور تک کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس منظر میں کچھ بھی تبدیل نہیں ہوا تھا، ویسے ہی رنگ تھے اور ویسے ہی نقش۔ وہ چند لمحوں تک اسی منظر میں کھوئی کسی تبدیلی کا سراغ لگاتی رہی لیکن اسے ایسا کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ شاید وہ مزید کچھ دیر کھڑکی رہتی تا ہم تاجاں کے کمرے میں آ جانے سے وہ کھڑکی سے پلٹ کر صوفے پر آن بیٹھی۔

"بی بی سئیں۔ آپ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ میں ناشتہ لاؤں آپ کے لیے؟"

"ہاں! میں آج بھرپور ناشتہ کروں گی، لیکن میں پہلے نہا لوں۔" نادیہ نے زندگی سے بھرپور لہجے میں کہا اور اٹھ گئی۔ تاجاں کمرے سے پلٹنے لگی تو اس نے حکم صادر کر دیا۔ "تاجاں مائی! آج سے تم صرف میرے ساتھ رہو گی۔ اور میرے معاملات دیکھو گی۔ حویلی سے تمہیں اب کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔"

"جی بی بی سئیں۔" تاجاں مائی نے آہستگی سے کہا اور باہر چلی گئی۔ نادیہ نے ایک طویل سانس لی اور زندگی کے اک نئے دور کا آغاز کر دیا۔

☆......☆

دوپہر ڈھل گئی تھی اور دن تھا کہ تیزی سے گذرتا چلا جارہا تھا۔ فرح کی بے چینی حد سے زیادہ بڑھنے لگی تھی۔ وہ دن کا پہلا پہر تو سوتی رہی تھی۔ جب بیدار ہوئی تو گھر میں سکوت تھا۔ وہی سکوت جو حویلی میں ہوا کرتا تھا۔ وہ کمرے میں تنہا تھی۔ اس کی زندگی کی پہلی صبح یوں کسی ایسے کمرے میں ہوئی تھی جو حویلی میں نہیں تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ پھر گذرتے لمحوں میں اس نے خود کو یقین دلایا کہ وہ اب شادی شدہ ہے اور اپنے میاں کے کمرے میں ہے، لیکن وہ کہاں ہے؟ اسی سوال نے اسے بیڈ پر سے اٹھایا۔ وہ کمرے سے باہر آئی۔ وہاں بھی وہی حویلی والا سناٹا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں آئی تو وہاں زبیدہ پھوپھو سکون سے بیٹھی تسبیح کر رہی تھیں۔ وہ ظہر کی نماز کے بعد وہیں قریب ہی صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ جیسے ہی ان کی نگاہ فرح پر پڑی تو بولیں۔

''آؤ بیٹا۔! لگتا ہے خوب سوئی ہو۔''

''جی، بڑی بھرپور نیند آئی ہے۔'' اس نے حیار بار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا تم فریش ہو کر آؤ۔ میں تمہارے لیے ناشتہ بنواتی ہوں۔'' زبیدہ نے کہا۔

''وہ شعیب کہاں ہیں۔؟ انہوں نے......'' فرح نے شرمندہ لہجے میں ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''وہ تو آفس گیا ہے۔۔ ابھی کچھ دیر میں آ جائے گا۔'' زبیدہ نے اسے بتایا تو وہ چونک گئی۔

''پھوپھو۔! مجھے جگا دیتے۔ انہیں تیار ہونے میں......'' وہ پھر کہتے کہتے رک گئی تو زبیدہ نے سمجھایا۔

''کوئی بات نہیں، تم ایسے کرو فریش ہو جاؤ، ناشتہ کرو اور اس کے آنے سے پہلے پہلے تیار ہو جاؤ۔ ہو سکتا ہے حویلی سے بھی تمہیں لینے کے لیے کوئی آ جائے۔''

''جی بہتر۔'' اس نے مزید کوئی بات نہیں کی، فوراً ہی مان گئی۔ پھر وہ تیار ہو کر بھی بیٹھ گئی اور سہ پہر کا وقت ہو گیا۔ نہ تو شعیب آیا اور نہ ہی کوئی حویلی سے ان کے ہاں اسے لینے کے لیے آیا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی یونہی اوٹ پٹانگ سوچوں میں الجھی ہوئی تھی۔ تبھی اسے لگا جیسے باہر گاڑی رکی ہے اور شعیب آ گیا ہے۔ وہ جلدی سے اٹھی اور ڈرائنگ روم میں گئی۔ وہ آ چکا تھا اور صوفے پر پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بولا۔

''سوری مجھے دیر ہو گئی۔۔ آج یکدم ہی کئی کام نکل آئے تھے۔ امی کہاں ہیں؟''

''وہ اپنے کمرے میں ہیں۔ بلاؤں انہیں۔'' وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

''نہیں، وہ خود ہی یہاں آ جائیں گی، اگر انہیں آنا ہوا تو......'' اس نے کہا تو ملازم پانی کا گلاس لے کر آ گیا۔ تبھی فرح کو خیال آیا یہ کام تو اسے خود کرنے چاہیے تھے۔ اس لیے بولی۔

''آپ کھانا کھائیں گے؟ مطلب، اتنی دیر ہو گئی؟''

''میں نے کھانا کھا لیا ہوا ہے، بس ایک کپ چائے پیوں گا لیکن پہلے میں ذرا چینج کر لوں۔'' شعیب نے اٹھتے ہوئے کہا۔ تو وہ بھی اٹھ گئی۔ تب شعیب نے پوچھا ''تم کہاں جا رہی ہو؟''

''میں آپ کے لیے چائے بنا لاؤں۔''

''نہیں۔ وہ ملازم بنا لائے گا۔ تم جاؤ کمرے میں، میں ذرا امی سے مل کر آتا ہوں۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' اس نے دھیمے سے کہا اور کمرے کی جانب چل دی۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں زبیدہ کے کمرے میں ان کے پاس بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

''آج آفس میں کوئی ضروری کام تھا۔'' زبیدہ نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

''جی ہاں۔ ابہت ضروری تھے۔ ورنہ شاید میں نہ جاتا۔ انہیں ہی نمٹاتے ہوئے اتنی دیر ہو گئی۔ دراصل مجھے کہیں انکوائری پر جانا تھا۔ پہلے سے طے تھا، میرے نہ ہونے سے بہت سارے لوگ ڈسٹرب ہوتے۔''

''چلو، وہ تو ہو گیا۔ اب تم تیار ہو جاؤ، تمہیں حویلی جانا ہو گا فرح کے ساتھ۔'' زبیدہ نے نرم لہجے میں کہا۔

''کیا وہاں سے فرح کو لینے کوئی نہیں آیا۔'' شعیب نے پوچھا۔

''نہیں، پتا نہیں کیا بات ہے؟'' زبیدہ نے تشویش سے کہا۔

''کوئی فون؟'' اس نے پوچھا۔

"نہیں۔" فرح نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے دھیمے سے کہا۔

"وہ لوگ جنہیں اپنی بیٹی کا اتنا بھی احساس نہیں، وہاں ہمیں کیا کرنے جانا ہے۔۔ وہ جب آئیں گے تو لے جائیں گے۔ اگر انہیں فرصت نہیں تو یہاں کون فارغ بیٹھا ہوا ہے۔" اس نے کافی حد تک تلخی سے کہا۔

"ہوسکتا ہے بیٹا! ان کے پاس کوئی ایسا معاملہ ہو گیا ہو جس کی وجہ سے......" زبیدہ نے کہنا چاہا تو وہ پھر تلخی ہی سے بولا۔

"نہیں امی، دل نہیں مانتا۔ ایسا ہی کوئی گمبھیر مسئلہ ہوتا تو اب تک ہمیں ضرور اطلاع مل چکی ہوتی۔ اور اگر آپ کو حویلی والوں سے ہمدردی ہے تو آپ فون کر لیتیں۔ یہ فرح فون کر لیتی۔۔"

"اب تم اپنی ضد نہ کوئی بنا لینا۔ جب ان سے رشتہ بنا لیا ہے تو پھر اس رشتے کو نبھانا تو ہے۔" زبیدہ نے ایک کمزور سی دلیل کا سہارا لیا۔

"امی! یہ رشتہ صرف ہم ہی نے نبھانا ہے صاف بات ہے۔ وہ آئیں اور فرح کو لے جائیں بات ختم۔ اس میں اتنی الجھن والی بات کیا ہے۔" اس نے خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"بات تمہاری ٹھیک ہے، لیکن یہ حالات، انہیں بھی تو دیکھنا ہے۔" زبیدہ نے پھر ایک نئی مگر کمزور دلیل دی۔

"امی! آپ حویلی والوں کی بے جا وکالت کر رہی ہیں۔ میں آج آپ کو صاف بات بتا دوں۔ جن حالات میں میری شادی ہوئی، وہ ایک شرط کا شاخسانہ ہے۔ میں نے قبول کی لیکن اب اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں حویلی والوں کا دست نگر ہو کر اپنی انا گنوا دوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے بیٹے نے ہر طرح کی مزدوری تو کی ہے لیکن کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ یہی انا میرا سرمایہ ہے۔ اور میں اسے کسی قیمت پر گنوانا نہیں چاہتا۔" اس نے صاف گوئی سے کہہ دیا تو فرح چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ زبیدہ بول پڑی۔

"اس میں انا کہاں سے آ گئی؟" زبیدہ نے پھر بات کو بڑھانا چاہا۔

"دیکھیں امی! آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ آپ کے بھائی دلاور شاہ نے کہا ہے کہ آپ یہ جو کچھ بھی کر رہی ہیں، جائیداد میں حصہ لینے کے خاطر کر رہی ہیں۔ آپ کا اور آپ کے بھائی کا معاملہ کیا ہے اور کیا ہوگا۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی مجھ پر یہ انگلی اٹھائے کہ میں بھی حویلی سے کچھ حاصل کرنے کی غرض سے ان کے ساتھ ناتا جوڑے ہوئے ہوں۔ آج میں آپ پر واضح کر دوں کہ میں کبھی بھی حویلی نہیں جاؤں گا۔ آپ نے اپنا تعلق رکھنا ہے۔ آپ جائیں، میں آپ کو کبھی نہیں روکوں گا، یہ میرا حتمی فیصلہ ہے۔" شعیب نے کہا اور اٹھ گیا۔ زبیدہ اسے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن ایک لفظ بھی نہیں کہہ پائی۔ زبان جیسے گنگ ہو گئی تھی۔ بس وہ اسے اجنبی نگاہوں سے دیکھتی رہ گئی اور وہ کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ وہ چونکی اس وقت جب فرح کی سسکی کمرے میں گونجی۔

"یہ کیا ہو گیا پھوپھو!" وہ روہانسا ہوتے ہوئے بھیگے لہجے میں بولی تو زبیدہ جیسے ہوش میں آ گئی۔

"تو بھی اچھی طرح جانتی ہے فرح۔ حویلی والوں کو اس کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اگر اس کا نہیں خیال تو کم از کم تیرے بارے میں سوچ لیتے۔ تم ان کی بیٹی، تمہیں لینے کے لیے اب تک کسی کو آ جانا چاہیے تھا۔ کیوں نہیں آیا کوئی؟"

"آنا تو چاہیے تھا، مگر پتا نہیں کیوں۔" وہ حیرت اور مایوسی کے ملے جلے لہجے میں بولی۔

"ویسے تمہیں ہی فون کر لینا چاہیے تھا۔" زبیدہ نے تاسف سے کہا۔

"اب کیا ہو سکتا ہے؟" فرح نے پوچھا۔ اس کے چہرے پر زردی چھا گئی تھی۔ تبھی زبیدہ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو میری بیٹی! شعیب جتنا نرم ہے اتنا سخت بھی ہے۔ نرمی پر آئے تو بہت کچھ برداشت کر جاتا ہے۔ جیسے کہ میرے بارے میں اس نے سنا اور ایک لفظ کہے بغیر سب کچھ برداشت کر گیا۔ ایک ذرا بھی ماتھے پر شکن نہیں ڈالی۔ اس کے رویے میں بھی تبدیلی نہیں آئی۔ مطلب اس نے میرے ماضی کو کھلے دل سے تسلیم کر لیا۔ لیکن اب اگر

اس نے حویلی والوں کے بارے میں، ان کے رویے پر اپنا خیال بتایا ہے تو اب وہ اسی پر قائم رہے گا، میں اس کی ماں ہوں۔ اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ اس لیے تم اسے ایسی بات پر کچھ مت کہنا کیونکہ وہ مزید سخت ہوتا چلا جائے گا۔ ممکن ہے وقت کے ساتھ اس میں نرمی آ جائے۔“

”جی پھوپھو! میں سمجھ گئی، لیکن حویلی فون کریں نا آپ۔“

”اب فون کیا کرنا، ہم دونوں ہی چلتی ہیں۔ شام تک لوٹ آئیں گی۔ میں خود جا کر معلوم کروں گی کہ بات کیا ہے۔ تم تیار ہو جاؤ۔“

”مگر وہ ان کی اجازت......“ فرح نے لرزتے ہوئے یوں پوچھا جیسے کہ وہ کسی شکنجے میں آ چکی ہو۔ اسے کون سا ان باتوں کا تجربہ تھا۔ یا پھر احساس۔ جس کے تحت اسے اپنی ہی کسی سوچ کا سہارا مل جاتا۔

”تم جاؤ، اسے بتا دو۔ پھر جو کہے اس پر بحث مت کرنا۔“ زبیدہ نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا تو فرح اٹھ گئی۔ وہ اندر سے بری طرح کانپ رہی تھی۔ شعیب کا رویہ جہاں اسے دہلائے دے رہا تھا۔ وہاں حویلی والوں کا اسے نظر انداز کر دینا بھی خوف زدہ کر رہا تھا۔ یہی سوچ اس کے حواسوں پر چھا گئی تھی کہ وہ کہیں اکیلی تو نہیں ہو گئی حویلی کے شجر سے گرا ہوا پھول جیسے زندگی کی شاہراہ پر پھینک دیا گیا ہو۔ اس کی ذات ایک ایسی کشتی کی مانند ہو گئی ہو جیسے ناخدا کے بغیر سمندر میں دھکیل دیا گیا ہو۔ وہ دبے قدموں جا کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔ اس کی آمد کا احساس کر کے شعیب نے اس کی طرف دیکھا اور اٹھ بیٹھا۔ وہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی اور پھر بولی۔

”اگر آپ کی اجازت ہو تو میں...... میں...... اور پھوپھو۔ حویلی ہو آئیں۔“

”بالکل۔ تم جب چاہے اور جس وقت چاہے جا سکتی ہو۔ میری طرف سے تمہیں اجازت ہے۔ وہاں جانے کے لیے مجھ سے پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں۔“ اس نے خوشدلی سے کہا۔

”آپ کہیں ناراض تو نہیں؟“ اس نے لرزتے ہوئے کہا۔

”میں تم سے کیوں ناراض ہونے لگا۔ دیکھو فرح...! عزت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہوتی۔ جنہیں ہم اپنا کہتے ہیں تو انہیں فقط لفظوں میں اپنا نہیں کہنا چاہیے بلکہ اپنے عمل سے ثابت کرنا چاہیے۔ اب حویلی والوں کا رویہ تمہارے سامنے ہے۔ خود بتاؤ، مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

”آپ کا فیصلہ ٹھیک ہے۔ اگر آپ کہیں کہ میں نہ جاؤں تو نہیں جاتی۔“ اس نے کافی حد تک اعتماد پکڑتے ہوئے کہا۔

”فرح تم کبھی بھی خود کو ڈانواں ڈول محسوس نہیں کرنا، کبھی بھی یہ مت سمجھنا کہ اگر حویلی والوں نے تمہیں نظر انداز کر دیا ہے تو میں تمہیں اکیلا چھوڑ دوں گا۔ دیکھو، تم میری عزت ہو، میں ہی تمہیں مان نہیں دوں گا تو پھر کون دے گا؟ رات میں نے یونہی لفاظی نہیں کی، جو کہا اس پر کاربند رہوں گا۔“ شعیب نے کہا تو فرح کے آنسو نکل آئے۔ وہ جذبات میں مغلوب لہجے میں بولی۔

”میرا مان تو آپ ہی ہیں۔۔۔“

”ڈونٹ وری۔ تم جاؤ امی کے ساتھ۔“ اس نے پیار سے کہا تو وہ اٹھ کر تیار ہونے لگی۔ وہ بہت حد تک سنبھل گئی تھی۔ اسے شعیب کا رویہ بہت اچھا لگا۔ یوں جیسے تپتی دوپہر میں کوئی سائبان میسر آ گیا ہو۔ اسے زندگی کا رخ ہی کچھ اور طرح کا لگا جیسے دھوپ چھاؤں میں زندگی کا حسن اس پر عیاں ہونے لگا ہو۔ نادیہ کی وہ باتیں جو کبھی اسے اوٹ پٹانگ سی لگتی تھیں۔ کچھ کچھ اس کی سمجھ آنے لگی تھی۔ وہ جو دنیا کے متضاد رویے کی بات کیا کرتی تھی۔ تب اسے معلوم ہی نہیں تھا رویہ کیا ہوتا ہے اور پھر اس پر متضاد رویہ۔ اب اسے احساس ہو گیا تھا۔

شام ڈھلنے سے پہلے فرح اپنی پھوپھو زبیدہ کے ساتھ حویلی پہنچ گئی۔ شعیب کا ڈرائیور انہیں پورچ تک لے آیا تو انہوں نے وہیں سے اسے واپس بھجوا دیا۔ حویلی میں داخل ہوتے ہی انہیں حویلی کا سناٹا کہیں گہرا لگا۔ وہ دونوں چلتی ہوئی اماں بی کے کمرے میں گئیں۔ وہ افسردہ سی اپنے بیڈ پر بیٹھی ہوئی نجانے کن سوچوں میں کھوئی ہوئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر یکبارگی وہ کھل اٹھیں۔ پھر اٹھ کر انہیں گلے لگایا تو آنسو روک ہی نہ سکیں۔

”اماں بی کیا ہوا؟ بتائیں تو، خیریت تو ہے“ زبیدہ نے چونکتے ہوئے کہا تو فرح بھی اپنے تئیں دہل گئی۔

”بیٹھو۔“ اماں بی نے انہیں اشارہ کرتے ہوئے

کہا۔ پھر ملازمہ کو بلانے کے لیے گھنٹی دے دی۔

"اماں بی، سب ٹھیک ٹھاک تو ہے نا؟ امی کہاں ہیں..؟" فرح نے پوچھا تو اماں بی نے کھوئے لہجے میں کہا۔

"پتا نہیں ٹھیک ہے یا نہیں۔ تمہاری امی کمرے ہی میں ہوں گی۔ میں اسے یہیں بلوا لیتی ہوں۔"

لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ ملازمہ اندر آ گئی۔ وہ فرح بی بی سے ملی، زبیدہ سے حال احوال پوچھا اور اماں بی کا حکم پا کر واپس الٹے قدموں چلی گئی۔

"اماں کچھ تو ہے جو فرح کو لینے کوئی......" زبیدہ نے کہنا چاہا تو اماں بی نے کہا۔

"ظہیر شاہ رات ہی کسی وقت حویلی سے چلا گیا۔ پتا چلا ہے کہ واپس لندن چلا گیا۔ دلاور شاہ نے اسے روکنے کی بھی کوشش کی لیکن وہ پاکستان سے پرواز کر گیا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ڈرائیور واپس آ گیا ہے۔ ساری تفصیل اسی نے بتائی ہے۔"

"اوہ! بے چاری نادیہ میں پہلے ہی کہتی تھی اسے...... اس حویلی سے اسے کبھی وفا نہیں ملے گی۔ یتیم بچی ہے نا۔ اس لیے اس کے ساتھ ایسا ہو رہا ہے۔ ہر کوئی اس پر ظلم کرنا چاہتا ہے اور کرتا چلا جا رہا ہے۔ کہاں ہے وہ؟" زبیدہ نے ایک دم سے تلخ ہوتے ہوئے کہا۔

"اپنے کمرے میں ہی ہو گی۔" اماں بی نے دھیرے سے کہا تو وہ چند لمحے سوچتی رہیں پھر اٹھ گئیں۔

"میں معلوم تو کر دوں وہ بے چاری کس حال میں ہے۔ بہت ظلم کیا ہے حویلی والوں نے اس کے ساتھ۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ جبکہ فرح نجانے کن سوچوں کے تحت لرز کر رہ گئی۔ اسے لگ رہا تھا کہ جیسے صحرا بالکل اس کے قریب آ گیا ہے۔ تپتی ہوئی لو اسے ابھی سے جھلسانے لگی ہے۔ نادیہ کی زندگی اگر تلخ ہو گئی ہے تو پھر اس کی زندگی کو بھی زہر آلود ہونے سے کوئی نہیں بچا پائے گا۔ یہ مکافات عمل ہوا کیا ہو وہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔

☆......☆

گہری رات کا سناٹا مزید گہرا ہو گیا تھا۔ آخری دنوں کا چاند ابھی تک نہیں نکلا تھا۔ نادیہ اندھیرے میں ٹمٹماتے ہوئے برقی قمقموں کو دیکھ رہی تھی۔ حویلی سے چھن کر جانے والی روشنی میں ذرا فاصلے تک منظر سسک رہے تھے۔ اپنے وجود کو برقرار رکھنے میں اور اپنے آپ کو بچانے کی فکر میں کہ اندھیرے انہیں نگل نہ جائیں۔ وہ اپنے آپ سے فرار حاصل کر کے دنیا سے بے خود ہو کر سو گئی تھی۔ شاید وہ تنہا ہوتی تو اتنی چبھن نہ ہوتی۔ جتنا ارد گرد کی باتوں نے اسے دکھ دیا تھا۔ ظہیر شاہ تو پہلے ہی اس کی زندگی میں نہیں تھا۔ اب اگر وہ لندن چلا گیا ہے تو اس کی زندگی میں تو کوئی فرق نہیں آیا۔ مگر ایسا کر کے اس نے نادیہ کو کم مائیگی کا احساس ضرور دلا دیا تھا۔ اس نے بڑے مان اور حق سے ظہیر شاہ کے سامنے شرط رکھی تھی۔ اگر اس کے دل میں نادیہ کے لیے ذرا سا پیار یا تھوڑی سی ہمدردی بھی ہوتی نا تو وہ ضرور اس کی بات پر غور کرتا۔ اگر اس کے بس میں نہ ہوتا تو اچھی طرح سے اسے سمجھانے کی کوشش کرتا۔ اس کی انا پر ذرا سی ٹھیس کیا آئی وہ پوری طرح کھل گیا۔ اس کے اندر کا سخت گیر انسان جو پیر سائیں کا جانشین تھا۔ ایک دم سے بول پڑا۔ اس نے اپنا آپ ظاہر کر دیا کہ وہ کیا ہے اور کیسا ہے۔ وہ جتنا بھی تعلیم یافتہ ہو گیا تھا مگر اس کے ضمیر میں وہی حاکمانہ انداز تھا۔ ضد اس کی گھٹی میں تھی اور اپنی عظمت کو منوانا ان کی فطرت بن گئی ہوئی۔ انہوں نے روایات کے سہارے تو خود کو بنا سنوار لیا تھا لیکن زندگی کی حقیقت اور فطرت کے تقاضوں کو نہیں اپنایا تھا۔ انہیں یہ خیال کیوں نہیں آیا تھا کہ جو خون ان کی رگوں میں دوڑ رہا ہے وہی خون اس کی رگوں میں بھی تھا۔ یہی سوچتے ہوئے اس کی ذہنی رو شعیب کی جانب ہو گئی تو ایک دم جیسے اس کے پورے وجود میں سناٹا پھیل گیا۔ ویسا ہی مہیب سناٹا جو حویلی کے در و بام پر ہمیشہ لپٹا رہتا ہے۔ یہی سناٹا اس کی بغاوت کی بنیاد تھا۔ وہ ایک دم سے خوف زدہ ہو گئی۔ تبھی اس کے اندر سے ایک چیختی ہوئی صدا بلند ہوئی۔

"کیوں اب تم کیوں خوف زدہ ہو گئی ہو۔ یہ سناٹے تم نے خود چنے ہیں ـــ اب کیوں ڈرتی ہو؟"

"میں نے ـــ؟ نہیں تو ـــ میں نے کیوں یہ سناٹے چنے تھے؟" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم کیوں جھوٹ بولتی ہو ـــ محبت خود چل کر تیرے در تک آ گئی ـــ لیکن تم نے اس کی قدر نہیں کی ـــ شعیب

تجھے لینے کے لیے حویلی میں آ گیا تھا۔''

''میں نے کب اسے کہا تھا کہ وہ یوں خاموشی سے سر نیوڑائے ہر حکم مان لے۔۔۔ وہ لڑتا میرے لیے۔ وہ مجھے لے جانے کے لیے ضد کرتا۔۔ وہ پاگل ہو جاتا میرے لیے۔۔''

''کس برتے۔۔۔ کس ناطے وہ تیرے لیے یہ سب کرتا۔۔۔ کیا تو نے اسے مان دیا۔۔۔ عزت اور احترام کے اس استھان پر رکھا، جہاں پر کھڑا ہو کر وہ پورے اعتماد کے ساتھ تمہارے لیے لڑ سکتا۔ اجنبیوں کے ساتھ بھی ایسا سلوک نہیں کیا جاتا جو تو نے اس کے ساتھ کیا ہے۔۔''

اس کے اندر سے احتجاج اٹھا تو وہ لمحے اس کی نگاہوں کے سامنے آ گئے جب شعیب کمرے میں بیٹھا ہوا تھا اور وہ کمرے سے باہر دروازے کی درز میں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کس قدر بے بسی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ وہاں بیٹھا کسی اجنبی کی طرح سب کو دیکھ رہا تھا اور جب اس نے شرط رکھی تھی تو اس کا چہرہ کس قدر سرخ ہوا تھا۔ وہ کیا تھے۔۔۔ جذبات تھے۔۔۔ یا غصہ تھا۔۔۔ کیا تھا۔۔۔

''تو نے وقت خود اپنے ہاتھوں سے گنوا دیا ہے۔ تم لاہور میں اس کی تصویر دیکھنے سے لے کر اسے حقیقت میں اپنے سامنے دیکھنے تک، کوئی فیصلہ نہیں کر پائی۔ یہ مان لو کہ تم اپنے ہی فیصلے کے بوجھ تلے دب گئی ہو۔۔ اب اگر سناٹے تمہارے اندر پھیل گئے ہیں تو اس میں کسی کا قصور نہیں ہے۔۔ نہ حالات کا اور نہ ہی قسمت کا۔۔ تم نے اپنی خوشیاں خود دوسروں کو دے دی ہیں۔ اب تہی دامن ہو جانے کا کیا فائدہ۔ اپنی قسمت کو ریت کی مانند اپنی مٹھی سے اُڑا دیا ہے۔''

''نہیں، میں نے قربانی دی ہے۔۔'' اس نے چونکتے ہوئے سوچا۔

''غلط کہہ رہی ہو۔۔ اگر تم نے قربانی دینا ہوتی نا تو یوں تنہائی محسوس نہ کرتی۔ اپنے فیصلے پر افسوس زدہ، ماتم نہ کر رہی ہوتی۔ تم اپنے ذہن میں کچھ اور ہی لیے بیٹھی ہو۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہو، کیا تم پیر سائیں سے نفرت نہیں کرتی ہو؟''

''ہاں۔ انجھے نفرت ہے۔۔ لیکن مجھے شعیب پر بھی غصہ ہے اور میں۔۔۔''

''تم خود الجھی ہوئی ہو۔۔۔ تمہیں اپنی ذات کے علاوہ کچھ بھی دکھائی نہیں دے پا رہا ہے۔ اور اگر کچھ دکھائی بھی دے رہا ہے تو تم سمجھ نہیں پا رہی ہو کہ آخر کرنا کیا ہے۔۔ اور اپنے اسی احمق پن کی وجہ سے تم اپنی بازی خود ہار گئی ہو۔ نہ تمہاری بغاوت تمہارے کسی کام آئی۔۔ اور نہ تمہاری محبت۔۔۔''

''نہیں شعیب کو مجھ سے محبت ہے۔ ورنہ وہ یوں تڑپ کر میرے لیے حویلی نہ بھاگا آتا۔۔''

''تو پھر تو نے اس کا مان کیا رکھا۔ اس کے سامنے تک نہیں گئی۔۔ اور اگر تجھے اب شعیب کی محبت کا احساس ہے تو کیا۔۔۔؟ وہ تو اب فرح کا ہو چکا۔ اب اگر تم اپنی محبت کا اظہار بھی کرو گی تو فرح کی گنہگار ہو گی۔ جسے تم نے خود اپنے ہاتھوں سے سونپا ہے۔ مان لو، زندگی تمہارے در پر خوشیاں لے کر آئی، جسے تم نے خود لوٹا دیا۔

''میں اگر مان بھی لوں کہ میں نے خود اپنی خوشیاں دوسروں کو سونپ دی ہیں تو پھر کیا میری زندگی کی تنہائی ختم ہو جائے گی۔۔؟''

''ختم نہیں ہوگی، لیکن سکون تو ہو جائے گا۔ اپنا قصور مان لینے میں بڑا حوصلہ چاہیے۔''

''میں کیا کروں۔۔؟''

''کچھ بھی نہیں، بس تسلیم کر و کہ تم نے زندگی کے تحفوں کو ٹھکرا دیا۔ جس کے لیے تنہائی تمہارے سنگ اب چلے گی۔ کرنا یہ ہو گا کہ بجائے تنہائی کو عذاب سمجھنے کے۔۔ اس تنہائی کو اپنا دوست بنا لو۔۔ کسی کے سامنے اپنا دست سوال دراز نہ کرو۔ اپنی ذات میں کھو جاؤ۔ اپنی بے وقوفی، اپنے احمق پن۔ یا جذباتی لمحوں کا شاخسانہ۔۔ جو بھی نام دو۔۔ اسے بھول جاؤ۔ اور دنیا پر یہ ظاہر کردو کہ تم نے قربانی دی۔ اس پر قائم ہو۔۔''

''یہ تو منافقت ہوگی۔۔۔ میں تو منافقت نہیں کر سکتی۔۔''

''نہ کرو منافقت۔ لیکن کسی پر اپنی کمزوری تو ظاہر نہ کرو۔''

''کیسے۔۔کیسے۔۔۔میں تنہائی کو اپنا دوست بنا سکتی ہوں۔''

''یہ سوچنا ہوگا۔۔۔یہ مجبوری ہے۔۔کرنا ہوگا یہ۔۔۔''

''ہاں۔!میں اپنی تنہائی کو اپنا دوست بنا لوں گی۔گذری یادوں کے سہارے۔۔''اس نے بے بسی سے سوچا تو کافی حد تک اس کے دل میں سکون اتر گیا۔اسے لگا جیسے بہت بڑا بوجھ اس کے ذہن سے ہٹ گیا ہو۔وہ کھڑکی سے ہٹ کر اپنے بیڈ پر آن لیٹی۔تبھی خوشبو کے آوارہ جھونکے کی مانند شعیب کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے آ گیا۔اختر رومانوی کا ہیولا جو اس کے ذہن میں بنا تھا۔وہ اس سے یکسر مختلف تھا۔اس نے اختر کے بارے میں یہی ہیولا بنایا تھا کہ وہ پتلے سے بدن کا، عام سے لباس میں ملبوس ہوگا۔اس کے چہرے پر بے روزگاری نے کافی حد تک شباہت کو چھین لیا ہوگا۔ایک عام سا نوجوان جسے زندگی سے تو کوئی حصہ نہیں لیکن زندگی کے لیے خاص جدوجہد کرنا بھی کرنا چاہتا ہو۔کیونکہ خوابوں کی دنیا میں رہنے والے اکثر عملی زندگی میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔لیکن جب اس نے شعیب کو دیکھا تو اس کا خیال یکسر بدل گیا۔تصویر تو پھر تصویر ہوتی ہے۔زندہ وجود جب سامنے آ جائے اور جذبات واحساسات کی مہکتی ہوئی پرچھائیں اس کے ساتھ خود پر اثر انداز ہو جائے تو بندے کو بے خود کر دیتی ہے۔اسے فون پر کی جانے والی طویل باتیں یاد آنے لگیں۔گذری ہوئی راتوں کے وہ جذباتی لمحات جن میں اپنا آپ کسی کو سونپ دینے کو جی ہمک اٹھتا ہے۔باتوں کی آبشار میں وجود بھیگتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔دل بے ترتیب دھڑکنوں کو قابو کرنے کے لیے دل ہی نہیں چاہتا۔ہوا کے دوش پر بہہ جانے کو جی چاہتا ہے اور بدن سے اٹھتی ہوئی سوندھی سوندھی مہک بالکل کچی مٹی پر پانی چھڑکنے جیسی ہو جاتی ہے۔جس سے بے خود ہو جانا اچھا لگتا ہے۔وہ لمحے اپنی پوری قوت کے ساتھ اس کے گرد منڈلانے لگے۔جیسے پرندے کسی سرسبز درخت پر ایک کے بعد ایک آ کر بیٹھنے لگتے ہیں۔تبھی ان گذرے لمحوں نے اس کے احساسات اور جذبات میں ہلچل مچادی۔لیکن اس بار ان لمحات کی خوشبو تو پھیلی مگر اس میں ہجر کی وہ ٹیس بھی شامل تھی جس نے اسے بے قابو کر دیا۔مایوسی کی لہر پورے وجود میں زہر بن کر پھیلنے کو تیار ہو بیٹھی۔کھو دینے کے احساس نے اسے پوری طرح جکڑنے کی بھرپور کوشش کی۔تبھی وہ چونک گئی۔زندگی کی راہ پر اپنے فیصلے کا زادراہ لے کر ابھی تو وہ محض ایک قدم ہی چلی تھی کہ ہانپ کر بیٹھ گئی۔کیا وہ روز اسی طرح خود جنگ کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔سارا دن خود کو سمیٹنے اور رات بکھرتے گذرے گی۔؟وہ تو کسی منزل تک پہنچنے سے قبل ہی اپنا وجود ریزہ ریزہ کر بیٹھے گی۔۔کیا وہ تنہائی کے سراب میں کسی سہارے کی تلاش میں سراب دیکھتی رہے گی یا پھر اس صحرا میں تڑپتی ہوئی پیاسی دم توڑ جائے گی۔۔کیا اس کے مقدر میں زندگی کی لطافتوں سے بھرا ہوا کوئی سائبان نہیں ہوگا۔وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔اس کا پورا بدن پسینے میں نہا چکا تھا۔وہ کیوں بہک رہی ہے۔اسے تو اپنے فیصلے پر قائم رہنا ہے۔اس نے بے بسی سے خود پر غور کیا۔بدن کی تڑپ پکار رہی تھی اور وہ بے حال ہو کر خود کو بے بس محسوس کر رہی تھی۔اچانک اسے خیال آیا کہ وہ اگر بے بس ہے تو اس کے بنانے والا تو بے بس نہیں اسے اپنے رب سے مدد مانگنی چاہیے۔وہی تو سارے بے سہاروں کا سہارا ہے۔وہ اگر اس کے ساتھ ہوگا تو کہیں بھی کمزوری اسے راہ سے بھٹکا نہیں سکے گی۔اسے اپنے رب ہی سے مدد مانگنا ہوگی۔اس خیال کے آتے ہی اسے یوں لگا جیسے دہکتی ہوئی آگ پر چھاجوں پانی برس جائے۔ایک سکون کی لہر پورے وجود میں پھیل گئی۔ٹھنڈک کا احساس اس کے پورے وجود میں مہکنے لگا۔وہ جلدی سے اٹھی اور باتھ روم میں چلی گئی۔کتنی ہی دیر تک پانی کے چھینٹے منہ پر مارتی رہی۔پھر بڑے اہتمام سے وضو کیا اور کمرے میں آ گئی۔اس نے جائے نماز بچھائی اور اپنے رب کے حضور کھڑی ہو گئی۔کمرے سے باہر رات کا اندھیرا اپنا آپ منوار ہا تھا اور کمرے کے اندر نادیہ اس روشنی کا سراغ پانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔جس میں وہ اپنے شعور کی نگاہیں خود تھام سکتی تھی۔ہر طرف سکون چھا گیا تھا۔

☆☆☆

زندگی میں جب بنا خواہش کے بہت زیادہ خوشیاں مل جائیں تو انہیں سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔اور پھر وہ خوشیاں جن کے بارے میں بندہ بالکل ناامید ہوتا ہے۔سوکھے ہوئے پیڑ پر اچانک بہار آ جائے تو اس درخت کے ثمرات کو پانے کی بے چینی بندے کو بے حال کر دیتی ہے۔ناامیدی سے امید تک کے سفر میں کھو دینے کا تو احساس ہی نہیں ہوتا، بس پانے کی جستجو اور خواہش بڑھتی رہتی ہے۔جب پا لیا تو پھر کھو جانے کا خوف اپنی پوری ہیبت کے ساتھ بندے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔فرح کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔اس نے تو کبھی سوچا نہیں تھا کہ اس کی شادی ہو جائے گی۔اب جبکہ وہ خواب جیسے لمحات میں سے گذر رہی تھی۔شعیب کی محبت نے اسے نہال کر دیا ہوا تھا۔ایسے میں حویلی کی طرف سے آنے والی ہواؤں میں خوف زدہ کر دینے والے احساسات اسے دہلا دیتے تھے۔کبھی کبھی تو وہ اپنی ہی سوچوں سے گھبرا جایا کرتی تھی۔اس کے شادی کے پہلے ہی دن جب وہ حویلی گئی تھی۔تبھی نادیہ کو بھی دالاں پایا تھا۔لیکن آفرین ہے نادیہ پر اس نے شکوہ یا شکایت کا ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔بلکہ اسے زیادہ محبت سے اپنے اور خدمت کرنے کی تلقین کرتی رہی تھی۔نجانے اسے کیوں لگ رہا تھا کہ یہ خوشیاں جو اس کے حصے میں آئی ہیں، اس کی اپنی نہیں، نادیہ کی دی ہوئی ہیں۔

"فرح۔۔۔ارے او فرح۔۔کہاں ہو بیٹی۔۔"

زبیدہ پھوپھو کی آواز پر وہ اپنے خیالوں سے چونکی، وہ باہر کہیں کھڑی اسے آوازیں دے رہی تھی۔تب وہ جلدی سے نکل کر کمرے سے باہر آ گئی۔زبیدہ کاریڈور کے کنارے کھڑی تھی۔

"جی پھوپھو۔!" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کے پاس چلی گئی۔

"ارے بیٹا، شعیب کے آنے کا وقت ہو گیا ہے اور ابھی تک تم ویسے ہی پھر رہی ہو۔تھوڑا بہت تیار ہو جاتے ہیں بیٹی۔" زبیدہ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا

"ابھی میں نے کھانا بنوایا ہے خانساماں سے ۔۔کچن سے آ کر بیٹھی ہوں۔" اس نے وجہ بتائی تو زبیدہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اچھا تم تیار ہو کر آ جاؤ ڈرائینگ روم میں۔" زبیدہ نے کہا اور اس طرف بڑھ گئی۔اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ یونہی سوچنے لگی کہ سنا ہے ساس بہت ظالم ہوتی ہے۔یہاں تو یہ نعمت میسر تھی کہ وہ بالکل بڑوں کی مانند اس کی دیکھ بھال کرتی تھی۔وہ اپنی قسمت پر مسکرا دی۔

وہ تیار ہو کر ڈرائینگ روم میں آ گئی تو زبیدہ پھوپھو کو اپنی سوچوں میں گم پایا تب وہ اس کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"پھوپھو۔!میں نے دیکھا ہے کہ آپ زیادہ تر سوچوں میں گم رہتی ہیں آخر ایسی کیا بات ہے۔"

"بیٹی۔!یہ جو یادیں ہوتی ہیں نا۔۔۔یہ انسان کا بڑا سرمایہ ہوتی ہیں۔اچھے دن چاہے وہ بہت تھوڑے سے بھی ہوں۔۔وہ یاد آتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ ہم زندہ ہیں۔۔۔"

"اگر میں غلط نہیں تو کہہ سکتی ہوں کہ آپ پھوپھا کاشف کو یاد کرتی ہیں۔" اس نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹی۔!وہی تو میری زندگی کا حاصل تھا۔اس کا اور میرا ساتھ جتنا بھی تھا۔وہ ایسا تھا کہ بندہ چاہتے ہوئے بھی اسے نہیں بھلا سکتا۔" اس نے یادوں میں جھانکتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔پھر چونکتے ہوئے بولی۔"بیٹی۔!یہ جو تعلق ہوتے ہیں نا، بڑے نصیبوں سے بنتے ہیں۔ان کی حفاظت کرنا۔۔۔خوشگوار تعلق ہوں نا تو زندگی خوبصورت ہو جاتی ہے۔ورنہ تعلق نبھانے میں خونِ جگر بھی رائیگاں چلا جاتا ہے۔قسمت والے ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں زندگی میں اچھا ہمراہ مل جاتا ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔۔۔میں جو کبھی ایسے تعلق کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔مجھے یوں مل گیا کہ سوچنا بھی نہیں پڑا۔اور نادیہ کے من میں کیا ہے۔یہ میں نہیں جانتی، لیکن اس نے نہ صرف اپنے ہر فیصلے پر خود لکیر پھیری ہے بلکہ وہ کسی بھی فیصلے تک پہنچنے میں خود اپنی سوچوں کو سہارا نہیں لیتی۔ڈٹ جانے کی اس میں ہمت

ہی نہیں ہے۔" زبیدہ نے اپنے تئیں تجزیہ کرتے ہوئے کہا تو فرح تیزی سے بولی۔

"لیکن پھوپھو۔! آپ کو یہ ماننا پڑے گا کہ اس میں حوصلہ ہے، ورنہ وہ حویلی کی روایات کو توڑ کر اتنی دور نہ چلی جاتی۔"

"وہ ہی تو میں کہہ رہی ہوں، فیصلہ کر کے اس پر ثابت قدم رہنا نہیں آیا اس کو۔ اگر وہ شعیب کے لیے گئی تھی تو پھر اسے ہر حال میں شادی بھی اسی سے کر لینی چاہیے تھی۔ اپنے فیصلے پر قائم رہتی۔" اس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"شاید یہاں قدرت کا فیصلہ تھا۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"خیر۔ جو ہوا سو ہوا۔ نجانے آنے والے حالات میں کیا ہے۔ اس بارے کچھ بھی تو نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن۔! تم اپنے اس تعلق کو بہت خوشگوار رکھنا۔ اس کے لیے زندگی کی راہوں پر چلتے ہوئے بہت ساری قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔ شوہر اور بیوی کا تعلق اتنا گہرا ہے کہ ٹوٹے نہیں ٹوٹ سکتا۔ لیکن اگر اس میں کہیں شک کی دراڑ پڑ جائے تو کچے دھاگے سے بھی نازک تعلق ہوتا ہے۔ یہ سارا تعلق اعتماد اور یقین پر ہوتا ہے۔"

"جی پھوپھو۔! آپ میری راہنمائی کرتی رہیں نا۔" اس نے کافی حد تک خوف زدہ لہجے میں کہا۔ اس پر زبیدہ مسکرا دی اور بڑے پیار سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اور بڑے نرم لہجے میں بولی۔

"میں ہوں نا ادھر۔ لیکن تم خود کو مضبوط رکھنا۔"

یہ لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ باہر گاڑی رکنے کی آواز آگئی۔

"لگتا ہے شعیب آ گئے۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی تو زبیدہ نے اطمینان سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اچھا، میں نے شعیب سے بات کرنی ہے، تم لوگوں کے بارے میں، میری ہاں میں ہاں ملاتی رہنا۔"

"ٹھیک ہے، پھوپھو۔" فرح نے سعادت مندی سے کہا اور شعیب کی راہ تکنے لگی۔

وہ جب کھانا کھا چکے اور گپ شپ کے لیے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے کہ زبیدہ نے یونہی بات چھیڑ دی۔

"شعیب تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری شادی کو آج ایک ہفتہ ہو گیا ہے۔"

"جی امی۔" اس نے حیرت سے اپنی ماں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ یہ سوال ایویں نہیں، کسی خاص بات کی تمہید ہے۔

"اب تمہیں بھی معلوم ہے کہ یہ شادی کس حال میں ہوئی اور حالات کیا تھے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں اپنے بیٹے کی بارات دھوم سے لے کر جاتی، چار دن خوب ہلا گلا رہتا اور میں ہر ماں کی طرح اپنے ارمان پورے کرتی۔" وہ بڑی مسرت سے بولی تو شعیب نے خوشگوار انداز میں کہا۔

"امی۔! اس ساری تمہید کو چھوڑیں اور جو آپ نے اصل بات کہنی ہے وہ کہیں۔ ورنہ پھر میں نے یہ ضد کر لینی ہے کہ میری بارات لے کر جائیں اور فرح کو دوبارہ سے دلہن بنا کر لے آئیں۔"

"ویسے ہونا تو یہی چاہیے، لیکن اب اس میں وہ مزہ نہیں رہے گا۔" اس نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

"تو اصل بات بتائیں پھر۔؟" وہ بولا۔

"دیکھو، میرے تو ارمان پورے نہیں ہوئے۔ لیکن بے چاری کا کیا قصور ہے۔ اسے تو کہیں لے کر جاؤ، گھماؤ پھراؤ۔" زبیدہ نے فرح کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"امی، یہ سارا قصور آپ کا ہے۔ آپ نے پہلے کہا ہی نہیں۔ ورنہ میں اسے کب کا لے جاتا، ویسے کیا یہ بات فرح نے آپ سے کہی ہے؟" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"نہیں، میں نے خود سوچا ہے۔ اب ایسا کرو، پورے ایک ہفتے کی یا دس دن کی چھٹی لو، اور نکلو یہاں سے۔ مجھے بھی لاہور سے آئے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں۔"

"تو یوں کہیں نا، آپ کا جی یہاں نہیں لگ رہا۔" وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

"نہیں، اب میں نے کہاں جانا ہے پتر۔ مرنا جینا تم دونوں کے ساتھ ہے۔ تم ذرا شمالی علاقوں میں گھوم آنا اور

میں اتنے دن لاہور رہ لوں گی۔ بس اتنی سی بات ہے۔" وہ اداس لہجے میں بولی۔

"امی۔ کیوں نہ ایسا کریں۔ یہاں سے تبادلہ کروالیں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ نجانے اس کے لہجے میں حسرت کہاں سے اتر آئی تھی۔ زبیدہ نے اس کے لہجے پر توجہ دیئے بغیر کہا۔

"اگر تو لاہور میں ہوتا ہے تو پھر ٹھیک ہے، ورنہ کسی اور شہر میں ہو تو پھر کوئی فائدہ نہیں، وہ بھی ایسا ہی ہو گا۔ یہاں تو پھر حویلی نزدیک ہے۔ فرح کے لیے آسانی ہو گی۔"

"او کے۔! تو پھر آپ سامان باندھیں۔ میں نے پہلے ہی سے پندرہ دن کی چھٹی لے لی ہوئی ہے۔ میرا بھی دل کرتا ہے کہ میں جاؤں لاہور۔۔۔ اپنے دوستوں یاروں سے ملوں۔۔۔ کیوں فرح تم تیار ہو؟" آخری فقرہ اس نے فرح کی طرف دیکھ کر کہا جو ان کی باتوں کے درمیان بالکل بھی نہیں بولی تھی۔

"جی، جیسا آپ چاہیں۔" اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

"تو ٹھیک ہے کل دن کے وقت نکلتے ہیں۔" شعیب نے حتمی انداز میں کہا اور اٹھ گیا۔ زبیدہ نے فرح کی طرف دیکھا تو دونوں ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر مسکرا دیں۔ ان کے دل کی بات شعیب نے پہلے ہی بوجھ لی ہوئی تھی۔

اگلی صبح جب وہ ناشتے سے فارغ ہوئے تو شعیب نے فرح کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں تو پھر چلنے کے لیے تیار ہو؟"

"جی، میں بالکل تیار ہوں۔"

"اور امی۔؟"

"وہ بھی تیار ہیں۔"

"تو پھر نکلیں۔ سامان رکھواؤ گاڑی میں۔"

"وہ پھوپھو نے رکھوا دیا ہے۔ ڈرائیور انتظار کر رہا ہے۔"

"چلو پھر۔" یہ کہتے ہوئے شعیب اٹھا اور ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ جہاں زبیدہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ بولا۔ "چلیں امی۔"

"ہاں، وہ ذرا ڈرائیور سے کہہ دینا، حویلی کی طرف سے ہوتا ہوا چلے، جاتے ہوئے ان سے مل لیں۔" زبیدہ نے اٹھتے ہوئے تو وہ ایک دم سے چونک گیا۔ پھر خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"امی۔! اب چھوڑیں، وہاں پتہ نہیں کتنا وقت لگ جائے واپسی پر بھی۔"

"کتنا وقت لگے، زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ آدھا گھنٹہ۔ وہاں ہم نے سارا دن تھوڑی رہنا ہے۔" وہ حیرت سے بولیں۔

"تو امی، آپ پہلے حویلی سے ہو کر آ جائیں۔ پھر ہم نکل چلتے ہیں۔ میں آپ کا یہاں انتظار کرتا ہوں۔" اس نے کہا اور صوفے پر ٹک گیا۔ تب فرح کے چہرے پر پھیلی ہوئی ساری خوشگواری ختم ہو گئی۔ جیسے سورج کے آگے بادل آ گئے ہوں۔

"کیا تمہیں حویلی جانا اچھا نہیں لگتا؟" زبیدہ نے پوچھا تو اس نے صاف لفظوں میں کہا۔

"اچھا لگنے یا نہ لگنے کی بات نہیں، بس میں نے سوچ لیا ہے کہ وہاں نہیں جانا تو بس نہیں جانا۔"

"اس کی وجہ؟" وہ تیز لہجے میں بولی۔

"میں نہیں جانتا۔" اس نے یہ کہہ کر لاجواب کر دیا۔ ماحول میں ایک دم سے تلخی در آئی تو گزرتے ہوئے لمحے بھاری لگنے لگے۔ تبھی فرح نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"پھوپھو۔! اگر شعیب حویلی نہیں جانا چاہتے تو اس میں سوال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ان کی مرضی ہے کہ وہ جائیں یا نہ جائیں۔ انہوں نے ہمیں تو نہیں روکا۔ اگر آپ حویلی جانا چاہیں تو آپ ہو آئیں۔ میں بھی یہیں آپ کا انتظار کروں گی۔"

اس کے یوں کہنے پر زبیدہ نے بڑی گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ سمجھ گئی کہ وقت یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی کوئی بات منوا سکے۔ جب فرح ہی اپنے حق سے دستبردار ہو رہی ہے تو وہ اپنے بیٹے کی ضد کو تسلیم کیوں نہ کرے۔ یہ ایسا وقت بھی نہیں تھا کہ وہ اس سے حویلی نہ جانے کی وجہ پوچھے۔ وہ جتنا پوچھتی ماحول اتنا ہی کشیدہ ہو جاتا تھا۔ اس نے چند لمحے سوچا اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلو۔! سیدھے نکلتے ہیں۔ بعد میں جب آؤں کی

تو حویلی چلی جاؤں گی۔"

اس کے یوں کہنے پر شعیب چند لمحے اپنی ماں کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر تحمل سے بولا

"امی۔! آپ حویلی سے ہو آئیں بلکہ فرح کو بھی ساتھ میں لے جائیں۔ وہ ہمارا یوں اچانک جانا کسی اور ہی معنی میں نہ لے لیں۔"

"میں انہیں فون پر بتادوں گی۔ اور ہم ان کے پابند تھوڑی ہیں۔ جو انہیں بتاتے پھریں۔ جیسے ضرورت ہوگی وہ خود ہی فون کرلیں گے۔ چلو نکلو، اب دیر مت کرو۔" یہ کہتے ہوئے وہ باہر کی جانب چل دیں۔ وہ صوفے پر بیٹھا چند لمحے سوچتا رہا، پھر اٹھ گیا۔ فرح اس کے پیچھے پیچھے پورچ تک آ گئی۔ ذرا سی خفگی اب بھی اس کے من میں تھی۔ اس کے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے کار بڑھا دی۔ فرح نے پہلی بار سلامت نگر دیکھا تھا۔ بچپن میں شاید وہ ان گلیوں اور راستوں سے گذری ہوگی، جواب بہت بدل گئے تھے۔ اب اس کے سامنے جو منظر بھی تھے، وہ سب نئے تھے۔ وہ ان مناظر میں کھو جانا چاہتی تھی جو اسے شعیب دکھاتا۔

☆☆☆

کئی دن گذر گئے تھے۔ نادیہ کا من نجانے کیوں بھاری بھاری رہتا تھا۔ وہ لاکھ اپنی توجہ شعیب اور فرح کی طرف سے ہٹاتی، مگر پھر بھی ذہنی رو ان کی طرف چلی جاتی۔ نجانے کب کے کہانیوں میں پڑھے ہوئے واقعات اس کے ذہن میں تازہ ہو جاتے۔ اگرچہ ہر کہانی اور افسانے کا ہیروئین اور ہیرو الگ الگ تھے لیکن نادیہ کے ذہن میں آنے والے واقعات میں سارے ہیرو اب شعیب اور ہیروئین فرح بن چکے تھے۔ جو بھی واقعہ اس کے ذہن میں در آتا۔ اس میں صورت حال جو بھی ہوتی، اس ساری صورت حال میں اسے وہ دونوں دکھائی دیتے۔ انسان چاہے جتنا بھی خود کو اپنے قابو میں کرنے کی کوشش کرے لیکن یہ دماغ بھی عجیب شے ہے۔ سوچوں کے اتنے پہلو اس میں ابھرتے ہیں، شعور اور لاشعور کی اتنی کارفرمایاں اس میں ہیں کہ انسان خود اسی کے ہاتھوں بے بس ہو جاتا ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ ان دونوں کے بارے میں سوچے لیکن کوئی نہ کوئی سوچ وہ سوچتی چلی جاتی۔ وہ چونکتی اس وقت جب من میں ایک طرح کی یا بہت اور کھو دینے کا احساس جاگزیں ہو جاتا۔ دل سے اٹھنے والی ہوک اسے کہیں کا نہ رکھتی تو وہ خود سے شرمندہ ہو جاتی۔ جب اس نے اپنی محبت کسی دوسرے کی جھولی میں ڈال دی تو پھر پچھتانا کا ہے کا۔ یہیں سے اس کے اندر کشمکش کا آغاز ہو جاتا اور اس کے اندر بیٹھی ہوئی نادیہ سے گفتگو اس قدر بڑھتی کہ بحث تک جا پہنچتی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس بحث کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ یہ گفتگو، یہ بحث، یہ ہمکلامی، اس پر سوچیں ہمکلامی میں کبھی ہار جاتی اور کبھی جیت جاتی، لیکن اس کے دل میں کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ اس نے غلط کیا، کیونکہ اسی دوران اس کا اپنا مقصد پوری طرح تن کر اس کے سامنے آن کھڑا ہوتا تھا۔ باوجود شدید خواہش کے وہ اپنے مقصد کے لیے ایک بھرپور کوشش نہیں کر پائی تھی۔ وہ ابھی اس حصار ہی سے باہر نہیں نکلی تھی جو خود اس نے اپنے گرد باندھ لیا تھا۔ شاید وہ ان دونوں کو بھول کر اپنی دنیا میں کھو جاتی، جہاں اس کے اپنے تصورات تھے اور اپنی مرضی کی مملکت تھی مگر اس کی دنیا میں روزانہ ہی ہلچل پیدا ہو جاتی۔ اماں بی، زہرہ بی، یا پھر پیر سائیں کسی نہ کسی حوالے سے ان دونوں کا ذکر کر دیتے۔ بات یہیں سے شروع ہوئی تھی کہ وہ حویلی میں آئے بغیر لاہور کیوں چلے گئے؟ یہی سوال ان کے لیے سوہان روح تھا۔ کہیں محبت کا تقاضہ تھا، لیکن کھو جانے کا خوف تھا اور کہیں انا پر ٹھیس پڑی تھی۔ خود اس کی سوچ میں کیا تھا۔ یہ جاننے کی اس نے کبھی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اس کے اندر سے خود بخود کوئی واقعہ ابھرتا اور چشم زدن میں وہ ان دونوں کو پا لیتی۔ تب من کی دنیا ہی میں عجیب طرح کی لہریں اٹھ جاتیں۔ جنہیں وہ خود سمجھ نہ پاتی اور جو سمجھ آ تیں اسے نظر انداز کر جاتی۔

چاہیے تو یہ تھا کہ گذرتے دنوں کے ساتھ اس کی یہ کیفیات ماند پڑ جاتیں لیکن ایسا نہ ہوا۔ اب تو اس میں جذبات بھی شامل ہو گئے۔ حسرتیں بھی منہ کھولے آ جاتیں۔ امیدیں آنکھیں کھولے اس کی طرف تکنے لگتیں۔ اور خواہشات اپنے بال کھولے اس کا طواف کرنے لگتیں۔ ایسے میں وہ بے انتہا گھبرا جاتی۔ فرار کی

کوئی راہ اس کے پاس نہیں تھی۔یہی وہ کمزور ترین لمحات تھے جن میں وہ بے بسی محسوس کرتی تھی۔وہ بے حال ہو جاتی۔وہ جب ایسے لمحات پاتی، تو اپنی توجہ مبذول کرنے کی بجائے فرار چاہتی۔تب اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ سیدھے جا کر وضو کرتی اور اپنے رب کے حضور جا کر کھڑی ہو جاتی۔یہی وہ وقت ہوتا جب وہ دنیا سے ناطہ توڑنے میں پوری طرح تو نہیں مگر کافی حد تک کامیاب ہو جاتی۔وہ جب تک حاضر رہتی، تب تک سکون میں ہوتی۔پھر معمولات زندگی کی ابتداء ہوتی اور ایک دورانیے میں پھنس کر دوبارہ اسی کیفیت میں آ جاتی۔رسائل، کتابوں اور میگزین کے انبار لگ گئے تھے لیکن ایک لفظ بھی پڑھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔وجہ صرف یہی تھی کہ کسی بھی کہانی کا ہیرو شعیب ہوتا اور ہیروئن فرح۔دوسرا اسے کچھ دکھائی نہ دیتا۔اس لیے پڑھنے والی چیزیں اس کی منتظر رہنے لگیں۔سوائے رب کے حضور کھڑے ہونے کے، اس کے پاس فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

اس سہ پہر بارش ٹوٹ کر برسی تھی۔یوں لگ رہا تھا کہ سارے بادل آج ہی برس جائیں گے۔کچھ دیر پہلے ہی بی اماں اسے بتا کر گئیں تھیں کہ شعیب اور فرح سوات کی حسین وادی میں ہیں۔وہیں سے انہوں نے فون کر کے بتایا ہے کہ وہ کہاں کہاں کی سیر کر رہے ہیں۔اور کیسا محسوس کر رہے ہیں۔وہ تو چلی گئیں لیکن موسم کی گھٹن کے ساتھ اس کے اندر کی گھٹن بھی بڑھنے لگی تھی۔پھر اچانک ہی بارش ہونے لگی تو وہ اپنی کھڑکی سے آن لگی۔دور تک برستا ہوا پانی سارے مناظر کو دھندلا کر رہا تھا۔اور وہ خیالوں کی دنیا میں اپنے وجود کو بھلانے کی ناکام کوشش میں تھی۔بارش کا شور کم اور اس کے اندر کا شور کہیں زیادہ تھا۔اسے ہوش اس وقت آیا جب بارش تھم گئی، اس کے اپنے اندر کی اور باہر بھی۔اس نے اچانک ہی ایک فیصلہ کیا اور پھر اس پر عمل کرنے کا مضبوط ارادہ کر لیا۔اس نے اپنا بہترین لباس چنا اور باتھ روم میں گھس گئی۔

کافی دیر بعد جب سورج مغرب میں غروب ہو گیا اور شہر کے سارے برقی قمقمے روشن ہو گئے تب وہ کاسنی رنگ کے شلوار سوٹ میں ملبوس اور بڑی ساری سیاہ چادر میں خود کو چھپائے ڈرائینگ روم میں تھی۔اس کے ساتھ تاجاں مائی تھی، جس کے ہاتھ میں اگر بتیاں اور ڈھیر سارے پھول تھے۔اماں بی اور زہرہ بی دونوں وہیں براجمان تھیں۔اسے یوں دیکھ کر اماں بی نے پوچھا۔

''نادیہ بیٹی۔! کہاں جا رہی ہو؟''

''میں مزار پر جا رہی ہوں۔۔میں صاحب مزار کے لیے شاید اتنا نہیں، بلکہ اپنے والدین کی آخری آرام گاہ پر جانا چاہتی ہوں۔''

''لیکن تمہیں معلوم ہے کہ پیر سائیں نے حویلی کی سب خواتین کو مزار پر جانے سے منع کیا ہوا ہے۔'' زہرہ بی نے دھیمے سے لہجے میں اسے یاد دلایا۔

''آپ ایسا کریں، انہیں اطلاع دے دیں۔میرے خیال میں وہ مجھے منع نہیں کریں گے۔۔اور اگر انہوں نے منع کر دیا تو میں نہیں جاؤں گی۔واپس اپنے کمرے میں چلی جاؤں گی۔۔ایک ذرا بحث نہیں کروں گی۔'' نادیہ نے بڑے تحمل سے کہا۔اس پر بی اماں چند لمحے سوچتی رہیں۔پھر نادیہ کے چہرے پر پھیلے ہوئے اعتماد کو دیکھ کر بولی۔

''ٹھیک ہے، میں ایک بار پوچھ لوں۔''

''جی ضرور۔!'' نادیہ نے کہا اور وہیں سے پلٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔اماں بی نے تاجاں بی بی ہی سے کہا کہ وہ جائے اور پیر سائیں سے اجازت لے آئے۔وہ فوراً ہی مردان خانے کی جانب چلی گئی۔کافی دیر بعد جب کہ مغربی افق پر سرخی ختم ہو گئی۔تاجاں اس کے کمرے میں آئی۔

''بی بی سکین۔پیر سائیں نے اجازت دے دی ہے۔بس اتنا کہا ہے کہ عشاء کی اذان ہوتے ہی واپس حویلی پلٹ آئیں۔''

''اماں بی اور زہرہ بی کو بتا دی ہے یہ بات۔۔۔'' نادیہ نے پوچھا۔

''جی، میں انہیں بتا آئی ہوں۔''

''تو پھر چلو، ہمارے پاس تھوڑا سا وقت ہوگا۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا اور اپنی سیاہ چادر کو اپنے اردگرد یوں لپیٹ لیا کہ صرف آنکھیں دکھائی دیں۔

وہ درگاہ کے احاطے میں پہنچی تو وہ روشن تھا۔لیکن ہر

طرف سناٹا تھا۔ یوں جیسے وہاں کوئی نہ ہو۔ اچانک اسے درگاہ کی ایک جانب مزار کی جالی کے پاس بہت ساری خواتین دکھائی دیں ورنہ وہاں کیا کسی مرد کا کوئی وجود نہیں تھا۔ وہ اس حیرت میں تھی کہ وہ ادھیڑ عمر خاتون اس کی طرف بڑھ آئی جو درگاہ کی خدمت گذاروں میں سے ایک تھی۔ وہ اسے دیکھ کھنچی چلی جا رہی تھی۔ اس کے انداز سے یہی لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اس کی آمد کی منتظر ہو۔ پھر اس نے اظہار کر ہی دیا۔

''بڑی خوشی ہوئی بی بی سکین آپ یہاں تشریف لائیں۔ عرصے بعد مرشد خاندان کی کوئی بی بی یہاں تشریف لائیں ہیں۔

''تو کون ہے اور تجھے میری آمد کے بارے میں کیسے پتہ ہے۔'' نادیہ نے حیرت سے پوچھا۔

''بی بی سکین آپ ہم سے کیا بھولی ہوئیں ہیں۔ زندگی گذار دی ہے یہاں خدمت کرتے۔ پہلے حویلی میں تھی اب یہاں ہوں۔۔۔ اور باقی رہی بات کہ آپ کی آمد بارے کیسے پتہ ہے تو ابھی کچھ دیر پہلے پیر سائیں کا حکم ہوا تھا کہ بی بی سکین درگاہ پر آ رہی ہیں۔ اس لیے کوئی بھی مرد احاطے میں نہ ہو۔ اور جب تک آپ یہاں ہوں، کسی کو آنے کی اجازت نہ دیں۔ صرف خواتین رہ سکتی ہیں ادھر۔''

''اچھا تو یہ پیر سائیں کا حکم تھا۔'' وہ ہمکلامی کے سے انداز میں بولی۔

''جی بی بی سکین۔'' وہ خدمت گار خاتون کو سمجھ نہ آیا تو اس نے پوچھا۔

''کچھ نہیں، تم جاؤ اپنا کام کرو۔'' نادیہ نے کہا اور درگاہ کے اس کونے کی جانب دیکھا جو احاطہ پار کر کے تھوڑا فاصلے پر تھا اور اسی کونے میں پہلو بہ پہلو اس کے والدین دفن تھے۔ وہ مزار پر حاضری دینے کی بجائے سیدھا اپنے والدین کے مرقد پر گئی۔ وہاں جاتے ہی اس نے قبر پر پھول ڈالے، اگر بتیاں سلگائیں اور دونوں قبروں کے درمیان بیٹھ گئی۔ سفید پتھروں سے آراستہ پختہ قبروں کے درمیان، سیاہ چادر ڈالے، آنکھیں بند کر کے سر جھکائے وہ کافی دیر تک زیر لب پڑھتی رہی۔ پھر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ سیاہ چادر کے پس منظر میں اس کے دونوں گورے ہاتھ یوں دکھائی دینے لگے۔ جیسے چمک رہے ہوں، حنائی ہاتھ، جڑاؤ کنگن اور بھرے بھرے ہاتھ۔ آنکھیں بند، ہلتے لب اور روشن چہرہ، اس وقت وہ کسی اور ہی جہاں کی مخلوق لگ رہی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر تک یونہی بیٹھی دعا مانگتی رہی۔ پھر جیسے اسے سکون آ گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور اپنے اردگرد دیکھا، ویسا ہی سناٹے سے بھرا ماحول تھا۔ دور کہیں اکا دکا خواتین آتی جاتی نظر آ رہی تھیں۔ وہ اپنے والدین کے مرقد سے اٹھی اور درگاہ کے صاحب مزار کی جانب بڑھ گئی۔ وہ اس کے پڑدادا تھے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ صاحب کرامات اور مستجاب الدعا شخصیت تھے۔ ان دنوں ان کی نہ حویلی تھی اور نہ ہی جاگیر، وہ فقیر آدمی تھا اور نجانے کہاں سے آ کر بستی کے باہر ڈیرے ڈالے تھے۔ ادھیڑ عمری میں انہوں نے یہاں کی ایک خاتون سے شادی کی اور پھر ایک گھر بنا کر رہنے لگے تھے۔ یہ حویلی تو ان کے دادا کی جوانی کے دور میں بنی تھی جب مریدین نے اصرار پر درگاہ تعمیر کی تھی۔ انہی دنوں ملک تقسیم ہوا تو درگاہ کے نام پر کافی ساری زمین دادا کی کوششوں سے الاٹ ہو گئی۔ انہوں نے اپنے مریدین کے ذریعے ان زمینوں کو آباد کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بستی تیسری نسل آنے تک تحصیل کا درجہ پا گئی اور بڑے قصبے کا روپ دھار گئی۔ نادیہ کو اپنے خاندان بارے ساری معلومات تھیں۔ وہ انہیں خیالوں میں کھوئی ہوئی مزار کی جالی کے پاس چلی گئی۔ جہاں کچھ خواتین پہلے ہی سے موجود تھیں۔ اسے دیکھتے ہی وہ وہاں سے ہٹ گئیں۔ جالی سے اندر کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ سنگ مرمر کی جالی منقش تھی۔ اور اس پر لوگوں نے مختلف رنگوں کے دھاگے باندھے ہوئے تھے۔ بڑے چھوٹے، نیلے پیلے، سرخ، سبز، ہر رنگ اور ہر طرح کے دھاگے۔۔۔ وہ انہیں دیکھنے لگی۔ بظاہر تو ان دھاگوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی، لیکن جس وقت یہ دھاگے اس جالی سے باندھے گئے تھے، تب دھاگہ باندھنے والے کے من میں نجانے کیسی خواہش ہوگی۔ وہاں جتنے بھی دھاگے بندھے ہوتے تھے ہر دھاگے کی گرہ میں کم از کم ایک خواہش تو پنہاں تھیں۔ اس جالی پر نجانے کتنی

خواہشیں پوری ہونے کی منتظر تھیں۔ ممکن ہے ان میں کچھ پوری بھی ہو گئی ہوں۔ یہ گرہیں خواہش کی نجانے کتنے سپنوں میں لپٹی ہوئی ہوں گی۔ کاش اس میں کوئی ایسی صلاحیت ہوتی کہ وہ جس گرہ پر ہاتھ رکھتی اسے معلوم ہو جاتا کہ اس میں کون سی خواہش پنہاں ہے۔ تب کتنا اچھا لگتا۔ تب اگلے ہی لمحے وہ مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں جا گری۔ اگر یہ معلوم بھی ہو جائے کہ کس گرہ میں کون سی خواہش بندھی ہوئی ہے تو کیا وہ کسی بھی خواہش کو پورا کرنے کی مجاز ہے؟ ایسا ہو نہیں سکتا۔ یہ تو قدرت کے کارخانے میں دخل اندازی کے مترادف ہے۔ رنگوں بھری یہ گرہیں خواہش کی نجانے اپنے اندر کتنی رنگین و سنگین حسرتیں رکھتی ہوں گی۔ وہ یہ سوچ تو سکتی ہے کہ ان گرہوں میں خواہشیں لپٹی ہوئی ہیں، وہ خواہشیں کیسی ہیں یہ نہیں جان سکتی تھی۔ وہ پوری توجہ سے اس بارے سوچتی چلی گئی تھی۔ تب اس نے ایک گہری سانس لی، اور مزار کے اندر دیکھنے لگی، وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک احساس اس کے سراپے میں پھیل گیا کہ زبیدہ پھوپھو نے یہیں کاشف پھوپھا کو دیکھا تھا، اسی جالی سے جہاں رنگین دھاگوں میں خواہش وقت کی صلیب پر ٹنگی ہوتی ہیں۔ انہوں نے جو خواہشیں کی وہ پوری تو ہوئی لیکن یوں کہ پوری زندگی ایک گرہ کی مانند ہو کر رہ گئی۔ کاشف پھوپھا، کچھ عرصہ زندہ رہے اور پھر یہ دنیا چھوڑ گئے۔ ساری رنگینیاں پھر سنگینی میں بدل گئیں۔ اور پھر اس کے اپنے ساتھ کیا ہوا۔۔۔؟ یہ سوچ آتے ہی وہ چونک گئی۔ وہ گھوم پھر کر اپنی ہی ذات کے بارے میں سوچنے لگ جایا کرتی تھی۔ کیا وہ خود کو مظلوم سمجھتی ہے؟ یہ سوال بذات خود اسے اپنی ذات کے بارے میں سوچنے پر آمادہ کر رہا ہے۔ اس نے اپنا سر جھٹک دیا۔ اور ایصال ثواب کے لیے قرآنی آیات پڑھنے لگی۔

دعا مانگنے کے بعد جب اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرے تو ایک سکون اس کے من میں اترتا چلا گیا۔ وہ اٹھ گئی۔ تب اسے احساس ہوا کہ مزار پر ڈالنے کے لیے پھول تو ابھی تاجاں مائی ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ آگے بڑھی اور تاجاں مائی سے پھول لیے اور اس کمرے میں داخل ہو گئی جہاں مزار تھا اور اس میں کسی عورت کو جانے کی قطعاً اجازت نہیں تھی۔ دہلیز پار کرتے ہی وہاں موجود خواتین کی چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ تاجاں مائی کے ساتھ ساتھ وہاں پر موجود خدمت گار خواتین کے رنگ بھی فق ہو گئے۔ ایک طرف انہیں یہ خوف تھا کہ پیر سائیں کو کیا جواب دیں گی اور دوسری طرف بی بی سئین کو روک بھی نہیں سکتی تھیں۔ مزار پر آتے ہی نادیہ نے اس روایت کو بھی توڑ ڈالا تھا۔ اس نے مزار پر پھول چڑھائے۔ واپس پلٹنے لگی تو نجانے اس کے دل میں کیا آئی۔ اس نے مزار پر پڑی بہت ساری چادروں میں سے ایک چادر اٹھا کر اپنی سیاہ چادر پر اوڑھ لی۔ چند لمحے وہاں کھڑی رہی اور پھر وہاں سے نکل آئی۔ وہ کمرے سے نکلی اور احاطے میں آ گئی۔ واپسی پر درگاہ کے احاطے میں موجود ایک پرانے درخت پر اس کی نگاہ پڑی۔ جس پر مختلف رنگوں کے دھاگے باندھے ہوئے تھے۔ وہاں اور کچھ بھی باندھا ہوا تھا۔ رنگین رومال، رنگ برنگے شیشوں والے پراندے، چھوٹی بڑی گھنٹیاں، لکڑی کے چھوٹے چھوٹے جھولے۔۔۔ اور نجانے کیا کچھ اندھیرے اور ذرا اونچائی کے باعث وہ اچھی طرح دیکھ نہیں پائی تھی۔ اس نے سوچا، یہ بھی تو گرہیں خواہش کی ہیں۔ کس گرہ میں کیا ہوگا؟ لیکن یہ وقت سوچنے کا نہیں تھا۔ وہ اب واپسی کی راہ پر تھی۔

اپنے کمرے میں آتے ہی وہ سیدھے آئینے کے سامنے گئی۔ اس نے مزار سے لی ہوئی چادر کو دیکھا، سبز رنگ کی رنگ برنگی چمکیلی کڑھائی اور لیس سے آراستہ، اسے خود کو آئینے میں دیکھ کر یوں لگا جیسے وہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہو۔ وہ دنیا، جس میں وہ خود کر دیکھنا پسند کرتی ہے۔ ایک الوہی ہالہ اس کے اردگرد پھیل گیا تھا۔ وہ چند لمحے خود کو دیکھتی رہی، پھر وہ چادر اتار کر اونچی جگہ پر رکھ دی۔ ایسے میں تاجاں مائی اس کے لیے کھانا لے کر آ گئی۔ اس نے ذرا سا چکھا اور پھر اپنے ہی خیالوں میں کھو گئی۔ وہ چونکی اس وقت جب عشاء کی اذان نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ اٹھی اور اپنے رب کے حضور پیش ہونے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

رات کا نجانے کون سا پہر تھا، اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ کتنی دیر تک وہ اس خواب کے حصار میں رہی

جس کے ٹوٹ جانے سے وہ بیدار ہوئی تھی۔ عام طور پر ہوتا یوں ہے کہ کوئی بھی دیکھا گیا خواب پوری طرح یاد نہیں رہتا۔ اس کا کچھ حصہ شعور سے محو ہو جاتا ہے کچھ دھندلا رہ جاتا ہے اور تھوڑا بہت یاد رہتا ہے۔ مگر وہ خواب اسے پوری طرح یاد تھا۔ اس کی ایک ایک جزئیات اس کے ذہن میں پوری طرح عیاں تھی۔ وہ عشاء پڑھنے کے بعد بیڈ پر لیٹی تو پتہ نہیں کب اس کی آنکھ لگی تھی۔ سوتے ہوئے اس کے ذہن میں درگاہ اور اس کا ماحول تھا۔ سنگ مرمر کی جالیوں پر دھاگوں سے پڑی ہوئی گرہیں خواہش کیں ۔ درخت پر بندھیں خواہشیں۔ مزار کے اندر کا ماحول، والدین کی قبر اور وہاں جو اسے سکون ملا، سب کو وہ محسوس کرتے ہوئے سو گئی تھی۔ پھر اسے یوں محسوس ہوا کہ وہ سمندر کے کنارے کھڑی ہے۔ حالانکہ اس نے پوری زندگی میں کبھی سمندر نہیں دیکھا تھا۔ بس قصے کہانیوں میں پڑھا تھا۔ یا پھر تصویریں دیکھی تھیں۔ مگر وہاں کا ماحول ہی کچھ دوسرا تھا۔ وہ کنارے پر کھڑی ہے اور دور افق پر سورج طلوع ہو رہا ہے۔ جس کی نارنجی روشنی میں وہ سمندر کا نیلگوں پانی دیکھ رہی ہے۔ تواتر سے اور ایک دورانیے میں لہریں آ رہی ہیں اور اس کے قدموں کے پاس آ کر بنا چھوئے واپس پلٹ رہی ہیں۔ تبھی وہ آگے بڑھتی ہے اور ایک لہر پر سوار ہو جاتی ہے۔ وہ لہر اسے لے کر چل پڑتی ہے۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا، نیلگوں پانی، زمین نجانے کہاں چلی گئی تھی اور وہ سمندر پر کھڑی تھی، لہر اسے خود پر سوار کیئے بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ اس نے گہرے سبز رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا اور اس کے لمبے گھنیرے بال ہوا سے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ اچانک اسے دور ایک جزیرہ دکھائی دی، جس میں ایک محل کے برج دکھائی دینے لگے۔ سفید محل لمحہ بہ لمحہ اس کے نزدیک ہونے لگا۔ یہاں تک کہ وہ جزیرے کے کنارے تک آ پہنچی۔ گہرے سبز درختوں اور رنگ برنگے پھولوں کی بہار، ہلکی ہلکی باد نسیم اور پرندوں کی مختلف آوازیں۔ ایک عجیب فرحت آگیں منظر تھا۔ جس میں خوشبو رچی ہوئی تھی۔ جہاں سمندر ختم ہو رہا تھا وہیں سے جزیرے کے کنارے سے، ایک خوبصورت روش دور محل تک جا رہی تھی۔ اس نے اس روش پر قدم رکھ دیا۔ پھر وہ یہیں راستہ چلنے لگا۔ جس طرح لہر اسے یہاں تک لے آئی تھی۔ بالکل ویسے ہی وہ روش اسے محل تک لے گئی۔ وہاں کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ محل میں داخل ہو گئی۔ وہاں ہر شے سفید تھی، جیسے ہی دروازے سے اندر گئی ایک بہت بڑے کمرے کے درمیان میں سفید چاندنی پر ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ سفید ریش، سفید لباس۔ ان کے قریب ہی ایک جواں سال جوڑا بھی تھا۔ انہوں نے بھی سفید لباس پہنا ہوا تھا۔ مرد نے سفید پگڑی اور خاتون نے سفید چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ وہ تینوں اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی ان کے قریب پہنچ گئی اور اسی سفید چاندنی پر ان کے قریب بیٹھ گئی۔

"خوش آمدید بیٹی۔! ہم شاید تجھے ابھی نہ بلاتے مگر تو نے جس شدت سے ہمیں یاد کیا ہے۔ ہمیں خود چل کر تمہارے پاس آنا پڑا۔ پہچانتی ہو میں کون ہوں؟" اس سفید ریش بزرگ نے بڑی محبت سے پوچھا۔

"نہیں۔! میں نے آپ کو نہیں دیکھا پہلے۔۔ کون ہیں آپ۔۔؟" اس نے ہولے سے کہا۔

"میں تمہارا پڑدادا ہوں بیٹے۔! آج تم میرے پاس آئی ہو تو مجھے اچھا لگا۔۔ تمہارا خلوص اور تمہارے اندر اپنی تلاش، یہی ضرورت تھی۔۔ اور انہیں دیکھو، یہ کون ہیں؟" اس بزرگ نے کہا تو نادیہ نے تب ان کی جانب دیکھا، وہ حیرت میں کھو گئی۔ وہ بالکل اس کے ماں باپ جیسے تھے۔ جن کی تصویر اس نے کمرے میں رکھی ہوئی تھی۔ اس نے ان کی طرف دیکھ کر لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یہ میرے والدین ہیں۔۔"

"ہاں۔! یہ تمہارے والدین ہیں۔ یہ تم سے بات نہیں کر پائیں گے۔۔ بس تمہیں اتنی اجازت ہے کہ تم انہیں دیکھ سکو اور یہ اطمینان کر لو کہ یہ بہت اچھی جگہ پر ہیں۔ ہاں اگر تم ان سے ہمکلام ہونا چاہو، ان سے باتیں کرنا چاہو یہ مرحلہ ابھی دور کا ہے۔ اس سے تمہیں گذر کر آنا ہوگا۔"

"بتائیے۔! میں وہ مرحلہ طے کر کے اپنے والدین سے ضرور باتیں کروں گی۔ وہ کیسا مرحلہ ہے۔۔ میں

اسے ضرور پار کروں گی۔۔"

"وہ کوئی نیا مرحلہ نہیں ہے۔ ایک ہی ہے۔۔سیدھا راستہ۔۔اس پر چلتی چلی جاؤ گی تو یہ مرحلہ بھی طے ہوتا چلا جائے گا۔ بس تم میرے پاس آتی رہا کرو۔۔سارے مرحلے خود بخود طے ہوتے چلے جائیں گے۔" انہوں نے کہا تو اسے کچھ ڈھارس بندھی۔ ایک ملال جو اس کے من میں بگولے کی طرح اٹھا تھا۔ وہ ایک دم ختم ہو کر رہ گیا وہ دونوں اس کی جانب ایک تک دیکھے چلے جا رہے تھے۔ ان کے چہروں پر کسی قسم کے کوئی جذبات نہیں تھے۔ ناویہ ان کی طرف دیکھتی رہی۔ لیکن دل میں یہ خواہش نہیں ابھری کہ وہ آگے بڑھ کر انہیں چھو لے۔۔ وہ یوں ہو گئی تھی کہ جیسے اس کے اندر سے ساری توانائی کشید کر لی گئی ہو اور وہ بے جان سی ان کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہو۔

"میں آپ کے پاس آتی رہا کروں گی۔۔میری رہنمائی کرتے رہیے گا۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ کسی انسان سے کچھ مت مانگنا۔۔ مانگنا تمہاری سرشت ہی سے خارج ہو جانا چاہیے۔ جو کچھ بھی لینا ہے۔۔وہ صرف ایک ہی ہستی سے، بس عرض کر دینا ہے، تمہارے لیے بہتر ہو گا تو مل جائے گا، نہیں بہتر ہو گا تو نہیں ملے گا۔ اب تم جاؤ۔" سفید ریش بزرگ نے کہا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کے والدین نے بھی آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر مزید بیٹھنے کی اسے چاہت ہی نہیں ہوئی، وہ اٹھی اور محل سے نکلتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ روش اسے جزیرے کے کنارے تک لے آئی۔ وہاں لہر اس کے انتظار میں تھی۔ اس نے سمندر میں اپنا پاؤں ڈالا تو وہ پھر لہروں کے دوش پر تھی۔ یہاں تک کہ وہ ساحل تک آ پہنچی۔ یہیں اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ تب وہ یہ محسوس کر رہی تھی کہ جزیرے پر جو خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ یہاں اس کے کمرے میں بھی ہے۔ وہ آنکھیں بند کر کے اس خواب کو کئی بار اپنے ذہن میں دہرا چکی تھی۔ ہر بار انہی جزئیات کے ساتھ وہ اسے پوری طرح یاد تھا۔ خوشبو تھی کہ اس کے کمرے میں اس خواب کو ماورائی بنا دینے کا بھرپور احساس دے رہی تھی۔ کافی دیر تک یونہی بے خیالی میں بیٹھی رہی۔

"یہ کیسا خواب تھا؟" اس نے خود سے سوال کیا۔

"جو بھی تھا تم خود جانتی ہو۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ خوابوں میں اشارے ہوتے ہیں۔ تمہیں خواب پوری طرح یاد ہے تو ان جزئیات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"کون سمجھائے گا مجھے۔"

"تم سمجھنے کی کوشش تو کرو جس طرح یہ خواب تمہیں خود بخود آ گیا ہے۔ ویسے ہی سمجھنے سمجھانے کے سارے مرحلے طے ہو جائیں گے۔۔"

"اور وہ سیدھا راستہ۔"

"ایک ہی تو ہے۔۔صراط مستقیم۔ جو ہر ایک کے لیے ہے۔۔الوہی پیغام۔۔پڑھنا ہے تو اسے پڑھو۔۔سب سنور جائے گا۔"

"ہاں۔! پڑھنا بھی ہے۔۔مجھے سمجھنا بھی ہے۔۔خواب کی ایک ایک رمز کو جاننا ہے۔ میں سمجھ لوں گی۔۔" اس نے عزم سے سوچا۔ پھر اٹھ کھڑی ہوئی، اس نے دیوار پر لگے کلاک کو بھی دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ وہ اٹھی اور وضو کرنے کے لیے بڑھ گئی۔ وہ ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے اچھی طرح سمجھ آ گئی تھی کہ اسے اگر کچھ لینا ہے تو ایک ہی ہستی ہے۔۔ باتیں کرنی ہیں اپنے بارے میں کچھ کہنا ہے تو فقط اسی ایک ہستی سے جس نے اسے پیدا کیا ہے۔ انسانوں کے ساتھ سارے معاملات میں کہیں نہ کہیں مانگنے کا عنصر پیدا ہو جاتا ہے۔ زندگی کے گہرے راز کیا ہیں۔ اسے یہ سمجھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ راز سمجھے، سمجھ میں نہیں آتے جس پر رحمت نازل ہو جائے تو پھر کائنات کے راز بھی عیاں ہونے لگتے ہیں۔ یہ اس کی عنایت ہے۔ جس پر ہو جائے۔ جب بات ٹھہری ہی اس کی رحمت پر تو پھر اس کی خوشنودی کیوں نہ حاصل کی جائے۔ یہ نکتہ اسے الہام ہو گیا تو سارے تفکرات اس سے دور ہو گئے۔ وہ پورے سکون سے جائے نماز پر آن کھڑی ہوئی۔ خوشبو کا احساس تیز ہو گیا تھا تو اسی قدر سکون اس کے اندر اتر گیا۔

☆☆☆

مغرب کا وقت ختم ہو چکا تھا اور حویلی جگمگا اٹھی تھی۔ رات بے تابی سے چھائی تو پھر بڑھتے ہی چلے

جانے کو بے تاب ہو گئی۔ ایسے میں پیر سائیں کھانے کی میز پر آ بیٹھے۔ بہت دنوں بعد وہ حویلی میں یوں کھانے کے لیے آئے تھے۔ ورنہ یہ وقت ان کا مردان خانے میں گذرتا اور دسترخوان وہیں لگایا جاتا تھا۔ آج خاص طور پر کھانا حویلی میں کھانے کے لیے کہا تو خاصا اہتمام کر لیا گیا۔ اماں بی اور زہرو بی وہاں موجود تھیں یا پھر حویلی کی خادمائیں جو ان سے ذرا فاصلے پر موجود تھیں۔

''نادیہ بیٹی نہیں آئی۔؟''

''نہیں۔اس نے آنے سے منع کر دیا تھا۔'' اماں بی نے ہولے سے کہا۔

''کیا اسے بتایا نہیں گیا تھا کہ آج۔۔۔'' پیر سائیں نے کہتے ہوئے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''بتایا تھا مگر اس نے اپنا کھانا کمرے ہی میں منگوا لیا۔'' انہوں نے دوبارہ کہا تو پھر وہ نہیں بولا۔ خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ سیر ہو گیا تو ڈرائنگ روم میں صوفے پر جا بیٹھا۔ چائے اسے وہیں دے دی گئی۔ تبھی اس نے اماں بی سے کہا۔

''نادیہ بیٹی کو ذرا بلوائیں۔ کئی دن ہو گئے میں نے اسے دیکھا نہیں ہے۔''

اس کے یوں کہنے پر اماں بی نے اپنی ملازمہ کو اشارہ کیا تو وہ چلی گئی۔ وہ خاموشی سے چائے پیتے رہے لاشعوری طور پر نادیہ کا انتظار کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد وہ بڑی ساری سیاہ چادر میں لپٹی وہیں آ گئی۔ اور ایک طرف کھڑی ہو کر پیر سائیں سے بولی۔

''جی پیر سائیں، حکم۔''

''آؤ بیٹھو بیٹا۔ میں نے تم سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔'' پیر سائیں بولا تو وہ ایک طرف پڑے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اور خاموش رہی۔ کتنے ہی لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے تو وہ بولا۔'' نادیہ بیٹی۔ میں نہیں جانتا کہ تمہارے ذہن میں کیا ہے۔ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں بہت کچھ مثبت نہیں ہے۔ جس کا اظہار تم نہیں کر پاتی ہو مگر اپنے رویے سے اظہار بھی کر دیتی ہو۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ آخر ایسی کیا بات ہے، جو تم کہنا چاہتی ہو مگر کہہ نہیں پاتی۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''نہ دلاور شاہ تمہیں کیا احساس ہے کہ ایسا سوچا تم نے۔'' اماں بی نے آہستگی سے پوچھا۔

''دیکھیں اماں بی، کل نادیہ بیٹی نے دربار شریف پر جانے کی اجازت چاہی، جو میں نے دے دی، میں نے یہ اہتمام کر دیا کہ جب تک یہ وہاں پر ہے، کوئی مرد دربار کے احاطے میں داخل نہیں ہوگا۔ لیکن اس نے وہاں کی ایک ایسی روایت کو توڑ دیا، جو وہاں نہیں ہوتی تھی۔'' آخری لفظ کہتے ہوئے وہ گڑبڑا گیا۔

''میں مزار کے اندر چلی گئی تھی جہاں بڑے پیر صاحب دفن ہیں۔'' نادیہ نے آہستگی سے کہا۔

''کیوں۔'' پیر سائیں نے تحمل سے پوچھا۔

''بس۔ میرا دل کیا اور میں چلی گئی۔'' وہ تیزی سے مگر دھیمی آواز میں بولی۔

''بیٹا۔! اگر ہم ہی اپنی روایات کی پاسبانی نہیں کریں گے تو پھر دوسرا کون کرے گا۔ یہ اور بات، اصول و ضوابط اس لیے بنائے گئے ہیں کہ لوگ اپنی جگہ حصار میں رہیں۔ ان کی ایک حد مقرر کر دی گئی ہے کہ وہ جہاں رہیں، وہیں تک محدود ہو جائیں۔ انہیں یہ احساس ہو کہ ہم میں اور ان میں ایک فاصلہ ہے۔''

''مگر میں تو کسی سے نہ فاصلے کے بارے میں سوچتی ہوں اور نہ قربت کے بارے میں۔ مجھے ان باتوں سے کیا لینا دینا۔ میں نے اب یہ سوچا کہ میں ہفتے میں ایک دن ضرور درگاہ پر جایا کروں۔''

اس نے کہا تو پیر سائیں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بجائے اس کی بات کو سمجھ کر اس پر آئندہ عمل کرنے کا وعدہ کرتی۔ وہ تو اپنا ارادہ ظاہر کرنے لگی تھی۔ اسے ایک دم سے غصہ تو بہت آیا لیکن خود پر قابو پا کر بولا۔

''دیکھو بٹی۔ میں جو تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔ ان روایات کی حفاظت ہم ہی نے کرنی ہے۔ اور یہ ہم پر کسی فرض کی مانند لاگو ہیں۔''

''پیر سائیں۔! آپ میرے ایک سوال کا جواب دیں۔ کیا سارے فرائض کی ادائیگی ہم عورتوں کے لیے ہی ہے۔ ان کا حق کوئی نہیں۔ یا پھر ہم عورتوں کی مخلوق حقوق کے لیے بنی نہیں، ان پر صرف فرائض ہی لادے

جاتے ہیں۔"

"نادیہ۔!" پیر سائیں نے ایک دم سے اسے جھڑک دیا۔ "میں اگر تم سے انتہائی تحمل سے بات کر رہا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں تم سے اپنی بات نہیں منوا سکتا۔ تمہیں وہی کرنا پڑے گا، جو میں کہتا ہوں۔"

"لیکن مجھے اپنی زندگی گزارنے کا پورا پورا حق ہے اور میں حق کو پوری طرح استعمال کروں گی۔ یا پھر آپ مجھ سے میری زندگی کا حق چھین لیں۔" اس نے آنکھیں نیچی کیئے بے خوف انداز میں کہہ دیا۔ جس پر پیر سائیں نے شدید حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس کے منہ پر ہی اس کا حکم ماننے سے انکار کر رہی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر تک خاموش بیٹھا رہا، پھر اٹھتے ہوئے بولا۔

"اگر یہ کرنا پڑے گا تو میں کرلوں گا۔ لیکن یہ اچھا ہے کہ تم سنبھل جاؤ۔"

"مجھے معلوم ہے پیر سائیں۔ میں نے کیا کرنا ہے۔ میں اسی دن مرگئی تھی، جب میں نے حویلی سے قدم باہر نکالا تھا۔ یہ آپ ہی کی ضد ہے کہ میری زندہ لاش کو اس حویلی کے در و دیوار میں قید کر لیا ہے۔ لاشوں پر حکم نہیں چلایا جاتا، انہیں دفن کر دیا جاتا ہے یا پھر میری طرح در گور۔۔۔۔"

پیر سائیں نے حیرت سے سنا اور پھر ایک لفظ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ وہاں رہ گئی تو ان تینوں خواتین کے درمیان خاموشی ٹھہر گئی۔ جس میں حیرت کے ساتھ خوف بھی سانس لے رہا تھا۔ تبھی اماں بی نے کہا۔

"یہ تم نے کیا کیا بیٹی۔ دلاور شاہ کا عتاب اگر تم پر آ گیا تو بہت برا ہوگا۔"

"اب اس سے بڑا عتاب کیا آئے گا اماں بی۔ یہ جانتے بوجھتے بھی آپ مجھے ڈرا رہی ہیں۔" نادیہ نے کہا اور بنا اجازت کے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چل پڑی۔ اسے اب کسی کی پرواہ نہیں رہی تھی۔

پیر سائیں اپنے خاص کمرے میں بیٹھا۔ اپنے غصے اور حیرت پر قابو پا رہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نادیہ اس کے لیے اتنی مشکل پیدا کر دے گی۔ وہ جس قدر اسے اپنی راہ پر چلانا چاہتا، اس قدر ناکامی ہو جاتی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ نادیہ کا ایسا رویہ کیوں ہے؟ ظہیر شاہ نے بھی تو اس اس کا دل جیتنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بلکہ اس کے ساتھ ہتک آمیز رویہ اپنا کر پہلی رات اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اب نادیہ کا یہ رویہ عین فطری تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ بس ایک ہی راہ ہے اور وہ یہ کہ ظہیر شاہ لوٹ کر حویلی میں آ جائے۔ وہی اسے محبت اور پیار سے اپنی ڈگر پر لے آئے ورنہ نادیہ کا رویہ ایسا ہو جائے گا کہ سنبھالے نہیں سنبھلے گا۔ وہ کتنی ہی دیر تک اسی ایک نکتے پر سوچتا رہا۔ پھر اس نے ارادہ کر لیا کہ ظہیر شاہ کو واپس بلوائے گا۔ اب اس کی تعلیم سے زیادہ یہاں پر ضرورت تھی، وہ تو پھر بھی مکمل ہو جائے گی۔ اس نے فون اٹھایا اور ظہیر شاہ کے نمبر ملا دیئے۔

"جی بابا سائیں۔!" تمہیدی باتوں کے بعد اس نے پوچھا۔

"تم ایسا کرو، فوراً واپس یہاں سلامت نگر آ جاؤ، یہاں تمہاری ضرورت ہے۔" پیر سائیں نے کہا۔

"بابا سائیں۔! اگر آپ مجھے نادیہ کی وجہ سے بلا رہے ہیں تو میں قطعاً نہیں آؤں گا۔ میں ایسی کسی عورت کے ساتھ نہیں رہ سکتا جو انتہائی درجے کی بدتمیز ہو اور اسے نہ خونی رشتوں کا پاس ہو اور نہ جسے ادب و آداب چھو کر گزرے ہوں۔"

"میں یہ مانتا ہوں کہ وہ ایسی ہے لیکن تم نے اس کے لیے نہیں آنا، ہمیں اس کی ذات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بلکہ اس سے متعلق جو ہمارے معاملات ہیں۔ ان کے لیے آنا ہے۔ تم آؤ اور اس کا دل جیتو، ہمارا مطلب نکل گیا تو پھر ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں رہے گی۔"

"معاف کیجئے گا بابا سائیں۔ وہ جس نہج پر آ گئی ہے، اب اس کا بدل جانا یا ہمارے مطلب کے لیے تیار ہو جانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ بلکہ وہ ہمیں خراب کرنے لگی۔" اس نے صاف اور دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا۔

"تم تو مایوس ہو گئے۔ چلو تم ایسا کرو۔ میری بات مانو اور آ جاؤ۔ یہاں دیکھ لیں گے کہ کیا کرنا ہے۔" پیر سائیں نے اسے پیار سے سمجھایا۔

"بابا سائیں۔ اچھی بات تو یہ ہے کہ میں خود اس کے منہ نہیں لگنا چاہتا۔ وہ عورت اسی دن میرے دل سے اتر گئی جب وہ حویلی سے بھاگ گئی تھی۔"

(جاری ہے)